تذکرہ
شاعراتِ اُردو

آغاز سے موجودہ دور تک کی عفت مآب شاعرہ خواتین کا
تذکرہ، معہ انتخاب کلام و تبصرہ

تالیف

محمد جمیل احمد ایم، اے بریلوی

ناشر
قومی کتب خانہ بریلی

مندرجات

دورِ حاضر

الف

خ

د

ر

ز

ک

ل

م

ن

چند مضامین حواشی

× × × × × × × × ×

فہرست تصاویر

تعارف

[از محترم جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی ام اے، پی۔ایچ۔ڈی (لندن)]

اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر اپنے وسیع مفہوم میں وزن و بحر کی قید سے آزاد رہ کر بھی شعر ہی رہتا ہے لیکن عرف عام میں جسے ہم شعر کہتے ہیں اس کا منظوم ہونا لازمی ہے۔ تو گویا اب شاعری کے بنیادی عناصر دو ٹھہرے۔ تخیل اور موزونی طبع۔ یہ دونوں چیزیں فطری ہیں کسبی نہیں۔ لیکن قدرت نے اپنے اس انعام کے لئے صرف مردوں کو مخصوص نہیں کیا۔ فیض کا دروازہ مستورات پر بند نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے اور کسی دلیل کی محتاج نہیں چنانچہ ہر متمدن عہد میں ایسی خواتین گذری ہیں جو ہر اعتبار سے شاعرہ تھیں۔

یہاں قدرتی طور پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فطرت نے اس باب میں عورتوں کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں کی۔ تو شاعرات کی تعداد اتنی مختصر اور ان کے کلام کی تعداد اس قدر کم کیوں ہے کہ مرد شاعروں کے مقابلے میں ان کا عدم وجود برابر ہے؟ وجہ ظاہر ہے۔ جہاں تک جسمانی زور و قوت کا تعلق ہے قدرت نے مرد کو عورت کے مقابلے میں بدرجہا غالب و قاہر بنایا ہے اسی زور و قوت کی بناء پر مرد نے کبھی عورت کو اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھا اور اس کی ذہنی استعداد اور دماغی قابلیتوں کو کبھی نشو و نما کا موقعہ نہیں دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، عورت کے اکثر فطری ملکات معطل رہتے رہتے بالآخر بیکار ہو گئے اور وہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی کارنمایاں نہ کر سکی۔ بایں ہمہ بعض طبیعتوں کا جوش اور زور، طوفان و سیلاب کے مانند تھا جو مرد کے تعصب کی پیدا کی ہوئی گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود نہ رک سکا اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ

شعر کی دنیا میں بہت سے تابناک جواہر پارے عورت کے دل و دماغ کے خزینوں سے نکل کر عالم وجود میں آئے، لیکن مرد کی "غیرت" نے گوارا نہ کیا کہ انھیں منظرِ عام پر آنے دے۔ میر صاحب نے شعرا کا تذکرہ لکھا لیکن کسی شاعرہ کا ذکر کرنا یا اس کا کوئی شعر نقل کرنا ایک زبردست اخلاقی گناہ سمجھا۔ حالانکہ خود ان کی صاحبزادی شعر کہتی تھیں اور اچھا کہتی تھیں یہی حال میر صاحب کے بعد آنے والے اکثر دوسرے تذکرہ نویسوں کا ہے کہ عورت کے ذکر سے اُن کی "اخلاقی غیرت" کو شرم کا پسینہ آنے لگتا ہے۔ زمانہ کی دستبرد اور مردوں کی اس دارو گیر کے باوجود خواتین کے کلام کا کچھ حصہ ہم تک پہنچ ہی گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مستورات کے ذوق شعری کی مناسب تربیت کی جاتی تو وہ اس میدان میں کسی طرح مردوں سے پیچھے نہ رہتیں۔

زمانہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہمارے "جنسی اخلاق" کا آئین، آزادی کی ہوا سے متاثر ہونا شروع ہوا۔ وہ اگلی سی پابندیاں اور سختیاں نہ رہیں اور ہمارے شعرا کے تذکروں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خال خال کیا جانے لگا۔ چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشنِ بے خار" میں چند شاعرہ خواتین کا نہایت مختصر حال اور نمونہ کلام درج کیا ہے۔ مولوی عبد الغفور نساخ، شیفتہ سے چند قدم آگے بڑھے اور "سخن شعرا" میں بطور ضمیمہ شاعرات کا مختصر تذکرہ شامل کتاب کیا۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ آزادی کی راہیں کھلتی گئیں اور شاعرات کے مستقل تذکرے لکھے جانے لگے چنانچہ "شمیم سخن" اور "تذکرۃ الخواتین" وغیرہ وجود میں آئے۔

شاعرات کے ان تمام تذکروں میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ مشترک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں جن شاعرہ عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر

طوائفیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعرات کے حالات نہایت نامکمل اور نمونہ کلام بیحد مختصر ہے۔ بعض شاعرات کا محض تخلص اور صرف ایک شعر نقل کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ حالات جب صرف نام یا تخلص تک محدود ہوں تو پڑھنے والے کو شاعرہ کے ماحول کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، اور نہ وہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ شاعرہ کن کن چیزوں سے کس حد تک متاثر ہوئی ہے۔ اسی طرح جب نمونۂ کلام ایک دو شعروں سے زیادہ نہ ہو تو لکھنے والے کے میلانات اور رجحانات کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میر صاحب کا سوز و گداز آج ضرب المثل ہے لیکن اگر ان کے صرف یہ دو شعر ہم تک پہنچے ہوتے :۔

ہے بہتر رونا اپنا لونڈوں کی دوستی سے :: اس دن ہی کو کہتے تھا اکثر مدیر ہمارا

بس جو بزمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش :: کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

تو ظاہر ہے کہ ہم ان کے متعلق جو رائے قائم کرتے وہ سراسر لغو ہوتی یہی حال دوسرے اکابر شعرا کا ہے۔ انشا کی ٹھٹول بازی سے کون واقف نہیں، لیکن اگر ان کی صرف یہ غزل :۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہوتی تو یقیناً ہم انھیں ایک نہایت سنجیدہ گو شاعر سمجھتے، اور ظاہر ہے کہ ہماری یہ رائے حقیقت کے سراسر خلاف ہوتی بنابریں شاعرات کے حالات اور ان کا کلام مہیا کرنے میں جس بے توجہی سے کام لیا ہے اب اس کی تلافی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے تذکرہ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ کم سے کم اپنی ہمعصر شاعرات کے حالات اور ان کا معتدبہ کلام پوری کوشش کے ساتھ فراہم کرے۔ کلام کا نمونہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اتنا تو ہو کہ پڑھنے والا اس کے مطالعہ کے بعد لکھنے والی کی رنگِ طبیعت کو سمجھ سکے۔
مسٹر محمد جمیل احمد ایم۔اے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے

شاعرات کا یہ مبسوط تذکرہ موسوم بہ "شاعراتِ اُردو" مرتّب کیا۔ اس میں شاعرات کے حالات بھی ہیں اور کلام کا معقول نمونہ بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی نکتے اور تنقیدی اشارے بھی۔ عصرِ حاضر سے پہلے کی شاعرات کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دوسرے تذکروں سے ماخوذ ہے۔ اس لیے لازمی طور پر ناتمام ہے۔ البتہ دورِ حاضر کی شاعرات کے حالات اور کلام کی فراہمی میں بڑی کد وکاوش کی ہے۔ اس آزادی کے دور میں بھی شاعرہ خواتین کے حالات اور کلام کا مہیّا کرنا "ہفتخوانِ رستم" کو طے کرنے سے کم نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ جمیل حسنا دورِ حاضر کی شاعرات کے متعلق اتنا کثیر سوانحی اور شعری مواد کیونکر فراہم کر سکے۔

"شاعراتِ اُردو" کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ دوسرے تذکروں کے برعکس "شاعراتِ اُردو" میں ان شاعرات کا ذکر یکقلم ترک کر دیا گیا ہے جو زنانِ بازاری کے طبقہ میں شامل ہیں۔ جمیل صاحب کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض طوائفیں خود بھی شعر کہتی تھیں اور اچھا کہتی تھیں لیکن اکثر و بیشتر ان کا کلام ان کے مردِ احباب کا کہا ہوا ہے اور جمیل صاحب کا یہ خیال بے بنیاد نہیں۔

کسی تذکرہ کے متعلق یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمہ وجوہ مکمل ہے، اپنی ان کوتاہیوں کے باوجود جن کا ازالہ موجودہ حالات میں تقریباً ناممکن تھا۔ "شاعراتِ اُردو" اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے خدا اسے حسنِ قبول روزی کرے اور جواں سال مؤلف کی سعی مشکور ہو۔ آمین۔

(ڈاکٹر) عندلیب شادانی ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)
ڈھاکہ یونیورسٹی - ڈھاکہ

پیش لفظ

[از جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔اے دبیر کامل منشی فاضل، ایچ۔پی۔اے رجسٹرار جامعہ اردو وصدر شعبۂ فارسی و اردو آگرہ کالج آگرہ]

ہر ملک کی خواتین نے جہاں تمدن، معاشرت اور سیاسیات میں کم و بیش حصہ لیا ہے وہاں زبان و ادب، اور شعر و شاعری کی ترقی میں بھی انھیں ایک حد تک شریک پایا جاتا ہے۔ یورپ ہو یا ایشیا، چین ہو یا جاپان، ایران ہو یا ہندوستان، ہر ملک میں وہاں کے ماحول اور تمدن کے مطابق ایسی خواتین پیدا ہوتی رہی ہیں جو ادبیات کے گلستاں کو سدا بہار بنانے میں ساعی ہوئیں۔ یوں بھی عورتیں فنون لطیفہ سے اثر پذیر ہونے کے جذبات مرد سے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ معاشرت اور ماحول اسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقعہ نہ دے۔ مصوری، موسیقی، شاعری کے لئے جن لطیف احساسات اور نازک جذبات کی ضرورت ہوتی ہے وہ عورت میں بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ مگر ہندوستانی ماحول نے خواتین کے ان احساسات و جذبات کو بہت کم اُبھرنے اور ظاہر ہونے کا موقعہ دیا ہے۔ خواتین کی جانب سے اس تغافل کا ہی نتیجہ ہے کہ شاعرات سلف کے حالات اور کلام سے ہم بالکل تاریکی میں ہیں۔ آج ان کے احوال و کلام کی تدوین کی کوشش، ظلمات میں آب حیات کی تلاش سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس دور میں معاشرت کی اک گونہ تبدیلی اور نشر و اشاعت کی سہولت کے باعث، ہم کو کچھ ادیب اور شاعر خواتین کے نام نمایاں نظر آنے لگے ہیں اگر خواتین کا یہ علمی ذوق، اور ادبی خدمات کا شوق، اسی طرح اُبھرتا رہا، اور افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہ سکا، تو شاید ہماری ادیب و شاعر خواتین قابل عزت جگہ پانے کی مستحق ٹھہر سکیں گی۔ مگر تعجب ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی اردو ادبیات کے مؤرخ اور ناقد، خواتین کی ہمت افزائی اور ادبی خدمات کا

اعتراف و تذکرہ کرنے سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔
جناب جمیل صاحب بریلوی ایم۔ اے (مصنف "اردو شاعری کی مختصر تاریخ")
ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور تنہا اس زبردست
اور مشکل کام کو سر انجام دینے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ شاعرات اردو شاعر خواتین کا
تذکرہ ہے جس میں جمیل صاحب نے نہایت کاوش اور تحقیق کے بعد ابتدا سے لیکر موجودہ
دور تک کی شاعرات کا کلام اور حالات فراہم کئے ہیں اس کتاب سے تاریخ و تنقید
ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اردو میں مدت مدید سے تذکرے
لکھے گئے، لیکن اس تمام عرصہ میں شاعر خواتین کے متعلق شاعرات اردو جیسا
کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ اس لئے تاریخ ادبیات کے مطالعہ کرنے والوں
کی نظر میں مصنف کی یہ محنت جو مرتبہ رکھتی ہے ظاہر ہے۔
کتاب کے مقدمہ سے جمیل صاحب کی متانت طبع، ذوق سلیم اور وسیع مطالعہ کا
اندازہ ہوتا ہے۔ شاعرات کے مختلف دور اور اسکول قائم کرنے میں مصنف نے جس ہے
کام لیا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے تحت ان تمام خواتین کا تذکرہ آگیا ہے جن کے
نام یا دو ایک شعر قدیم تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ کتاب کا زیادہ حصہ دور حاضر
کی شاعرات پر مشتمل ہے جس میں تذکرہ کے ساتھ ساتھ کلام پر تنقید و تبصرہ کا
فرض بھی ادا کیا ہے۔ اور اکثر شاعرات کا انتخاب کلام بھی تفصیل سے درج کیا ہے۔
شاعرات کے خود نوشتہ حالات اور خود کردہ انتخاب کا شمول اس کتاب کی ایک
دلچسپ خصوصیت ہے جس کی قدر و منزلت کا اندازہ مورخ اور نقاد ہی خوب
کر سکتے ہیں۔ نہ معلوم اس کے لئے مصنف کو کس قدر خلوص و نیاز، اور صبر و
استقلال سے کام لینا پڑا ہوگا۔
میں جمیل صاحب کی اس تصنیف اور محنت کو کامیاب اور لائق مبارکباد سمجھتا ہوں۔
مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ ادبی خدمت علمی حلقوں میں خراج تحسین حاصل کرے گی۔

محمد طاہر فاروقی

انتساب

خواہرانِ محترم

اُمنہ و بنّو

کے نام

جنکی

آج صرف یاد باقی ہے

جمیلہ

نام مصنف - محمد جمیل احمد
پیدائش ۲۲ر جون سنہ ۱۹۲۱ء
مولد - بدایوں
مسکن - بریلی
تعلیم - ام-اے (اقتصادیات) فرسٹ ڈویژن سنہ ۱۹۴۰ء
ال-ٹی سنہ ۱۹۴۱ء
پتہ - معرفت قومی کتب خانہ - بریلی - یو-پی

دیگر تصانیف :-

(الف) مطبوعہ :-

(۱) اُردو شاعری کی مختصر تاریخ
(۲) غزالہ
(۳) ٹوٹتے ہوئے دل
(۴) تاثرات

(ب) زیرِ طبع :-

(۱) اقبالیات
(۲) آئینۂ سخن
(۳) سازو مضراب
(۴) سراب
(۵) وداعِ آخر

مصنف

محمد جمیل احمد ایم-اے بریلوی

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم صد ۹۲

التماس

موجودہ صفحات میں اردو شاعرات کا ایک مکمل تذکرہ اور اُن کے کلام کا ایک مختصر انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا خیال تو اسوقت آیا تھا جب میں اپنی کتاب "اردو شاعری کی مختصر تاریخ" (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) مرتب کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت چند در چند وجوہات کی بناء پر یہ چیز صرف عالم خیال ہی میں رہی۔ عموماً زمانہ نقوش کو ہلکا کرتے کرتے مٹا دیا کرتا ہے۔ مگر یہ نقش کچھ اس طرح کا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ نیرنگ خیال بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۴۰ء میں، میں نے "شاعرات ہند" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو بہت پسند کیا گیا اور پھر ہر طرف سے اس خیال کی تکمیل تک پہنچانے کی تاکید ہونے لگی۔ اور بالآخر میں نے اس کارِ مشکل کو شروع کر ہی دیا۔ لیکن جتنا کام کرتا گیا اُتنا ہی یہ کام اور زیادہ مشکل نظر آتا گیا۔ آخر مسودہ کو نامکمل حالت میں چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اتفاقاً کچھ عرصہ بعد محترمی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) نے اس مسودہ کو اسی طرح غیر مکمل صورت میں دیکھا۔ آپ نے میری ہمت افزائی فرمائی اور کہا "مجھے آپ کی یہ کتاب بہت پسند ہے۔ آپ نے اچھا کام کیا ہے۔"

اس کے بعد پھر میری کچھ ہمت بندھی اور پھر میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ آپ نے بھی مسودہ دیکھکر میری ہمت افزائی کی اور کچھ مفید مشورے بھی دئیے۔ عام طور پر یہ خیال پسند کیا گیا۔ طبقۂ نسواں اور خصوصاً شاعرات نے میرے اس خیال کو سراہا اور میری ہمت بندھائی:

مسز بی حق نے لکھا۔

"کتاب شاعراتِ اردو" کی ترتیب کا خیال قابلِ ستایش ہے"

محترمہ عزیز جہاں بیگم ادا نے لکھا:۔

"شاعراتِ اردو کی ترتیب کا خیال مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی، مجھے یقین ہے کہ ادبی دنیا میں آپ کی اس کوشش کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا"

محترمہ آمنہ خاتون عفتؔ نے لکھا:۔

"آپ کے قومی جذبات اور جنس نسواں کی قدر قابل مبارکباد ہے"

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:۔

"جملہ خواتین آپ کی اس محنت کی داد دینگی"

شہزادی تیمور جہاں حجابؔ نے لکھا:۔

"آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ واقعی شاعرات بیویوں کی حقیقی دلی ترجمانی ہے اس چیز کا تو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی روئے زمین پر مذاقِ سخن رکھنے والی عورتوں کی حوصلہ افزائی کریگا۔

بلکہ ہم لوگ اس بات سے تنگ آچکے تھے۔ ہر زنانہ مشاعرہ پر اظہارِ تنقید کیا جاتا رہا جس کے سبب ہم لوگوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے مراد آباد۔ دہلی۔ میرٹھ اور مظفر نگر کے مشاعروں کے بعد میں جن کی بے ملنے صدارت کی متذکرہ بالا نتائج نکلتے رہے، آپ نے زمانہ حاضرہ کی شاعرات کو صفحۂ قرطاس پر لاکر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے، علاوہ اس کمزوری کو پورا کر دیجئے جس کی ضرورت اسوقت ہمارے ملک کی تمام لائبریریوں کو تھی!!........

ایک اور مکتوب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"خبر نہیں آپ نے ان منتشر ٹکڑوں کو کیسے یکجا کر دیا ہے۔ واقعی آپکو بڑی تلاش اور کاوش کرنا پڑی ہوگی"

محترمہ صابرہ سلطان حزیں نے لکھا:۔

"کتاب مذکور کی اشاعت اُردو ادب پر آپ کا ایک احسانِ عظیم ہوگا عورت کی جہاں ہر چیز کو پس پشت ڈالا جاتا رہا ہے وہاں اسکی شاعری بھی ناقابلِ التفات سمجھی گئی"

مُحترمہ خدیجہ مستور لکھنوی نے لکھا:۔

"یہ معلوم ہو کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ آپ نے اُردو شاعرات کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے۔ شکر ہے کہ اردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہو رہی ہے"

محترم جناب رازق الخیری صاحب (ایڈیٹر رسالہ عصمت) فرماتے ہیں:۔

"میری دلی دعا ہے کہ آپ اس کوشش میں کامیاب ہوں۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔"

بہر حال ان ہمت افزائیوں نے میری دستگیری کی اور آج کسی نہ کسی طرح ان صفحات کو ختم کر رہا ہوں۔ ایک غیر متعلق شخص اسکو دیکھ کر کہے گا کہ اس میں کیا رکھا ہے، چند بے ربط جملے، دو چار شعر اور بس، لیکن جو لوگ اس قسم کا کام کر نیکے کچھ تھوڑے بہت بھی عادی ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ "اور بس" بھی کس قدر جگر کاوی اور محنت پژوہی چاہتا ہے۔

موجودہ مجموعہ میں شاعرات کا جو انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے اس میں کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا گیا نہ کسی خاص اصول کی سختی سے پابندی کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اکثر مختلف خواتین کے کلام کے انتخاب میں مختلف معیار قائم کرنا پڑے ہیں۔ اور اس کی وجہ تھی۔ شاعرات — خصوصًا شاعرات گزشتہ کا اتنا زیادہ اور ایسا کلام دستیاب نہیں ہو سکا کہ ان سب کا انتخاب کسی ایک خاص معیار کے مطابق کیا جا سکتا۔ اگر ایک بلند معیار قائم کر کے انتخاب کی کوشش کی جاتی تو اکثر ان خواتین کو جو اس تذکرہ میں شامل ہیں نظر انداز کر دینا پڑتا۔ اور اگر کوئی پست معیار قائم کیا جاتا تو یہ مجموعہ بجائے ذوقِ سلیم کو تسکین بخشنے کے اس پر ایک بار بن جاتا۔ علاوہ ازیں پھر اکثر خواتین کا کم و بیش تمام کلام پیش کر دینا پڑتا۔ جو موجودہ مجموعہ کا مقصد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انتخاب میں کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ معیار انتخاب کرنیوالے کے ذوق پر

منحصر ہوتا ہے اور خود ذوق قانونِ تغیر کا ماتحت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ مختلف شخصوں کا ذوق مختلف ہوتا ہے، خود ایک ہی شخص کا ذوق مختلف اوقات اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے۔ کیف کے کسی ایک خاص لمحہ میں ایک شعر اس کو اشکبار کر دیتا ہے اور دوسرے لمحہ میں وہی شعر بے کیف و سادہ نظر آتا ہے، البتہ اس بات کی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ خواتین کا جو کچھ کلام راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے منتخبہ اشعار اس میں بہتر ہوں؛ ان شاعرات کے کلام کی نمائندگی اور ان کی خصوصیات کی طرف رہبری کر سکیں؛ صاف اور اگر ممکن ہو تو پُر کیف پُر اثر ہوں اور حتی المقدور معائب سے پاک ہوں۔ انتخاب میں جذبات کو الفاظ پر ہر جگہ ترجیح دی گئی ہے؛ اس لئے کہ میرا نظریۂ شاعری خوبصورت الفاظ کا چناؤ نہیں بلکہ خوبصورت جذبات کا صداقت آگیں اظہار ہے۔ اکثر شاعرات سلف کا صرف ایک ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ دستبرد زمانہ سے ان کا صرف ایک ہی شعر یادگار رہ گیا ہے اور ان کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

شاعرات کے کلام ـــ اور اس سے زیادہ ان کے حالات ـــ کی فراہمی میں مشکلات پیش آئیں۔ اردو کے جتنے خاص خاص تذکرے ہیں وہ سب شعراء سے متعلق ہیں البتہ تلاش و کاوش کے بعد چند چھوٹے چھوٹے تذکرے ایسے ملتے ہیں جن میں کچھ خواتین کے اشعار

ہیں، لیکن قریب قریب ان سب تذکروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ شاعرات کے زمانے اور مقام کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اکثر پورا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ حالات نہایت ناکافی اور تشنہ ہیں، کلام پر تنقید و تبصرہ کا بالکل فقدان ہے، کلام کے نمونے جو پیش کئے گئے ہیں وہ نہایت مختصر، غیر تسکین بخش اور اکثر پوچ و لچر ہیں! یہ تو خیر شاعرات گزشتہ کے متعلق تھا۔ لیکن شاعرات حاضرہ کے متعلق یہ بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں میری مشکلات ظاہر ہیں۔ میں نے سوچا کہ خود شاعرات کو لکھوں اور خود ان سے ان کے حالات اور انتخاب کلام حاصل کروں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پتے کیسے حاصل ہوں۔ میں نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن، دہلی ریڈیو اسٹیشن، اور مختلف رسالوں (خصوصاً زنانہ رسالہ) کے ایڈیٹروں کو لکھا، ہر جگہ جواب ایک مستقل خاموشی تھی۔ میں ایک گدائے مبرم کی طرح برابر تقاضہ کرتا رہا۔ بالآخر لکھنؤ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کا جواب ملا کہ اس سلسلے میں ہم کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے بعد مخترم رازق الخیری صاحب ایڈیٹر رسالہ عصمت نے تحریر فرمایا:-

"اصولاً میں کسی خاتون یا کسی مضمون نگار کا پتہ کسی کو نہیں لکھ سکتا۔ چونکہ یہ اصول کی بات ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگی"!

خیر۔ ان بزرگوں نے اتنا کرم تو کیا کہ جواب دیا۔ اوروں نے اسکی زحمت بھی گوارا نہ فرمائی۔ پھر بھی جتنے پتے مجھے معلوم ہو سکے میں نے

ان پر عریضے ارسال کر سکے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری آواز بالکل صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی۔ اس طرح میں اس مجموعہ میں کچھ شاعرات کے خود منتخبہ اشعار اور خود مرسلہ حالات بھی پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں ان ذریعوں کے علاوہ میں نے ملک کے ادبی رسالوں اور صحیفوں سے بھی بہت مدد لی ہے!

ہماری شاعرات کی کوئی ترتیب و تقسیم بھی نہیں کی گئی۔ اور کی بھی کیسے جاتی جب ان کے کلام ہی کو محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہ کی گئی۔ تو ترتیب و تقسیم و تنقید کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے' میں نے صفحاتِ ذیل میں اس امر کی پہلی مرتبہ کوشش کی ہے اور یہاں جو ترتیب و تقسیم پیش کی گئی ہے وہ راقم الحروف ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے چونکہ اس کے بغیر کوئی تذکرہ بھی تاریخی، تنقیدی اور ادبی حیثیت سے قابلِ وقعت نہیں۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے شعراء کو مختلف ادوار اور اسکولوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ میں نے بھی اسی روش کی تقلید میں شاعرات کے مذکورہ ذیل ادوار و اسکول قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) موجدین

(۲) شاعراتِ اُردو کا دہلی اسکول

(۳) شاعراتِ اُردو کا لکھنؤ اسکول

(۴) دورِ حاضر

مختلف ادوار کو سمجھنے اور اس وقت کی زبان اور شاعری کا اندازہ

کرنے کے لئے اردو زبان کے ارتقا کا ایک مختصر سا خاکہ بھی ضروری تھا اس لئے آغاز میں وہ بھی پیش کر دیا گیا ہے ہجری اور عیسوی سنہ جہاں تک ممکن ہوا ہے "مختصر تاریخ ہند" مصنفہ مولٰنا سیّد ابوظفر صاحب ندوی رفیق دار المصنفین اور "داستان تاریخ اردو" مصنفہ پروفیسر حامد حسن قادری سے لیے گیے ہیں۔ ان کتابوں میں مصنفوں نے بڑی کاوش اور احتیاط سے ہر جگہ تمام اصل ہجری سنہ اور حسابی عیسوی سنہ درج کئے ہیں۔

شروع میں بطور مقدمہ شاعرات کے کلام پر ایک مختصر ریویو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں مختلف ادوار اور اسکولوں کی شاعرات کے کلام کی نمایاں خصوصیات پیش کر دینے کی کوشش کی گئی ہے خصوصًا دور حاضر کی شاعرات کے مختصر حالات درج کرنیکے بعد ان کے کلام پر مجمل تنقیدی نوٹ بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ ان تنقیدی نوٹوں کے متعلق ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

کچھ گرامی قدر شاعرات سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے شاعرات کا کلام ابھی سخت اور شدید تنقیدوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور یوں بھی عیب جوئی اور عیب نمائی میرا مسلک نہیں۔ اسلئے ان تنقیدی نوٹوں میں تحسین، ہمدردی اور ہمت افزائی کا پہلو غالب ہے۔ چونکہ میرا مقصد تعمیر ہے تخریب نہیں۔ پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ واقعات سے انحراف نہ ہو اور تنقید تنقید ہی رہے۔

ادوار گزشتہ میں شاعرات کے ناموں کی ترتیب میں زمانہ اور

وقت کا حتی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ مگر موجودہ دور میں چونکہ زمانہ کا کوئی خاص سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے جس میں کسی تخلص کو تلاش کرنا نسبتہً آسان تر ہے۔

موجودہ مجموعہ میں صرف عفت مآب خواتین کو شامل کیا گیا ہے انہیں شاہدانِ بازاری کے اشعار و حالات پیش نہیں کئے گئے اسکا سبب یہ نہیں ہے کہ شاہدانِ بازاری کا شمار عورتوں میں نہیں، یا ان کے جذبات قابلِ اعتنا نہیں اس کے کئی سبب ہیں :۔ اوّل یہ کہ شاہدانِ بازاری کے کلام کی بابت وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں کا کلام ہے یا ان کے تذکروں میں سے کسی نے ان کے نام سے کہہ دیا ہے، لیکن یہی اعتراض بعض مواقع پر شاعرات پر بھی صادق آسکتا ہے، اور مجھے اس میں کلام نہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں اس شبہ کے لئے ہر ممکن گنجائش موجود ہے اور یہاں بظاہر اس کے امکانات کم ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ عورت فطرتاً شرم و حیا کا مجسمہ ہے اور یہ چیز نسوانی فطرت کا ایک ضروری جزو ہے۔ ہمارے ذہن میں عورت کے تصور کی لطافت ہی اسوقت تک قائم ہے جبتک حیا و شرم کے جذبات اس کے ساتھ ہوں یہی وجہ ہے کہ ابتذال و فحاشی ایک وقت مرد کی زبان سے اس قدر گراں نہیں

---

[1] میں انگریزی پڑھنے کے بعد بھی اپنے نظریوں میں خالص مشرقی ہوں، اور یہ نظریہ بھی مشرقی نظریہ ہے۔ اسکو مغربی کسوٹی پر نہ جانچیے یہ لطافت اس کثافت کی متحمل نہ ہوگی۔

گذرتی اور اس قدر حیا سوز نہیں ہوتی جتنی کہ عورت کی زبان سے ہوتی ہے۔ شاہدان بازاری کے کلام کا زیادہ تر حصّہ فحاشی و ابتذال پر مشتمل ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ شاعرات کے یہاں بھی اکثر مبتذل اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یاسمن۔ گوہر۔ ضیاء۔ شرم اور کنیز (فاطمہ بیگم) وغیرہ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ ان میں بھی یاسمن اور کنیز دونوں لونڈیاں تھیں بیگمات میں سے نہیں نہیں۔ لیکن پھر بھی فحاشی ان کے کلام میں کہیں کہیں ملتی ہے ان کا عام رنگ نہیں۔ برخلاف اس کے شاہدانِ بازاری کا عام رنگ یہی ہے چند مثالیں جو بغیر کسی خاص کاوش و اہتمام کے لے لی گئی ہیں ملاحظہ ہوں۔

دلبر (اکبر آبادی)

قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس
اک روز لپٹ کر شب مہتاب میں سونا

امراؤجان زہرہ (لکھنؤ چوک)

سو بوسے گر دئیے ہیں تو دس اور دیجئے
تسبیح میں ضرور ہیں دانے شمار کے

شیریں (لکھنؤ چوک)

رات باقی ہے ٹھہر جا ابھی جلدی کیا ہے
دلِ شیدا مجھے بیتاب نہ کر وصل کی رات

نگن جان زینب (لکھنؤ چوک)

اجل جو حسرتِ بوس و کنار میں آئی
چمٹ کے لاش کو قاتل نے خوب پیار کیا

صاحب جان جان

جان و دل بیچتے ہیں ہم اپنا
ایک بوسہ پہ لے لو سستا ہے

بندی جان ناز (آرہ)

مُنھ سے بولو تو سہی کلب ہے کی گھبراہٹ ہے
بات کی بات میں ہوتی ہے سحر وصل کی رات

منی بائی حجاب (کلکتہ۔ رامپور بھی آ کر رہی تھی حجاب اور داغ کے اکثر افسانے مشہور ہیں۔)

اُنسے کہدو کہ ہمیں تمسے یہ امید نہ تھی
وعدہ ہم سے ہوا رہو غیر کے گھر وصل کی رات

شوخ ہو بیباک ہو سفاک ہو چالاک ہو
کیوں شبِ وصلت میں مجھسے آپ شرمانے لگے

زہرہ (انبالہ)

جان جاتی ہے تمھارے ہجر میں
اب لپٹ جاؤ خدا کے واسطے

خورشید جہاں خورشید (کانپور)

ہم تڑپتے ہیں تو ہنس ہنس کے یہ فرماتے ہیں
کیا ہوا تھا یہ ترا دردِ جگر وصل کی رات

فہیمن جان صنم (کلکتہ)

چھاگلیں یار کی کرتی ہیں قیامت برپا
سیکڑوں یار بجاتی ہیں گجر وصل کی رات

یہ کس قدر مخربِ اخلاق اور حیا سوز اشعار ہیں! اور ان کا ابتذال فحاشی اور سوقیت کس قدر شدید اور گھناؤنی ہو جاتی ہے جب یہ احساس باقی رہے کہ یہ ایک عورت کی زبان سے نکلے ہیں

یہاں پر بھی یہ رکیک و مبتذل اشعار قاری کے ذوقِ سلیم پر غالباً گراں گزریں گے مگر اِن کو یہاں پیش کرنے کا مقصد ناظرین پر یہ واضح کرنا

ہے کہ اس حیاسوز فحاشی اور اس ابتذال میں جو کچھ شاعراتِ سلف کے کلام میں باقتضائے رنگ زمانہ ملتا ہے، کیا فرق ہے۔

تیسری وجہ شاہدانِ بازاری کو یہاں شامل نہ کرنے کی یہ ہے کہ ان کو عفت مآب خواتین و بیگمات کے دوش بدوش ایک ہی بزم میں پیش کرنا ان خواتین و بیگمات کی توہین ہے۔ اس لئے میں نے موجودہ مجموعہ کو شاہدانِ بازاری کے کلام سے ملوث نہیں ہونے دیا ہے، البتہ اگر وقت نے فرصت اور واقعات نے اجازت دی تو شاہدانِ بازاری کا ایک تذکرہ علیحدہ مرتب کرونگا۔ اور اسمیں عفت مآب خواتین شامل نہیں کیجائینگی۔

میں موجودہ مجموعہ کیلئے معذرت خواہ نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اپنا جرم خود تسلیم ہے۔ فضلائے ادب کی بے نیازی اور زمانہ کے گرد و غبار میں چھپے ہوئے ایک گوشۂ ادب کو جرأکر میں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں، اور اس جرم کیلئے ہر سزا کا مستوجب ہوں۔

لیکن! — مجھے اس تذکرہ کے نقائص اور خامیوں کا پوری طرح احساس ہے۔ ان مساعی کی کامیابی و صحت کا دعویٰ نہیں۔ البتہ ادب کے اس شعبہ میں جس کے ساتھ بدقسمتی سے تجاہلِ عارفانہ برتا گیا اور برتا جارہا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ تشنہ و غیر مکمل لیکن التفات طلب۔

اگر آپ نے اس مجموعہ کو اس نظر سے دیکھا کہ کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا ہوا ہے تو میرے گھبرائے ہوئے ضمیر کی وحشت کچھ اور بڑھ جائے گی لیکن اگر آپ کی نظریں اس پر اسطرح پڑیں کہ اس ضمن میں کیا ہو چکا ہے اور

اب کیا کیا گیا ہے تو میں آج بھی اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا ہوں۔
مجھے احساس ہے کہ موجودہ تذکرہ میں اکثر وہ خواتین شامل ہونے سے رہ گئی ہونگی جن کو شامل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے انکی شعرگوئی سے انحراف یا انکی شاعرانہ عظمت سے انکار ہے بلکہ اس کی وجہ ان کے کلام اور حالات کا اسوقت دستیاب نہ ہو سکنا ہے۔ اگر شاعرات نے توجہ فرمائی اور اپنے حالات و کلام وغیرہ مجھے ارسال فرما دیئے تو انشاءاللہ آئندہ اڈیشن میں نہ صرف یہ کہ یہ کمی پوری ہو جائے گی بلکہ موجودہ دور کی زیادہ سے زیادہ شاعرات کے خودنوشتہ حالات اور انتخاب کلام بھی پیش کر سکوں گا جسکی ابتدا اسی اڈیشن سے کردی گئی ہے نیز ادب نواز حضرات و خواتین سے میری التجا ہے کہ وہ آئندہ اڈیشن کو زیادہ سے زیادہ مکمل صورت میں پیش کرنے کیلئے میری اعانت فرمائیں اور اپنے مفید مشوروں اور پُرخلوص مدد سے مجھے استفادہ کا موقعہ دیں۔

آخر میں ان تمام خواتین کا بہ دل مشکور ہوں جنھوں نے اپنا کلام اور اپنے حالات مجھے ارسال فرمائے، یا دوسری خواتین کے حالات و کلام کی فراہمی میں میری مدد فرمائی، میں اس دلچسپی اس ہمت افزائی، اس پُرخلوص اعانت کے لئے بے حد ممنون ہوں ——— اور یہ جذبہ ممنونیت یہ اظہار تشکر رسمی نہیں قلبی ہے۔

جمیل

بریلی
یکم جنوری ۱۹۶۴ء

مقدمہ

مُقدمہ

تذکرہ نویسی اور اُردو شاعرات

شاعرات کے کلام کی تدوین کی ضرورت

اُردو ادب کا ایک نہایت تعجب خیز اور تاسف زا واقعہ یہ ہے کہ جہاں شعراء کے کلام کو شروع ہی سے محفوظ رکھنے اور سراہنے کی کوشش کی گئی وہاں خواتین کی مساعی شعری کو نہایت بے پرواہی سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مستثنیات زندگی میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعراء" (۱۲۸۱ھ) میں کچھ شاعرات کا ضمناً ذکر کر دیا ہے یا اسی طرح دو چار نام اور بھی بتلائے جا سکتے ہیں جہاں کہیں کہیں دو ایک شاعرات کے نام بھی نظر آجاتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ شاعرات کے ساتھ اس ادبی التفات کا عشر عشیر بھی نہیں برتا گیا جو شعراء کے ساتھ برتا جاتا رہا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس اغماض کی تھوڑی بہت ذمہ دار ہماری قدیم مشرقی تہذیب اور اخلاق ہو۔ جس میں عورت کو کسی عنوان سے بھی منظرِ عام پر لانا ایک عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن افسوس اس کا ہے کہ

یہ تجاہلِ عارفانہ صرف اسلاف تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آج اس ریشنی ترقی اور تہذیب کے زمانہ میں بھی، جو تذکرے اُردو میں قابلِ قدر کہے جاسکتے ہیں ان میں کہیں خواتین کا نام تک نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے ان بزرگوں کے نزدیک صنفِ نازک کے جذبات قابلِ احترام نہ ہوں اور کمال بے نیازی و بیدردی سے تلف کئے جاسکتے ہوں، لیکن کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب شاعروں کے کلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کیگئی اور کیجارہی ہے تو کیوں نہ ان ہی اغراض و مقاصد کے ماتحت خواتین کا کلام بھی مدوّن کیا جائے۔ ممکن ہے جواب میں یہ عذر پیش کیا جائے کہ شاعرات کا کلام شعراء کے کلام سے پست ہے اور اس معیار پر پورا نہیں اُترتا اور اسوجہ سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہیں کیجارہی ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا بہمنی دَور کے اردو شاعروں مثلاً نظامی، نصرتی، رستمی وغیرہ کا کلام آج کی شاعری کے معیار پر پورا اُترتا ہے؟ کیا وَلی، انشا اور نظیر اکبرآبادی کا تمام تر کلام اس معیارِ شاعری پر پورا اُترتا ہے؟ کیا ناسخ اور ان کے تلامذہ کا بیشتر حصّہ کلام اس معیارِ شاعری پر پورا اُترتا ہے جس کو آج صحیح معنوں میں شاعری سمجھا جارہا ہے؟ —— اور پھر بھی ان حضرات کا کلام محفوظ رکھا گیا اور آج بھی رکھا جارہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی معقول عذر ہی نہیں۔ خواتین میں جہاں کچھ شاعرانہ حیثیت سے نومشق اور مبتدی ہیں وہاں بہت سی ایسی خواتین کے نام بھی پیش کرئے جاسکتے ہیں جو نہایت

کہنہ مشق، قادر الکلام، صاحبِ ذوق اور خوش گو ہیں، یوں تو خود شعرا میں بھی بعض کا کلام بعض سے پست ہے اور پھر بھی محفوظ رکھا گیا اور رکھا جا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً خواتین کا کلام اس قدر بلند نہیں کہ اساتذہ کے کلام کے مقابلہ پر لایا جاسکے، تاہم صدہا شاعر ایسے نکالے جاسکتے ہیں جن کا کلام اکثر خواتین کے کلام سے پست ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ قلم چونکہ اب تک زیادہ تر مرد کے ہاتھ میں رہا ہے اسلئے وہ عام طور پر عورت کو نظر انداز کرتا رہا ہے۔ حیاتِ انسانی کا یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ جہاں مرد کی جذباتی تاریخ میں عورت سب سے پیش پیش رہی ہے وہاں اسی عورت کو ہمیشہ پس پشت ڈالا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے جذبات تک کو قابلِ احترام نہیں سمجھا گیا۔ کس قدر افسوس اور ناانصافی کی بات ہے کہ دنیا کے تمام ادیبوں کا بیشتر حصہ جس "عورت" کے گرد حلقہ زن ہو اسی عورت کے جذباتِ لطیف اور ادبی کارناموں کو یوں مٹا ڈالا جائے اور اس پر کوئی التفات نہ کیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ فضلائے ادب اپنی شہرت کی پرنخوت بلندیوں پر پہنچکر بھی کس طرح اپنے اس ادبی جُرم کا جواز پیش کرسکیں گے، وجدانی حیثیت سے بھی جذباتِ عورت کی زبان سے ادا ہونیکے بعد شدید تر ہوجاتے ہیں۔ وہی بات اگر مرد کی زبان سے ادا ہو تو اس میں اتنا کیف و اثر نہیں ہوتا جتنا کہ ایک عورت کی زبان سے ادا ہونیکے بعد اس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ ایک

نفسیاتی حقیقت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کے جذبات کو عورت سے ایک فطری وجبلی لگاؤ ہے ۔ ہندی شاعری میں جو کشش، جو شیرینی اور جو کیف واثر ہے اس کی ایک بہت بڑی وجہ —— جو اور تمام وجوہات پر فوق ہے —— یہ ہے کہ اس میں جذبات کا اظہار بجائے مرد کے عورت کی زبان سے ہوتا ہے، اسلئے یہ ایک مزید سبب ہے جس کی بناء پر خود عورت کی زبان سے ادا کئے ہوئے جذبات کو محفوظ رکھنا اور اسکی قدر کرنا چاہیئے تھی ۔

حیاتِ انسانی کے اس دورِ نہضت میں "عورت" نے جو اہمیت حاصل کرلی ہے وہ چنداں تشنۂ اظہار نہیں ۔ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے، صدیوں کا جمود ٹوٹ رہا ہے، معاشرت اور تمدن، تہذیب و اخلاق کے خود ساختہ اصول گریزاں ہیں، زمانہ مجبوراً مساوات کیطرف آرہا ہے ۔ اسلئے اب خواتین کے ساتھ وہی تجاہلِ ماضی برتنا ان کے جذباتِ لطیف کو ٹھکرانا اور ان کے کارناموں کو قابلِ التفات نہ سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے ۔

چنانچہ ضرورت ہے کہ ان کے کلام کو جمع کیا جائے اور ملک کے اس گرانمایہ ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کیجائے ۔

اُردو زبان کی تخلیق و ارتقا اور اسمیں شاعری کا آغاز

ہر قوم و ملک کی زبان پر اس کی تاریخ اسکے تمدّن اسکی معاشرت کا بہت اثر پڑتا ہے، اُردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اگر ہندوستان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسطرح تاریخی اثرات اس زبان کی تخلیق کا باعث ہوئے۔

اس وقت سے کہ جس وقت کی کوئی مستند تاریخ بھی موجود نہیں ہے، مختلف قومیں شمالی مغربی راستوں سے ہندوستان میں آتی اور بستی رہیں، تاریخ نے ان قوموں کو "غیر آرین" اقوام کے نام سے موسوم کیا ہے، یہ قومیں اپنی اپنی زبانیں اپنے ہمراہ لائیں جو کچھ تبدیل شدہ صورت میں "پراکرت" کے نام سے موسوم ہوئیں۔

تقریباً ساڑھے تین ہزار برس کا زمانہ گزرا بحیرۂ اسود اور بحیرۂ اخضر کے مابین سیحوں اور جیحوں کے سواحل پر اور کوہ قاف کے ارد گرد ایک قوم آباد تھی جو اقتصادی ضروریات کی بناء پر کچھ مغرب کیطرف چلی گئی اور کچھ یورپ میں آباد ہوگئی اور کچھ مشرق میں آکر ایران اور ہندوستان میں آباد ہوگئی۔ ہندوستان میں یہ لوگ "آرین" کہلائے۔ یہ لوگ اپنی زبان اپنے ہمراہ لائے جو "سنسکرت" کہلائی۔

بدھ مذہب کے بانی شاکیامنی مہاتما بدھ سنہ ۵۴۳ قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے، انھوں نے پالی زبان میں اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ مہاتما بدھ کے یہ فقرے سید محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے نقل کئے ہیں۔

"دھرم کرو۔ دھرم کرو۔ دھرم کا اسنکھ پھل ہے۔ دھرم کا ڈنڈ بچاؤ۔"

اگر محمود صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے اور واقعی یہ فقرے مہاتما بدھ کے ہیں تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پالی زبان کس قدر اُردو کے قریب آچکی تھی؛

آرین قوم اپنی زبان کو متبرک سمجھتی تھی اسلئے اس کو دوسرے اثرات سے پاک رکھنے کی انتہائی کوشش کیگئی، تقریبًا چار سو برس تک ان کی یہ کوشش کامیاب رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ زبان مغلوب قوم (ڈروڑ) کی زبان سے خلط ملط ہونے لگی اور اس طرح یہ خفیف تغیر مختلف پراکرتیں ظہور میں آتی رہیں اور مٹتی رہیں؛

مولانا سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں ایک ہندو فاضل کے ایک محققانہ خطبہ کی مدد سے ان پراکرتوں پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا رقمطراز ہیں :-

"ایک ہندو فاضل مہامہا پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب کے عنوان سے چند خطبے دئے تھے جنکو ہندوستانی اکاڈیمی نے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کردیا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرت زبانوں کا کچھ کچھ حال بیان کیا ہے اور ان کی حسب ذیل چھ قسمیں بتائی ہیں :-
ماگدھی - شورسینی - مہاراشٹری - پیشاچی - اونتک اور آپ بھرنش ۔

۱۔ ماگدھی - مگدھ اور اس کے قرب و جوار کے عوام کی زبان تھی قدیم "ماگدھی" اشوک کے کتبوں میں ملتی ہے۔ عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے ملازم مثلاً دھیور۔ سپاہی بدیسی، جین، سادھو اور بچّوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں۔

۲۔ شورسینی۔ شورسین یا متھرا کے قرب و جوار کے علاقہ کی زبان تھی۔ سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی بات چیت میں اسکا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔

۳۔ مہاراشٹری۔ مہاراشٹر یعنی مرہٹہ کی زبان۔ اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کیلئے کیا جاتا تھا۔

۴۔ پیشاچی۔ پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی و شمالی حصّوں کی زبان تھی۔

۵۔ اونتک۔ اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی یہ زبان اجین اور مندسور میں رائج تھی۔

۶۔ آپ بھرنش۔ اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ اُجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا۔ دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے۔ راجپوتانہ مالوہ، کاٹھیاوار اور کچھ وغیرہ مقامات کے ٹکسال بھاشا کے

گیت اس بھاشا کی بگڑی ہوئی صورت ہیں ہیں، قدیم ہندی بھی بیشتر اس بھاشا سے نکلی ہے۔

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں:-

۱- ٹامل - جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فایق ٹامل ہے - اس زبان کا نشوونما زیادہ تر جینیوں کے ہاتھوں ہوا اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے -

۲- ملیالم - ملیبار کی زبان ہے مگر اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہیں؛

۳- کنڑی - اس زبان کے ادبیات کی پرورش و پرداخت بھی جینیوں نے کی؛

۴- تیلنگو - اندھرا صوبہ میں مروج ہے؛

(ہندوستان میں ہندوستانی" نقوش سلیمانی - از سید سلیمان ندوی ۲۴-۲۵)

محمد بن قاسمؒ نے ۷۱۱ء ۹۳ھ میں سندھ پر حملہ کیا اور تین برس تک وہاں قیام کیا - اس زمانہ میں بہت سے عرب سپاہیوں نے ہندوستان میں شادیاں کیں اور یہیں بس گئے ان واقعات نے بھی یہاں کی زبان پر بہت اثر ڈالا - اور یہاں کی مقامی پراکرتوں میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہونے لگے -

اس کے بعد محمود غزنویؒ کے متواتر سترہ کامیاب حملوں سے یہاں کی زبان بہت متاثر ہوئی اور رفتہ رفتہ ملکی زبان میں عربی کے

ساتھ ساتھ فارسی الفاظ بھی شامل ہونے لگے۔ محمد غوری کے حملوں نے اس اختلاط کو اور مدد پہنچائی۔ محمد غوری نے ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں پرتھی راج کو شکست دیکر اسلامی حکومت مستقلاً ہندوستان میں قائم کردی، اسلئے مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور زبان کا جو اثر یہاں کی ملکی زندگی اور زبان پر پڑ رہا تھا اس نے بھی زیادہ گہری دیرپا اور مستقل صورت اختیار کرلی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے، اور اکثر مصنفین نے ان کی نقل کی ہے کہ پرتھی راج کے درباری شاعر چند برداؔئی نے ایک کتاب "پرتھی راج راسو" تین جلدوں اور ستر حصوں میں لکھی ہے جو اس وقت کی ہندی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں بکثرت عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں لیکن یہ نظریہ کہ یہ کتاب غوریوں کے زمانہ میں لکھی گئی اب قطعی طور سے غلط ثابت ہوچکا ہے اور معلوم ہوچکا ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے پہلے نہیں لکھی گئی[1]۔ اس کتاب پر حافظ محمود خاں شیرانی کے فاضلانہ تبصروں نے جو اورنٹیل کالج میگزین میں چھپے ہیں اس بھید کو پوری طرح کھول کر رکھدیا ہے۔ البتہ اس سے پہلے کی ایک ہندی کتاب کا پتہ چلا ہے۔ اس کتاب کا نام "ویسل رائے" ہے اور یہ "نوبت لال" کی تصنیف ہے۔ اسمیں عربی و فارسی آمیز

---

[1] ملاحظہ ہو "نقوش سلیمانی" از سید سلیمان ندوی صـ۴ حاشیہ

ہندی کے نمونے ملتے ہیں[۱] اس کے علاوہ مسعود، سلمان، اور ابو عبد اللہ کے کلام سے بھی زبانوں کے باہمی اختلاط پر بہت روشنی پڑتی ہے!

محمد غوری کے بعد سلطان بلبن۔ سلطان تغلق اور سلطان فیروز کی علم پروری نے اس اختلاط کو بہت ترقی دی سلطان فیروز نے نگرکوٹ سے بہت سی سنسکرت کی کتابیں منگوا کر ترجمہ کروائیں۔

لودیوں میں سکندر علم و ادب کا عاشق تھا اس نے حکام کا انتخاب ذاتی قابلیت پر رکھا۔ ہندوؤں نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور خصوصاً کایستھوں نے حصول منصب و جاہ کیلئے فارسی پڑھنا شروع کی۔ فارسی و بھاشا کا یہ اتحاد دراصل موجودہ اُردو کا آغاز تھا اسلئے یہ خیال کہ اُردو کی بنیادیں شاہجہانی دور میں قائم ہوئیں، داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔! دراصل یہی زمانہ اُردو کی تخلیق کا زمانہ ہے۔

افغانوں کا زمانہ تاریخ ہند کا نہایت پُرآشوب زمانہ گزرا ہے! لیکن اُردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک اہم دور ہے، فارسی و بھاشا کا یہ اختلاط و اتحاد ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا کہ ۱۲۵۵ء ۶۵۴ھ میں سپہر ادب کے اس نیرِ اعظم نے طلوع کیا جسکو عرفِ عام میں خسروؒ کہتے ہیں یہ پہلی ہستی تھی جس نے اس ساز کے خاموش تاروں کو پہلی دفعہ چھیڑا!

۱؎ ملاحظہ ہو اُردو سرشتے کمیٹی رپورٹ موسومہ "اُردو زبان اور ادب" مرتبہ سید ضامن علی صاحب ایم۔اے۔ صدر شعبہ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی۔

اس ساز کی آواز ملک میں پہلی مرتبہ گونجی ـــــ یہ آواز سرودِ اُردو کا اوّلین نغمہ تھی! امیر علیہ الرحمۃ کے اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

سب کوئی اس کو جانے ہے   پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ گھڑی میں میکھا ہے   فلک کیا ان دیکھا ہے [1]

امیرؒ کے بعد نظریں کبیرؔ (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء / ۸۴۳ھ تا ۹۲۴ھ) پر پڑتی ہیں۔ ہر چند کہ کبیرؔ ہندی کے شاعر تھے پھر بھی ان کے یہاں اکثر صاف اُردو کے اشعار نظر آتے ہیں

کر گذران غریبی پر   مغروری کس پر کرتا ہے

یہ تن ہے کاغذ کی پڑیا   بوند پڑے گل جاؤ گے
کہیں کبیرؔ سنو بھئی سادھو   اک نام بِنا پچھتاؤ گے

گنگا جاؤں نہ جمنا جاؤں   نہ کوئی تیرتھ نہاؤں
ڈالی چھیڑوں نہ پتہ چھیڑوں   نہ کوئی جیو ستاؤں
کہیں کبیرؔ سنو بھئی سادھو   میں واہی کے بھجن گاؤں

جب مغلوں کا زمانہ آیا تو یہی مخلوط زبان، ایک نئے رنگ میں ظاہر

---

[1] ملاحظہ ہو "اُردوئے قدیم" یہ دونوں شعر حمد باری میں ہیں۔

ہوئی کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں اور رہنے سہنے کی جگہوں کیلئے اب تقریباً تمام عربی وفارسی الفاظ استعمال ہونے لگے تھے اور ان ہی زبانوں کی صرف ونحو اور لغات اب ہندی میں آ گئے تھے۔ اسکی ایک بڑی وجہ خود اکبر کی سیاسی پالیسی تھی، ہندو شہزادیوں کے محل میں آنے، ہندوؤں سے ربط ضبط بڑھنے اور خود محل کے اندر ہندو تہوار منائے جانے کی وجہ سے فارسی اور بھاشا کے اس اختلاط کو بہت تقویت پہنچی اور اس طرح خود شاہی محل میں اس نوزائیدہ زبان کی پرورش ہونے لگی۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ شاہجہاں اپنے بھائی کو "شاہ بھائی" اور دادا کو "شاہ دادا" کہتا تھا۔ اسی زمانہ میں اُردو زبان فارسی نظم کے سانچے میں ڈھلی اور اسوقت سے اس میں اور ہندی میں فرق پیدا ہو گیا۔ اس زمانہ سے اُردو کا علمی دَور شروع ہوتا ہے۔ اس لئے مغلوں کا زمانہ کتابی اور تحریری اُردو کے ظہور کا زمانہ ہے۔

امیر خسروؔ نے اُردو شاعری کا آغاز ضرور کیا ـــــ لیکن یہ صرف آغاز ہی تھا اُردو زبان کے اوّلین شعراء دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتک سمجھا جاتا تھا کہ دکن اسکول کے قیام کا زمانہ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء یعنی محمد قلی قطب شاہ کا عہد ہے لیکن حال ہی میں تحقیقاتِ جدید سے اس سے بھی پہلے بہمنی دَور کے کچھ اُردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جس سے اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ دکن اسکول کے قیام کا زمانہ قطب شاہی دور نہیں بلکہ بہمنی

دوَر (۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء تا ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء) ہے۔ دکن میں اُردو کا مکمل خاکہ اس وقت تیار ہو چکا تھا۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحؒ جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے بہمنی حکومت کے زمانہ میں ۸۰۱ھ ۱۳۹۷ء میں دکن گئے اور وہیں ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء میں انتقال فرمایا اسوقت دکن میں اُردو (جسکے دوسرے قدیم نام ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور دکنی وغیرہ بھی ہیں)[1] عام طور سے رائج ہو چکی تھی، نثر میں خواجہ صاحب کے اکثر جملے تو کچھ مصنفین نے نقل کئے ہیں مگر مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے معتمد انجمن ترقی اُردو نے اپنی تالیف "اُردو کی ابتدائی نشو ونما

---

[1] ملاحظہ ہو "نقوش سلیمانی" از سید سلیمان ندوی،
یہ خیال کہ اس زمانہ میں دکن میں اُردو ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی غلط ہے۔ یہ غلطی اکثر مصنفین نے کی ہے یہانتک کہ خود اُردو سروے کمیٹی کی رپورٹ میں یہ غلطی موجود ہے، صفحہ ۱۱ پر تحریر ہے:

"دکن میں اُردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہو گئی تھی اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔"

واقعہ یہ ہے کہ دکن میں ولیؔ سے پہلے اُردو کبھی ریختہ کے نام سے نہیں پکاری گئی۔ سب سے پہلے ولی نے (اور وہ بھی غالباً سفر دہلی یعنی تقریباً ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۰ء کے بعد) اس لفظ کا استعمال اُردو کیلئے کیا ہے یہ ریختۂ ولی کا جا کر اسے سنا دو ؛ رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ملاحظہ ہو:۔ مقالات ہاشمی از جناب نصیر الدین ہاشمی حصہ اول ص ۳۰۸ — ۳۱۰

میں صوفیا ءکرام کا کام،، میں ایک قدیم بیاض کے حوالہ سے خواجہ صاحب کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں اور سید نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ,, مقالات ہاشمی" حصہ اول میں " خواجہ بندہ نواز رح کی ہندوستانی شاعری" کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں خواجہ صاحب کے نام سے کچھ اردو اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اگر یہ اشعار واقعی خواجہ صاحب کے ہیں، اور بعد کو ان کے کسی معتقد نے کہہ کر ان کے نام سے وابستہ نہیں کر دیئے ہیں تو ہمیں دکن میں اردو شاعری کا آغاز قطب شاہی دور سے تقریباً سو برس پہلے سے کرنا چاہیئے۔ ان اشعار میں جو خواجہ صاحب کے نام سے مولانا عبدالحق صاحب نے کسی قدیم بیاض سے نقل کئے ہیں ایک مثلث بھی ہے جو ہاشمی صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ وہ مثلث یہ ہے:-

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
اپیں اپیں دکھاونے کیسی آرسی لایا

خواجہ صاحب کا ایک اور نعتیہ شعر ملاحظہ ہو جو ہاشمی صاحب نے نقل کیا ہے:

اے محمدؐ ہجلو جم جم جلوہ تیرا ذات تجلی ہو گی سیس پور نہ سہرا

بہمنی دور حکومت کے ایک قدیم ممتاز دکنی شاعر کا حال ہی میں پتہ چلا ہے، جس کا تخلص نظامی تھا اس کا زمانہ ۸۶۳ھ ۱۴۵۸ء ہے اس کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے جس کے چار شعر یہ ہیں:-

کہوں سد سا جی نظامی دھرم پدم سب سنے بات بانجی کدم

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوائے پرت بال سینا کو تار ادھار

عطارد مسخر ہوا اسے قلم مسخر کیا سو روے بہت علم

چمکنے لگے جب کتک ہاتھیر پرا ہوا کیا دھرت آکاس پر

اس کے بعد دکن میں قطب شاہی (گولکنڈہ) اور عادل شاہی (بیجاپور) دور کے اردو شاعر ملتے ہیں۔

قطب شاہی دور کے شاعروں میں سب سے پہلے خود محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء) کا نام آتا ہے جو ابراہیم عادل شاہ بیجاپور اور جہانگیر کا ہمعصر تھا ۲؎ فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا اس کے اردو کے دو شعر یہ ہیں:-

ہے محمد قطب شہ بارہ اماماں کا غلام میں سو عاجز داس ٹھیرا یا علی سنج دستگیر
آیت قرآں جیوں نازل ہوا حضرت کی تئیں مرتضیٰ ہیں بس دو جگ میں جیوں محمد بینظیر

۱؎۔ یہ مثنوی احمد شاہ ثالث (۸۶۵ھ / ۱۴۶۰ء تا ۸۶۷ھ / ۱۴۶۲ء) کے عہد میں لکھی گئی تھی، جو خاندان بہمنی کے گیارھویں حکمراں علاؤالدین ہمایوں شاہ (۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ء تا ۸۶۵ھ / ۱۴۶۰ء) کا لڑکا تھا۔

۲؎ سید عبدالحی صاحب نے گل رعنا میں اسی قطب شاہ کی بابت لکھا ہے کہ "یہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس تک ہماری نظر پہنچ سکی ہے۔"

محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تا ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء) بھی جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجہ، داماد اور جانشین تھا، اُردو میں شعر کہتا تھا اس کے صاف اشعار کا انداز یہ ہے:-

ساقیا! شراب ناب کہاں — چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

پیا سانولا من ہمارا لبھایا — نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

اس کا بیٹا عبد اللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء تا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) بھی جو اس کے بعد تخت پر بیٹھا شاعر تھا۔

عادل شاہی دور کے شاعروں میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی المخاطب بہ "جگت گرو" والیٔ بیجاپور (۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) جو عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمراں تھا اور کمال خاں وبیر رستمی جو محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء) کے عہد کا شاعر گذرا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف "نورس"[۵۱] ہے۔ اس کی ابتدا

---

۵۱ اس کتاب کا ذکر گل رعنا، تاریخ ادب اُردو مترجمہ مرزا محمد عسکری اور اُردو شہ پارے وغیرہ میں آیا ہے لیکن ان سب نے اس کو علم موسیقی کی ایک کتاب کہا ہے (ملاحظہ ہو گل رعنا ص۲۳ ۔ تاریخ ادب اردو ص۵۷ ۔ اُردو شہ پارے ص۳۴- ص۳۵) لیکن سید نصیر الدین ہاشمی جنھوں نے اس کتاب کو خود دیکھا ہے وہ رقمطراز ہیں:- "ابتک خیال یہ تھا کہ "نورس" فن موسیقی کی کتاب ہے اور اس میں راگ راگنیوں کی تفصیل و تشریح درج ہوگی مگر دراصل اس میں ہندی راگ راگنیوں کے اقسام یا ان کے قواعد درج نہیں ہیں بلکہ بعض راگوں کے تحت دکنی نظمیں لکھی گئی ہیں"۔ (مقالات ہاشمی حصہ اول ص۳۹)

حسب ذیل عنوان اور شعر سے ہوئی ہے۔

"ابخلی در مقام کوری"

سید محمد[1] میرے دل پر نانو جیوں رسول کر لکھے عرش ٹھانو

خاتمہ ذیل کے شعر پر ہوا ہے،

رام گبری راگنی کستوری سیا ہو کیں کہیں دھلا

اس کے دو اور شعر جن میں "نورس" کا نام آیا ہے یہ ہیں،

سہلا "نورس" کلیاں بدھاوے ابراہیم گر گنی گاوے

بن بیچ تھا وی "نورس" کا آتی بھر بھر وارو پیالا پیلانی

رستمی نے خاور نامہ دکھنی کے نام سے ایک رزمیہ مثنوی تصنیف کی جو دراصل فارسی خاور نامہ مصنفہ حسام کا ترجمہ ہے اسکے دو شعر ہیں۔

خلق کہتی ہے مجھکو کمال خاں دبیر تخلص سو ہے رستمی بینظیر

خاور نامہ دکنی کیتا ہوں تام ہوا خاوران پر قصہ تمام

ان کے علاوہ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے مشہور شاعروں میں وجہی، ابن نشاطی، غواصی، احمد جنیدی، شاہی مرزا شغور، نصرتی اور ہاشمی وغیرہ گزرے ہیں۔ غواصی کی تصنیف

---

[1] سید محمدؒ سے مراد خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ہیں۔

"طوطی نامہ نخشی"[۱] اور مولانا نصرتی کی مثنویاں "گلشن عشق" اور "علی نامہ" مشہور ہیں۔ ہاشم علی برہانپوری۔ کاظم علی، رام راؤ، سیوا، اور قلی خاں اس دور کے مشہور مرثیہ گو گزرے ہیں۔

---

[۱] یہ کتاب نخشی کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ اور بالکلیہ دکنی نظم ہے۔ اس کتاب کے متعلق ابتک عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اسکا ایک مصرعہ اردو اور ایک فارسی میں ہے۔ "شعر الہند" اور "اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ" تک میں اسکے متعلق یہی صراحت ملتی ہے۔ مولانا عبد السلام صاحب ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں "غواصی نے طوطی نامہ نخشی کو نظم کیا جسکا ایک مصرعہ ہندی اور ایک مصرعہ فارسی تھا"۔ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ میں اسکے متعلق لکھا ہے "غواصی نے نخشی کے طوطی نامہ کا ترجمہ کیا تھا جس کا ایک مصرعہ ریختہ اور ایک فارسی تھا" اس قسم کے تمام بیانات غالباً میر حسن کے تذکرہ سے ماخوذ ہیں جس میں اس کتاب کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے۔

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود، طوطی نامہ نخشی را نظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریختہ گفتہ"۔

لیکن دراصل یہ تمام بیانات غلط ہیں۔ سید نصیر الدین ہاشمی صاحب نے جنھوں نے خود اس کتاب کو دیکھا ہے، نیرنگ خیال بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء میں اسکے متعلق ایک مفصل مضمون لکھکر اس غلطی کا ازالہ کر دیا ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا، یہ کتاب بالکل دکنی نظم ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

رتن خاص دریائے لولاک کا	جھلک لامکاں نور افلاک کا
محمد نبی سید المرسلیں	سدا روشن اچھتے دنیا ہور دیں
کہتے ہیں جو تھا کوئی سوداگر ایک	وجاہت منے پاک صورت میں نیک
جہاں میں جھلکتا اچھو جم مدام	بحق محمد علیہ السلام
غواصی اگر توں ہے سچا غواص	لگا عشق اپنا خدا سات خاص

اس کتاب کے دو نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔

دکن کے حملوں کے سلسلے میں عالمگیرؒ کی عمر کا ایک بڑا حصّہ اورنگ آباد میں بسر ہوا۔ حیدرآباد کی تباہی کے بعد شعراء اورنگ آباد آکر بس گئے اور ایک عرصہ تک یہ علم و ادب اور اُردو شاعری کا گہوارہ رہا۔ ان شعراء کی زبان نسبتاً کچھ صاف ہوگئی تھی پھر بھی دکن کے الفاظ و محاورات ان کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس دَور کے شعراء میں سب سے زیادہ عروج شمس الدین ولیؔ[۱] کو حاصل ہوا۔ ولیؔ کا اثر اُردو شاعری پر دو طرح سے پڑا۔ اوّل یہ کہ فارسی کی تمام بحریں اُردو میں آگئیں اور آئندہ کیلئے اُردو شاعری کا نمونہ بن گئیں۔ دوم یہ کہ ان بحروں کے ساتھ فارسی کی اصطلاحات، شاعرانہ محاورے، استعارے اور تشبیہیں بھی تمام اُردو میں آگئیں۔ یہ چیز ابتدائی دَور میں اُردو شاعری کے لئے معین و مددگار ثابت ہوئی۔ چونکہ اسوقت تک اُردو شاعری کا کوئی مستقل انفرادی خاکہ تیار نہیں ہوا تھا، اور اسے کسی بیرونی مدد اور نمونہ کی ضرورت تھی مگر بعد کی یہی چیز اُسکے لئے بہت مضر بھی ثابت ہوئی۔ اُردو کے شاعر صرف فارسی شاعری کی

۱۔ اب تک ولیؔ کے متعلق جو معلومات حاصل تھیں وہ آبحیات اور دوسرے تذکروں تک محدود تھیں۔ مگر پروفیسر سیّد ابراہیم صاحب سیانی ام۔ اے کی مساعی قابلِ داد ہیں کہ انھوں نے ولیؔ کے کلام کو مدون کر کے "دیوانِ ولی" کے نام سے شایع کر دیا ہے۔ ولیؔ کے متعلق یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔

تقلید میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اور اس وجہ سے اُردو شاعری کا کوئی علیحدہ انفرادی قالب تیار نہیں ہو سکا اور اس طرح اسکی اصلی ترقی رک گئی۔

۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ء میں دکن میں اورنگ زیبؒ کا انتقال ہو گیا اور اس طرح دکن کی مہم کا جو بیس برس سے جاری تھی خاتمہ ہو گیا۔ امرا ابھی برسوں کی جنگ سے پریشان ہو چکے تھے، عالمگیرؒ کے بعد جب محمد شاہ رنگیلے تخت پر بیٹھے تو دلّی شعراء کا مرکز بن گیا۔ امرا بھی شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ مشاعرے منعقد ہونا شروع ہو گئے اور اب اُردو شاعری کی نشو و نما بجائے دکن کے دہلی میں ہونے لگی۔ وَلی اور دیگر شعراء بھی دکن سے آئے۔ یہ دراصل دہلی اسکول کا قیام تھا۔ وَلی کی پیرانہ سالی کے زمانہ میں سودا و میر کا شباب تھا۔ مظہر جانجاناں۔ درد۔ سوز۔ قائم۔ یقین وغیرہ سب اسی زمانہ سے متعلق ہیں۔

دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں اُردو کیطرف خاص توجہ کیگئی۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں بیدل المتوفی ۱۱۳۳ھ ۱۷۲۱ء ادھر توجہ کی ان کے شاگرد امیروں میں ایک محمد امیر خاں انجام تھے۔ جب ان دونوں کو اُردو شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ان کے ساتھ اور بھی بہت سے اُردو شاعر پیدا ہو گئے۔ انھوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا کام الفاظ کی چھان بین اور تحقیق تھی۔ تحقیق شدہ الفاظ تمام ہندوستان میں بطور سند کے بھیجے جاتے تھے۔ محمد شاہ نے امیر خاں انجام کو "عمدۃ الملک" کا خطاب دیکر اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ اسلئے یہ انجمن "عمدۃ الملکی انجمن" کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۱

۵۱ ملاحظہ ہو "مغل اور اردو" مصنفہ نواب نصیر حسین صاحب خیال

دہلی اسکول کے سلسلے میں غالب، مومن، شیفتہ اور ذوق وہ نام ہیں جو اُردو شاعری کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پہنچکر اُردو شاعری اپنی ترقی کے بام بلند پر پہنچ گئی۔ دہلی اسکول کی ممتاز ترین خصوصیت روحانی اور جذباتی تجربات کا شاعری میں اظہار ہے، اور شاعری کا یہی نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے۔

جب شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی پر تباہی آئی تو آشوب زمانہ سے مجبور ہوکر شعراء رفتہ رفتہ دلّی سے نکلکر لکھنؤ میں پناہ لینے لگے۔ یہاں آصف الدولہ کے عہد وزارت سے غازی الدین حیدر کے زمانہ تک[ا] ان خانماں برباد شعراء کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اس دور میں ہر امیر کے دربار میں شعراء کا وجود شانِ امارت میں داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مرزا سلیمان شکوہ کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جن کے دامنِ تربیت میں مصحفی و جرأت جیسے شاعروں کی تربیت ہوئی۔ انشا کو میر سعادت علیخاں کی مصاحبت نصیب ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس زمانہ میں لکھنؤ شاعری کا ایک مخصوص طرز قائم ہو گیا۔ یہ لکھنؤ اسکول کا آغاز تھا۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ اسکول کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسوقت لکھنؤ کی معاشرت میں جو نزاکت اور عیش پرستی

ا۔ شعر الہند حصہ اول صفحہ

پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر اسوقت کی لکھنؤ شاعری پر بھی پڑا ہے
لکھنؤ شاعری کا ابتذال اسی عیش پرستی کا آئینہ دار ہے۔ سودا اور میر کے زمانے میں اگرچہ زبان بہت کچھ صاف ہو گئی تھی پھر بھی اس میں اکثر غلط، بھدّے اور ثقیل الفاظ موجود تھے۔ شیخ ناسخ نے زبان کو غلط الفاظ سے پاک کیا۔ اور اپنی تمامتر توجّہ اصلاح زبان کی طرف منعطف کر دی۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ زبان شستہ اور پاکیزہ ہو گئی مگر اس ہنگامہ میں شاعری کا اصل مطمح نظر یعنی ترجمانی جذبات نظروں سے محو ہو گیا۔ اور شاعروں کی توجہ خوبصورت اور صحیح الفاظ و محاورات کے چناؤ میں گھر کر رہ گئی۔

نواب یوسف علیخاں (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء) اور انکی وفات کے بعد نواب کلب علیخاں (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء تا ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) کے عہد میں رامپور میں شعراء کی بیحد قدر و منزلت ہوئی۔ نواب کلب علیخاں کی قدر افزائیاں ہر صاحب کمال کو گرویدہ کئے ہوئے تھیں۔ ان کے دربار میں اکثر اساتذۂ دہلی و لکھنؤ کا مجمع رہا اور بازار شاعری خوب گرم رہا یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر، داغ، منیر، جلال، تسلیم وغیرہ وغیرہ جیسے باکمال شعرا، سب رامپور میں موجود تھے لیکن یہ صورت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی نواب موصوف کی وفات کے بعد یہ محفل درہم برہم ہو گئی۔ کچھ شعرا حیدرآباد چلے گئے اور کچھ نے اپنی اپنی راہ لی۔ اور دنیائے ادب کا یہ درخشندہ دور جلد ہی افسانۂ ماضی بن گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کے بعد سے سیاسیات کے جدید نظم و نسق کے ساتھ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دیگئی اور اس کے بعد سے عوام کی تہذیب، اخلاق اور معاشرت پر بھی انگریزی اثرات غالب آنے لگے اور در اصل یہی اثرات شاعری میں دورِ جدید کے آغاز کے محرک ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کا آغاز مغربی ادبیات کا منت کش ہے، جدید دَور کا آغاز دراصل ۱۸۷۴ء ۱۲۹۰ھ سے ہوتا ہے جب مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں "طرح" کی بجائے "خاص" عنوان پر نظمیں لکھوائی گئی تھیں۔ آزاد نے شاعری میں لفظی صناعی سے گزر کر اس طرز کی بنا ڈالی جس کا عنصر غالب "پیغام" اور "اصلاح" ہے، جس کام کو آزاد نے صرف شروع کیا تھا۔ اس کو حالی نے عملی جامہ میں پیش کیا۔ دَورِ جدید کے علمبرداروں میں آزاد۔ حالی شبلی۔ مولانا اسمٰعیل۔ اور اکبر الہ آبادی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے جنسی عشق و محبت کے تصور سے بلند ہو کر ملکی، ملّی اور اخلاقی مضامین پر زور دیا۔ دورِ جدید کی بہترین پیداوار اقبالؒ کی صورت میں منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی اقبالؒ نے ملّی و اخلاقی شاعری کو اپنا موضوعِ فکر بنا لیا اور اسکو اس مقام بلند تک پہنچا دیا جس کی مثال اُردو تو کیا عربی اور انگریزی ادب میں بھی ملنا مشکل ہے۔

موجودہ دَور میں قصیدہ، مرثیہ، اور مثنوی پر کوئی خاص

توجہ نہیں کی گئی۔ غزل گوئی کا دور دورہ بھی کم ہو گیا اور اس کی جگہ مختلف قسم کی نظموں نے لے لی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ دَور کے شعراء نے محسوس کیا کہ غزل جس کا ہر شعر بلحاظ معنی منفرد اور دوسرے اشعار سے غیر مربوط ہوتا ہے، مسلسل جذبات کی ترجمانی کا نہایت ناقص ذریعہ ہے، اور چونکہ اعلیٰ قسم کی شاعری کیلئے صرف چند مختلف انفرادی جذبات کی انفرادی ترجمانی کافی نہیں بلکہ مسلسل جذبات کا اظہار ضروری ہے اس لئے انھیں غزل سے بلند ہو کر نظم کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانا پڑا۔

موجودہ دَور میں کچھ مذہب پرستی، کچھ قوم نوازی، کچھ تعصب پروری اور کچھ سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت اُردو کو مٹا دینے کی کچھ نامحمود و نامسعود تحریکیں ملک میں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں، اور سینما اس مہلک تحریک کو بہت پھیلا رہا ہے۔ لیکن اربابِ نظر کا خیال ہے کہ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اُردو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ہندوؤں کی بھی زبان ہے اس کی ترکیب فارسی و عربی ہی سے نہیں بھاشا اور سنسکرت سے بھی ہوئی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں ہی کے نہیں ہندوؤں کے بھی جذبات پر قائم ہوئی ہیں۔ اگر آج یہ محل مسمار کیا جاتا ہے تو دونوں قوموں کا نقصان ہے۔ دونوں کا خسارہ ہے۔ دونوں کی صدہا سال کی مجموعی

مساعی کے نتیجہ کو صدمہ پہنچنے کا ڈر ہے۔

سر تیج بہادر سپرو کا یہ قول غور طلب ہے کہ

"اُردو ہمارے دیرینہ تمدن و تاریخ کی یادگار ہے۔ جو لوگ اُردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ کے بدل دینے کے خیال خام میں مبتلا ہیں۔"

اور آپ کا یہ بیان یاد رکھنے کے قابل ہے:۔

اُردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے اور ہے۔ اگر ہندو اُردو کو تباہ کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خود اپنی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں"۔[1]

---

[1] ماخوذ از تقریر "اُردو زبان" جو صاحب موصوف نے یوم آزادی کے موقعہ پر فرمائی تھی اور جو سالنامہ نیرنگ خیال بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی

اُردو شاعرہ خواتین کے کلام پر ایک نظر

خواتین میں اُردو شاعری کی ابتدا ملکہ نور جہاںؒ؟

خواتین میں اُردو شاعری کی ابتدا "صاحب جلوۂ خضر" کی تحقیق کے مطابق عہدِ جہانگیری سے ہوتی ہے۔ "جلوۂ خضر" میں ملکہ نور جہاں بیگم کو اُردو کی شاعرہ بتایا گیا ہے

ؒ نور جہاں کا نام مہر النسا تھا۔ ان کے والد مرزا غیاث بیگ بوجہ غربت تلاش معاش میں قندھار سے ہندوستان آئے۔ رفتہ رفتہ اکبر کے دربار میں انھیں ایک اچھا عہدہ مل گیا۔ مہر النسا اپنی والدہ کے ہمراہ محل میں آنے جانے لگی اس کا حسن دیکھکر شہزادہ سلیم اس پر عاشق ہو گیا۔ اس واقعہ کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے مہر النسا کی شادی علی قلی خاں المعروف بہ شیر افگن سے کر دی۔ جب سلیم تخت پر بیٹھا تو اس نے شیر افگن کو بنگال میں بردوان کی جاگیر عطا کی۔ (ملاحظہ ہو۔ اسمتھ۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صـ۳۷۰) بعض افترا پرداز مورخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے شیر افگن کو دھوکہ سے قتل کروا دیا مگر تاریخ کا یہ ایک شرمناک دروغ ہے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی کتاب "تاریخ جہانگیر" میں اس قصہ کو بالکل غلط بتاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کا دامن شیر افگن کے قتل سے بالکل آلودہ نہ تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ جہانگیر کو شیر افگن پر بعض وجوہ کی بنا پر سلطنت کے خلاف سازش کا شبہ ہوا۔ چنانچہ اس نے خود اپنے سوتیلے بھائی

اور نورجہاں کے حسب ذیل دو اُردو شعر نقل کئے گئے ہیں جو یہ ہیں ؎

دیں جگہ زخم جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

لیکن یہ بیان مصنّف موصوف کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ان اشعار کے

[بقیہ پچھلے صفحہ سے] قطب الدین کوکا کو بنگال روانہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ڈاکٹر بینی پرشاد کی زبانی سنیئے وہ لکھتے ہیں:۔

"جب شیر افگن، قطب الدین سے ملنے آیا تھا تو شاہی فوج نے اس کو گھیر لیا۔ اس بات کو دیکھکر شیر افگن سخت برہم ہوا۔ اور قطب الدین اس کو دھیما کرنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ شیر افگن نے اس پر تلوار کا وار کر دیا قطب الدین زخمی ہو کر تقریباً مر چکا تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ شیر افگن کو مار ڈالیں۔ اور ایک کشمیری سپاہی نے جو قطب الدین کی فوج میں تھا شیر افگن کو گرا دیا اور دیگر شاہی سپاہیوں نے ہر طرف سے گھیر کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ شیر افگن کے یوں مارے جانیکے بعد ہی قطب الدین کی روح بھی جسم سے پرواز کر گئی۔" (تاریخ جہانگیر صہ ۱۸۶)

متعلق اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ محبن الدین معین بدایونی شاگرد مرزا سودا کے ہیں۔ میر حسن کے تذکرے میں یہ دونوں شعر اور اسی غزل کا ایک اور شعر معین کے حالات میں موجود ہیں۔

ویسے بھی ان اشعار کی زبان کو دیکھنے کے بعد اس قسم کی غلطی کرنا تعجب خیز ہے۔ زبان کی شستگی، صفائی و سلاست اور تراکیب و بندش کی چستی سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ یہ اشعار بہت بعد کے زمانہ کے ہیں۔

[پچھلے صفحہ سے] یہ واقعہ ۱۶۰۷ء ۱۰۱۶ھ میں ہوا۔ اس کے بعد مہرالنسا، بیوہ ہو کر آگرہ چلی آئی اور تقریباً چار برس کے بعد ۱۶۱۱ء ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر سے اس کی شادی ہو گئی اور اس کو "نور محل" اور پھر "نورجہاں" کا خطاب دیا گیا۔

نورجہاں نہایت غیور، دانشمند اور دلیر عورت تھی۔ جہانگیر کے ساتھ شادی ہوتے ہی اس نے تمام مملکت میں اپنا وقار قائم کرلیا اور وہ ہی سلطنت کا سارا انتظام کرنے لگی۔ اس کے باپ کو اعتماد الدولہ اور اس کے بھائی کو "آصف خاں" کا خطاب ملا اور دونوں اعلیٰ عہدوں پر مامور کیے گئے۔

جہانگیر نے سلطنت کے اکثر کام نورجہاں کے سپرد کردئے تھے۔ وہ سب کاموں کی خود دیکھ بھال کرتی تھی۔ اور دربار میں بیٹھکر سب لوگوں کی فریادیں سنتی تھی وہ زبانِ فارسی کی بہت بڑی ادیبہ اور شاعرہ تھی۔ اکثر نئے قسم کے زیور اور لباس اس کی ایجاد ہیں۔ نورجہاں فیاض اور مخیرہ بھی حد درجہ کی تھی۔ وہ غریبوں کی ہمیشہ دستگیری اور امداد کرتی رہتی تھی۔ غریب لڑکیوں کی پرورش اور

عہدِ جہانگیری میں شمالی ہند میں اُردو شاعری کے متعلق ابھی تک کچھ بصراحت معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا عبدالسّلام ندوی نے شعرالہند میں جہانگیر کے زمانہ میں صرف ملّا نوری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرعے اُردو کے بھی نکل گئے ہیں، مثلاً ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد   بیچارۂ نوریؔ نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

[پچھلے صفحہ سے] شادی کا انتظام وہ خود کیا کرتی تھی

وہ بہت بالغ نظر اور زبردست سیاست داں بھی تھی جس وقت ۱۶۲۶ء ۱۰۳۶ھ میں جہانگیر کابل جا رہا تھا۔ مہابت خاں نے بغاوت کی اور اس کو گرفتار کر لیا۔ نورجہاں خود فوج لیکر گئی لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ خود بھی مہابت خاں کے قبضہ میں آگئی لیکن اس قید کی حالت میں اس نے جس قدر دانشمندی اور ہوشیاری کا ثبوت دیا تاریخ میں اسکی مثال ملنا مشکل ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی عقلمندی اور تدبیر کی بنا پر خود اس قید سے نکل گئی بلکہ جہانگیر کو بھی نکالکر لے گئی اور مہابت خاں جیسا زبردست سپہ سالار اور سیاستداں اس سے زک کھاکر دکھن کو بھاگ گیا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد نورجہاں اپنے داماد "شہریار" کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی مگر آصف خاں نے شہریار کو شکست دیکر خسروؔ کے لڑکے داور بخش کو تخت پر بٹھال دیا اور اپنے داماد خرم کو جو اس وقت دکن میں تھا بلوا بھیجا۔

لیکن ان کے متعلق بھی سید نصیر الدین صاحب ہاشمی کا خیال ہے کہ "یہ نوری بیجا پوری ہیں" (مقالات ہاشمی حصہ اول ص ۲۷۰)
اس دور کے دکنی شعراء سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان ابراہیم عادل شاہ وغیرہ ہیں۔ ان کا زمانہ سولھویں صدی عیسوی ہے اور ان کی زبان و کلام کا اندازہ یہ ہے؛

سلطان محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ) ۱۵۸۰ء / ۹۸۸ھ تا ۱۶۱۱ء / ۱۰۲۰ھ

چلی چندنی میں جب تک پیو ہمارا | اوتن عکس دیبی چندرتھی اتارا
بسی جن ھیامیں پرت ہم سجن کی | میں اُسکی پرت کچ نہیں اوش پیارا

(پچھلے صفحہ سے) خرم دکن سے آکر تخت نشین ہوا اور شاہجہاں کا لقب اختیار کیا
نورجہاں نے اب سلطنت کے کاموں سے بے تعلق ہوکر لاہور میں سکونت اختیار کرلی اور شاہجہاں نے دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرر کردی۔ آخر ۱۶۴۳ء / ۱۰۵۴ھ میں اس زبردست ملکہ نے دنیا سے رحلت کی
نورجہاں کی رحلت کی یہ تاریخ (۱۶۴۳ء) ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب "اسٹوڈینٹس ہسٹری آف انڈیا" میں دی ہے (ص ۲۷۵) لیکن اسمتھ نے لکھا ہے کہ تقریباً ستر برس کی عمر میں ۱۶۴۵ء / ۱۰۵۶ھ میں اسکا انتقال ہوا۔ (آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا ص ۳۸۳ حاشیہ)
اگر نورجہاں کی وفات کی یہ تاریخ صحیح ہے تو اس کا سنہ پیدائش تقریباً ۱۵۷۵ء / ۹۸۳ھ ہوگا

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا کہ اس بیں نہیں ہمن ٹک دل قرارا
صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل ہیں صبوری کیوں کرے ہو کر تمھارا

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (بیجاپور) ۱۵۸۵ء ۹۸۸ھ تا ۱۶۲۷ء ۱۰۳۷ھ

شامی عنبر بتیاں پھرائے شربت گھول امرت پلائے
بادل دما ہے بجلی بجاوے باجی خالو شتابی آنے پاوے

میرا پیر سکندر ہوا ڈھونڈی سید محمد ابراہیم کوں دکھا نگری

غواصی اور نصرتی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ مگر ان کی زبان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ غواصی کے دو شعر ہیں۔

جن اس جواہراں کے سمندر کا گھیر ہے غواص اس دور میں بینظیر
سویو جواہراں کا ر لیانا ہے بہار جو ملک ہندوستاں میں ایک ٹھار
[طوطی نامہ بخشی]

مولانا نصرتی فرماتے ہیں:۔

خریدار کو خوب سودے سے کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام
شہ کی ثنا نصرتی نصر ونول یوں لکھی دور کے دفتر اوپر اچھے ہر ایک بچن

حال ہی میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور سے بھی پہلے بہمنی دورِ حکومت کے کچھ اردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جنمیں نظامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا زمانہ پندرھویں صدی عیسوی ہے

نگران کی زبان اُن شعراء سے بھی زیادہ خراب ہے

کھرا ہوئی جو بات میں رانکر — کہی کو توالیوں کہ منجھکوں پکر
اگر چور وجری باہوئے سپاہ — پکر کون تس بہتر کہوری باہ
نکربان جی لوہے کرکا نتہ سنگ — نہ ہوتا کدھن کا تتہ کو نہ بہنگ

ان اشعار کے بعد پھر ایک دفعہ ان اشعار کو پڑھیئے جو صاحب "جلوہ خضر" نورجہاں کے بتاتے ہیں، اور یہ امر پھر خود ہی واضح ہو جائیگا کہ یہ خیال کہ یہ زبان اس زمانہ کی ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بُت بیباک میں ہم
نقش پا کیطرح اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خود دہلی اور کہیں کہیں سودا تک کے یہاں زبان میں ثقل و گرانی دسقم موجود ہے اس لئے قطع نظر اس سے کہ اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ اشعار معین الدین معین بدایونی کے ہیں، ویسے بھی اس زبان کو اس دور کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ نورجہاں نے کچھ اُردو میں کہا ہو لیکن آج اسکا کوئی اُردو شعر موجود نہیں اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس کا اُردو میں شعر کہنا بھی تحقیق نہیں۔ اس لئے ملکہ نورجہاں کا شمار اردو شاعرات میں نہیں کیا جا سکتا۔

شہزادی زیب النسا مخفی[1]

ملکہ نور جہاں کا اُردو میں شعر کہنا ثابت نہیں۔ نور جہاں کے بعد نظر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی صاحب فضل و کمال دختر شہزادی زیب النساء مخفی پر پڑتی ہے شہزادی زیب النساء فارسی کی مسلم الثبوت شاعرہ تھی گو بعض ناقدین کو اس میں کلام ہے کہ موجودہ دیوان مخفی اسی زیب النساء کا کلام ہے۔

زیب النساء کا اُردو میں شعر کہنا مختلف شہادتوں سے ثابت ہے۔

(۱) مشہور فرانسیسی وقائع نویس موسیو گارسن ڈتاسی[2] (۱۸۲۱ء تا ۱۸۷۷ء) اپنے تذکرہ میں شہزادی زیب النساء کی اُردو میں شعر گوئی کی شہادت دیتا ہے۔ یہ مغربی محقق لکھتا ہے۔

---

[1] حالات دیکھئے زیب النساء مخفی کے تذکرہ میں

[2] ۔ موسیو گارسن ڈتاسی (۱۸۲۱ء تا ۱۸۷۷ء) انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی عالم اور مستشرق گذرا ہے۔ اس کو اُردو سے عشق تھا۔ پیرس میں بیٹھا بیٹھا اُردو کی رفتار و ترقی کا غایر مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اپنے فرانسیسی اور انگریز احباب کے ذریعہ یہاں کے حالات اور کتب دستیاب کرتا تھا ہر سال کے اختتام پر اپنی یونیورسٹی میں اُردو کی سالانہ ترقی پر نہایت مفصل اور محققانہ لیکچر دیتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اس نے اُردو پر اس طرح انیس ۱۹ لیکچر دئیے جن کا ترجمہ آٹھ سو صفحات کی ضخیم جلد میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دیا ہے

" میں نے زیب النساء کی اُردو نظمیں دیکھی اور پڑھی ہیں"۔

(۲) صاحب "جلوۂ خضر" اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہیں :

" ایک پرانی بیاض میں شہزادی کے اُردو شعر ہماری نظر سے گزرے ہیں"۔

(۳) نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال اپنی کتاب "مغل اور اردو" میں رقمطراز ہیں۔

" مخفی تخلص کرتی تھی اور فارسی میں اپنے جذبات دہراتی تھی مگر اُردو میں بھی اس نے جو کچھ کہا ہے اس زبان کا سرمایہ ناز سمجھا جاتا ہے"۔ [زیب النساء اور اردوئے معلی، مغل اور اردو ص۳۱]

[پچھلے صفحہ سے] اس شخص نے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت، اُردو اور ہندی کی بڑی خدمت کی ہے اور بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستانِ تاریخ اُردو" میں گارسن دتاسی کے تذکرہ میں اسکی ان کتابوں کے نام گنائے ہیں جو اُردو کے متعلق ہیں، وہ کتابیں یہ ہیں:-

(۱) پند آموز حکایات کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۲۱ء)

(۲) انتخابِ کلام میر تقی میر معہ ترجمہ زبان فرنچ (مطبوعہ ۱۸۲۶ء)

(۳) قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین کا فرنچ ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۴) انتخابِ کلام ولی اورنگ آبادی (مطبوعہ ۱۸۳۶ء)

(۵) کتبہ جات عربی و فارسی اُردو (مطبوعہ ۱۸۲۸ء)

پھر نواب صاحب موصوف اسی صفحہ کے حاشیۂ زیریں میں لکھتے ہیں،

"شاہزادی کی اصل مادری زبان فارسی تھی مگر وقت کا اثر اور اُردو کے اقبال کو دیکھنا کہ زیب النسا اس ملکی زبان کو نہیں بھولتی اور اسے خلعتِ نظم عطا کرتی ہے"

[پچھلے صفحہ سے] - (۶) ذکر تذکرہ جات مشتمل بر حالات شعراء و مصنفین ہندی اُردو (مطبوعہ ۱۸۳۸ء)

(۷) مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی و فارسی و اُردو (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۸) ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اُردو کتابوں میں ہے (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۹) انتخاب قصۂ گل بکاولی معہ ترجمہ زبان فرانسیسی (مطبوعہ ۱۸۳۵ء)

(۱۰) اُردو زبان کا ابتدائی رسالہ (مطبوعہ ۱۸۳۳ء)

(۱۱) سعدی دکھنی ہندوستان کا ایک مشہور شاعر (مطبوعہ ۱۸۴۳ء)

(۱۲) تذکرہ شعرائے اُردو (دو جلدوں میں) مطبوعہ ۱۸۴۷ء

(۱۳) انتخابات اُردو۔ ہندی (مطبوعہ ۱۸۵۴ء)

(۱۴) تذکرہ مصنفین معہ تصانیف اُردو (مطبوعہ ۱۸۶۸ء)

(۱۵) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک (مطبوعہ ۱۸۷۴ء)

(۱۶) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک

(۱۷) تذکرہ شعرائے اُردو (تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورہ نمبر (۱۲) کا ترمیم شدہ اڈیشن معہ اضافہ مقدمہ مشتمل بر تاریخ زبان و اصناف شاعری - اس میں تین ہزار اُردو۔ ہندی شعراء و مصنفین کا تذکرہ ہے (مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

(داستان تاریخ اُردو صفحہ ۷۸-۷۹)

کہتے ہیں کہ شہزادی کا زیادہ تر کلام تلف ہو گیا۔ اس کا اُردو کلام اب نایاب ہے۔

صاحب "جلوۂ خضر" نے زیب النساء کے تین اُردو مطلعے پیش کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

جدا ہو مجھسے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے[1]

ان اشعار کے علاوہ زیب النساء کا کوئی اُردو شعر نہیں ملتا۔

میو سیو ڈ ٹاسی اور صاحب جلوۂ خضر کی روایت کے بعد ہمیں اس مسئلہ پر ذرا تنقیدی نظر ڈالنا ہے اور اس کیلئے ہمیں اسوقت کے شاعرانہ ماحول پر نظر ڈالنا ہوگی۔ شہزادی زیب النساء کی تاریخ ولادت ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء ہے اور تاریخ وفات ۲۹ رذی الحجہ ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۱ء ہے۔ زیب النساء کی وفات کا مادۂ تاریخ "وادخلی جنتی" ہے۔ اسمیں

---

[1] میری نظر سے یہی شعر "تذکرۃ الخواتین" میں گنا بیگم شوخ اہلیہ نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر نظام وزیر عالمگیر ثانی کے تذکرہ میں گذرا ہے۔ لیکن تذکرۂ شمیم سخن میں جو تذکرۃ الخواتین کا اکثر ماخذ رہا ہے یہ شعر شوخ کے بیان میں موجود نہیں ہے

۱۱۱۲ھ نکلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب انتقال ہوا تو ۱۱۱۳ھ کے ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ اس لئے تاریخ گو نے آئندہ سال کا مادہ تاریخ کہہ دیا جو ایسی صورت میں جائز ہے جو اشعار زیب النساء کے نام سے پیش کئے گئے ہیں ان کی زبان کی صفائی اور رنگ کی پختگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر یہ اشعار واقعی زیب النساء کے ہیں تو اس کی اخیر عمر کے ہیں۔ ولی غالباً اسوقت دہلی آچکے تھے چونکہ وہ تقریباً ۱۷۰۰ء مطابق ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے میں[1]
اس وقت دہلی میں مرزا عبدالقادر بیدل موجود تھے یہ عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے، دہلی میں پرورش پائی تھی اور شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیرؒ کی سرکار میں نوکر ہوئے تھے۔ آخر عمر گوشۂ عزلت میں فقر و توکل میں بسر کی اور ۱۷۲۱ء مطابق ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔ یہ بھی کبھی کبھی اُردو میں کہا کرتے تھے۔ پرانے تذکروں میں ان کے دو ایک اُردو اشعار اب تک موجود ہیں پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب داستان تاریخ اُردو میں اُن کے دو اُردو شعر قائم اور میر وغیرہ کے تذکروں کے حوالہ سے دئے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

---

[1] "تاریخ داستان اُردو" مؤلفہ پروفیسر حامد حسن قادری ص۲۳

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردہ سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

(داستان تاریخ اُردو ص۲۸-۲۹)

علاوہ ازیں اس وقت دہلی میں اکثر شعراء پیدا ہو چکے تھے جو بعد کو اُردو کے بڑے بڑے اساتذہ ہوئے۔ ان میں شاہ مبارک آبرو (المتوفی ۱۷۵۰ء) اور خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اشرف علی۔ فغاں۔ ناجی۔ احسن اور حاتم وغیرہ بھی ان ہی کے ہمعصر تھے۔ ولی اور ان شعراء کی زبان میں کہیں کہیں سقم بھی نظر آتا ہے مگر ان کے یہاں نہایت شستہ اور صاف زبان کے نمونے بھی بکثرت موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ولی

سفرِ عشق کا اگر ہے خیال ہمّت دل کو زاد راہ کرو
عاشقو عاشقی کے دعوے پر آہ وزاری کے دو گواہ کرو
گل و بلبل کا گرم ہے بازار اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

زندگی جامِ عیش ہے لیکن فائدہ کیا اگر مدام نہیں

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی بند مت ہو سبحہ و زنار کا

مستی ہیں روزِ حشر تک کو بنی کو بھولا ہے وہ : جو جام چشمِ یار سے می پی کے متوالا ہوا

کہاں ہے آج یارب جلوہ مستانہ ساقی کہ ولسے تاب جی سے صبر سرسے ہوش لیجائے

اے ولی رہنے کو دنیا ہے مقلم عاشق کوچہ یار ہے یا گوشہ تنہائی ہے

شاہ مبارک آبرو

سخن اوروں کا تشنہ ہو کے سنتا اور سب کہتا
مگر اک آبرو کی بات جب کہتے تو پی جاتا

ناجی۔

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشمِ کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند گوہر ہیں آب

احسن

لام نستعلیق کا ہے اس بُتِ خوشخط کی زلف
ہم تو کافر ہیں اگر بند سے نہ ہوں اسلام کے

شاہ حاتم

ہجر کی زندگی سے موت بھلی کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

ان اشعار سے اس وقت کی صاف زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔
زیب النساء فارسی کی قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعرہ تھی۔ جن لوگوں نے موجودہ دیوان مخفی کے زیب النساء کا کلام ہونے پر شبہ کیا ہے

ان میں علامہ شبلی بھی ہیں۔ لیکن خود علامہ شبلی جو زبردست تاریخداں بھی تھے۔ زیب النساء کے مسلم الثبوت فارسی شاعرہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ شہزادی زیب النساء نہایت ذہین، طبّاع، صاحب علم و فضل اور صاحب جوہر خاتون تھی پھر جب ماحول پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت دہلی میں شعر و شاعری کا چرچا ہو چکا تھا۔ اچھے اچھے شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ ان تمام واقعات و شواہد کی روشنی میں یہ امر قابلِ قیاس ہے کہ زیب النساء نے اُردو میں بھی کچھ کہا ہو۔ اور اس کی تصدیق موسیو ڈ تاسی اور صاحب جلوۂ خضر کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ جن دونوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ شہزادی کا اُردو کلام ان کی نظر سے گزرا۔ اب رہا یہ سوال کہ متذکرۂ بالا اشعار زیب النسا کے ہیں یا نہیں۔ ان کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زبان بہت زیادہ صاف اور رنگ بہت پختہ ہے۔ زیب النساء کے شاعرانہ ماحول اور خود شہزادی کی فطرتی ذہانت و ذکاوت کو دیکھتے ہوئے یہ امر کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اشعار اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کہے ہوں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اسوقت کے شعراء کی طرح زیب النساء کے اُردو کلام میں بھی صاف اور خراب دونوں زبانوں کے نمونے موجود ہوں لیکن اب صرف یہی

اشعار باقی رہ گئے ہوں جن کی زبان اس قدر صاف تھی، باقی کلام گردشِ روزگار کے ہاتھوں تلف ہو چکا ہو' لیکن اگر تحقیق کسی وقت یہ بھی ثابت کر دے کہ یہ اشعار کسی اور کے ہیں زیب النسا کے نہیں تب بھی اس سے زیب النساء کی اُردو گوئی کی نفی لازم نہیں آتی۔ اس وقت ہمیں موسیو ڈ تاسی اور صاحب جلوۂ خضر کے بیانات کے پیشِ نظر یہ کہنا ہو گا کہ شہزادی زیب النساء اُردو میں بھی کہتی تھیں۔ لیکن آج ان کا کوئی اُردو شعر باقی نہیں۔

شاعراتِ اُردو کا دہلی اسکول

شہزادی زیب النسا کے بعد میرؔ و سوداؔ کے زمانہ کی کچھ خواتین کا کلام ملتا ہے۔ ان خواتین کا ایک دَور قائم کیا جا سکتا ہے، جو اس زمانہ سے لیکر غدر سے کچھ عرصہ بعد تک کی شاعرات پر مشتمل ہے۔ خواتین بھی اپنے ماحول اور زمانہ سے متاثر ہوئی ہیں، ان کے کلام پر شعراء کا بھی اثر پڑا ہے اور شعراء کی طرح خواتین میں بھی شاعری کے دو مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ اس طرح شاعرات کے بھی دہلی اور لکھنؤ کے دو اسکول قائم کئے جا سکتے ہیں، یہ پہلا دَور دہلی اسکول سے متعلق ہے۔

بیگم بنت میر تقی میر۔ جینا بیگم تلمیذ سوداؔ۔ بسم اللہ بیگم تلمیذ انعام اللہ یقین۔ کاملہ بیگم جعفری تلمیذ شاہ نصیر۔ قادری بیگم تلمیذ شاہ نصیر بھورا بیگم ضیاء تلمیذ شاہ نصیر حیدری خانم حیدری، بادشاہ بیگم خفی، نواب

اختر محل اختر ۔ نازنین ۔ گنا بیگم شوخ ۔ گوہر بیگم گوہر ۔ اور سکندر جہاں بیگم ضیا وغیرہ وغیرہ اس دور کی خاص شاعرات ہیں ان خواتین کے کلام میں دہلی کے اساتذہ کی امتیازی خصوصیات موجود ہیں :

(۱) شاعری کا سب سے بڑا کمال ذاتی یا شخصی جذبات کا ـــــ ان جذبات کا جو شاعر یا شاعرہ نے خود محسوس کئے ہوں ـــــ اظہار ہے اور اس قسم کی اعلیٰ شاعری کے نمونے ان شاعرات کے یہاں موجود ہیں ۔

بسم اللہ بیگم

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے ۔۔۔ کہ مضطر ہے دل گاہے تپاں ہے

جینا بیگم

دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے ۔۔۔ تمھارے آنیکا نت انتظار رہتا ہے

شوخ

شمع کیطرح کون رہ جانے ۔۔۔ جسکے جی کو لگی ہے سو جانے

امیر بیگم اسیر

خاک میں ملگئی ہوں جس پہ اسیر ۔۔۔ اسی دل میں غبار ہے اپنا

مخفی

خدا جانے کیا بات ہے اسمیں مخفی
کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے

سکندر جہاں ضیاءؔ

یوں جو ہم نوجوان مرتے ہیں
ان کی یادِ شباب ہے دل میں

واہ ری نارسائی قسمت
ان کے در تک نہ ہو سکا جانا

رباعی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں
طوفاں زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں
ظالم اب اپنے در سے اٹھاتا ہی کس لئے
کیا کم ہے یہ ستم کہ ترے دل سے دور ہوں

ان اشعار کی تاثیر سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہر شعر ایک نشتر ہے جو دل میں اُترتا چلا جاتا ہے، اور یہ کیفیت یہ اثر ان میں اس وجہ سے ہے کہ یہ جذبات شدت کے ساتھ محسوس کئے گئے ہیں اور سادگی کے ساتھ ادا ہو گئے ہیں۔ اور شاعری کا مقصود یہی ہونا چاہیئے۔

ان شاعرات کی غزلوں میں تغزل کے اصلی جوہر موجود ہیں۔ سوز و گداز، درد و اثر، جوش و مستی، یاس و حسرت سب کی مثالیں ملتی ہیں۔ غزل کی زبان اصولاً نہایت شیریں، نرم۔ صاف اور شستہ ہونا چاہیئے۔ ان خواتین کی غزلیات میں یہ جوہر بھی موجود ہے۔

جعفری

ساقیا مجھکو ترا ساغر پلانا یاد ہے
کلمۂ لا تقنطوا سے دل جھکانا یاد ہے

خفی

جن سے ہم آشنائی[1] کرتے ہیں
ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں

[1] یہاں یہ لفظ اپنے خالص فارسی معنوں میں (دوستی) میں استعمال ہوا ہے اور بہت سے دوسرے الفاظ کی طرح اردو میں آکر اب اس کا مفہوم بھی بگڑ چکا ہے۔

اے خفیؔ اپنے اشک بے تاثیر
مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

خاکساری :-

لکھا نصیب کا کوئی مٹا نہیں سکتا
کہ میرے درد کو ہمدم بٹا نہیں سکتا

حاتم

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی
میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوار ہو

عفت

رونے کیلئے میرے جنازہ پہ اب عفتؔ
جز یاس والم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

(۲) کلام میں نازک مزاجی اور عشق کی خودداری کافی حد تک موجود ہے جو میر جیسے تنک مزاج اور غیور طبع شاعر کے اثرات کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ عشق کا وقار اور خودداری ملاحظہ ہو :-

خفی :-

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانہ کے نہیں ہم

فاطمہ :- نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائے گا

(۳) اکثر پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضامین کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ان میں ندرت پیدا ہوگئی ہے اور طرزِ بیان کی خوبی اور لطافت نے ان کو اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ مثلاً عاشق محبوب کو رقیب کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا ہے اور بے اختیار اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس کو اس طرح ادا کرنا کہ " مژہ موتی پرو رہی تھی" ندرت ادا کی

ایک اعلیٰ مثال ہے:

شوخ:- رقیبوں سے وہ جسدم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اے دردِ جگر موتی پروتی تھی

پھر ایسے موقع پر خود "دردِ جگر" کو مخاطب کرنا بلاغت کی کیسی نادر مثال ہے!

یا مثلاً محبوب کی شرم و حیا کی تعریف شاعری میں ایک عام بات ہے لیکن ذرا یہ ندرت ادا ملاحظہ ہو:

نازنین

کس حسن ادا کی آمد ہوئی چمن میں　　نرگس نے منھ چھپایا پتّوں کے پیرہن میں

یہ حسنِ تعلیل کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔

یا مثلاً شاعرہ محبوب کی ابرو کو تیغ سے تشبیہ دیتی ہے، بعد کو خیال آتا ہے کہ خون آشامی اور سفاکی میں تیغ ہرگز ابروئے محبوب کے مدمقابل نہیں لائی جاسکتی اس کو انتہائی لطافت کے ساتھ یہ کہکر ٹال دیا جاتا ہے کہ "یہ رواروی کی بات تھی"!

گوہر:-

ابرو کو جو تیر سے تیغ باندھا　　یہ بات تھی اک رواروی کی

۴۔ تشبیہ و استعارے اکثر نہایت نیچرل، سادہ و لطیف ہیں، ان میں بڑی شگفتگی اور تازگی ہے۔

جینا بیگم:- ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے ہے : کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے ہے

یہ کتنی نیچرل، کتنی لطیف، اور کتنی مکمل تشبیہ ہے، پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حیا :-

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا آبِ گہر میں عکس بناتا ہے یار کا

یہ کیسی نادر تشبیہ اور کیسا لطیف تخیّل ہے!

عصمت دہلوی

لعل لبِ جاں بخش ہے گویا ورقِ گل اور رخ پہ پسینہ ہے تراجوں عرقِ گل

یوں نرمۂ گوش اسکا لچکتا ہے گہر سے شبنم سے لچک جاتا ہی جیسے ورقِ گل

(۵) کلام میں کہیں کہیں شوخی کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

گوہر

چھلنی داغوں سے دل ہے گوہر انگیا ملی ہم کو سوزنی کی

مصرعہ ثانی میں ابتذال پیدا ہو گیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ شاعرہ کا مقصود اصلی ابتذال نہیں، شوخی و ظرافت ہے۔

ان شاعرات کے یہاں خامیاں بھی ہیں۔ کلام کی ناہمواری، پستی، رکیک و عامیانہ جذبات، آورد ان کے عیب ہیں لیکن یہ عیب کہاں نہیں کیا خود میر جیسے خدائے سخن کے یہاں یہ تمام عیب اور خامیاں موجود نہیں۔

شاعراتِ اُردو کا لکھنؤ اسکول

اس کے بعد ان خواتین کا دور آتا ہے جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ خواتین کے اس دور کو دورِ ثانی

کہہ سکتے ہیں، ان میں اکثر شاعرات وہ ہیں جو نواب واجد علیشاہ کے زمانہ حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس دور کی ممتاز شاعرات یہ ہیں:۔

۱۔ حرم نواب آصف الدولہ۔ بیگم جان المعروف بہ بہو بیگم المتخلص بہ جانی۔ دلہن

۲۔ حرم نواب واجد علیشاہ۔ حیدری بیگم عرف ماہ طلعت المتخلص بہ قمر۔ نواب بیگم حجاب۔ نواب صدر محل صدر۔ عالم سلطان جہاں بیگم المخاطب بہ محبوب محل المتخلص بہ محبوب۔

۳۔ دیگر خواتین :۔ چنبیلی المتخلص بہ یاسمن کنیز و تلمیذ سید انشا۔ سلطان بیگم سلطان۔ ضیائی بیگم ضیا۔ بہو بیگم محل خاص نواب یوسف علیخاں والئ رامپور۔ نواب شاہجہان بیگم شیریں فرمانروائے ریاست بھوپال۔ شمس النساء بیگم شرم تلمیذ خواجہ وزیر۔ پارسا۔ مستور بیگم مستور۔ کنیز فاطمہ کنیز۔ شریر وغیرہ وغیرہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی یہ شاعرات اپنے ماحول اور زمانہ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ اسوقت لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت میں جو عیش پرستی آگئی تھی اس کا اثر یہاں کے شعراء کی طرح شاعرات کے کلام پر بھی پڑا ہے اور لکھنؤ اسکول کے ابتذال کی ایک بڑی وجہ یہی ماحول کا اثر ہے۔ دراصل آج جس چیز کو ہم مبتذل اور رکیک کہتے ہیں وہ اس وقت مبتذل نہیں سمجھی جاتی تھی اور اس پر

انگشت نمائی نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء تو شعراء لکھنؤ اسکول کی شاعرات تک کے یہاں مبتذل، رکیک اور سوقیانہ مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔

ذلیل کنیز مرزا سلیمان شکوہ

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم تو ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

میں فرشتہ کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے اپنے کرتوت پہ جس دم کہ میں آجاتی ہوں

یاسمن کنیز سید انشا

دختر رز سے رات صحبت تھی شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا

فاطمہ بیگم کنیز دختر نواب نصرت الدولہ

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو نا نہ سے جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائیگی

یہ ابتذال و فحاشی کی نہایت رکیک اور حیا سوز مثالیں ہیں۔
لیکن متذکرہ بالا تینوں شاعرات لونڈیاں تھیں پھر بھی یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ شعر ان ہی کے ہیں یا کسی نے کہکر ان کے نام کے ساتھ شامل کر دئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ دہلی کی شاعرات کے یہاں کہیں کہیں اور لکھنؤ کی شاعرات کے یہاں اکثر مبتذل اور عامیانہ مضامین ملتے ہیں۔ لیکن مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ اس گناہ کی ذمہ دار اس قدر وہ شاعرات نہیں جس قدر کہ ان کا ماحول، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، اور ان کا زمانہ ہے۔

۲۔ لکھنؤ کی معاشرت میں بقول مولانا عبدالسلام ندوی جو نزاکت اور زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اس کا اثر یہاں کی شاعری پر ایک اور طرح سے بھی پڑا ہے، اس کی وجہ سے یہاں کی زبان میں اکثر زنانہ پن پیدا ہو گیا ہے، شعرائے لکھنؤ کے کلام کا یہ ایک عیب ہے۔ مگر شاعرات کے یہاں یہی چیز حسنِ کلام کا زیور بن جاتی ہے۔ چونکہ یہاں اس کی وجہ سے زندگی اور ادب میں ایک صداقت آمیز مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اس قسم کا لب و لہجہ عورتوں کی زبان اور ان کا حصہ ہے، اس لئے اُن کے منھ سے ایسی زبان بہت نیچرل اور فطرت و حقیقت کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

بہو بیگم:۔

شب بزمِ ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشکِ قمر سے

پر خوف یہی دل میں مرے آیا کہ ہے ہے
نازک ہے نہ دب جائے کہیں تارِ نظر سے

نواب صدر محل صدر:۔

ملنے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر
منھ کو بگاڑ کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ

۳۔ ناسخ نے جب اصلاحِ زبان کی طرف توجہ کی تو رفتہ رفتہ یہ خیال لکھنؤ کی فضائے شاعری پر کچھ ایسا غالب آگیا کہ لوگوں کی توجہ جذبات سے ہٹ کر الفاظ پر مرکوز ہو گئی۔ اور شعراء کا طرۂ امتیاز خوبصورت، اور صحیح الفاظ کا انتخاب سمجھا جانے لگا۔ اس سے زبان کو تو صرور فائدہ ہوا، مگر روحِ شاعری کو زبردست صدمہ پہنچا اور شعر محض آورد اور لفظی صناعی بنکر رہ گیا۔ اور مراعاۃ النظیر، تجنیس، ایہام تضاد وغیرہ وغیرہ تمام صنعتیں یہاں کی

مرغوب صنعتیں بن گئیں۔ یہ صنعتیں دہلی کے متقدمین شعرا، کی بھی مرغوب صنعتیں تھیں۔ شاہ مبارک آبرو، ناجی، احسن، حاتم، خانِ آرزو شاہ نصیر سب کا کلام ان صنعتوں کا گنجینہ ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ میر اور سودا ہی کے زمانہ سے دہلی کے شاعر سنبھلنے لگے انھوں نے محسوس کیا کہ یہ شاعری کا مطمح نظر نہیں بلکہ صحیح مطمح نظر ترجمانی جذبات ہے، انھوں نے سمجھ لیا کہ تمامتر آورد اور شاعری کا عیب ہے اس کا حُسن نہیں، اور انھوں نے حتی المقدور اس سے احتراز کیا۔ لیکن لکھنؤ میں یہی چیز استادی کا ثبوت اور شاعری کا کمال سمجھی جانے لگی اور چونکہ یہاں کی شاعرات بھی اسی ماحول میں سانس لے رہی تھیں۔ اس لئے وہ بھی اس اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی شاعرات کے یہاں بکثرت رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں جنکی بنیاد سراسر آورد پر قائم ہے۔

جانی حرم آصف الدولہ۔

دہن پر تیرے تھا ہم کو توہم ۔۔۔ یہ عقدہ آج ہی ہم پر کھلا ہے

دولہن حرم آصف الدولہ

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا ۔۔۔ تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک ۔۔۔ خانۂ دل جو گرا ہو اُسے آباد کرو

ضیائی بیگم ضیا

میں ہوں وہ ننگ خلق کہ کہتی ہی مجھکو خاک ۔۔۔ اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

فاطمہ بیگم کنیز

نقّاش نے اس بت کا مرے نقش جو کھینچا ✿ ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا

شبر بی فرمانروائے بھوپال

کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر   اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

پہلے شعر میں دہن، عقدہ اور عقدہ کے ساتھ کھلنا، دوسرے میں آبلۂ پھوٹ کر بہنا، آنکھ، تری، راہ، قافلہ، تیسرے میں عمارت، خانۂ دل، گرنا، آباد کرنا، چوتھے میں خاک، مٹی، بنانا، خراب کرنا۔ پانچویں میں نقاش، بت، نقش، کھینچنا، ساعد، ہاتھ، پہنچا چھٹے میں کافر، زلف، لام، اس لام، — سب رعایتِ لفظی کی مثالیں ہیں — سب الفاظ اسب آورد!

۴ - پھر بھی جہاں شاعرات کا مطمح نظر آورد اور الفاظ کا انتخاب نہیں رہا ہے بلکہ ترجمانیٔ جذبات رہا ہے وہاں اشعار بغایت بلند اور پُرتاثیر ہو گئے ہیں، ان میں درد بھی ہے اور کیف بھی، سادگی بھی ہے اور صفائی بھی، شعرائے لکھنؤ میں بالخصوص آتش کے یہاں اس قسم کے تغزل کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔

جانی ۔ کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جانِ ناتواں کی!
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

دلہن:۔

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

مستور ؎ خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت
رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

صدر ؎ صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ
بابِ قبول سے رہے میری دعا الگ

قمر ؎ نہ پوچھا اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے درد و حسرت ہے فغاں ہے آہ و زاری ہے

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا　　بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا

شمیم

کوئی نا آشنا نہیں ایسا　　ملے ہیں آپ آشنا کیا خوب

لیکن یہ یہاں کا عام رنگ نہیں۔

۵ ۔ لکھنؤ شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عاشق اکثر اپنی خودداری کھو بیٹھا ہے اور بہت پست و ذلیل نظر آتا ہے اور اس طرح عشق کے وقار و غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت بھی خواتین کے کلام میں موجود ہے۔

شیریں ؎ قابلِ پابوس کیا ہم بھی نہیں ہیں آپ کے
کیا خطا کی ہم نے گر چوما قدم کو کیا ہوا

دہلی اسکول کے تحت میں فاطمہ کا یہ شعر گذر چکا ہے ؎

نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہی تمکنت　　ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائیگا

ان دونوں شعروں کے مطالعہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کا یہ امتیازی فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ شعرائے دہلی جہاں کہیں عاشق کی نیازمندی اور خاکساری دکھاتے ہیں وہیں ساتھ ہی ساتھ اس کی خودداری، وقار اور عظمت کو بھی قائم رکھتے ہیں، ان دو متضاد جذبوں کو ایک جگہ جمع کر دینا فن شاعری کا ایک زبردست کمال ہے۔ مثال کے طور پر تسنیم کے مندرجہ بالا شعر کے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

کرتے ہو مجھکو منع قدمبوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

دورِ حاضر

:- دور جدید کی چند ممتاز شاعرات کے نام یہ ہیں :-

صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ تسنیم ملیح آبادی۔ عزیز جہاں آدا بدایونی۔ کنیز فاطمہ حیا لکھنوی۔ خورشید آرا بیگم خورشید (منشی فاضل و ادیب فاضل) ام الشہاب زیب عثمانیہ لدھیانوی۔ نوشابہ خاتون قریشی، نجمہ تصدق ام۔ اے، بی۔ ٹی۔ آمنہ خاتون عفت مظفر نگری۔ رابعہ خاتون پنہاں بریلوی۔ بلقیس جمال بریلوی۔ میمونہ خاتون غزالہ بریلوی۔ شاہزادی تیمور جہاں حجاب دہلوی۔ گوہر اقبال حور میرٹھی۔ خورشید اقبال حیا میرٹھی سیدہ سردار اختر۔ اختر حیدر آبادی۔ عابدہ خانم نسرین۔ سیدہ بیگم حبیب اللہ خانصاحب رفعت جہاں نکہت۔ انوار فاطمہ تسنیم لکھنوی۔ بشیر خالدہ ادیب۔ ممتاز جہاں ناز۔ نجمہ رحمت اللہ بی۔ اے۔ سعیدہ عرف شوکت دلہن۔ محبوب جہاں محبوب۔ شکیلہ خاتون شکیل۔

شکیلہ خاتون نکہت۔ عارفہ بیگم انجم۔ کنیز میمونہ بشیر النساء بیگم بشیر۔ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری۔ ناز بلگرامی۔ محترمہ حیدر زئی۔ وفا ٹونکی برج۔ بیگم اختر۔ ثروت جمیل ثروت مظفر نگری۔ عذرا جمال دہلوی۔ صابرہ سلطان حزیں وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ شاعراتِ سلف اپنے کلام میں یا تو ایسے الفاظ لاتی تھیں جو تذکیر و تانیث پر بصراحت دلالت نہ کریں۔ مثلاً

مخفی (دہلوی)

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں

عالم حرم واجد علیشاہ

جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمہیں قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہے سزائے دل

اور یا اپنے آپ کو بتذکیر نظم کرتی تھیں۔

اشک (دہلوی) ؎ کسی عاشق کا بیشک استخواں ہی میں نہ مانونگا
کہ شانہ تیرے رخ تک اتنا بیباکانہ آتا ہے

سلطان بیگم سلطان (لکھنوی)

تھی وہ نگاہِ ناز یا ناوک کا تیر تھا ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہکے ہائے دل

پہلی صورت بہتر تھی چونکہ اس میں جذبات کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ فطرت اور حقیقت سے انحراف تھا اس لئے اثر کو صدمہ پہنچتا تھا۔ برخلاف اس کے موجودہ دور کی شاعرات زیادہ تر اپنے

آپ کو بتانیث ہی نظم کرتی ہیں اور اکثر صیغہ جمع حاضر کی بجائے (جو شاعرات سلف کا مسلک تھا) صیغہ واحد حاضر لاتی ہیں۔ اس سے جذبہ کی عالمگیریت و وسعت تو ضرور باقی نہیں رہتی مگر اس میں ایک ایسی تازگی شدت اور حقیقت آمیزی پیدا ہو جاتی ہے جو نہایت مؤثر ہوتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

ممتاز جہاں ناز

کچھ اس قدر میں کھو گئی تیرے خیال میں
معلوم خود نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

کنیز فاطمہ حیا

اب نہ لکھونگی عمر بھر اُن کو میں دل کا حال زار
اب نہ بناؤنگی کبھی میں انھیں دل کا رازدار

عابدہ خاتون پروین

کچھ نہیں چاہتی مگر اک نگہ غلط اثر
ہمت اعتراف ہو جس سے لب گناہ میں

سائرہ ؎ پشیماں ہو رہی ہوں شکوۂ جور و جفا کر کے
کوئی ہوگا پشیمانِ شکایت میں نہ سمجھی تھی

ظریفہ ؎ ہیں آپ دکھاتی تھیں سو رنگ کے جلوے
تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے

۲۔ اس دور میں شاعرات نے یہ بھی محسوس کیا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دراصل "ظرف تنگنائے غزل" کبھی بھی "بقدرِ شوق" نہیں تھا۔ لیکن فارسی شاعری کا اثر اُردو پر کچھ اس بُری طرح طاری ہوا تھا کہ ہم اُسکے شکنجے سے باہر نکل ہی نہ سکے۔ غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے جس میں صرف

انفرادی جذبوں کا اظہار ممکن ہے۔ لیکن اس میں مسلسل جذبات کا اظہار پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ محسوسات، تصورات، اور کوائف کو مربوط اور مسلسل کر کے مکمل تجربات کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اسی لئے غزل عموماً انتشار خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دَور میں غزلگوئی کا وہ زور نہیں رہا ہے جو پہلے تھا۔ یہ بات محسوس کی گئی کہ عمدہ قسم کی شاعری کے لئے جذبات وتجربات، تصورات اور تخیلات کو مربوط اور مسلسل صورت میں ادا کرنے کی ضرورت ہے اس لئے رفتہ رفتہ غزل کی جگہ نظموں نے لے لی۔

۳۔ موجودہ دَور میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے شدید امتیازات مٹ گئے خواتین نے بیشتر دہلی کا رنگ اختیار کرلیا گو غالب اور مومن کی نازک خیالی اور بلند پروازی پوری طرح خواتین سے نہ نبھ سکی۔ تاہم انھوں نے خیالات زبان اور بیان میں بہت کچھ ان سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شاعرات حاضرہ کے یہاں کی شراب مصطفیٰ غالب کی ہی کشیدہ ہے۔

عصرِ حاضر کی شاعرات پر غالب کا اثر دو طرح سے پڑا ہے۔ زبان پر اور خیالات پر۔ فارسی الفاظ وتراکیب کی کثرت اور بندشوں کی چستی وجدت ملاحظہ ہو۔

خورشید آرا بیگم خورشید

صباحت سے سحر اور رنگ و بو سے گل تہی داماں
مگر ناواقفِ رمزِ گداز و سوز تھا نغمہ

خمار و کیف سے ناآشنا تھی فطرتِ صہبا
بہارِ شامِ سحر آئیں نہ تھیں رنگینیاں ساماں

رابعہ خاتون پنہاں بریلوی

ہیں نگاہیں جوششِ حرماں سے خونِ دل میں نم
مردمِ چشم لہو آمیز ہے حسرت سے شیم
ہر تحرک ہے لبِ سیماب وش کا خوں فروش
ہر رگِ جاں آتشِ اندوہ سے سوزش بدوش

ام الشہاب زینب

شعلۂ شمعِ فروزاں سے نہیں اتنی تپش
گرمیِ شوقِ شہادت ہے کہ گھبراتا ہے تو

وحید النساء وحید

صد سوزشِ جراحت و صد سوزشِ فراق
دل ہے اک اضطراب کی دنیا لئے ہوئے
امید چارہ سازیِ بیمار الوداع
خود ہے جگر میں درد مسیحا لئے ہوئے

طرزِ ادا اور خیالات پر جو غالب کا اثر پڑا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں:-

طاہرہ خاتون شبنم	غالب
قید حیات میں تو کرتا ہے فکر راحت	قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
دیوانے ہنس پڑینگے سنکر خیال تیرا	موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ج۔ بیگم اختر صدیقی سندیلوی	غالب
آپ اپنے پہ رشک آتا ہے	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
کہ تمنائے سے پیار کرتے ہیں	میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

ظریفہ

منظور نہیں مجھکو تنگ ظرفی منصور
دنیا پہ عیاں حالِ دل زار نہ کرتے

غالب

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں

عزیز جہاں آدا بدایونی

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کئے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے اُن کو میہماں کئے ہوئے

غالب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

خالدہ بیگم خالدہ جیلپور

زندگی میری کہیں حرفِ مکرر تو نہیں
برق کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہی نشیمن میرا

غالب

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

ہم - عصرِ جدید کے علمبرداروں نے جنسی محبت کے تصور سے بلند ہو کر شاعری میں "پیغام" اور "اصلاح" کی بنیاد ڈالی تھی اور اس تحریک کا مکمل ترین اظہار اقبالؒ کی ہستی میں ہوا - اقبالؒ نے قومی، ملی اور اخلاقی شاعری کو اپنا موضوع خاص بنا لیا تھا اور اس میں وہ آپ ہی مجتہد اور آپ ہی مختتم تھا - اقبالؒ کا اثر عصرِ حاضر پر اس قدر زیادہ پڑا ہے کہ ابھی اس کو صحیح طور پر محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ اثر صرف شعراء پر ہی نہیں شاعرات پر بھی ہوا ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آج ہم خواتین کی زبان سے بھی قومی، ملی اور مذہبی بیداری کے نغمے سن رہے ہیں - شاعرات حاضرہ میں اقبالؒ کے رنگ کی کامیاب ترین مثال محترمہ زیب عثمانیہ کا کلام ہے -

(الف) تلقینِ عمل } م۔ج۔ اختر گورکھپوری

قسم ہے ذوقِ عمل کی تجھکو قدم بڑھا اضطرابِ ہستی
خلش طلب کی نہیں ہے جبیں وہ خاک پائیگا زندگی کو

نوشابہ خاتون قریشی

سعی و حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی　　ہے سکونِ موت سے بدتر سکونِ انجماد
رزم گاہِ دہر میں آمادۂ پیکار رہو　　تا بکے سامانِ نکبتِ ہستیٔ بیکار رہو

زیب عثمانیہ

جس کے قوا ہیں محرومِ آرام　　وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام
فتنوں سے پُر ہے منزل کا ہر گام　　تو سادہ رہرو میں سادہ رہرو
مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر　　رہِ حیات میں مڑ مڑ کے نقشِ پا کو نہ دیکھ

جہاں بانو بیگم حیدرآبادی

یاں تنازع للبقا کا جاوداں دستور ہے　　لَن ترانی کی صدا باقی ہی کوہِ طور ہے
حرکتِ لاانتہا ہی رازِ ہست و بود ہے　　اے کہ سن گر آرزوئے منزلِ مقصود ہے

سیدہ بیگم حبیب اللہ خانصاحب

خراب حالت ہوئی یہانتک تغافلِ بے محل کہانتک
کہ شاہراہِ عمل پہ دنیا قدم برابر بڑھا رہی ہے

آمنہ خاتون عفت

تو ہر خارِ بیاباں رشکِ گلہا جناں ہوگا　　اگر یہ پائے ہمت جانبِ منزل رواں ہوگا

(ب) تعلیمِ خودی } سیّدہ سردار اختر۔

خود کو بھی ہشیار کر مجھ کو بھی ہشیار دیکھ | اشہد ان لا الٰہ ہے میری تعبیرِ خواب

ام الشہاب زیب عثمانیہ

اپنی خودی کو پوج اے برہمن | کمتر ہیں اس سے تیرے سب اصنام

غنچے کی جیبِ رنگیں نقدِ خودی سے خالی | ضعفِ خودی کی شاہد سبزے کی پائمالی

تاریخ امتوں کی اس بات پر ہے شاہد | ہر کم مذاقِ ملت ہے جلد مٹنے والی

اے بحر کچھ سمجھ کر قطرہ کی کر اہانت | ہے رازدار تیری دنیائے بیکراں کا

حجلۂ عجز سے نکل پردۂ بندگی اٹھا | وقت کا اقتضا ہے زیبؔ خود کو اب آشکار کر

عزیز جہاں بیگم اداؔ۔ بدایونی۔

رخِ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود | ناداں گلۂ گردشِ ایام کہاں تک

اے ذرّۂ ناچیز خجل مہر کو کر دے | افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہاں تک

(ج) مغربیت سے بیزاری }

سیّدہ سردار اختر

کتنی اداؤں کیساتھ آج ہے محوِ خرام | گردنِ اخلاق پر خنجرِ تہذیبِ حال

جلوۂ افرنگ کی آہ یہ افسوں گری | کل کہ جو شے تھی حرام آج وہ شے ہے حلال

پی کے مئے مغربی ہو نہ بہت جوش میں | ہوش میں آ ہوش میں تیرا نہیں یہ کمال

چشمِ بصیرت میری دیکھ چکی آہ آہ | موت سے پہلے ترا سانحۂ ارتحال

سیّدہ عذرا جمال

بت افرنگ سے ہو تو نہ اگر رشتہ بہ پا
اب بھی ہے زندہ و پائندہ نزارِ ب ودود

نوشابہ خاتون قریشی

کلیجے مسلم کے جل چکے ہیں گلوں پہ خنجر بھی چل چکے ہیں
کہ اہلِ یورپ ستم سے اپنے ہماری طاقت کچل چکے ہیں
وہ شور ظلم و غضب کا اٹھا ہوئی قیامت زمیں پہ برپا
کہ خونخوارانِ فتنہ افزا بگڑ چکے ہیں مچل چکے ہیں

(د) قومی و ملی نغمے } زیب عثمانیہ:-

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری
زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں
بچائیگی تجھے کیا کفر کی آئینہ دیواری
مجھے اے زیب پہروں خون کے آنسو رلاتی ہے
مری ملت کی کم کوشی مری ملت کی ناداری

ثروت جمیل صاحبہ ثروت مظفرنگری

جوش میں کاش پھر آجائے مسلماں کا لہو
توڑ دیں بند غلامی تیرے آزاد غلام
ماہ و انجم کو گلے اٹھ کے ملا دیں باہم
حریت، الفت و توحید کا دیکر پیغام
تیشۂ حق سے کریں قطع حصارِ باطل
ظلمت دہر میں ہو روشنی شمع کلام

قلب پر تمغۂ ایمان لگا دے یارب
بخت خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

سیدہ بیگم سیدہ

مخدّرات گروہِ مسلم، ہماری حالت ہی کیا رہی ہے
یہ غفلت بے پناہ توبہ کہ قومِ مسلم پہ چھا رہی ہے
وہ عزم باقی نہ رزم باقی نہ شوکت و شانِ بزم باقی
ہماری ہر چیز مٹ چکی ہے کہ ہمکو قسمت مٹا رہی ہے

بیگم نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب

خدا کے واسطے اے مسلمِ خوابیدہ اٹھ تو بھی
ترا یہ خوابِ غفلت ایک دن خوابِ گراں ہوگا
مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساسِ خودداری
نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اے خواہراں ہوگا
اگر ہو جائے تیرے دل میں پیدا جذبۂ خدمت
تو اے خاتونِ مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا
کہ تیری گود میں پلتی ہے قومِ مسلمِ عالی
توجہ سے تیری ہر فرد فردِ رفتگاں ہوگا

بلقیس جمال

آ سکوتِ شام میں پھر نالۂ پیہم کریں
آ لبِ خاموش کو پھر واقفِ ماتم کریں
آہِ دل کا شمعِ محفل کو بنا دیں رازداں
گرمیٔ سوزاں کو سوزِ زیست کا مرہم کریں
کھینچ لیں سینہ سے پھر پوشیدہ نوکیں تیر کی
زخمہائے چاکِ دلِ شرمندہ مرہم کریں
آ میرِ گلشن ہیں زخمِ غنچہ محتاجِ رفو
بلبلوں میں پھر بپا ہنگامۂ ماتم کریں

برگہائے خفتہ کو بیدار خواب غم کریں نیم وا کلیوں کو رنگِ زندگی سے رنگ دیں
اک شعاع نور چمکا ئیں جبینِ ماہ پر
ثبت کر دیں ایک آنسو آستینِ ماہ پر

(۳) اُمید کی جھلک

جہاں بانو بیگم صاحبہ حیدرآبادی

سونیوالے چونک غفلت سے سحر ہونیکو ہے پھر ہم آغوش تجلی برگ و بر ہونیکو ہے
قافلہ کا کوچ پھر اے بیخبر ہونیکو ہے تو پڑا سوتا ہے کیوں کیا دربدر ہونیکو ہے

سیدہ عذرا جمال

ہو نہ مایوس غلامی کے اگر دام میں ہے زندگانی کا مزا کوششِ ناکام میں ہے

آمنہ خاتون عفت

قدم پہلا سنبھل کر تم نے گر عفت بڑھایا ہے
تو پھر نزدیک منزل جلد تر یہ کارواں ہوگا

سیدہ بیگم حبیب اللہ خاں صاحب

خدا یہ دن بھی گذارد نگا وہ سیدہ پھر قرار دیگا
ہماری حالت سنوار دیگا کہ کس کی بگڑی سدا رہی ہے

خورشید اقبال حیا

تو رنج نہ کر مغموم نہ ہو اُمیدیں مجھ سے کہتی ہیں
اس یاس کے ریگستاں سے پرے تسکیں کی نہریں بہتی ہیں

(س) حبّ وطن

بلقیس جمال

آ وطن کی خاک کے ذرّے بنائیں آفتاب
آ چمن کی ہر کلی سے اک چمن پیدا کریں

سیدہ عذرا جمال :-

اُٹھ کہ پھر تیرا وطن گردشِ ایام میں ہے
تلخیٔ زہر تیرے بادۂ گلفام میں ہے

سیّدہ سردار اختر

مرے وطن کو خدا حریّت نواز کرے
نشاطِ کیف غلامی سے بے نیاز کرے

۵ - جوش اپنے خاص طرز کا مالک ہے دورِ جدید میں جوش سے بہتر محاکات کی مثالیں کسی نے پیش نہیں کیں۔ جہاں جوش کاوش اور آورد سے کام نہیں لیتا وہاں اس کے یہاں روح شاعری موجود ہے۔ جوانی کے جذبات کے مختلف پہلوؤں کو جس طرح جوش نے نمایاں کیا ہے وہ بھی کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ جوش کا اثر نوجوان قلب و دماغ پر بہت پڑا ہے اور اس میں ہماری شاعرات بھی شامل ہیں۔ یہ امر بہت امید افزا ہے کہ ہماری شاعرات نے اس وقت تک اپنے کلام کو اس برہنگی سے محفوظ رکھا ہے جو جوش کے نغموں کا خاصّہ ہے ساتھ ہی ساتھ ابھی انھوں نے خدا اور مذہب سے وہ بغاوت بھی نہیں کی جو جوش اور متبعینِ جوش کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر ہماری شاعرات نے جوش کے معائب سے بچکر صرف اس کے آرٹ کی تقلید کی تو وہ ایک پختہ ادب کے قابلِ تقلید

نمونے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گی جوش کے رنگ کی کامیاب مثالیں محترمہ شمیم ملیح آبادی کے کلام میں ملتی ہیں جو خود جوش کی بھانجی ہیں -

واقعات نگاری اور فطرت کی منظر کشی کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

صفیہ شمیم ملیح آبادی -

بزمِ قدرت پہ کیف طاری ہے
چاند کا فیضِ عام جاری ہے
سارا عالم رہینِ عشرت ہے
نور ہے مستیاں ہیں نگہت ہے
جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں
چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں
بے خبر فکر سے ہے روحِ حزیں
سانس ہر ایک ہے نشاط آگیں
یہ فضائیں گلوں کی یہ بُو باس
اب بھی لیکن شمیم دل ہے اُداس

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار
خاک پر بیٹھی ہوئی ہے دلفگار
چیتھڑوں سے جسمِ لاغر ہے ڈھکا
کائناتِ دل میں ہے محشر بپا
آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار
گیسوئے خمدار پر گرد و غبار
قلب میں اُلجھن، پریشان و حزیں
ایک کُرتا زیب تن نیم آستیں
ایک کہنہ اوڑھنی اوڑھے ہوئے
جسکے آنچل جا بجا اُدھڑے ہوئے
اندرونی دُکھ کی سچّی داستاں
کر رہی ہے اسکی چشم خوں فشاں
بیکسی بیچارگی کا سر فرازنہ
دستِ نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات، یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

بلقیس جمال

سرخ لبوں میں بادۂ شیریں آنکھیں رنگیں، عارض سیمیں
ناز بداماں محشر آگیں دامن رنگیں، پلّو زرّیں
آنکھوں میں اک جامِ تبسّم پتلی میں آرامِ تبسّم
ابرو میں اک دامِ تبسّم زلفوں میں اک شامِ تبسّم
ہونٹوں میں پیغامِ تبسّم سرتاپا الہامِ تبسّم

میمونہ خاتون غزالہ

ہونٹوں پہ ہے تبسّم آنکھیں جھکی ہوئی ہیں معصوم حسن بیخود انگڑائی لے رہا ہے
ہاتھوں میں چوڑیوں کی رنگیں لہریاں ہیں اک نیم باز غنچہ کانوں میں ہنس رہا ہے
مژگاں میں مست پتلی رقصاں ہے یا ستمگر کالی گھٹا میں کوئی انگڑائی لے رہا ہے
گیسو سے نرم جھونکے کچھ چھیڑ کر رہے ہیں ان پیاری انکھڑیوں میں ساغر چھلک رہا ہے
بجلی تڑپ رہی ہے ہر ہر نظر میں قاتل ہر اک ادا میں ظالم شعلہ بھڑک رہا ہے

معصومیت کی پتلی دیوی، نزاکتوں کی
تیری ادائے سادہ جنّت نہیں تو کیا ہے

خورشید آرا بیگم خورشید

شفق سے رنگیں اُفق ہوئی ہے جہاں پہ نشّہ سا چھا رہا ہے
ضیا میں ہمدوش تیرگی ہے کہیں کہیں جلوہ زا ہیں اختر
ہیں مائل آشیاں عنادل، ہیں اہلِ عالم سکون خواہاں
کنارِ رحمت میں سوئے زحمت ہے سکوں شورشیں ہیں مضطر

جمالیات و تجلّی آمگیں، فضا ہے لیکن کنارِ چشمہ
خموش بیٹھی ہے اک دوشیزہ جمال و رنگ شباب پیکر
ہیں گیسوئے عنبریں پریشاں، نگاہ یکسو لگی ہوئی ہے
ہیں بے نیازِ نظارہ آنکھیں ہیں خشک لب زرد روئے اور
سکوت کا بُت ہے یا الٰہی شبیہ مایوسئ الم ہے
ہوئی ہے یا محویت مجسّم، یا بیخودی کا جمیل پیکر
نگاہیں ساکن، زبان ساکت ہے دل میں جذبات کا تلاطم
مثالِ سیماب ہر رگِ جاں، جگر میں غم کے لگے ہیں نشتر

عارفہ بیگم انجم:۔

یہ کشمیر کا گلستاں اللہ اللہ
بہاریں فرشتوں کو للچا رہی ہیں
جدھر دیکھئے صورتیں پیاری پیاری
حسینانِ جنّت کو شرما رہی ہیں
یہ معلوم ہوتا ہے دوشیزہ پریاں
خراماں خراماں چلی آرہی ہیں
نہ دیکھو ہٹاؤ نظر اُن کے رُخ سے
حیا دار آنکھیں جھکی جا رہی ہیں
یہ پُر کیف منظر ہے کیا روح پرور
نگاہیں نگاہوں کو شرما رہی ہیں
یہ گردش میں ہیں اُنکی مستانہ آنکھیں
کہ گلزار میں جام چھلکا رہی ہیں

کنیز میمونہ

بھوک کی شدت سے ہے چہرہ تباہ حال
فرطِ غم سے آرزو میں پائمال
چشم سے لبریز پیمانے عیاں
آنسوؤں سے غم کے افسانے عیاں
ہائے یہ اُٹھتی جوانی کا جمال
بے حسینہ اور روٹی کا سوال

زرد مٹی کی ہے عارض پر نقاب جس طرح بادل کی تہہ میں ماہتاب
حسرت وارمان منھ پھیرے ہوئے حادثاتِ زندگی گھیرے ہوئے
زندگی گرداب میں آئی ہوئی آبرو کی ناؤ چکرائی ہوئی
آسماں کی کجروی افسوس ہے حسن کی یہ مفلسی افسوس ہے

۶ - اختر شیرانی اپنی رومان بھری نظموں کے لئے موجودہ عصر میں اپنا ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ اور موجودہ دَور کی شاعرات اسکے رنگ سے بھی متاثر ہوئی ہیں۔ آدا۔ بدایونی۔ کنیز فاطمہ حیا۔ نجمہ تصدق ام۔اے بی۔ٹی وغیرہ کے یہاں رومانیت کے جو شدید نقوش ہیں وہ دراصل اختر ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اس رنگ کی ایک خاص خصوصیت جنسی جذبات کی بے دھڑک نمائش ہے۔ اگر اس رنگ میں نظمیں لکھتے وقت شاعرات صرف اس امر کا لحاظ رکھیں کہ جذبات کی عظمت اُن کے پھوٹ پڑنے میں نہیں اُن کے ضبط و تحمل میں ہے۔ تو وہ اُردو میں اکثر بہترین نظموں کی تخلیق کر سکتی ہیں۔

اس دَور کی شاعرات کے چند رومان پرور نغمے ملاحظہ ہوں:۔

محترمہ کنیز فاطمہ حیا

آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبّت کرلیں دل کے ویرانے کو معمورِ مسرت کرلیں
گردشِ چرخ کو پھر خوگرِ بہجت کرلیں عمرِ ناشاد کو سرمایۂ عشرت کرلیں
وقت باقی ہے ابھی آؤ کہ الفت کرلیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبّت کرلیں

آؤ دیکھو کہ سراپا غم پنہاں ہو ہمیں
شمع کی طرح سے اک شعلہ سوزاں ہو ہمیں
دل شکستہ ہوں ستم کش ہیں پریشاں ہوں ہمیں
درد شاید ہو کہ منت کش درماں ہو ہمیں

تم جو آجاؤ تو سب دور شکایت کرلیں
آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کرلیں

مرے دور رہنے کا غم نہ کر
مرے چھوٹنے کا الم نہ کر
مجھے خامہ خوں سے رقم نہ کر
مرے دل سے اُف یہ ستم نہ کر

مرا تذکرہ بھی نہ لب پہ لا
مجھے بھول جا، مجھے بھول جا

میں رہین منت یاس ہوں
ہوئیں مدتیں کہ اداس ہوں
غم آرزو کے میں پاس ہوں
میں الم کی لطف شناس ہوں

تجھے کیوں ہے ملنے کا آسرا
مجھے بھول جا، مجھے بھول جا

تجھے چاہتا ہے دل حزیں
کروں لاکھ منھ سے نہیں نہیں
ہوں ترے خیال سے میں قریں
میں کہیں ہوں اور مرا دل کہیں

ہے دل حزیں کا یہ مدعا
مجھے بھول جا، مجھے بھول جا

تمھیں نے کی تھی محبت کی ابتدا کہ نہیں
تمھیں نے درس غم دل دیا کہ نہیں
سکون روح کی محفل کو کر گئے خود برہم
ہمارے دل کو شناسائے غم کیا کہ نہیں
یہ بے نیاز زباں اب کس لئے بتاؤ تو
فسانہ غم الفت مرا سنا کہ نہیں

نجمہ تصدق ام۔اے۔بی۔ٹی

چاندنی، مے، بہار، خلوتِ ناز
ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

غم نہ کر للہ اتنا غم نہ کر میرے لیے
زندگی کیا ہے فقط ناکامیوں کا نام ہے

وہ مست مست، رات، وہ بادِ بدست رات
اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے

یہ دور کی وادی سے مجھے کس نے پکارا
اک آگ محبت کی مرے دل میں لگا دی

پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی
ہر چیز ترے مست تبسم پہ لٹا دی

پھر کر دیا مدہوش مجھے ہوش میں لا کر
پھر مست نگاہوں نے نگاہوں کو پلا دی

اس شرمِ جفا پر تری، قربان وفائیں
جب شکوۂ بیداد کیا آنکھ جھکا دی

پھر ہنستی ہوئی آنکھ سے دیکھا مجھے نجمہ
پھر سینۂ تاریک میں اک شمع جلا دی

عزیز جہاں آدا بدایونی

ہاں ابرِ سیاہ، انجمِ رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے

تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گذارے

آنکھوں سے اِدھر اشکِ گہرتاب کی بارش
گردوں پہ اُدھر سسکیاں لیتے ہوئے تارے

کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں گنگا کے کنارے

بھولے سے نہ وہ جن کو کبھی یاد کریں گے
جیتا ہے کوئی اب انھیں یادوں کے سہارے

میرے مہِ تاباں سے آدا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گذارے

سر میں پنہاں تصوّرِ موہوم
دل میں اک آرزوئے نامعلوم

ایک نالہ سا ہے بغیر آواز
ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز

روح میں انتشار سا کیا ہے
دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

کیوں یہ حالت ہے بیقراری کی
سانس لی یا کسی نے چٹکی لی

گھٹ کے روتے ہیں صدمے سہتے ہیں
کیا محبت اسی کو کہتے ہیں

نجمہ رحمت اللہ بی-اے

اُفق کے پار اس دلکش فضا میں
جہاں رقصاں ہیں مہر و مہ کی کرنیں

وہاں رنگینیاں قوسِ قزح کی
بناتی ہیں فضا کو ارغوانی

وہاں ہیں چاندنی، پھول اور تارے
مقدس ہیں وہاں کے سب نظارے

وہاں کرتی ہیں خوشیاں رقص ہر سو
مرے ہمدم مجھے لے چل وہیں تو

جفا و جور سب کچھ بھول جائیں
کبھی واپس نہ اُس دنیا سے آئیں

شکیلہ بیگم نکہت

گلوں کو اوس سے نہلا کے جا چکی ہے بہار
مجھے تو خون کے آنسو رلا چکی ہے بہار

مری تو دنیا مٹا کر ہی جا چکی ہے بہار
فقط مجھے یہی نغمہ سُنا چکی ہے بہار

بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

صفیہ شمیم ملیح آبادی

پُر کیف ہو جب دنیائے چمن اور ہر سو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں ہوں وجد میں جب گلپوش شجر
جب محوِ ترنّم ہو عالم گل صحرا کو مہکاتے ہوں

جب کھیت ہواؤں کی رو سے، میدانوں میں لہراتے ہوں
روشن ہو زمیں کا جب سینہ، جب حسن فلک کا سوتا ہو
لیلائے شب کے دامن میں اک آدھ ستارا ہوتا ہو
جب نہروں، اور تالابوں میں ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم ہو موتی، ہر ذرۂ خاکی لعل و گہر
آراستہ ہو سلمائے جہاں جب نور کے دلکش زیور سے
پُرنور ہو جب تاریک فضا، مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت ہٹا کے پردوں کو تو کاش چمن میں در آئے
ہستی کا مری ذرہ ذرہ تصویرِ مسرت بن جائے

محترمہ صفیہ شمیم کی اس پُرکیف نظم کے بعد جوش کی یہ لاجواب رباعی ذہن میں آجاتی ہے۔

غلطاں ہے سبو میں عکس انجم ساقی
دریا میں ہے چاند سے تلاطم ساقی
اس وقت نظر ملا کے دم بھر کے لئے
میں تیرے نثار ایک تبسم ساقی

سائرہ

تری گلیوں میں مٹ کر موت کے دن کاٹ دیتی ہیں
تری گلیوں سے اُٹھے گی قیامت میں نہ سمجھی تھی
محبت تھی نشاطِ زندگانی وہ بھی کیا دن تھے

کہ آفت تم نہ سمجھے تھے مصیبت میں نہ سمجھی تھی
نظر ملتے ہی کچھ محجوب ہے وہ بیوفا مجھ سے
نگاہوں سے بھی ہوتی ہے شکایت میں نہ سمجھی تھی

ظریفہ

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے
کرتے بھی تو رسوا سر بازار نہ کرتے
میں آپ دکھاتی تمھیں سو رنگ کے جلوے
تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے
جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر
اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے

۷- دَورِ جدید کی شاعرات نے اخلاقی مضامین کو بھی نظم کیا ہے۔ درس و تبلیغ عموماً روحِ شاعری کے منافی ہوتے ہیں جبتک کہ کہنے والا رومیؒ سعدیؒ یا اقبالؒ نہ ہو، اور شاعرات میں ابھی رومیؒ سعدیؒ یا اقبالؒ کی تلاش قبل از وقت ہے یہی وجہ ہے کہ شاعرات کے اس قسم کے اشعار میں شاعرانہ حسن و کیف تو موجود نہیں البتہ اخلاقیات کے زبردست جواہر ریزے ضرور ہیں۔

نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے
زمانہ کا ہر غم اُٹھاتا چلا جا

ممتاز جہاں ناز

جورِ دنیا سے تنگ دل کیوں ہوں
ہم کو ملتا ہے اس ستم میں لطف

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی

مشکلیں غم کی خوشی سے کاٹ دے انساں ہے وہ
کچھ نہیں پہلو میں اک ہنستا ہوا دل چاہیے

شفیق بیگم نازؔ

حوادث سے زمانہ کے نہ گھبرانا کبھی اے نازؔ
خدا کے ہاتھ ہے بگڑی ہوئی قسمت بنا دینا

بیگم نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا توکل دولتِ دارین کا طبل و نشاں ہوگا

شہزادی تیمور جہاں حجابؔ دہلوی۔

اعانت تو نے گر کی بے کسوں کی اور غریبوں کی
خدا کے فضل سے دونوں جہاں میں کامراں ہوگا

نہ پھول اس عیشِ دو روزہ پہ ہرگز پتلۂ خاکی
کہ اک دن کچھ نہ ہوگا تو بھی زیرِ خاکداں ہوگا

۸ - ہمارے یہاں کثرت سے ایسے مضامین ہیں جن کو الفاظ کے اُلٹ پھیر سے مختلف زمانوں میں شعراء باندھتے چلے آئے ہیں اس قسم کے اکثر مضامین فرسودہ ہونے کی وجہ سے بےکیف ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج گل و بلبل کے افسانوں اور ہجر و وصال کی داستانوں میں کوئی لطف باقی نہیں رہا ہے حالانکہ یہ جذبات آج بھی قلبِ انسان میں اسی طرح جلوہ افروز ہیں جیسے کہ پہلے تھے، البتّہ ذی استعداد شعراء ندرت اور جدّتِ ادا سے کام لیکر جدید انداز اور نئے طرز سے اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ معمولی اور مستعمل مضامین میں بھی ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، اور فرسودہ مضامین فرسودہ نہیں معلوم ہوتے۔ اس

قسم کی مثالیں خواتین کے یہاں بھی موجود ہیں

سعیدہ خاتون سعیدہ عرف شوکت دلہن

شبِ فرقت کی بیتابی سے میں واقف نہیں لیکن
کسی نے جیسے کانٹے رکھدیئے ہیں آج بستر میں
نہیں معلوم اس کے بعد کتنے انقلاب آئے
جنوں کے ساتھ اک صحرا بھی آیا تھا مرے گھر میں

وفا ٹونکی

کھوئی کھوئی مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی جیسے دل سینہ میں ڈوبا ہی چلا جاتا ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی :-

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

عزیز جہاں ادا- بدایونی :-

تارہ سمجھ کے اک اک ذرّہ کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اسکو ڈھونڈھتی ہوں
تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان و آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں

نجمہ تصدق ام- اے- بی- ٹی

اُن کی آنکھیں دیر تک رہتی ہیں اشک کہکشاں
جب کبھی راتوں کو نجمہ یاد آجاتی ہوں میں

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو، مسکرا دئے
دلوں سے، جہاں سے، زمان و مکاں سے
میں رسم وفا ہوں اُٹھی جا رہی ہوں

۹- دورِ حاضر کی خواتین کے کلام کی ایک خصوصیت تشبیہات و استعارات کی تازگی و شگفتگی، حسن اور لطافت ہے، انسان فطرۃً تصویر سے لطف اُٹھاتا ہے اور چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے، اسلئے اس سے طبیعت کا محظوظ ہونا ایک فطری امر ہے، یہ اثر خصوصًا اسوقت زیادہ لطیف ہوتا ہے جب تشبیہ محسوسات سے دی جائے، اس قسم کی تشبیہ بہت عمدہ خیال کی جاتی ہے اور بہت مشکل بھی ہے۔ چونکہ غیر مادّی اور غیر مرئی اشیاء کی تصویر کھینچنا بہ نسبت مادّی اور مرئی اشیاء کی تصویر کھینچنے کے مشکل ہے۔ تشبیہات و استعارات کی چند نادرہ اور لطیف مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عابدہ خاتون نسرین

ہے فسانہ ہر نگاہ میں، ہر ادا میں ہے کہانی
یہ شہاب سی اُمنگیں، یہ شراب سی جوانی
یہ عذار بوس کاکل، یہ نمایشِ پریشاں
کہ شراب جیسے اُڑ کر بنے آتشِ گلستاں

ممتاز جہاں ناز

اتنا سکوں نہیں کہ کروں ترکِ مدّعا
نیرنگیٔ فلک ہے تمھاری نظر مجھے

عزیز جہاں اداؔ بدایونی :-

جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے
عرق آلود روئے ناز نیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں
جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں

شبِ سیاہ میں روشن ہے شمع جگنو کی
دیا غریب کا جس طرح ٹمٹمایا ہوا
ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے پنکھڑی گل کی
رکا ہوا سرِ مژگاں ہے قطرہ آنسو کا
فضائے ساکن و تیرہ میں جس طرح کوئی
لرز رہا ہو فلک سے گرا ہوا تارہ

صفیہ شمیم ملیح آبادی

چہرہ عرق عرق وہ ادا ئیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھئے

۱۰- دورِ حاضر کی شاعرات کے کلام میں جذبات نگاری کی بعض اس قدر اعلیٰ اور بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں کہ اُردو شاعری بجا طور پر ان پر ناز کر سکتی ہے، وہ جذبات ہیں ـــــ زندہ مگر خوں گشتہ۔ اور اسی لئے ان میں بڑا کیف و اثر ہے :-

صفیہ شمیم ملیح آبادی :-

کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں نہ پوچھئے
دیکھا ہے جو وہ خوابِ پریشاں نہ پوچھئے
کیونکر ہوا ہے درد بھی درماں نہ پوچھئے
مشکل ہوئی ہے کس طرح آساں نہ پوچھئے
وقتِ سفر تسلیٔ پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے
مستقبلِ شمیم ہے جس سے ضیا فگن
وہ دلفریب خوابِ پریشاں نہ پوچھئے

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی

آتشِ غم بجھا رہی ہوں میں — اشک پیہم بہا رہی ہوں میں
کوئی دیکھے مرا جنونِ طلب — ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں
شاید اب عشق ہو گیا کامل — غم میں لذت سی پا رہی ہوں میں
دیکھئے کس ستم کا ہو آغاز — پھر انھیں یاد آ رہی ہوں میں

وفا ٹونکی :-

ہر گھڑی رونے کی عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
جان لیوا تری فرقت کبھی ایسی تو نہ تھی
موت ہی جیسے کہ اب اس سے بچھڑا سکتی ہے
زندگی مجھ پہ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنی ہستی پہ خود اک بار ہوئی جاتی ہوں
خود سے بیزار طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی

التجاؤں میں اثر ہے نہ دعاؤں میں اثر
مجھ سے برگشتہ مشیّت کبھی ایسی تو نہ تھی

دشمنوں سے بھی سمجھنے لگوں ان کو بد تر
دوستوں سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

زندگی جیسے کہ ممکن ہی نہیں تیرے بغیر
تیرے آنے کی ضرورت کبھی ایسی تو نہ تھی

تجھ سے کچھ کہنے کا ارماں کبھی ایسا تو نہ تھا
تجھ سے کچھ سُننے کی حسرت کبھی ایسی تو نہ تھی

یوں وفا سے ہوئے ناراض تم اکثر لیکن
جیسی اب ہے تمھیں نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

بلقیس جمال

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سُن
داستانِ درد تاریخِ دلِ بیمار سُن

تیری اُلفت مرہم زخمِ دلِ مجبور تھی
تیری اُلفت روح و جانِ عاشقِ رنجور تھی

تیری اُلفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی
تیری اُلفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی

تیری اُلفت کا مغنی تھا ہر اک تارِ نفس
نام لیتی تھی ترا انحسر ہا بِ آوازِ نفس
اس نے دیکھی ہیں لہو آمیز راتیں ہجر کی
اس نے دیکھی ہے مرے احساس کی آشفتگی
اونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے
تیری اُلفت جاگ اُٹھتی تھی کنارِ خواب سے
سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں
تیری اُلفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں
چاندنی راتوں کی کیف آگیں تجلّیات میں
تیری اُلفت نور تھی غمخانۂ جذبات میں
الغرض تیری محبت تھی مرا سرِّ حیات
کائنات الفت تھی مجھکو تیری الفت کائنات

آہ اب کیونکر سناؤں عاشقی کا ماجرا کسطرح اُلفت کو تیری مجھسے پھر لوٹا گیا
رخصت اے صبحِ جمالِ آرزوئے تشنہ کام
السّلام اے مرکزِ حسنِ تمنّا السّلام

عزیز جہاں آدا بدایونی
کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئینگے
وہ آئینگے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے

سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکونِ دل کی وسعتوں کو بیکراں کیے ہوئے

حدیثِ آہ نیم شب سناؤں گی، سناؤں گی
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کیے ہوئے

تجلّیاں لیے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو بیکراں کیے ہوئے

متاعِ صبر و ہوش کو لٹاؤں ان کی راہ میں
وداع صبر و ہوش کو متاعِ جاں کیے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظار دلستاں کیے ہوئے

یہ کس قدر بلند پایہ شاعری کی مثالیں ہیں! یہ کیسے تڑپتے ہوئے جذبات ہیں! کس قدر شدید طور پر محسوس کیے ہوئے ذاتی شخصی جذبات! ان میں کتنی زندگی ہے، کتنی صداقت ہے، کتنا کیف ہے، کتنا اثر ہے! اگر ہماری شاعرات اس طرح کی بلند پایہ جذبات نگاری کرتی رہیں تو اُردو شاعری منفعل اور شرمندہ نظر نہ آئے گی۔

۱۱۔ ان شاعرات کے بیان میں زور اور کلام میں جوش بھی موجود ہے صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:—

بلقیس جمال — "پروانہ"[1]

میں نغمۂ خموش ہوں — پیامِ سوز و جوش ہوں
شرر کدہ بدوش ہوں — نوائے خوں فروش ہوں
غمِ دوامِ عشق ہوں — کہ صبح و شامِ عشق ہوں
شہید نامِ عشق ہوں — کہ اک پیامِ عشق ہوں

---

[1] جناب تلوک چند محروم نے بھی ایک نظم "پروانہ" کے عنوان سے لکھی ہے جس کے چار بند ہیں،

آفریں ننھے سے کیڑے آفریں — یہ ذراسی جاں اور عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں — تیرے مرنے کی ادا ہے دلنشیں
شکوۂ حسنِ تغافل کیش کیا
جان دینے کے سوا درپیش کیا

شہپرِ ذوقِ فنا پر اُڑ چلا — سوزِ الفت کی ہوا پر اُڑ چلا
عشق کے اوجِ سما پر اُڑ چلا — اُڑ چلا راہِ وفا پر اُڑ چلا
گھر سے نکلا جستجوئے یار میں
تاکہ گم ہو جائے کوئے یار میں

بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا — اس لئے ہی بہرہ اندوزِ وفا
ظلمتِ شب تجھ کو نوروزِ وفا — تیرا جلنا طلعت افروزِ وفا
یہ ترے ننھے سے پر تیلے سے بال
ہیں سراپا دفترِ شرحِ وصال

مری حیات مشتعل ہے ایک سوز مستقل
یہی جہان آب و گل یہی ہے جاں یہی ہے دل
فزوں ہے سوزش جگر ڈہک رہے ہیں بال و پر
نظر اٹھا اٹھا نظر ہے شمع میری منتظر
لگی ہے آگ سر بسر
سلام عمر مختصر

پچھلے صفحہ سے}

اے کہ تجھکو آرزوئے عشق ہے شائقِ سرمست بوئے عشق ہے
جانتا بھی ہے جو خوئے عشق ہے مقتلِ عشاق کوئے عشق ہے
شمع پر پروانہ کو دیکھا نہیں
عشق بازی کھیل بچوں کا نہیں

محترمہ بلقیس جمال کی نظم جذباتی اعتبار سے جناب تلوک چند محروم کی نظم سے بہتر ہے، جمال کی نظم کے جذبات محروم کی نظم کے جذبات سے شدید تر ہیں، علاوہ ازیں محروم کی نظم میں چونکہ ایک تیسری ہستی کے جذبات کی ترجمانی کیگئی ہے ان میں وہ شدت اور اثر کی گہری کیفیت باقی نہیں رہی ہے جو جمال کی نظم میں موجود ہے۔ چونکہ جمال کی نظم میں سب کچھ پروانہ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذاتی جذبات ہیں جو شدید طریقہ پر محسوس کئے گئے ہیں اور اس نے محترمہ کی نظم کو بہت پر اثر بنا دیا ہے۔

سیّدہ سردار آختر

بصد ناز و تمکیں، بصد کجکلاہی
وہ آیا، وہ آیا وطن کا سپاہی

وطن جس کا پیارا، وطن جسکا ایماں
وطن کے مقدر کا روشن ستارا

جواں بازوؤں پر رِدا پارہ پارا
جبیں سے نمایاں مگر نورِ شاہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وہ تھرا اُٹھی ظلم و طاقت کی دنیا
وہ گھبرا اُٹھی کبر و نخوت کی دنیا

وہ گرما اُٹھی عزم و ہمت کی دنیا
وہ لہرا اُٹھا پرچم بے گناہی

وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

۱۲ - دورِ حاضر کی خواتین کے کلام میں کہیں کہیں فلسفیانہ مضامین بھی نظر آتے ہیں گو یہ اُن کا عام رنگ نہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

متشائم نظریۂ حیات

بلقیس جمال

کیف غم میں خاک ہے جامِ شرابِ زندگی
آبشارِ درد ہے بحرِ سرابِ زندگی

خاک اُڑتی ہے گلوں کی بلبلیں خاموش ہیں
مختصر سا ہے یہی بابِ کتابِ زندگی

خورشید آرا بیگم خورشید

زندگی جبر و فطرت کا پریشاں خواب ہے
زندگی مجبوریٔ انساں کی زنداگیں کراہ

زندگی ناکامیوں کی قسمت سیماب ہے
زندگی افسردہ ارمانوں کی غم پرور نگاہ

نظریۂ حصولِ مسرت

قیصر جہاں مسولی

خارزارِ غم کو طے کریں تو یہ جنت ملے
بے نیازِ عیش ہو جائیں تو یہ دولت ملے
ترک کردیں لذتیں ساری تو یہ لذت ملے
نظرِ استغنا جو حاصل ہو تو یہ نعمت ملے

نظریۂ خود فراموشی

ممتاز جہاں ناز

عین عرفاں ہے خود فراموشی
اپنی ہستی کے ہے عدم میں لطف

نظریۂ محبت

نثار فاطمہ نثار

محبت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیر سلاسل کی
شکایت کیجئے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی

نظریۂ عبادت

ح۔ اختر گورکھپوری

میں اپنے ذوقِ خدا پرستی کو ایسے مرکز پہ لا رہی ہوں
جہاں نہ دیر و حرم کے بندے ذلیل کرتے ہوں بندگی کو

نظریۂ عظمتِ انساں

محترمہ شمیم ملیح آبادی:۔

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لئے　　نغمہ سرا ہیں مرغِ خوش الحاں مرے لئے
چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے　　آتا ہے روز ابرِ بہاراں مرے لئے
روشن ہے میرے واسطے رخسارِ ماہتاب　　شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے
بخشی ہے مجھکو خالقِ یکتا نے کائنات　　ہیں عیش کے نشاط کے ساماں مرے لئے

اس میں اقبال کے آفاقی نغموں کا اثر کس قدر غالب ہے۔ محترمہ کے یہ اشعار اقبال کے اس مصرعہ کی کیسی دلکش تشریح ہیں ع

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

۱۳۔ اس دَور کی شاعرات نے مرثیئے بھی لکھے ہیں، دو ایک نہایت مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں،

محترمہ کلثوم (اپنے بیٹے کی وفات پر)

بیٹھے بٹھائے مجھپہ تو بپتا سی پڑ گئی　　برچھی غموں کی ہائے کلیجہ میں گڑ گئی
افسوس ایک بیک مری قسمت بگڑ گئی　　کیسی ہری بھری مری کھیتی اُجڑ گئی

دکھیاری غم کی ماری نہ روئے تو کیا کرے
کثرت سے غم کی جان نہ کھوئے تو کیا کرے

محترمہ حبا میرٹھی:۔ (علامہ راشد الخیری کی وفات پر)

ابھی بدل نہ سکا تھا مزاج دنیا کا

کئے ہوئے ہے مقیّد رواج دنیا کا
تخیّلات پہ اب بھی ہے راج دنیا کا

چلے گئے تم ابھی سے ہمیں شکایت ہے
الم کدے میں تمھاری ابھی ضرورت ہے

۱۴- دورِ حاضر کی شاعرات نے حمد، نعت و منقبت کے مضامین پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اس قسم کی بعض عمدہ مثالیں انکے یہاں موجود ہیں

حمد

محترمہ انوار فاطمہ شمیم لکھنوی :-

اپنی نااہلی کا احساس رہا تھا نہ کریم — مجھکو جرأت یہ ہوئی تھی کہ تری حمد کروں

نعت

محترمہ آمنہ خاتون عفّت

مری روح و جاں نذرِ چشم کرم ہیں — خدارا نظر اک اٹھا دو محمدؐ
گناہوں سے مردہ ہوئی روحِ عفّت — شفاعت سے اپنی جِلا دو محمدؐ

بیگم عروج

تمنّا خون بنکر دوڑتی پھرتی ہے رگ رگ میں — مری ہستی کی گویا روح ہے اُلفت محمدؐ کی
قسم کھاکر کہا ہے نحنُ اَقرب کہنے والے نے — وہ مجھ سے دور ہے جسپر نہیں رحمت محمدؐ کی

منقبت

محترمہ انوار

اے شہ تشنہ لب و راحتِ جانِ زہراؓ
اے جگر بندِ علیؓ فخرِ حجاز و بطحا
اے حسینؓ مدنی سرورِ باغِ احمدؐ
صدفِ بحرِ کرامات کے دریکتا
ساقیِ کوثر و تسنیم مکینِ فردوس
کسقدر رتبۂ عالی تھیں حق نے بخشا

محترمہ ریحال

دلِ قاتل میں لرزہ پڑ گیا تھا جب سنائی تھی
نگاہِ واپسیں میں داستانِ آخری تو نے
سرِ لاشِ پسر تیرے تبسّم ہائے پنہاں پہ
زمانہ محوِ گریہ ہے ہنسی تھی وہ ہنسی تو نے
نہ کیوں شاہا ترا مرنا سبق آموزِ عالم ہو
فنا ہو کر سکھائی ہے جہاں کو زندگی تو نے
قیامت تک رہے گی سجدہ گاہِ کربلا والے
سکھا دی ایک سجدے سے جہاں کو بندگی تو نے

۱۵ - اس دور کی شاعرات نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ گو یہ قطعات طویل نہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:-

محترمہ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری

دردکی ٹیسیں کبھی بھی رائگاں جاتی نہیں
آہ کا ہونا اثر ہے قلب پر وہ ہو بہو

جسطرح آذر صفت اک بُت تراش ہوشیار
کاٹ کر پتھر بناتا ہے بتانِ خوبرو

محترمہ سلمیٰ لاہوری:-

یوں ہی آسان کٹ نہیں سکتی
زندگانی کا سلسلہ ہے دراز

جس کو کہتے ہیں لوگ شادی وغم
ہیں اسی راہ کے نشیب و فراز

۱۶- شاعرات حاضرہ نے رباعیاں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں- اکثر رباعیاں نہایت پُر اثر و بلند پایہ ہیں۔

شاہزادی تیمور حجاب۔ حجاب دہلوی (آپ تیموریہ نسل سے تعلق رکھتی ہیں)

عبرت کدۂ دہر کے والی ہم ہیں
افسوس کہ وقف پائمالی ہم ہیں

تیمور کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے
اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

محترمہ عابدہ خانم نسرین

دل سرد ہے جا بادۂ عنابی لا
سونے کیلئے حسین مہتابی لا

دس بجنے کو آئے نیند کا نام نہیں
اے اول شب لباس شب خوابی لا

مستقبل پر ایک نظر:- خواتین کی اُردو شاعری کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کے پیش نظر ہے انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے- اگر ایک طرف ان کے یہاں روایتی شاعری ملتی ہے تو دوسری طرف ذاتی جذبات اور قلبی واردات کی بھی کمی نہیں- اگر انھوں نے قدیم طرز پر اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے تو وہ جدید خیالات سے بھی پوری طرح متاثر ہوئی ہیں اگر ان میں بعض خواتین نومشق

ہیں تو وہاں بعض ایسی کہنہ مشق شاعرات بھی ہیں جن کے کلام میں پختگی، صفائی، بلند پروازی سب کچھ موجود ہے، اور ان کو بجا طور پر اُستادی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے خواتین کا کلام ابھی بہت کچھ اصلاح طلب ہے، لیکن موجودہ ترقی کو دیکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مستقبل کے متعلق مایوس ہو جائیں۔

موجودہ دَور میں تعلیم کی ترویج و ترقی نے خواتین، خصوصاً مسلم خواتین میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کر دیا ہے اور یہ ذوق بہت امید افزا ہے شاعرات کی ایک معتدبہ جماعت پیدا ہو گئی ہے اور تعلیم نسواں کی کوششوں کے ساتھ اس جماعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہماری عصبیت پرور ذہنیتوں نے اُردو کا گلا نہ گھونٹ دیا —— اور یوں بھی اُنکی پھونکوں سے یہ چراغ بجھتا نظر نہیں آتا —— تو رفتار زمانہ اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ یہ جماعت بہت جلد ترقی کریگی اور مستقبل قریب میں ہندوستان میں ایسی شاعرات پیدا ہو جائینگی جو صحیح معنوں میں شعر و شاعری کی علمبردار ہونگی۔ اور اردو ادب کی اس بڑی کمی کو پورا کر دیں گی جو آج بھی اس میں موجود ہے۔ گو اب پرانی شاعرانہ روش کی ترقی کا زیادہ امکان نہیں تاہم جذباتی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قومی، وطنی، محاکاتی، اور فلسفیانہ شاعری میں ابھی ترقی کی بہت گنجایش باقی ہے، اور موجودہ خواتین نے قدیم طرز تغزل کو ترک کر کے اس رنگ میں کہنا شروع بھی کر دیا ہے جو دماغی اور ذہنی

ترقی کی نہایت شاندار تمہید ہے۔

ادب کے متعلق دنیا میں دو نظریے قائم ہیں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی"۔ موجودہ دور میں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے شعر و ادب کی افادی حیثیت و ضرورت کو محسوس کر لیا ہے، ان کا مذہب "ادب برائے زندگی ہے۔ ان کے نزدیک ہر ایسا ادب مردود و نامسعود ہے جس کو زندگی اور زندگی کی گہری حقیقتوں سے تعلق نہ ہو، یہ امر بھی بہت امید افزا ہے کہ ہماری شاعرات بھی ادب کی اس افادی ضرورت کو رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگی ہیں، اور وہ دن دور نہیں جب وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں گی کہ اگر ادب کا زندگی اور زندگی کے گہرے حقائق اور ضروری مسائل سے تعلق نہیں تو وہ ادب پائندہ اور دیرپا نہیں ہو سکتا ہے، حضرت علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے

میں شعر کے اسرار سے واقف نہیں لیکن یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ سرافیل

لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم شاعرات کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ زمانۂ قریب میں شاعرات کی جماعت میں بہت کثیر اضافہ ہوگا، وہ صحیح راستوں کو ڈھونڈیں گی، وقت کی ضرورت کو سمجھیں گی اور اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ اپنا اور قوم کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچالیں گی بلکہ ساتھ ہی ساتھ ملک، قوم، مذہب اور زبان کی بہترین خدمات بھی انجام دے سکیں گی، کیا عجب ہے کہ اس

ہنگامہ میں کوئی سیفو[1]، کوئی خلنسہ[2]، کوئی قرۃ العین[3] کوئی میرا بائی[4] کوئی مس ایلزبتھ بیرٹ براؤننگ[5] بھی پیدا ہو جائے۔

بہرحال یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ دورِ سلف اور دورِ حاضر کی خواتین کے شعری کارناموں کا اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل کی شاعرات اپنے پیچھے زمانہ میں کیا نقوش باقی چھوڑتی ہیں۔

موجودہ شاعرات کی ادبی مساعی ہر حیثیت سے قابلِ تحسین و آفرین ہیں؛ لیکن میں مستقبل کی خواتین کو اس سے بھی زیادہ شاندار ادبی حیثیت سے دیکھنے کا متمنی ہوں میں عالمِ خیال میں آج بھی شاعرہ فردا کو یہ کہتے ہوئے سن سکتا ہوں کہ ع طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہی فسانہ

جمیل

---

[1] سیفو (Sappho) زبردست یونانی شاعرہ جس کا شمار ہومر (Homer) کے ساتھ ہوتا ہے اس کے متعلق ناقدین کے الفاظ یہ ہیں:-
"Sappho, the greatest of women poets, the peer of the greatest poets of the other sex in the supreme power of uniting art and passion ... ..." (Elis)

[2] خلنسہ مشہور عربی شاعرہ جو اپنے کلام کی بدولت غالباً ہمیشہ زندہ رہے گی۔

[3] قرۃ العین - ایران کی زبردست شاعرہ، مقررہ و ادیبہ

[4] میرا بائی - ہندی کی زبردست شاعرہ۔

[5] مس ایلزبتھ بیرٹ براؤننگ - Miss Elizabeth Barret Browning) - انگلستان کے جواں مرگ شاعرِ اعظم براؤننگ (Browning) کی بیوی جو بہت مشہور اور بہت بلند پایہ شاعرہ گذری ہے۔

شاعراتِ اُردو

موجدین

شاہزادی زیب النساء 'مخفی'

شاعراتِ اُردو

موجدین

مخفی

شاہزادی زیب النساء بیگم کا تخلص ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) کی سب سے پہلی اولاد تھیں۔ زیب النساء، دلرس بانو بنت شاہنواز صفوی[۱] کے بطن سے شوال ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں پیدا ہوئی تھیں!
ابتدائی تعلیم حافظ مریم ام عنایت اللہ خاں[۲] کے سپرد ہوئی۔
حافظ مریم اپنے زمانہ کی نہایت قابل اور تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے

---

[۱] شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں معزز عہدوں پر سرفراز ہوا اور شاہ نواز خاں کا خطاب پایا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں اورنگ زیب کی شادی اسکی بیٹی دلرس بانو سے کردی۔ چار لاکھ کا مہر باندھا گیا۔ طالب آملی نے تاریخ کہی۔ ع دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ۔

[۲] عالمگیری امراء میں عنایت اللہ خاں ایک نہایت معزز عہدہ دار تھا۔

سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ شہزادی نے صرف دو سال تین ماہ[1] میں قرآن شریف ختم کر لیا۔" اس کے بعد حفظ کرایا گیا۔ جسونت شاہزادی نے کلام مجید حفظ یاد کیا ان کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ اورنگ زیب نے انعام میں اس فاضل معلّمہ کو تیس ہزار اشرفیاں دیں[2]

اس کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم شروع ہوئی اور **ملّا سعید اشرف** ماژندرانی[3] نے جو ایک جیّد ایرانی عالم اور فارسی کے زبردست شاعر تھے اس تعلیم کی تکمیل کی۔ شاہزادی نظم و نثر میں ملّا سعید اشرف ہی سے اصلاح لیتی تھیں۔ اس لئے اکثر لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ فارسی میں جو کلام زیب النساء مخفی کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل ملّا ہی کا کلام ہے۔

ملّا اشرف غالباً ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء میں جب شاہزادی کی عمر تقریباً اکیس سال کی تھی۔ تعلیمی خدمات پر مامور ہوئے تھے اور تیرہ چودہ برس کے قریب وہ اس تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے۔ ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں ملّا نے وطن جانے کی اجازت چاہی اور ایک قصیدہ لکھکر

---

[1] مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۶۷۰-۶۷۱

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۸

[3] ملا سعید اشرف ماژندرانی ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ اورنگزیب کی حکومت کے شروع زمانہ میں ایران سے آئے تھے بڑے متبحر عالم اور زبردست شاعر تھے۔ عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کیلئے خود مقرر کیا تھا۔

شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست اس طرح کی گئی تھی۔

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل	در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند	گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان	دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندھار

شاہزادی نے انعام واکرام دیکر رخصت کیا اور ملّا اپنے وطن ایران کو واپس چلے گئے۔

۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۱ء میں اورنگ زیب نے شاہزادہ اکبر کو راجپوتوں کی بغاوت[1] فرو کرنے کے لئے ایک فوج کے ہمراہ جودھپور روانہ کیا راجپوتوں کے بہکانے سے شاہزادہ خود باغی ہوگیا اور حصولِ تخت کے لالچ میں خود عالمگیر کے خلاف صف آرا ہوگیا۔ زیب النساء اور اکبر میں جو سگے بھائی

---

[1] اس فتنہ کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ جسونت سنگھ والی مارواڑ کا ۱۶۷۸ء میں پشاور میں انتقال ہوگیا۔ مہاراجہ کی دو رانیاں لاہور آئیں اور ان کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب نے از راہِ لطف و عنایت ان دونوں لڑکوں کو دہلی میں رکھکر خاص اپنی عاطفت و نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ راجپوت بغاوت پر تُلے بیٹھے تھے انکو ایک اچھا بہانہ مل گیا اور انھوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ بادشاہ ان دونوں لڑکوں کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی بغیر سوچے سمجھے راجپوتوں نے بغاوت کردی۔

بہن بھائے خط و کتابت ہوتی تھی اور وہ اسو قت بھی جاری رہی - یہ خطوط مشکوک نگاہوں سے دیکھے گئے اور شاہزادی پر شاہی عتاب نازل ہوا۔ چنانچہ زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند ہوگئی - مال و متاع ضبط ہوگیا اور شاہزادی کو قلعہ سلیم گڑھ میں رہنے کا حکم ہوا۔ مگر جلد ہی شاہزادی کی بیگناہی ثابت ہوگئی اور اورنگ زیب نے ان کا قصور معاف کر دیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کو شاہزادی سے بہت محبّت تھی اور وہ ان کی

لہ زیب النساء کے پانچ بھائی تھے جن میں دو شہزادہ محمد اکبر اور شہزادہ محمد اعظم حقیقی اور باقی تین شہزادہ محمد سلطان، شہزادہ معظم شاہ اور شہزادہ کام بخش سوتیلے بھائی تھے۔ ان کے علاوہ زیب النساء کے چار اور بہنیں تھیں ان کے نام یہ تھے - زینت النساء بیگم - زبدۃ النساء بیگم - بدر النساء بیگم۔ اور مہر النساء بیگم - زینت النساء بیگم کی شادی سلطان اورنگ شاہ والئی ترکستان سے ہوئی تھی - زبدۃ النساء کا عقد دارا شکوہ کے لڑکے سپہر شکوہ سے ہوا تھا - لیکن عین عالمِ شباب میں انتقال ہوگیا۔ بدر النساء کی وفات بھی عالمِ شباب ہی میں ہوئی - مہر النساء شہزادہ مراد کے لڑکے ایزد بخش سے بیاہی گئیں - اس تفصیل سے مغربی مصنفین کی اس یاوہ گوئی کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے کہ سلاطین تیموریہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے - اس قسم کی موضوعہ روایتوں سے انھیں مغل شہزادیوں کو بدنام کرنیمیں بڑی مدد ملی ہے!

بڑی قدرومنزلت کرتے تھے۔ جب وہ کہیں باہر سے آتیں تو شاہزادوں کو حکماً ان کے استقبال کیلئے بھیجا جاتا۔ ۱۰۹۲ھ میں جب روح اللہ خاں کی والدہ حمیدہ بانو بیگم کا انتقال ہوا تو شہنشاہ نے شاہزادی زیب النساء کو رسم تعزیت ادا کرنے کیلئے بھیجا۔ ۱۰۹۳ھ میں جب شاہزادہ کام بخش کی شادی ہوئی تو تمام رسوم شاہزادی کے محل میں ادا ہوئیں۔ جملہ ارکانِ دولت شہنشاہ کے حکم سے شاہزادی کی ڈیوڑھی تک پاپیادہ گئے۔ عالمگیر، زیب النساء کو سفر وحضر میں ساتھ رکھتے تھے۔ کشمیر کے سفر میں بھی زیب النساء شہنشاہ کے ہمراہ تھیں البتہ جب اورنگ زیب دکن کی مہم پر گئے تو شاہزادی دہلی ہی میں مقیم رہیں۔ اسی دوران میں ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۱ئہ کو شاہزادی نے انتقال کیا۔ وَاُدْخُلِی جَنَّتِیْ مادہ تاریخ ہے۔ اس مادہ سے ۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں۔ چونکہ انتقال کے وقت سال پورا ہونے میں ایک دن باقی تھا اسلئے تاریخ گو نے ایک دن بعد کی تاریخ کہہ دی ہے!

علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

" عالمگیر اس زمانہ میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا یہ خبر سنکر سخت غمزدہ ہوا بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے اور باوجود انتہا درجہ کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لاسکا سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کیلئے زکوٰۃ وخیرات دیں

اور شہزادی کا مقبرہ تیار کرائیں"۔

شاہزادی کا انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر ان کی وصیت کے مطابق ان کو لاہور میں نئے کوٹ کے قریب (جو اب "نواں کوٹ" کہلاتا ہے) شاہی باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ باغ شاہزادی نے خود ہی بنوایا تھا۔ اور خوبصورتی میں شالامار کے بعد اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔

شاہزادی زیب النساء نہایت عالم و فاضل خاتون تھیں۔ عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتی تھیں۔ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:۔

"تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النساء علوم عربیہ اور فارسی زباں دانی میں کمال رکھتی تھی نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی خود صاحب تصنیف گذری ہیں

مگر علامہ شبلی فرماتے ہیں "لیکن اسکی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں"۔ مجمع الغرائب میں ملا سعید اشرف مازندرانی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ زیب النساء کی ایک بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جسکا نام ارادت فہم تھا حوض میں گر پڑی۔ اسپر ملا سعید اشرف نے ایک قطعہ لکھکر شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کا وہ شعر جس میں ارادت فہم کا نام آیا ہے یہ ہے:

دوش از دست ارادت فہم، خاکم در دہن
چوں بیاضِ سینۂ ماہی در آب افتادہ است

اس کے علاوہ تذکروں میں شاہزادی کی ایک اور تصنیف

" زیب المنشآت" کا ذکر ملتا ہے، "تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ" میں نے اس کو دیکھا ہے"۔ زیب المنشآت شاہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

زیب النساء بڑی علم دوست اور فضل و کمال کی بڑی قدردان تھیں، بڑے بڑے علماء و فضلا خدمت میں حاضر رہتے تھے تصنیف و تالیف کا محکمہ قائم تھا۔ اس کیلئے شاہزادی نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جس کے متعلق مصنف مآثر عالمگیری لکھتا ہے کہ اسکی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔ خود مصنف موصوف کے الفاظ یہ ہیں:۔

"درسرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بنظر ہیچ
یکے در نیامدہ باشد" (ص ۵۳۹)

"زیب النساء کی سرپرستی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے ایک کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

"زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں اس لئے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے حکم دیا کہ اسکا فارسی ترجمہ کریں چنانچہ اسکا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے"

شاہزادی زیب النساء نہایت متشرع، عبادت گذار، زاہدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔ مزاج میں بیحد نفاست و سادگی تھی۔ حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ

"لباس عموماً سادہ اور سفید پہنتی تھی۔ غالباً تمام عمر ریشمی اور رنگین لباس زیب تن نہیں کیا۔ میابائی[1] کا بیان ہے کہ وہ اس قدر سادگی پسند تھی کہ اس نے تمام عمر سرمہ اور مسّی استعمال نہیں کیا۔۔ تاہم وہ اپنی خواصوں اور دیگر متعلقین عورات کو اپنی پیروی پر مجبور نہ کرتی تھی بلکہ اس کے برخلاف ان کو رنگین اور ریشمین لباس پہننے کی تاکید کرتی تھی ..." [2]

خود زیب النساء کے نام سے جو فارسی کلام موجود ہے اس میں یہ شعر ملتا ہے

دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام　　　زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساءست

شاہزادی تمام عمر ناکتخدا رہیں۔ کسی تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شادی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہزادی، داراشکوہ کے بیٹے سے (جنکا نام غالباً سلیمان شکوہ تھا) منسوب ہوئی تھیں۔ مگر جب انھوں نے سیاسی پیچیدگیوں کا شکار ہو کر وفات پائی تو پھر شاہزادی

---

[1] میابائی زیب النساء کی دودھ پلائی تھی۔

[2] "شہزادی زیب النساء" مصنفہ حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی ص ۲۰

نے شادی کرنیسے انکار کردیا۔ اور تمام عمر تجرد میں اپنے علمی ذوق میں بسر کردی۔

عالمگیر نے ملک الشعرائی کا عہدہ جو عرصہ سے چلا آرہا تھا ختم کردیا تھا[۱]۔ لیکن زیب النسا کی ادب نوازی اور قدردانی نے اسکو گویا دوبارہ قائم کیا۔ بڑے بڑے شعراء غزلیں، نظمیں اور قصیدے کہکر لاتے تھے اور انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ علامہ شبلی نے بیان کیا ہے جس سے تیموریہ بیگمات کی علم دوستی، قدردانی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے اس واقعہ کو علامہ شبلی ہی کے الفاظ میں سنئیے:

"جہاں آرا بیگم (زیب النسا کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی ہر طرف پردہ کرادیا گیا۔ میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم کا ہاتھی پاس سے گذرا تو بیساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا۔

برقع برخ افگندہ بردناز بہ باغش	باغ میں برقعہ پہنکر اسلیے جاتی ہے
تانکہت گل بیختہ آید بہ دماغش	کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آوے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچہزار روپیہ دلوائے لیکن ساتھ

---

[۱] اس عہدہ پر فیضی، طالب آملی۔ قدسی اور کلیم مامور رہ چکے تھے۔

ہی حکم دیا کہ شہر سے باہر نکال دیا جائے (یعنی گستاخی کیوں کی) اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔" [۱]

چند افترا پردازوں نے اور ان کی کورانہ تقلید میں کچھ ناعاقبت اندیش مصنفوں نے زیب النساء اور عاقل خاں کے جو قصے[۲] بیان کئے ہیں وہ سب ان کے من گھڑت[۳] افسانے ہیں جن کو حقیقت سے کوئی

---

[۱] - یہ واقعہ صاحب خزانہ عامرہ نے صیدی طہرانی کے تذکرے میں بیان کیا ہے۔ غالباً علامہ شبلی نے وہیں سے لیا ہے۔

[۲] - اس طرح کے غلط قصوں کو مغربی مصنفین خصوصاً ڈاکٹر برنیر (Francois Bernier) نے بہت کچھ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے جو اس کے اکثر بیانات کی طرح بالکل بے بنیاد اور بادر ہوا ہیں۔ برنیر ایک فرانسیسی طبیب تھا جو شاہجہاں کے عہد کے آخری زمانے میں ہندوستان آیا اور عالمگیر کے ابتدائی عہد حکومت تک رہا۔ برنیر۔ دانشمند خاں کی ملازمت میں تھا جو ایک بڑا درباری اور نہایت عالم و فاضل شخص تھا۔ عالمگیر کے سفر کشمیر میں برنیر شہنشاہ کے ساتھ تھا۔

[۳] - یہ افسانہ اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں میں عشق تھا اور عاقل خاں چھپے چوری محل میں آیا جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ عالمگیر کو خبر ہو گئی۔ عاقل خاں ایک دیگ میں چھپ گیا۔ عالمگیر نے اس دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا (باقی اگلے صفحہ پر)

تعلق نہیں، لیکن یہاں اُن پر تبصرہ کا موقع نہیں۔ یہ بجائے خود ایک مستقل تاریخی موضوع ہے جو بالتفصیل بحث کا محتاج ہے، اوپر جو باغ والا واقعہ پیش ہوا ہے اس سے مغل شاہزادیوں کے آداب اور کیریکٹر پر روشنی پڑ چکی ہے۔ علاوہ ازیں ایک غور طلب امر یہ بھی ہے کہ وہ اورنگزیب جس کے زہد و اتقا، اور اخلاق و مذہبیت کو آج بھی اس کا سخت سے سخت ناقد اور بڑے سے بڑا دشمن بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا وہ اس قسم کے ناشدنی واقعات کو خود حرم شاہی کے اندر برداشت کر سکتا تھا اور خود وہی اورنگ زیب جس زیب النساء کی اس قدر عزت اور اس قدر قدر و وقعت کرتا ہو، کیا اس کے متعلق کچھ مفسدوں نے جو ناہنجار افسانے بیان کئے ہیں ان میں کچھ بھی حقیقت ہو سکتی ہے؟

پچھلے صفحہ سے} عاقل خاں نے دم نہ مارا اور اسی میں جلکر مر گیا مرتے وقت یہ مطلع پڑھا

بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم ❊ از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

اگر صرف اس واقعہ پر ہی بغور نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کسقدر لغو اور بے بنیاد ہے عاقل خاں لاہور کا حاکم تھا۔ زیب النساء دہلی میں رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں زیب النسا کا محل گویا باورچیخانہ تھا اور وہاں ہر قسم کے برتن موجود تھے کہ عاقل خاں ایک دیگ میں چھپ گیا پھر ایک طرف اہتمام رازداری یہ تھا کہ جلکر مر گیا اور منھ سے اُف تک نہ کی۔ اور دوسری طرف خود اورنگ زیب جیسے پُر جلال اور با جبروت شہنشاہ کی موجودگی میں پردہ دری اور گستاخی کا یہ عالم تھا کہ مذکورہ بالا مطلع باواز بلند پڑھا۔ سچ ہے کہ جھوٹ کو ثبات نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ع قصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند

علامہ شبلی رقمطراز ہیں :-

" عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے اور چونکہ شاعر تھا تمام تذکروں میں اسکے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں نام ونشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا' اور جو مستند اور معتبر خیال کیجاتی ہیں حسب ذیل ہیں :-

عالمگیر نامہ۔ مآثر عالمگیری۔ مآثر الامرا۔ تذکرہ سرخوش، خزانۂ عامرہ سرو آزاد۔ ید بیضا۔ ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اسکی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو سنہ ۱۱۰۸ھ میں واقع ہوئی "

حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی (مصنف "شہزادی زیب النسا") کے بیان کے مطابق شاہزادی کی شاعری کی ابتداء تیرہ چودہ برس کی عمر سے عربی زبان سے ہوتی ہے۔ شروع میں شاہزادی نے ایک عربی قصیدہ لکھا تھا جو حمد میں تھا۔ لیکن اس کے بعد سے عربی میں کہنا بند کر دیا اور فارسی میں کہنے لگیں جو کچھ کہتیں بہت چھپا کر ایک بیاض میں رکھتیں۔ جب ملا سعید اشرف ماژندرانی شاہزادی کے معلم مقرر ہوئے تو اتفاقاً ایک دن وہ بیاض ان کی نظر پڑ گئی۔ ملا نے اشعار کی تعریف کی اور اس دن سے خود اصلاح دینے لگے!

زیب النسا کے دیوان کے متعلق ناقدین میں بہت اختلاف رہا ہے

ایک طبقہ موجودہ دیوانِ مخفی کو ان کا دیوان تسلیم کرتا ہے، دوسرا طبقہ سرے سے ان کے شاعرہ ہونے ہی سے منکر ہے[۵۱] ان دونوں گروہوں کے بیچ میں جو درمیانی طبقہ ہے اس میں علامہ شبلی جیسا زبردست تاریخداں اور جید ناقد بھی شامل ہے۔ علامہ، زیب النساء کے شاعرہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن موجودہ دیوانِ مخفی کو شاہزادی کا کلام تسلیم نہیں کرتے خود علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعر تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا"

زیب النساء[۵۲] کے نام سے بہ تین اردو شعر منسوب کئے جاتے ہیں جن کی تائید

۵۱۔ مولوی احمد علی سندیلوی مصنف تذکرہ مخزن الغرایب زیب النساء کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:- "اما دیوان اشعار جائے بہ نظر نیامدہ۔ مگر در تذکرہ انتخابش بہ نظر آمدہ، لیکن اعتبار نہ شاید، سبب آں کہ اکثر شعرا اساتذہ صاحب آں تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود"

مولانا علی آزاد صاحب تذکرہ ید بیضا شاہزادی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ایں دو بیت از نام او مسموع شدہ" وہ دونوں اشعار یہ ہیں:-

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد | کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت | غنچۂ باغِ دلِ ما زیب دستارے نہ شد

۵۲۔ سطور بالا میں شاہزادی کے جو حالات پیش کئے گئے ہیں انہیں میرا ماخذ دوسری کتابوں کے علاوہ جنکے حوالہ دیئے گئے ہیں علامہ شبلی کا محققانہ اور بڑا نہ معلومات مقالہ بھی رہا ہے جو علامہ نے شہزادی پر الندوہ جلد ۶ نمبر ۹ بابتہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

مشہور فرانسیسی عالم و مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی اور نواب نصیر حسین خیال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہزادی کا باقی اُردو کلام دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو چکا ہے۔ ان اشعار کے متعلق مقدمہ میں روشنی ڈالی جا چکی ہے وہ اُردو اشعار (جو سب مطلعے ہیں) یہ ہیں:-

(۱)

جُدا ہو مجھ سے مرا یار، یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

(۲)

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

(۳)

آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

شاعراتِ اُردو کا دہلی اسکول

شاعرات اردو کا دہلی اسکول

بیگم: میر تقی میر کی دختر تھیں۔ شادی کے چند ہی روز بعد انتقال کیا۔ میر کو بیگم سے بہت محبت تھی اور ان کے انتقال کا ان کو بیحد صدمہ ہوا۔ میر کا یہ لاجواب شعر اسی سانحہ کی یادگار ہے

اب آیا دھیان اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

بیگم کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا

کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا

وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اسکا
سر ہم نے تہِ خنجرِ خونخوار تو رکھا

اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا[1]

---

[1] تذکرہ شمیم سخن اور تذکرۃ الخواتین میں بیگم کا صرف پہلا۔ دوسرا اور تیسرا شعر درج ہے، چوتھا شعر اور مقطع ایک قدیم تذکرے میں ملے ہیں جو شکستہ اور کرم خوردہ حالت میں کتب خانہ یادریہ گوپامئو میں دستیاب ہوا ہے، یہ تذکرہ محترمہ خدیجۃ النساء کا لکھا ہوا ہے، اسکا نام "اذکار خواتین" ہے اور اسکا سنہ تصنیف

جلینا بیگم :- مرزا بابر مغفور کی دختر اور جہاندار شاہ بہادر ولیعہد بادشاہ دہلی کی محل خاص تھیں - بقول صاحب تذکرہ چمن انداز مرزا سودا کی شاگرد تھیں -

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا　　مدّعا تم کو یاں نہ آنا تھا
ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم گئے　　کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

[بقیہ پچھلے صفحہ سے] ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء ہے - یہ چند صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں ۷۳ شاعرات کا اجمالی تذکرہ ہے، آخر میں بطور تتمہ محترمہ خدیجۃ النساء کے صاحبزادے جناب مفتی محمد حسن صاحب حسن نے اپنی والدہ ماجدہ کے مختصر حالات لکھے ہیں، محترمہ کے جد اعلیٰ العلماء آآ وجیہ الدین مؤلف فتاوے عالمگیری مشہور و معروف بزرگ گزرے ہیں - آپ کی والدہ کے نانا قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح مسلم تھے - آپ کے والد مفتی انعام اللہ صاحب بھی صاحب تصنیف تھے آپ کے شوہر مفتی نور اللہ المتخلص آباد آگرہ میں تھانہ دار تھے - ۱۸۵۷ء میں نائب کوتوال رہے ؛ محترمہ فارسی کی تعلیمیافتہ باذوق خاتون تھیں - آپ نے لعارضہ ذیابیطس ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا -

تذکرہ " اذکار خواتین " نہایت مختصر اور مجمل تذکرہ ہے ؛ حالات دو چار جملوں سے زیادہ نہیں - زیادہ تر شاعرہ خواتین کے ایک ایک دو شعر پیش کئے گئے ہیں -

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانئے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی
دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمھارے آنے کا بنت انتظار رہتا ہے

تصویر[۵۱] :- صاحبِ گلستانِ بے خزاں نے ان کے دو شعر دئے ہیں حالات معلوم نہیں۔ غالباً یہ دہلی یا نواحِ دہلی کی رہنے والی تھیں اور میر و سودا کا زمانہ پایا تھا۔

چل ہوا کھا، نہ صبا اس دلِ دلگیر کو چھیڑ
کیا مزا پائے گی تو، غنچۂ تصویر کو چھیڑ[۵۲]

---

۵۱ صاحبِ تذکرۂ چمن انداز نے لکھا ہے کہ غالباً تصویر صاحبِ گلستانِ بےخزاں کی شاگرد تھیں لیکن مصنف تذکرۃ الخواتین، صاحبِ تذکرہ چمن انداز کا یہ قیاس نقل کرنیکے بعد اسکی مخالفت کرتے ہیں اور رقمطراز ہیں :-
"یہ قرینِ قیاس نہیں ہے اسلئے کہ کتاب مذکورہ بالا گلشنِ بےخار کے جواب میں لکھی گئی تھی، اور غرض اسکی تدوین و ترتیب سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے جو گلشنِ بےخار میں نظیر اکبرآبادی کو ایک عامیانہ بازاری شاعر بنایا ہے اسی وجہ سے گلستانِ بیخزاں میں مشاہیرِ دہلی مثل غالب و مومن پر اعتراض کئے گئے ہیں اگر یہ شاعرہ گلستانِ بیخزاں کی شاگرد ہوتی تو غالباً ازراہِ تفاخر اس کا ذکر کرتے" ص۳۹
۵۲ ۔ تصویر کے اس شعر کی تمامتر بنیاد صنعتِ مراعاۃ النظیر پر ہے۔ ہوا کھانا، صبا دل، دلگیر، غنچہ تصویر وغیرہ سب رعایتِ لفظی کی مثالیں ہیں الفاظ اکثر

محبت اب تلک رکھتی ہے یہ تاثیر مجنوں کی
کہ بن لیلیٰ نہیں کھنچتی کہیں تصویر مجنوں کی

بسم اللہ:۔ بسم اللہ بیگم نام۔ اور بسم اللہ تخلص تھا، دہلی میں پیدا ہوئیں اور وہیں قیام رہا۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ منشی انعام اللہ خاں یقین تلمیذ مرزا جانجاناں مظہر کی شاگرد تھیں۔

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
گہے مضطر ہے دل گاہے طپاں ہے
نہ کیجئے ناز حسن عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہار بےخزاں ہے

جعفری:۔ کاملہ بیگم نام اور جعفری تخلص تھا۔ قادری بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ شاہ نصیر سے تلمیذ حاصل تھا۔ اپنے وقت کی مشہور شاعرہ تھیں انھوں نے عالم شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ شاہ نصیر کی مرغوب صنعتیں مراۃ النظیر

[پچھلے صفحہ سے] پُر تکلف انداز میں اصل جذبہ دب کر رہ گیا ہے اور اسی لئے شعر بے کیف ہو گیا ہے مگر اس جذبہ کو سید انشا نے اسطرح ادا کیا ہے کہ آج بھی ان کا شعر اُردو شاعری کیلئے باعث ناز ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

علاوہ ازیں جو لطافت و کیف "نکہت باد بہاری" میں ہے وہ "صبا" میں کہاں اور جو بات "اٹھکھیلیاں" کرنے میں ہے وہ "چھیڑنے" میں کہاں؟

لہ "اذکار خواتین میں آپ کا نام عارفہ بیگم لکھا ہے"

اور ایہام ان کے یہاں بھی موجود ہیں ؎

ساقیا مجھکو ترا ساغر پلانا یاد ہے　　　کلمۂ لاتقنطو سے دل چھکانا یاد ہے

تصوّر اس صنم کا دل میں لائے جسکا جی چاہے
ہماری بات سنکر آزمائے جسکا جی چاہے
کہا منصورؔ نے سولی پہ چڑھ کے عشق بازوں سے
یہ اس کے بام کا زینہ ہے آئے جسکا جی چاہے
غرورِ حُسن پر ہم سے وہ ناحق جھانجھ کرتا ہے
یہ نوبت چند روزہ ہے بجائے جسکا جی چاہے
محبّت کے محل میں عاشقِ جانباز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جسکا جی چاہے

قادری:- قادری بیگم نام اور قادری تخلص تھا جعفری بیگم کی چھوٹی بہن تھیں ان کو بھی شاہ نصیر سے تلمّذ حاصل تھا۔

شرطِ وفا یہ نہ تھی غیر کے گھر جائیے　　　کچھ تو حیا کیجئے اجی ہیں تو سنر مائیے
ترسِ خدا چاہئے اسے بت ترسا تجھے　　　عاشقِ رنجور کو اتنا نہ ترسائیے
ہجر میں اے قادری سخت ہی مضطرب دل
ایک دن اس سے ضرور ملنے کی ٹھہرائیے

حیا:۔ حیات النساء نام بھورا بیگم عرف، اور حیا تخلص تھا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر اور شاہ نصیر کی شاگرد تھیں۔ شعر و شاعری کی طرف بچپن سے میلان تھا۔ عمر بھر ناکتخدا رہیں۔ کافی عمر پائی تھی۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں انتقال کیا۔ دستبرد زمانہ سے صرف دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا　　آب گہر میں عکس نہاتا ہے یار کا

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیا ڈھونڈھے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس [1]

بی بی:۔ اللہ بندی بنت حاجی احمد اللہ مفتی۔ آپ مفتی محمد ولی کی شریک حیات تھیں تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ عابدہ زاہدہ اور پابند صوم وصلوٰۃ تھیں۔ مفتی عبیداللہ آپ کی یادگار تھے۔ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں انتقال کیا ان کی قبر گوپامئو میں ہے۔ ایک شعر یادگار ہے [2]

تو نے چل کر دو قدم مردوں کو زندہ کر دیا
اب تو اعجاز مسیحا تیری ٹھوکر میں رہا

---

[1] علامہ اقبال :۔ حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

[2] تذکرہ "اذکار خواتین"

بی بی حلیمہ :- بنت محمد آمان بن ابو سعید بن مفتی علیم اللہ بن مفتی عبید اللہ بن شیخ عیسیٰ مفتی محدث گوپامئو۔
بی بی حلیمہ نواب ذکی الدین محمد جان بن شیخ عبد السبحان خاں شہید کی زوجہ تھیں جو نواب والاجاہ کے خاندان سے تھے ان سے حاجی معظم الحق المخاطب بہ ذکی الدین محمد خاں صدر الصدور مدراس پیدا ہوئے۔
بی بی حلیمہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں ۲۵ رمضان ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۳ء) کو انتقال کیا۔ ایک شعر یادگار رہ گیا ہے'

بیچتا ہوں دل اگر انسے ماہِ کنعاں چاہیے
پھر اکیلے کیوں بیٹھے ہو کہدو "کیوں نہیں' ہاں چاہیے"

حرماں :- سیدۃ النسا نام اور حرماں تخلص تھا۔ مولانا فضل حق منطقی خیرآبادی ثم دہلوی کی دختر تھیں۔ والد سے دینی علوم حاصل کیے تھے دنیوی علوم میں منطق بھی پڑھی تھی ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) یا اس سے کچھ پہلے آپ کی شادی سید احمد حسین ابن سید تفضل حسین خیرآبادی سے ہوئی تھی۔ تذکرہ "اذکار خواتین" کی مؤلفہ محترمہ خدیجۃ النساء لکھتی ہیں "مجھ سے عمر میں بڑی ہیں۔ بہن کی شادی میں ملی تھیں" ایک شعر یادگار رہ گیا ہے':-

دردِ دل' دردِ جگر' کاوشِ دل' کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں' اور ایک کلیجہ میرا

حیدری :- حیدری خانم نام اور حیدری تخلص تھا۔ بشارت اللہ خاں دہلوی مصاحب خاص بادشاہ دہلی کی اہلیہ تھیں۔ ستر برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ میں انتقال ہوا۔ صرف ایک شعر یادگار ہے :-

حیدری نام ہے تیرا کیا خوب جو کہ تجھ سے پھرا وہ حیدر ہے

کیفی :- کیفی تخلص تھا۔ نام معلوم نہیں۔ آپ تیموریہ خاندان کی ایک شاہزادی تھیں۔ غدر سے پہلے وفات پائی۔

کسکا منھ ہے جو کرے مدح تری امیرِ نبی ؛ نعتِ اطہر میں ہو جب شخص ذکی محض غبی

حبذا ذات تری مایۂ حاجت طلبی ؛ مرحبا سیدِ مکی، مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

حقتعالیٰ نے کیا آپ کو ابر اکرام تجھ سے خنداں ہی لبِ غنچۂ امید انام

ہیں شجر اور حجر غرق سحابِ انعام نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں لقبی

فاطمہ :- اللہ داد نام اور فاطمہ تخلص تھا۔ مدرسہ زنانہ دہلی میں فارسی کی معلمہ تھیں ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء تک زندہ تھیں صرف ایک شعر یادگار رہ گیا ہے

۱؎ اس خمسہ میں قدسیؔ کی غزل کو تضمین کیا گیا ہے اسی غزل کو نواب اختر محل اخترؔ المتوفی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء نے بھی تضمین کیا ہے مقابلہ کیلئے ملاحظہ ہو تذکرہ نواب اختر محل اختر

آپ کی مرضی ہم نے پالی ہے — پھر یہ کیوں لبیت ولعل ڈالی ہے

عصمت:۔ نام معلوم نہیں۔ غالباً یہی نام اور یہی تخلص تھا۔ دہلی کی رہنے والی تھیں ۱۲۸۹ھ میں مدرسہ تعلیم مستورات میں معلمہ تھیں صاحب علم وفضل خاتون تھیں۔

لعلِ لبِ جاں بخش ہے گویا ورق گل — اور رخ پہ پسینہ ہی ترا جوں عرق گل
یوں زمۂ گوش اسکا لچکتا ہی ہولے سے — شبنم سے لچک جاتا ہی جیسے ورق گل
لب ہوئے بند نام احمد سے — اور مشکلکشا نے کھولدئے

یاد:۔ نام معلوم نہیں۔ یاد تخلص تھا۔ آپ خاندان تیموریہ کی ایک خاتون تھیں۔ تاریخ وفات ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء ہے۔

عبث فکر درماں ہے اے اقربا — کہ اب یاد دنیا سے چلنے کو ہے
سرانجام غسل وکفن کر رکھو — تن زار سے جاں نکلنے کو ہے[1]

اختر[2]:۔ نواب اختر محل نام اور اختر تخلص تھا۔ آپ کا تعلق خاندان تیموریہ سے ہے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء تک بقید حیات تھیں۔ نہایت ذہین طباع

---

[1] اس قطعہ کے متعلق محترمہ خدیجۃ النساء نے اپنے تذکرہ "اذکار خواتین" میں لکھا ہے کہ یاد نے نزع کی حالت میں لکھا تھا۔
[2] نواب اختر محل اختر کی بابت مولوی عبدالباری آسی لکھتے ہیں:۔ "لفظ لفظ سے مشق کلام کا پتہ چلتا ہے"۔

اور نیک مزاج تھیں۔ آپ کے کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی ظاہر ہوتی ہے نعت و منقبت سے زیادہ شغف تھا۔ کبھی کبھی غزل کہتی تھیں۔ تذکرۂ مرآت خیال میں انکی یہ نعت درج ہے جو فارسی کی ایک مشہور غزل پہ تضمین ہے۔

تجھپہ قربان ہوں اے ہاشمی و مطلبیؐ ۔ کہ ہے مشہور دو عالم تری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی ۔ مرحبا سیدِ مکّی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

وہ ترا نور ہے ماہِ فلک و مہرِ کرم ۔ تیرے جلوے سے منور ہوئے دونوں عالم
تابِ یوسفؑ کو کہاں ہے کہ ترے دیکھے قدم ۔ من بیدل بجمال تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

واہ کیا درجہ ہے کیا شان ہے اور کیا رتبہ ۔ خالقِ ارض و سما خود ہے ترا مدح سرا
انبیا کہتے ہیں سب صلّ علیٰ صلّ علیٰ ۔ نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

تو ہے نیسانِ کرم اور سحابِ اکرام ۔ بھر دیا موتیوں سے دامنِ اُمّیدِ انام
بار آور ترے باعث سے ہی نخلِ اسلام ۔ نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

سب سے پہلے کیا پیدا ترا اللہ نے نور ۔ پردۂ ذات میں اس نور کو رکھا مستور
اور اس نور کا اظہار ہوا جب منظور ۔ ذات پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

ہے ترے نور سے پُر نور زمین و بد شت — گلشنِ چرخ ہی تیرے ہی پئے گلگشت
تیرے ہی واسطے ہیں خاص یہ جنات ہشت — شبِ معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسی ہیچ نبی

قدسیاں آنکھیں بچھاتے ہیں ترے زیرِ قدم — خاکِ پا تیری ہے سرمہ چشمِ عالم
بخشدیجو مری تقصیر تو اے شاہِ امم — نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

سختیٔ حشر سے گھبرائیگی جب مخلوقات — اور نہ بن آئیگی اے ابرِ کرم کوئی بھی بات
انبیا سب تجھے کہدینگے کہ ای ابرِ نجات — ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی

ہو گئی لہو و لعب ہی میں مری عمر بسر — یادِ خالق میں نہ مصروف ہوئی ہیں دم بھر
گھسنی ہوں ناصیۂ عجز کو تیرے در پر — چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

درد عصیاں کے سبب سے ہی مری جان چلی — اور نہ بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کیطرح سے ہی ہی — سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

اک[1] آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا — لو آج ہم نے اسکا بھی جھگڑا مٹا دیا

---

[1] تذکرہ شمیم سخن اور تذکرہ 'اذکار خواتین' میں یہ شعر بھی اختر کے نام سے پیش کیا گیا ہے اور غالباً اول الذکر تذکرہ سے صاحب تذکرۃ الخواتین نے بھی اسکو نقل کیا ہے۔

لکھکر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا — ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

لیکن حیاتِ انیس میں یہ شعر میر انیس کے نام سے درج ہے۔

تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ آخر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

زہرہ :- فاطمہ نام اور زہرہ تخلّص تھا۔ مفتی سلیم اللہ گوپاموی کی صاحبزادی تھیں اور مولوی محمد اسمٰعیل خیرآبادی کو منسوب ہوئی تھیں۔ فارسی خواں تھیں۔ عابدہ زاہدہ تھیں۔ مولوی صاحب نے شعر کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ آپ نے ۲۲ شوال ۱۲۹۶ھ ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ اور قصبہ نارنول گوپامئو میں دفن ہوئیں۔ محترمہ خدیجۃ النساء نے "اذکار خواتین" میں آپ کی بابت لکھا ہے کہ "راقمہ کی بہن ہوتی ہیں۔"

یہ بھی حاضر، وہ بھی ہے موجود اے جانِ جہاں
آپ کو کیا چاہیئے، دل چاہیئے، جاں چاہیئے؟

حجاب :- ایک کشمیری الاصل خاتون تھیں ۱۲۹۳ھ میں بمبئی میں مقیم تھیں اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ اردو میں ان کا ایک شعر ملا ہے

کیا جانے بھلا لذّتِ دیدار کو اپنی جبتک کوئی یا دیدۂ خونبار نہ ہووے

خفی :- بادشاہ بیگم نام، یوسف والی عرف اور خفی تخلّص تھا۔ محمد یوسف سادہ کار کی نواسی اور چھوٹی بیگم کی لڑکی تھیں۔ چھوٹی بیگم کی شادی ایک انگریز بلاک نامی سے ہوئی تھی۔ اس سے خفی پیدا ہوئی۔ خفی کی شادی بھی کسی انگریز سے ہوئی تھی جسکا نام معلوم نہیں۔ مگر یہ شادی خوشگوار اور کامیاب

نہ ہو سکی۔ صاحبِ تذکرہ چمن انداز نے لکھا ہے کہ خفی انگریزی، فارسی اُردو۔ تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھی۔ بہت خوشنویس تھی اور شاعری میں اکثر لوگوں کو اصلاح بھی دیتی تھی۔ تذکرہ چمن انداز کی تصنیف کے وقت یہ شاعرہ زندہ تھی۔ اس سے صاحب تذکرۃ الخواتین نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء میں زندہ تھی۔

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں　　ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں
اے خفی اپنے اشک بے تاثیر　　مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

خاکساری:۔ دہلی کی ایک عفت مآب پردہ نشین خاتون تھیں۔ تذکرۃ الخواتین میں لکھا ہے کہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء تک حیات تھیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں

مصیبتوں میں کوئی کام آ نہیں سکتا　　کہ اپنے درد کو دل بھی بٹا نہیں سکتا
لکھا نصیب کا کوئی مٹا نہیں سکتا　　کسی کے درد کو ہمدم بٹا نہیں سکتا

حاتم:۔ یہ دہلی کی ایک عفیفہ تھیں۔ نام معلوم نہیں۔ حاتم تخلص تھا ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء تک حیات تھیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔

مجھ کو کدورتوں سے ملاتے ہو خاک میں　　کہہ دیجئے جو آپ کے دل میں غبار ہو

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی
میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوارہ ہو

اشک :- آپ کا نام معلوم نہیں، اشک تخلص تھا۔ آپ کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے تھا۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) تک زندہ تھیں۔ تذکرۂ چمن انداز اور تذکرۂ مرأت خیالی میں آپ کے دو شعر ملتے ہیں جو آپ کی یادگار ہیں۔

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے تو او بُتِ کافر فقط ترسانا آتا ہے

کسی عاشق کا بیشک استخواں ہے میں نہ مانوں گا
کہ شانہ تیرے رُخ تک اتنا بیباکانہ آتا ہے

امراؤ :- آپ کا نام حسینی بیگم اور تخلص امراؤ تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی میں رہتی تھیں۔ بہادر شاہ کی غزل پر غزل کہی تھی جس کے اب صرف دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں۔

باغِ عالم میں چھڑانا تھا اگر یوں ہے
پہلے ہی سبزۂ بیگانہ بنایا ہوتا

گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری
تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

سوہی :- آپ کا تعلق خاندانِ تیموریہ سے تھا۔ قبل از غدر شباب کا عالم تھا۔ صاحب تذکرہ جمیل کا بیان ہے کہ غدر کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہیں

شور ہے اسکی بے وفائی کا
بس نہیں چلتا کچھ رسائی کا

دامِ زلفِ سیہ لیے تو یہ
نہ بنا ڈھب کوئی رسائی کا

نازؔ:۔ عالم آرا نام اور نازؔ تخلص تھا۔ خاندانِ تیموریہ کی ایک شاہزادی تھیں۔ غدر کے بہت عرصہ بعد تک زندہ رہیں۔ عالمِ شباب میں شعر و شاعری سے شوق تھا۔ یہ اشعار جب ہی کی یادگار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کے غدر کے زمانہ میں نازؔ کا عالمِ شباب تھا۔

جان جانے کی یہ نشانی ہے　　مجھ سے روٹھا وہ یارِ جانی ہے

ہے اگر شوق بادشاہی کا　　کر غلامی علیؑ کی تو اے نازؔ

ثریاؔ:۔ نام بڑی بیگم[1] اور تخلص ثریاؔ تھا۔ آپ مرزا علیخاں کی اہلیہ تھیں۔ جو شاہ دہلی کے وظیفہ خواروں میں سے تھے ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں مرزا علیخاں کا انتقال ہو گیا اور ثریاؔ بیوہ ہو کر آگرہ چلی گئیں اور وہیں آخر تک سکونت پذیر رہیں۔

تبا دیں ہم تمھارے کاکلِ شبگوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی ہم اپنی یا اسے کالی بلا سمجھے
جسے دیکھا اُٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو
تری مژگاں کو ہم سوفارِ مژگانِ قضا سمجھے

اسیرؔ:۔ امیر بیگم نام تھا اور اسیرؔ تخلص تھا شاہ فخر الدین صاحب

[1] آپ کا نام تذکرۃ الخواتین میں نبڑی بیگم لکھا ہے مگر اذکارِ خواتین میں بڑی بیگم بتایا گیا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔ "ج"

قدس سرہٗ کی تلمیذ تھیں ۔ بیگمات چغتائیہ میں سے تھیں ۔ بہت زندہ دل خوش مذاق اور بذلہ سنج خاتون تھیں ۔

عشق دار و مدار ہے اپنا ۔۔۔ بیقراری قرار ہے اپنا
خاک میں مل گئی ہوں جس پہ اسیر ۔۔۔ اسی دل میں غبار ہے اپنا

مبارکؔ :- مبارک النساء نام اور مبارکؔ تخلص تھا۔ شاہ نجم الدین صغیر خلف شاہ نصیر کی اہلیہ تھیں ۔ شاہ نصیر سے اصلاح سخن لیتی تھیں ۔ دہلی وطن تھا ۔ ۱۸۸۰ء (۱۲۹۶ھ) میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ گئیں اور وہیں اقامت اختیار کرلی ۔

مجھے کیا خوفِ محشر ہو مبارکؔ دن قیامت کا
پکڑ لوں گی میں گوشہ دامنِ خاتونِ جنتؓ کا
عذابِ گور کی سختی الٰہی کیونکہ میں جھیلوں
تھکا ہارا ہوا آیا ہوں میں پہلی ہی منزل کا

مخفیؔ :- آپ کا نام سلطان جہاں اور تخلص مخفیؔ تھا مرزا قادر بخش صابرؔ گورگانی کی اہلیہ تھیں جو مرزا مکرم بخت بہادر ابن مرزا خورد بہادر نبیرہ مرزا معز الدین جہاں دار شاہ بہادر شاہ دہلی کے صاحبزادے تھے ۔

لنڈھائی ہے کہ ہمیں خفتگانِ خاک شراب ۔۔۔ قسم خدا کی عسس کا بڑا ثواب ہوا
خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفیؔ ۔۔۔ کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے

نازنین:۔ نام و مقام کا پتہ نہیں۔ اس باب میں سب تذکرہ نویس خاموش ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر خوب کہتی تھیں۔

رک گیا دل جو مرا قابلِ افغاں ہو کر
رہ گئے برہمی دہر کے ساماں ہو کر

اپنے کشتہ کو تو ٹھوکر سے جلاتے جاؤ
پھر کسے جانتے ہو کہاں عیسیٰ دوراں ہو کر

نازنین جوش صفا یہ ہے کہ میرا کینہ
رخ سے ظاہر ہے تری قلب میں پنہاں ہو کر

کس صاحبِ حیا کی آمد ہوئی چمن میں
نرگس نے منھ چھپایا پتوں کے پیرہن میں

اس مہروش نے رخ کو کاکل میں جب چھپایا
چوٹی کی بات سوجھی مہ چھپ گیا گہن میں

دم مسیحا نہ بھریں اپنی مسیحائی کا
گر کہیں شہرۂ جاں بخشیٔ جاناں ہو جائے

دل میں میرے ہے خیالِ زلفِ جاناں آجکل
دیکھتا ہوں روز میں خوابِ پریشاں آجکل

دل میں سودا ہے مرے زلفِ سیاہ یار کا
خوش مجھے آتی ہے سیرِ سنبلستاں آجکل

دم بدم بسمل تڑپتا خوب جی کو کھول کر
پر ادب آموز اے قاتل ترا دامن ہوا

جان دی میں نے جو اس چشم سیہ کے عشق میں
سیر گاہِ آہوانِ چیں مرا مدفن ہوا

احمدی:۔ نام احمدی بیگم اور تخلص احمدی تھا۔ سونی پت نواح دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک شریف گھرانے سے تھا صاحب تذکرۃ الخواتین

نے لکھا ہے کہ "پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ مگر چونکہ ان کے شوہر کو شاعری کی طرف میلان نہ تھا، نہ اس زمانہ میں شریف مستورات کی شاعری کچھ استحسان کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اس واسطے سنا گیا ہے کہ ان کا دیوان غائب کر دیا گیا اور اسی غم میں احمدی بیگم بیمار ہوئیں۔ غم کی فراوانی سے نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہمیشہ تپ رہنے لگی۔ ہوتے ہوتے انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ دِق ہوئی اور انتقال کر گئیں۔" ان کے اب صرف دو شعر موجود ہیں۔ مولوی آسی نے احمدی کو "شاعرہ نادرہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

محبت نے انساں کو انساں کیا	اسے اس خطا پر پشیماں کیا
گلوں کی طرح چاک داماں کیا	چمن میں بھی مجنوں نے اے احمدی

راویہ:۔ نام معلوم نہیں۔ راویہ تخلص تھا۔ دہلی کی ایک غریب، مگر عفت مآب خاتون تھیں۔ نئی سیتارام کے بازار میں کوئی چھیپی رہتا تھا اسکی بیٹی تھیں۔ نہایت عمدہ شعر کہتی تھیں۔ ذیل کے تین شعر اُن کی یادگار ہیں۔

دل عشق کے صدموں سے خبر دار نہ ہوتا	ہوتی نہ محبت تو یہ آزار نہ ہوتا
کر دور دلِ زار کا آزار خدایا	دے اپنی محبت مجھے اے بارِ خدایا
مجھے لیجا بُوحنّت کے دریر	الٰہی سب گنہ سے پاک کر کر

یاس :۔ آفتاب بیگم نام اور یاس تخلص تھا فیض آباد کی رہنے والی تھیں اپنے وقت کی اچھی شاعرہ تھیں۔

حال تیرے زار کا نوع دگر ہونے لگا
جاں بلب عاشق ترا اے سیمبر ہونے لگا

اک اک فرقت میں جاناں کی مرض ہم کو رہا
درد دل گر مٹ گیا، درد جگر ہونے لگا

نہ جلوہ بخش تیرا نور گر اے مصطفےٰ ہوتا
تو دنیا میں کوئی واقف نام خدا ہوتا

تصدق جاؤں میں اپنے رسول پاک کے ہر دم
مری مشکل میں ہے اے یاس وہ مشکلکشا ہوتا

شوخ :۔ گنا بیگم نام تھا اور شوخ تخلص۔ آپ نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر نظام وزیر عالمگیر کی اہلیہ تھیں۔ بہت خوش مزاج حاضر جواب، اور صاحب ذوق خاتون تھیں۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ میر قمر الدین منت سے تلمذ حاصل تھا۔ یہ حالات مصنف گلشن بےخار اور صاحب تذکرہ چمن انداز نے بیان کئے ہیں اور یہی مستند بھی ہیں۔ شوخ کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کسی نے ان کو میر سوز کا شاگرد بتایا ہے کسی نے مرزا سودا کا۔ کسی نے لکھا ہے کہ یہ علی قلی خاں ستش انگشتی کی دختر اور نظام کی اہلیہ تھیں کسی نے ان کا تخلص نام بتایا ہے اور کسی نے منظر۔

شوخ اپنے وقت کی ایک ممتاز شاعرہ تھیں، بہت کہنہ مشق اور پرگو تھیں، کلام سے متانت، سنجیدگی اور ذوق سلیم کا پتہ چلتا ہے۔

شمع کی طرح کون رہ جانے　　جس کے جی کو لگی ہے سو جانے

جی تک بھی اگر چاہو تو وسواس نہیں ہے
کچھ اور جو ڈھونڈو تو میرے پاس نہیں ہے

اب خواب ہی میں وصل ترا ہووے تو ہووے
ظاہر میں تو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے

مجھ سے کرتی ہی رہی زلف کجی کیا کیجے　　دل مرا لیکے یہ کہتی ہی رہی کیا کیجے

یار پردہ میں ہے اور عیش سے مایوسی ہے　　نقش پا تک بھی مرے درپئے جاسوسی ہے

عندلیبوں کو وہ گلزار مبارک ہووے　　ہم کو یہ سایۂ دیوار مبارک ہووے

رات دن جس لئے روتے ہو تو اللہ کرے　　ایکدن تم کو وہ دلدار مبارک ہووے

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام　　مجھکو باور نہیں جبتک نہ نشانی آوے

جسطرح میرے دلکو لگی چاہ کسیکی　　اسطرح نہ لگیو میرے اللہ کسی کی

اس زلف درازاپنی کو ظالم نہ کتر دے　　کیا فائدہ ہو عمر جو کوتاہ کسی کی

نے نامۂ و پیغام زبانی نہ نشانی　　حالت سے کوئی کیونکہ ہو آگاہ کسی کی

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے　　خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے[1]

---

[1] یہ شعر شاہزادی زیب النساء مخفی کا بتایا جاتا ہے لیکن صاحب تذکرۃ الخواتین نے شوخ کے تذکرہ میں لکھا ہے اور اس شعر کے سلسلہ میں ایک طویل لطیفہ لکھا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایکمرتبہ غازی الدین بارہ دری میں سو رہے تھے ۔ بیگم وہاں پہنچیں تو ان کی آنکھ کھل گئی اور فوراً یہ مصرعہ موزوں کر کے پڑھا ؂
"آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے"۔ بیگم نے فی البدیہہ جواب دیا ع "خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے"۔ مگر تذکرہ شمیم سخن میں جو اکثر صاحب "تذکرۃ الخواتین کا ماخذ رہا ہے" یہ شعر شوخ کے تذکرہ میں درج نہیں ہے ۔

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

ابر چھایا ہے مینھ برستا ہے جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

لے اُڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے[2] گل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اسے دردِ جگر موتی پروتی تھی

ترے رخ کی تجلّی دیکھکر کل رات حسرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا جی تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

ضرورت:۔ شرف النساء نام اور ضرورت تخلص تھا مرزا کوچک کی اہلیہ تھیں جو تیموریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے نعتیہ رنگ میں زیادہ لکھتی تھیں

سر سبز رہے باغ صدا دینِ نبیؐ کا مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
یا رب رہے شاداب ہمیشہ چمنِ دیں مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا

طلب:۔ صاحب تذکرہ چمن انداز نے لکھا ہے کہ ایک مجہول الحال عورت کا تخلص تھا مگر صاحب ماہ درخشاں نے ان کو دہلی کی ایک

---

[2] علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اڑائی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

پردہ نشین خاتون بتایا ہے لیکن انھوں نے تخلص طالبؔ بتایا ہے۔

طلبؔ کو طلب تھی جو دیدار کی　　کھلی رہ گئی آنکھ بیمار کی

ماہؔ :۔ یہ عفیفہ دہلی کی رہنے والی تھیں۔ نام معلوم نہیں حضرتؒ قطب الدین عرف کالے میاںؒ کی مرید تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے لکھا ہے کہ صاحب دیوان تھیں۔ اب مستزاد کا صرف ایک شعر یادگار رہا ہے۔

ماہؔ کے دل میں ترا نقش محبت جو ہے یار ۔ نہ مٹے گا وہ کبھی
باغ جنت بھی کوئی دیوے تو درکار نہیں ۔ تیرے کوچہ کے سوا

قمرؔ :۔ قمر النساء نام اور قمرؔ تخلص تھا۔ اشرف علیخاں مسرور کی اہلیہ تھیں زن و شوہر دونوں کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ شوہر کی وفات کے چند دن بعد انتقال کیا۔ تذکرۃ الخواتین میں صرف پانچ شعر ملے ہیں۔ جو کسی اور تذکرہ سے نقل کئے گئے ہیں ان اشعار سے زبان دانی، قادر الکلامی، ذوق کی سنجیدگی اور رنگ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

جسے لوگ کہتے ہیں خورشید رخشاں　　شرارہ ہے اک میرے سوزِ نہاں کا
مری آہ کی کارفرمائیاں ہیں　　بنہ لامکاں تک نہیں آسماں کا

ہوئی ہوں تشنۂ جامِ شراب نزع کے وقت
اٹھونگی حشر میں ساقی سبو سبو کرتی

وہاں حضرتِ دل تم کو زلیست ہو جاتی　　جو تم سے لطفِ سرِ زلف ہو بہو کہتی

گوہر :- گوہر بیگم نام اور گوہر تخلص تھا۔ کابل مولد تھا۔ جب سدوزئی اور بارک زئی قبیلے ہندوستان آئے تو یہ خاتون بھی اُن کے ہمراہ آئیں اور بقول بعض امرتسر اور بقول بعض لدھیانہ میں سکونت اختیار کی؛ فارسی، پشتو اور اُردو تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں۔ اُن کے اشعار سے زباندانی اور قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے؛ اشعار میں سادگی صفائی برجستگی اور لطافت ہے بہت حسین و جمیل تھیں اور اسکا خود انہیں بھی احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے ؎

مہوش و گلعذار ہم بھی ہیں   ایک بُتِ نوبہار ہم بھی ہیں

بہت بذلہ سنج اور خوش مزاج خاتون تھیں۔

ستم کر، جور کر، ظلم و جفا کر   پر لے ظالم کبھی مجھ سے ملا کر
لجا کر، شرم کھا کر، مسکرا کر[1]   دیا بوسہ مگر کچھ منہ بنا کر

عشق کیسا بلا ہوا صاحب   کس سے کہیئے یہ ماجرا صاحب
غیر اچھا ہی ہوگا اپنے لئے   ہم کو کہتے ہو کیوں برا صاحب

آپ کے جاں نثار ہم بھی ہیں   عاشق و دلفگار ہم بھی ہیں
مہوش و گلعذار ہم بھی ہیں   اک بُتِ نوبہار ہم بھی ہیں

---

[1] اس مصرعہ کو پڑھکر میر حسن کی مثنوی کے یہ شعر یاد آجاتے ہیں

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے   بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے   لجائے ہوئے، شرم کھائے ہوئے

امتحان دفا تو ہو وے گا
تم بھی ہو اور یار ہم بھی ہیں

درد کہتا ہے مجھسے غربت میں
تم نہ گھبراؤ یار ہم بھی ہیں

بس اُٹھ گئی رسمِ دل لگی کی
روئے وہ جو بات کی ہنسی کی

ابرو کو جو تیر سے تیغ باندھا
یہ بات تھی اک ردا روی کی

چھلنی داغوں سے دل ہے گوہر
انگیا ملی ہم کو سوزنی کی

آئیے لے جانِ عالم آئیے
اپنے بندہ پر کرم فرمائیے[۱]

عید آئی اور گیا ماہِ صیام
چاند سا منھ آج تو دکھلائیے

سال بھر گذرا اُمیدِ وصل میں
عید کا دن ہے گلے لگ جائیے

اک گھڑی بھی بیٹھنا دوبھر ہوا
دل کو سمجھالیں گے اچھا جائیے

وصل کی کہتا ہوں جب گوہر سے میں
ہنس کے کہتے ہیں کہ منھ بنوائیے

فاطمہ:۔ نام فاطمہ تھا اور یہی تخلص تھا۔ آگرہ کی رہنے والی تھیں

---

[۱] اکبر حیدری:۔

عید آئی ہے کرم فرمائیے
مژدۂ چشمِ عنایت لائیے

انتہائے شرم بے جا ہو چکی
آئیے پردہ سے باہر آئیے

مُہرِ خاموشیٔ الفت توڑئیے
دردِ دل کہہ جائیے سن جائیے

ماحصل یہ ہے کہ دل رکھ لیجئے
مختصر یہ ہے گلے لگ جائیے

آپ سے ہے اکبرِ محزوں کی عید
آئیے قربانِ مقدم آئیے

نازک مزاج وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت ؛ ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائیگا

ملکہ :۔ انّی (Anne) نام اور ملکہ تخلّص تھا۔ شروع میں مذہب تثلیث کی پیرو تھی۔ آخر میں مسلمان ہوگئی تھی۔ مسٹر بلاّ کیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی لڑکی تھی۔ انگلستان مولد تھا کلکتہ میں سکونت رہی یہیں اُردو اور فارسی کی تعلیم پائی۔ مولوی عبدالغفور صاحب مؤلف تذکرۂ سخن شعراء سے اصلاح سخن لیتی تھی۔

ہجر میں دل کو بیقراری ہے　　جوش فریاد و آہ وزاری ہے
آنکھیں پتھرا کے ہوگئی ہیں سفید　　کسی بُت کی جو انتظاری ہے
ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام　　میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا[۱]
آہ وزاری نہیں سنتا بخدا راتوں کو　　اس صنم کو ملکہ ہی نے مگر رام کیا

جمعیت :۔ یہ خاتون مسیحی مذہب کی پیرو تھی اور میجر آرجسٹن کی اہلیہ تھی۔ عرصہ تک آگرہ میں اقامت گزیں رہی۔ اُردو و فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھی۔ موسیقی میں بھی دخل تھا۔ اُردو۔ فارسی۔ ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتی تھی بہت ذہین اور طباع تھی۔

---

[۱] قاآنی :۔ ہمسایہ شنید نالہ ام گفت　　قاآنی را دگر شب آمد
میر حسن :۔ پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ　　بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

خدا کے روبرو جانا ندامت مجھکو بھاری ہے
کوئی نیکی نہ بن آئی اسی کی شرمساری ہے

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

معشوق کی خوبی ہے، یہ قسمت کا ہے احساں
رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے

خورشید:۔ یہ عفیفہ دہلی کی ایک سید زادی تھیں اور ناکتخدا تھیں ان کے متعلق مشہور رہا ہے کہ مرثیئے خوب لکھتی تھیں۔ ان کا ایک شعر ملتا ہے مگر صاحب تذکرہ چمن انداز کو اس پر شبہ ہے۔

اے جذبۂ دل کیونکہ اجازت دوں میں تجھ کو
ہے سخت کشش تیری وہ ایسا نہ ہو ڈر جائے

رعنائی:۔ قدسیہ بیگم نام اور رعنائی تخلص تھا۔ دہلی کی رہنے والی تھیں صرف ایک شعر ملا ہے جو زبان کا اچھا نمونہ ہے۔

میں جانتی تھی آنکھ لگی دلکو سکھ ہوا کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

غریب:۔ امیر النساء نام اور غریب تخلص تھا میر برکت علی کی زوجہ تھیں جو پٹنہ کے باشندے تھے۔

گر صبا دل میں جگہ اس کے نہیں کرتی تو خیر
اس قدر بھی مجھ سے اس محبوب کو برہم نہ کر

دل کو درپردہ جلایا مثل شمع کیوں غریب
وہ ہوا پروانہ غیروں پر تو ہو کچھ غم نہ کر

دل سر داب تو آہ شرربار نے کیا
لو اور وہ تو جلنے لگا میرے نام سے

رسوائے شہر مجھ کو دل زار نے کیا
کھلتا نہ تا بمرگ مرا یہ معاملہ

عفت :۔ نام معلوم نہیں۔ عفت تخلص تھا۔ حیدر ظہیر دہلوی کی تلمیذ تھیں سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک رسالہ میں آپ کی ایک غزل چھپی تھی اس کے چند منتخبہ اشعار یہ ہیں ؎

دل جس نے لیا وہ بت عیار نہیں ہے
مرتا ہوں کوئی ہائے مددگار نہیں ہے

انکار کی صورت ہے یہ اقرار نہیں ہے
بوسہ کی طلب پر نہ کہو پھیر کے منھ "ہاں"

ہمدرد نہیں کوئی بھی غمخوار نہیں ہے
سنتا نہیں احوال کوئی کسکو سنائیں

لازم تجھے اے خنجر خونخوار نہیں ہے
ہم تجھ پہ فدا ہوتے ہیں اور ہمسے ہی کھچنا

قسمت وہ ہماری کہ دیدار نہیں ہے
حیرت ہے ملا آئینہ کو بخت سکندر

جز یاس و الم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے
رونے کیلئے میرے جنازے پہ اب عفت

ضیا :۔ سکندر جہاں بیگم نام اور ضیا تخلص تھا۔ صاحب تذکرۂ ماہ درخشاں نے ضمیمہ میں لکھا ہے کہ میر امیر علی صاحب سابق کوتوال ریاست جاورہ

کی دختر تھیں۔ نہایت پختہ مشق اور پُرگو شاعرہ تھیں ان کے اشعار سے قادر الکلامی جھلکتی ہے

جی میں تو فکر بتاں اور لب پہ ہو ذکرِ خدا　　اے دلِ بیتاب تجھسے پارسائی ہو چکی
دیکھی گئی نہ ہم سے ہنسی اسکی غیر سے　　رو کا گیا نہ گریۂ بے اختیار چشم
آنکھیں بھی نذر گریۂ فرقت ہوئیں ضیا　　ماتم تھا پہلے دل کا ہوں اب سوگوار چشم
یہ کہتے ہیں ٹھکرا کے وہ نعش عاشق　　یہ فتنہ نہیں ہے جگا نیکے قابل
بھلا خاکساروں سے اتنی کدورت　　نہ تھے خاک میں ہم ملانیکے قابل
بجا ہے وفادار کوئی نہیں ہے　　مرا عشق ہے آزمانیکے قابل
یوں جو ہم نوجوان مرتے ہیں　　اُن کی یادِ شباب ہے دل میں[لہ]
بخیہ گر دشتِ جنوں سے تنگ ہوں　　جیب کچھ باقی ہے تو داماں نہیں
میری بیتابی پہ روتے ہیں عدو　　دوست میرے حال پہ خنداں نہیں
ایک قاتل سے دوستی کی ہے　　موت سے ہمنے دل لگی کی ہے
کب تلک ظلم اے ستم ایجاد　　انتہا بھی ستمگری کی ہے ؟
فیضِ استادِ مہرباں ہے ضیاء　　دھوم جو تیری شاعری کی ہے
بے وفاؤں کو باوفا جانا　　ہائے کمبخت دل نے کیا جانا
واہ ری نارسائی قسمت　　اس کے در تک نہ ہوسکا جانا
ہوا اک آفتِ جاں پہ فدا دل　　ندے دشمن کو بھی ایسا خدا دل

لہ مومن :- یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں　　تیرے عہدِ شباب نے مارا

سپ پئے مشق جفا لاؤں کہاں سے — تمھیں تو چاہئے روز اک نیا دل
دلِ ناکام لے کر کیا کرو گے — نہیں ہے یہ تمھارے کام کا دل
بتِ کافر سوا تیرے خدا سے — نہیں رکھتا ہے کوئی التجا دل
بتوں نے کر دیا اب غیرتِ دیر — کبھی مشہور تھا بیتِ خدا دل

رباعی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں — طوفاں زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں
ظالم اب اپنے در سے اٹھاتا ہے کس لئے — کیا کم ہے یہ ستم کہ ترے دل سے دور ہوں

شاعرات اردو کا لکھنؤ اسکول

شاعرات اُردو کا لکھنؤ اسکول

حرم نواب آصف الدولہ[1]

جانی :۔ نواب قمر الدین خاں کی دختر تھیں۔ آپ کا نام بیگم جان، عرف بہو بیگم اور تخلص جانی تھا۔ نواب آصف الدولہ والی اودھ کی حرم تھیں،

---

[1] نواب آصف الدولہ، نواب شجاع الدولہ کے فرزند تھے۔ نواب یحییٰ خاں نام، مرزا امانی عرف اور آصف تخلص تھا۔ شعر و سخن کے بڑے قدردان اور مربی تھے۔ ان ہی کے عہد میں مرزا سودا۔ میر تقی میر اور میر سوز وغیرہ دلّی سے لکھنؤ آئے۔ ایک اُردو دیوان اُن سے یادگار ہے۔ جس میں بقول رام بابو سکسینہ " تقریباً ۳۰۰ صفحات میں غزلیں۔ ۱۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے "۔ (تاریخ ادب اُردو مترجمہ مرزا عسکری صـ۲۹۵)

نواب آصف الدولہ کی تاریخیں یہ ہیں :۔

تاریخ پیدائش ۔ ۱۷۴۸ء مطابق ۱۱۶۱ھ

تاریخ جلوس ۔ ۱۷۷۴ء مطابق ۱۱۸۸ھ

تاریخ وفات ۔ ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۱ھ

اور اپنے وقت کی اچھی شاعرہ تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے ان کو "شاعرہ گرامی" کے لقب سے یاد کیا ہے

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جانِ ناتواں کی ۔ رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہیے کہاں کہاں کی[1]

دل جس سے لگا یا وہ ہوا دشمنِ جانی ۔ کچھ دل کا لگانا ہی نہیں راس نہ آیا[2]

نہیں ٹانکے مرے زخمِ جگر پہ ۔ یہ اس کا خندۂ دنداں نما ہے

نہیں ٹلتی کسی عنوان سے سر ۔ شبِ غم بھی کوئی کالی بلا ہے

دہن پر تیرے تھا ہم کو توہم ۔ یہ عقدہ آج ہی ہم پر کھلا ہے

دُلہن

دُلہن:۔ نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کی حرم اور نواب انتظام الدولہ کی صبیہ تھیں۔ نہایت خوش خلق۔ نیک طینت اور صاحبِ ذوق خاتون تھیں تذکرہ سراپائے سخن کی تصنیف کے وقت فیض آباد میں مقیم تھیں۔

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا ۔ تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں ۔ مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

ایسے کم ظرف نہیں ہیں کہ بہکتے جائیں ۔ گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک ۔ خانۂ دل جو گرا ہو اُسے آباد کرو

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی ۔ عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

[1] تذکرۃ الخواتین میں لکھا ہے کہ آخر وقت میں جب عالم نزع تھا ایک خواجہ سرا ہمدم نامی عیادت کے لئے آیا اور مزاج پوچھا کرب تکلیف کے عالم میں یہ شعر فی البدیہہ نظم کر کے ارشاد فرمایا

[2] بزم سخن

حرم نواب واجد علیشاہ [1]

قمر:۔ حیدری بیگم نام، ماہ طلعت عرف اور قمر تخلص تھا مرزا ہمایوں بخت کی دختر اور واجد علیشاہ کی حرم تھیں۔ بہت خوش گو۔ خوش فہم اور خوش مذاق خاتون تھیں۔ نہایت طباع اور ذہین تھیں۔ یہ بھی واجد علیشاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ اُردو اور فارسی دونوں میں دستگاہ رکھتی تھیں۔ اور دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء ہے۔ کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔ خود ان کے منتخبہ اشعار یہ ہیں جو انھوں نے ایک تذکرہ کیلئے دئے تھے۔

مر کے بھی خو نہ گئی بادہ کشی کی زاہد
حشر میں ساقیٔ کوثر کا نہ داماں چھوٹا

روز و شب کرتی ہی بلبل یہ قفس میں فریاد
ہائے کیا فصلِ بہاری میں گلستاں چھوٹا

لے گیا قیس پہ بھی فوق تمھارا وحشی
مر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوٹا

دعویٰ تھا عبث یار مسیحائی کا تم کو
اچھا نہ ہوا ایک بھی بیمار تمھارا

داغِ سودا سر پہ ہے پاؤں میں زنجیر شعاع
ہے پریرو تیری الفت میں یہ حالِ آفتاب

گر مقابل ہو تمھارے روئے آتش رنگ کے
بدر کی صورت گھٹے ہر دم کمالِ آفتاب

---

[1] نواب واجد علی شاہ اودھ کے آخری تاجدار اور نواب امجد علیشاہ کے بیٹے تھے۔ بیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھے شروع شروع میں انتظام مملکت [بقیہ صفحہ ۱۸۶ پر]

سوزشِ داغِ دلِ بیتاب سے پایا فروغ
آئینے ایسا بھلا کب تھا جلالِ آفتاب

عشقِ خطِ صنم کا تھا اللہ یہ گناہ　　بہرِ عذاب آتے ہیں مرقد میں مار سبز
گر آبِ زندگی بھی تو برسائے اے فلک　　کشتِ امیدِ وصل نہ ہو زینہار سبز
اے میکشو تکلفِ ساقی تو دیکھنا　　شیشے ہیں سرخ جام مئے خوشگوار سبز
شیدا ہیں چشمِ پُرفنِ آہو شکار کے　　گلشن میں کب ہے نرگسِ بیمار سے غرض
ہوں وہ گشتہ کہ بعدِ مرگ آئے جوشِ جنوں　　لوحِ مرقد کو مرے سنگِ فلاخن چاہیئے
تیرے جانباز کو بس کافی ہے شمشیرِ نگاہ　　قتلِ عاشق کیلئے کیا تیغِ آہن چاہیئے

گلِ سودا شگفتہ ہیں یہ فیضِ اشکباری ہے
نسیمِ آہ کا جھونکا یہاں بادِ بہاری ہے
نہ پوچھ اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے درد و حسرت ہے فغاں ہے آہ و زاری ہے
گرے لاتنے ستارے کہش سے تیرے مہ ناباں
روشِ گلزار کی ہر ایک فرشِ زرنگاری ہے

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا　　بھول کر بیٹھے ہیں پھر نہ کبھی یاد کیا

آپ کا ایک اور شعر جو "اذکار خواتین میں ملا ہے" یہ ہے :-

آنکھیں پتھرا کے ہو گئی ہیں سفید　　کسی بت کی جو انتظاری ہے

حجاب :- نواب بیگم نام اور حجاب تخلص تھا۔ نواب اعظم علیخاں کی دختر

تھیں جو نواب معتمد الدولہ برادر غازی الدین حیدر والی اودھ کے لڑکے تھے، ان کا سنہ پیدائش ۱۲۵۹ھ ہے۔ نواب واجد علیشاہ والیٔ اودھ کی محل خاص تھیں اور اُن کے ساتھ کلکتہ بھی گئی تھیں۔ نہایت خلیق، نیک طینت اور باذوق خاتون تھیں۔

(صفحہ ۱۸۵ سے) عدالت اور رعایا پروری کا شوق رہا۔ مگر جلد ہی خود غرض اور بدخواہ ہم نشینوں نے عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اور پھر رقص و سرود کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ رہا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو سلطنت انگلشیہ کی طرف سے انتزاع سلطنت کا حکم سنایا گیا اور اس کے بعد کلکتہ بھیجدئے گئے جہاں دو برس تک فورٹ ولیم میں نظر بند رہے اور پھر تا وفات مٹیا برج میں قیام رہا۔ لکھنؤ سے ان کے ہمراہ انکی بہت سی محلات اور بہت سے دوسرے لوگ بھی کلکتہ گئے تھے۔

نواب واجد علیشاہ کو شعر و شاعری کا بہت ذوق تھا۔ اختر تخلص کرتے تھے اور نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ بہت کثیر التصانیف تھے۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ "انکی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی"۔ (صد ۳۰۲) صرف غزلیات کے چھ دیوان ہیں۔ انکے علاوہ مراثی، مثنویات اور قصائد کے مجموعے علیحدہ ہیں۔ نواب واجد علیشاہ کی تاریخیں یہ ہیں:۔

تاریخ پیدائش:۔ ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۲ھ
تاریخ جلوس:۔ ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ
تاریخ معزولی:۔ ۱۸۵۶ء " ۱۲۷۲ھ
تاریخ وفات ۱۸۸۷ء " ۱۳۰۳ھ

بن کے تصویرِ حجاب اسکو سراپا دیکھو منھ سے کچھ بولو نہ آنکھوں سے تماشہ دیکھو

کہیں کیا اسے حجاب آخر یہ دیکھا آنکھ سے ہم نے
کیا طوفاں بپا بحر سرشکِ چشمِ پرنم نے
اڑا دی نیند اس کی جب فراقِ یار کے غم نے
گذاری رات ساری تارے ہی گن گن کے عالم نے
ہوا شب کو جو دھوکا اپنے اختر کا ستاروں میں[1]

صدر :- نواب صدر محل نام اور صدر تخلص تھا۔ نواب واجد علیشاہ آخری تاجدار اودھ کی اہلیہ تھیں، صاحب دیوان تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے "بادشاہ نامہ" اور "نامہ اسم" کو ان کی تصنیف بتایا ہے۔ اسی تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) تک زندہ تھیں۔

جوشِ جنوں میں رات دن سب سے رہا الگ الگ
میں ہوں جدا الگ الگ، لوگ جدا الگ الگ
میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر
منھ کو بچرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پہ

---

[1] تذکرۂ چمن انداز کے مصنف نے لکھا ہے کہ نواب واجد علیشاہ اختر کے دیوان میں ایک خمسہ ان کے نام سے موجود ہے جسکا نمونہ اوپر پیش کیا گیا۔

چلیو خدا کے واسطے بادِ صبا الگ الگ

خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریضِ عشق کی
میں ہوں دل سے دور دور مجھ سے دوا الگ الگ

ہجر میں خوب خاک اڑائی اُنپہ ہوا نہ کچھ اثر
نالے گئے الگ الگ آہِ رسا الگ الگ

حسرت و آرزوئے وصل، درد و مصیبتِ فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ
بابِ قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

عالم:۔ نام معلوم نہیں۔ عالم تخلص تھا۔ نواب واجد علیشاہ والئے اودھ کی اہلیہ تھیں اور آخر میں ان کے ساتھ جاکر کلکتہ بھی رہی تھیں۔ صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ ایک مثنوی بھی یادگار چھوڑی، کہا جاتا ہے کہ ستارہ بجانے میں کافی مہارت رکھتی تھیں۔

اے باغباں چمن میں یہ کہدے پکار کے　　　لو بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے
وحشی وہ ہوں کہ قیس نے بھی لیں تبرکاً　　　گنڈے بنا کے پہنے گریبانِ تار کے
بیقراری کیا بیاں ہو اس دلِ بیتاب کی
شور و افغاں سے ہمارے عرش تھرانے لگا
جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمھیں　　　قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہے سزا دل

اجاڑے دیکھئے کس کس کے آشیانے کو
یہی چمن میں ہے اب چارہ سُو فغاں صیاد

عالم وہ طلبگار تیرے ہونگے اسی دن
جب کوئی ستم اور وہ ایجاد کرینگے

گذاری رات ساری تارے ہی گن گن کے عالم نے
ہوا شب کو جو دھوکا اپنے اختر کا ستاروں میں

محبوب: سلطان جہاں نام۔ محبوب محل خطاب اور محبوب تخلص تھا نواب واجد علیشاہ کی حرم تھیں۔ بہت اعلیٰ ادبی مذاق پایا تھا۔ نہایت نیک طینت اور پاک باطن خاتون تھیں۔

اٹھا سکی نہ مصیبت فراقِ یار میں روح
نکل گئی تنِ لاغر سے انتظار میں روح

نہ نکلی حسرتِ دل ایک بھی کہ موت آئی
ہمیشہ تڑپے گی تیرے لئے مزار میں روح

جو آنا ہو تجھے مدّ نظر تو آ ظالم
نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح

نہیں ہے گور کی تنگی سے کچھ ہمیں دہشت
رہیگی بعد فنا کے بھی کوئے یار میں روح

اسی کے حکم سے ہے موت و زندگی محبوب
حقیقتاً ہے مری دستِ کردگار میں روح

۱؎ صاحب تذکرۃ الخواتین نے نواب عشرت محل عشرت حرم واجد علیشاہ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور مثال میں صرف یہ ایک شعر دیا ہے ؎

گرمئی عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مگر مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے اور غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ شمیم سخن میں جو تذکرۃ الخواتین کا اکثر ماخذ رہا ہے یہی غلطی موجود ہے لیکن یہ شعر عشرت کا نہیں میر تقی میر کا ہے۔

دیگر خواتین

کنیز:۔ اس جواں مرگ کا فاطمہ بیگم نام اور کنیز تخلص تھا۔ نواب نصرت الدولہ بہادر لکھنوی کی دختر کی کنیز تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں علوم ضروریہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر چکی تھی، نہایت شگفتہ مزاج، حاضر جواب طباع اور ذہین تھی۔ بیس برس کی عمر میں عین عنفوان شباب میں ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۵ء میں انتقال ہوا[1]

نقاش نے اس بت کا مرے نقش جو کھینچا ـــ ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا[2]
وصل کی شب ہو گا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے ـــ جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائیگی

ذلیل:۔ نوبہار نام ذلیل تخلص تھا۔ مرزا سلیمان شکوہ کی کنیز تھی طبیعت فحش گوئی کیطرف زیادہ مائل تھی۔

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں ہیں تم تو ـــ ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو
ہیں فرشتوں کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے
اپنی کرتوت پہ جیں دم کہ بیں آ جاتی ہوں

سلطان:۔ سلطان بیگم نام اور سلطان تخلص تھا۔ نواب معتمد الدولہ بہادر

---

[1] اذکار خواتین۔

[2] محترمہ خدیجۃ النساء بیگم نے اپنے تذکرہ اذکار خواتین میں لکھا ہے کہ کنیز نے یہ شعر تین[3] برس کی عمر میں کہا تھا

لکھنوی کی دختر تھیں۔ صاحب تذکرہ چمن انداز کا خیال ہے کہ صاحبِ دیوان تھیں۔ قبل غدر حیات تھیں کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی ظاہر ہے۔

دل سے صبر و قرار کھو بیٹھے ہم تو عاشق اسی کے ہو بیٹھے
دل ہی دل میں کڑھا کرو بیٹھے صورت اسکی نظر نہ آئے گی

لگایا گل سے جو دل کو تو نے سمجھ لے دلمیں یہ! اے بلبل
ہیں چند روزہ بہار کے دن یہ گل تو روزِ خزاں نہ ہوگا

ڈر ہی ہی کہ جان سے اپنی نہ جائے دل کبتک یہ تیرے ہجر کے صدمے اٹھائے دل
آخر یہ میری جان پہ آئی بلائے دل قاتل نے کب کہا تھا کہ آنکھیں لڑائے دل
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہکے ہائے دل تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
خالی ہے تیرے واسطے عشرت سرائے دل سینہ اگر ہے داغوں سے معمور کیا ہوا

سلطاں غزل اک اور بدلکر ردیف لکھ
پر شرط ہے کہ لفظ گل آئے بجائے دل

یاسمن: چنبیلی نام اور یاسمن تخلص تھا۔ سید انشا کی کنیز تھی اور ان ہی سے اصلاح سخن بھی لیتی تھی۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے یاسمن کی بابت لکھا ہے، جو بظاہر لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ "عجیب بات یہ ہے کہ صحبتِ مرد سے اس کو قطعی تنفر تھا۔ سید انشا نے شاید اس بات کو تصنع خیال کیا۔ اور بہ اتبارع شر لعیت اس کی شادی ایک نہایت معقول آدمی کے ساتھ کردی تیسرے روز بغیر عارضہ اور مرض کے جاں بحق تسلیم ہوئی۔"

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[۱]
سرمہ کھلوایا خموشی نے مجھے　　جب وہ منظورِ نظر یاد آیا
دخترِ رز سے رات صحبت تھی　　شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا

ضیاؔ: - ضیائی بیگم نام اور ضیاؔ تخلص تھا حکیم انور علی صاحب لکھنوی کی اہلیہ تھیں - نہایت فاضل خاتون تھیں - صاحبِ تذکرہ بہارِ بے خزاں نے لکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں اور تینوں میں شعر کہتی تھیں - باسٹھ برس سے زیادہ عمر پائی[۲]

تمھارا ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہو نازک میں ناتواں ہوں
میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھکو خاک
اس کو بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی
سوتے ہیں شب جو پیچ کھلے زلفِ یار کے
دعوے دروغ ہو گئے مشکِ تتار کے
شمشاد گرد سایۂ قامت چمن میں ہے
خورشید و مہ شعاع ہیں رخسار یار کے
بے وجہ بوئے شراب کی منھ میں نہیں ضیاؔ

---

[۱] غالبؔ ؎ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ؛ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
[۲] " اذکار خواتین"

چوسے ہیں تم نے ہونٹ کسی بادہ خوار کے

میں نے پوچھا قتل مجھکو کیجئے گا کسطرح　　بولے غفلت سے کبھی گا ہے نگاہِ تیز سے

بہو بیگم :۔ نام معلوم نہیں۔ بہو بیگم خطاب تھا۔ نواب یوسف علیخاں والئی رامپور کی محل خاص تھیں شعر کہنے کا فطری ذوق تھا، باکمال خاتون تھیں۔ تذکرہ چمن انداز میں اُن کے یہ دو اشعار ملتے ہیں۔

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا　　آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشکِ قمر سے

پر خوف یہی دل میں مرے آیا کہ ہے ہے　　نازک ہے نہ دب جائے کہیں تارِ نظر سے

عابدہ :۔ نواب امراؤ بیگم نام اور عابدہ تخلص تھا۔ نواب یوسف علی خاں والئے رامپور کی دختر اور نواب محمد زین العابدین فوجدار ریاست جے پور کی اہلیہ تھیں۔ صاحب علم و فضل خاتون تھیں۔ سنا ہے کہ ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اُردو اور ایک مثنوی متعلق شکار آپ نے چھوڑیں۔ مگر آپ کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے تذکرہ چمن انداز سے دو شعر نقل کئے ہیں جس سے موصوفہ کی تاریخ وفات ۱۲۸۶ھ نکلتی ہے ان میں جویا مرحوم نے ان ہی کے مصرعہ کو تضمین کیا ہے

یہ کرامت اسکی ہے جو یا کہ خود فرما دیا　　تا قیامت رحمت خلاقِ باری قبر کو

کشتہ ہیں اسے لاغری ہم رنگ گندم گوں کے جو　　ہے شکن گندم کی بس کافی ہماری قبر کو

پارسا:۔ آپ نواب میرزا محمد تقی خاں ہوسؔ کی دختر تھیں۔ ہوسؔ نواب آصف الدولہ کے قریبی عزیز تھے اور درباری مصاحبین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ صاحب تذکرہ چمن انداز کا بیان ہے کہ پارساؔ کی شادی تمام عمر محض اسوجہ سے نہیں کی گئی کہ ہوسؔ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ کوئی انکا داماد ہو۔ ان کے یہ دو شعر اب موجود ہیں۔

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا — یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا
چلتا نہیں ہے ابلق ایام ایک چال — اکثر یہ بدرکاب بنا اور بگڑ گیا

شرم ۔شمس النساء بیگم نام اور شرمؔ تخلص تھا۔ کلیم قمر الدین تلمیذ خواجہ وزیر کی صاحبزادی تھیں۔ بنارس مولد تھا مگر سکونت لکھنؤ میں رہی کلام میں فحاشی زیادہ ہے۔

جو تیری کاکل مشکیں کی بو صبا لائی — دماغ عرش پہ اس خاکسار کا پہنچا
مثال غنچہ تو کیوں دل گرفتہ ہی اے شرمؔ — خوشی ہو خط ترے اب گلعذار کا پہنچا

دشمن ہوا وہ جاں کا کی جس سے دوستی — سچ ہے مثل کسی کا کوئی آشنا نہیں
سو طرح کی جفا تری اے ناز نیں سہی — اس پر بھی قدر تجھکو نہیں تو نہیں سہی

پہلے ثابت کریں اس وحشی کی تقصیریں دو
کیوں مرے پاؤں میں پہناتے ہیں زنجیریں دو
دونوں زلفوں کا تری آیا جو وحشت میں خیال
پڑ گئیں پاؤں میں میرے وہیں زنجیریں دو

کہا قاصد سے نے کہ لایا ہوں میں پیغام وصال
آج خلعت مجھے پہناؤ کہ جاگیریں دو

دردِ دل دور ہوا سینہ کی سوزش بھی گئی
شربت وصل میں تیرے ہیں یہ تاثیریں دو

یا بہلنے سے بلائیں اُسے یا خط ہی لکھیں
شرم کیا خوب یہ سوجھیں ہمیں تدبیریں دو

گر پڑوں یار کے قدموں پہ اگر پی ہے شراب
ہاتھ آیا ہے بہانہ مجھے بیہوشی کا[۱]

جیتے جی نہ آیا اسے کچھ دھیان ہمارا — مرجانے پہ کیا نکلے گا ارمان ہمارا
کوئی نا آشنا نہیں ایسا — ملے ہیں آپ آشنا کیا خوب

وصل میں شرم وحیا شرم کو مشکل ہے بہت
کثرتِ شوق سے ہو جاتا ہے دشوار لحاظ

حجاب: عسکری بیگم نام اور حجاب تخلص تھا۔ ملا محمد زماں صفہانی کی پوتی اور محمد علیخاں مسیحا کی شاگرد تھیں شعر وشاعری سے شغف تھا۔ اکثر مشاعرے بھی اپنے مکان پر کراتی تھیں۔ تذکرۃ الخواتین میں ان کا صرف ایک

---

[۱] غالب
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذر مستی ایک دن

شعر ملا ہے، جس سے ان کی ادبی سنجیدگی اور شاعرانہ ذوق کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

رات کو آئیں گے ہم صاف معمّہ یہ ہے　　وعدۂ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

شیریںؔ:- نواب شاہجہاں بیگم سابق فرمانروائے بھوپال کا شیریںؔ تخلص تھا آپ کا خطاب رئیس دکا ورا عظم طبقہ اعلائے ہند کروان آف انڈیا زمرۂ ریاستہائے ہند تھا۔

آپ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۲۸۵ھ / ۱۸۷۰ء میں تخت پر جلوہ گر ہوئیں علوم حاضرہ سے واقف تھیں، عالی ہمت، خوش ذوق اور علم پرور خاتون تھیں۔ علماء و فضلا کی بہت قدر و منزلت کرتی تھیں۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ فارسی میں شاہجہاں اور اُردو میں شیریںؔ تخلص کرتی تھیں پہلا دیوان اردو کا ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء میں طبع ہوا تھا[1]

آتی ہے ہوا سرد گھٹا اٹھتی ہے گھنگھور　　منگواؤ صراحی و مئے و جام ہمارا
پہلی سی رکاوٹ نہیں اب ہے نظر لطف　　آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا
فرقت میں نری ساتھ دیا اپنا اسی نے　　کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا
کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر　　اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا[2]

---

[1] جناب نجم الغنی صاحب کو آپ کی شعر گوئی سے انکار ہے ملاحظہ ہو بحر الفصاحت بابُ السرقہ
[2] لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوشخط کی زلف ؎ ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہوں اسلام کے
احسنؔ

قابل پابوس کیا ہم بھی نہیں ہیں آپ کے
کیا خطا کی ہمنے گر چوما قدم کو کیا ہوا

عرش تک جاتا تھا یا اب کان تک آتا نہیں
ہم نشینو میرے نالے کے اثر کو کیا ہوا[۵۱]

درد فراق ہی میں سدا مبتلا رہے
دنیا میں اسطرح بھی رہا ہے ہم تو کیا رہے[۵۲]

لطف کیا پاؤگے تنہا دل شیدا لیکر
دیکھئے سیر بھی کچھ یاس و تمنا لیکر

غم سے مرتا ہوں نہ شرمائیے اجل آئی ہے پر
کوئی زندہ نہ کرے نام تمھارا لیکر

جھوٹی قسموں کے دلاسے تو نہ دو شیریں کو
دل بھی پھیرا ہے کبھی تم نے کسی کا لیکر

مستور:۔ مستور بیگم نام اور مستور تخلص تھا لکھنؤ کے ایک متمول خاندان کی تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ صرف ایک شعر ملا ہے۔

خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت
رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

عفت:۔ نجم النسا، نام اور عفت تخلص تھا۔ مولوی مقصود عالم مقصود

---

[۵۱] غالب ؎ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خواجہ احسن اللہ بیاں ؎
عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھکو اپنی آہ پر

[۵۲] دولہن حرم نواب آصف الدولہ ؎
دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

ساکن بہانی کی شاگردہ تھیں ۔صاحب دیوان گذری ہیں اب صرف یہ ایک شعر ملا ہے۔

ہم جو لے جانِ جہاں تم سے بچھڑ جاتے ہیں
صدمے ہوتے ہیں قلق ہوتے ہیں گھبراتے ہیں

مطلوب :۔ فضل النساء نام اور مطلوب تخلص تھا ۔شملہ کی رہنے والی تھیں۔

کیوں نمک پاش نہ ہو زخم جگر پر ہر دم :: مسکرانا ترا اے رشکِ قمر وصل کی رات
اللہ اللہ ری مدہوشی جامِ الفت :: جان و تن کی نہ رہی کچھ بھی خبر وصل کی رات
پاؤں میں وحشی کی ہر زلفِ جنوں کا حلقہ :: آنکھ دکھلاتا ہے پھر حلقۂ زنجیر عبث
نظرِ لطف سے اُن کو تو کبھی دیکھا کر :: کیا گذرتی ہے ترے چشم کے بیماروں پر

لطیف :۔ لطیف النساء نام اور لطیف تخلص تھا ۔پٹنہ عظیم آباد وطن تھا۔ اُردو۔فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں ۔اُردو کا صرف ایک شعر ملا ہے۔

یہ طفلِ اشک مرے جس گھڑی مچلتے ہیں :: تو پھر ہزار سنبھالو نہیں سنبھلتے ہیں

معشوق :۔ حیدری خانم نام اور معشوق تخلص تھا ۔فیض آباد کی رہنے والی تھیں صرف ایک شعر ملا ہے۔

پان کھا کے جو کہیں تھوک دیا اس گل نے :: رشکِ یاقوت بنے باغ کے کنکر پتھر

نظیر[1]: لکھنؤ کی ایک عفت مآب خاتون تھیں، زیادہ حال معلوم نہیں۔

کیا کہیں تم سے ہم کہ کیا ہیں ہم — پاکدامن ہیں پارسا ہیں ہم
تو جو اغیار کے پہلو میں یہاں رہتا ہے — مجھ پہ تنہائی میں پہروں خفقان رہتا ہے

ماہ:۔ منجھلی بیگم نام اور ماہ تخلص تھا۔ وطن لکھنؤ تھا۔ دو شعر ملے ہیں جن سے لکھنؤ کا رنگ صاف ظاہر ہے۔

گر مقابل عارضِ جاناں کے آکے دم آئے گل
شرم سے بلبل کو پھر ہرگز نہ منھ دکھلائے گل

کاکل ہیں مرے دل کو گرفتار کر چلے — کالی بلا سے ہائے مجھے مار کر چلے

کنیز:۔ کنیز فاطمہ نام اور کنیز تخلص تھا۔ آپ ایک تعلیمیافتہ اور خوش ذوق خاتون تھیں ۱۹۱۰ء ۱۳۰۷ھ میں متھرا ڈالی گنج میں رہتی تھیں۔

رضواں تری جنت مجھے درکار نہیں ہے — طیبہ کا ترے باغ میں اک خار نہیں ہے
سر پر جو ترا سایۂ دیوار نہیں ہے — شاہا مجھے فردوس بھی درکار نہیں ہے
کس دل میں تری حسرتِ دیدار نہیں ہے — خواہاں ترا کون اے شہِ ابرار نہیں ہے
یا شاہ ٹھکانا ہے مرا آپ کے ہاتھوں — بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے[2]

---

[1] آپ کا نام اذکار خواتین میں نظیر اور تذکرۃ الخواتین میں نظیرن لکھا ہے۔
[2] یہ مصرعہ میر انیس کا ہے۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے ایک نہایت دلدوز تصویر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

روشن ہیں چراغوں کی طرح داغِ محبت | تربت میں اندھیرا مری زنہار نہیں ہے
اس دل کو کہیں اہلِ وفا کہتے ہیں پتھر | جس دل میں ولائے شہ ابرار نہیں ہے

شریر:- مس میری فلورا سارکس نام اور شریر تخلص تھا۔ ان کا آگرہ سے تعلق تھا۔ جناب بزم اکبر آبادی کی صبیہ تھیں۔ ان کا سنہ پیدائش غالباً ۱۸۹۵ء سنہ ۱۲۹۱ھ ہے۔ ۱۹۱۱ء ۱۳۰۸ھ میں رامپور تھیں۔ اور مثنا صاحب بزم سکریٹری سے اصلاح لیتی تھیں۔ اسوقت عمر سولہ سال کی تھی۔ خوش مذاق اور خوش گو شاعرہ تھیں۔ رامپور میں ان کو اختر جہاں بیگم کا خطاب ملا تھا۔ اسی عمر میں نواب صاحب رامپور کی ایک غزل کو تضمین کیا تھا جو درج ذیل ہے۔

یہ جو ہے ملنے میں عار دیکھئے کب تک رہے | دشمنِ جاں وہ نگار دیکھئے کب تک رہے
قلب میں اس کے غبار دیکھئے کب تک رہے | ہم سے خفا ہے جو یار دیکھئے کب تک رہے

غیر کا یہ اعتبار دیکھئے کب تک رہے

[پچھلے صفحہ سے] اس واقعہ کی کھینچی ہے کہ شہدا کربلا کا قافلہ مدینہ سے روانہ ہونے کو ہے حضرت بی بی صغریٰ جانے کے لئے بیتاب ہیں مگر بوجہ علالت ان کو اجازت نہیں ملی ہے۔ لہذا بیکسی کے عالم میں وہ حضرت علی اصغر کو مخاطب کر کے اپنا دردِ دل کہتی ہیں۔ وہ بند جس میں اوپر والا مصرعہ آیا ہے یہ ہے:-

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی | تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی چپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی | رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے | تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

پہلو سے عاشق سے جب تم نے نکالا تھا دل ہم نے بھی اے لے لڑ پا خوب سنبھالا تھا دل
ہائے مگر کیا کریں جانے ہی والا تھا دل پہلے تڑپتا رہا نازوں کا پالا تھا دل
ہو گیا بے اختیار دیکھئے کب تک رہے

موسم گل کی بہار دیتی ہے کیا کیا مزے سارے درختوں نے بھی بدلے ہیں کپڑے نئے
شاخوں پہ پھر بلبلیں کرنے لگیں چہچہے غنچے چٹکنے لگے پھول مہکنے لگے
جوش پہ فصل بہار دیکھئے کب تک رہے

پہلے تو معلوم بھی مجھکو نہیں تھی یہ شے مست یکا یک ہوا بات نصیحت کی ہے
ایک نظر نے مگر کر دیا قصہ ہی طے آنکھیں تری دیکھکر پی ہی محبت کی مے
عشق کا ہم کو خمار دیکھئے کب تک رہے

قلب ہے بیکل بہاں آپ کا ملنا ہے دور رحم کی دیکھوں نظر کرتے ہیں کبتک حضور
ہو گیا اس کا یقیں مجھکو یہ اے رشک حور صدمۂ فرقت سے جان جائیگی اکدن ضرور
سینہ میں دل بیقرار دیکھئے کبتک رہے

ہو گئے جگر خون یاں آتے ہیں رنگ شباب رشک سے اغیار کے جل کے ہوا دل کباب
سر پہ ہے ناحق لیا ہجر بتاں کا عذاب عشق ہے ایسی بلا جل کے ہوا دل کباب
اپنے گلے کا یہ ہار دیکھئے کبتک رہے

مست ہیں سب بلبلیں باغ ہے پھولا پھلا سبزۂ تر نے جدا فرش ہے اپنا کیا
ساتھ ہو وہ غنچہ لب سیر کا جب ہے مزا آئی چمن میں بہار چلتی ہے باد صبا
شاخ کا گل ہے سنگھار دیکھئے کبتک رہے

سبز شجر دیکھکر خوش ہے ہر اک باغباں ایسا بھلا بار بار ملتا ہے موقع کہاں

دیکھنے کا باغ کے آج ہی کل ہی سماں حسن عروس بہار پھولوں کی نیرنگیاں

بلبل شیدا انتظار دیکھئے کبتک رہے

ہم کو نہیں اعتبار اس کے کسی قول کا دیکھو یہ تم اے شریر وہ نہیں باز آئیگا

دیکھتے ہو اس کی راہ جھوٹا ہے وہ پُر دغا وعدہ ہو ان کا وفا رشک تمھیں کیا ہوا

وصل کا یہ انتظار دیکھئے کبتک رہے

دَورِ حاضر

دورِ حاضر

(الف)

اختؔر:۔ محترمہ اختر بیگم قریشی بی-اے-بی-ٹی - دہلوی

محترمہ انور بشیر الدین، بی-اے-بی-ٹی نے محترمہ اختر قریشی بی-اے-بی-ٹی کے جو حالات رقم فرما کر ارسال کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

"محترمہ اختر قریشی بی-اے-بی-ٹی نے ایک نہایت ہی معزز، ممتاز اور روشن خیال خاندان میں ہوش سنبھالا۔ آپ کے والد ماجد دہلی میں محکمہ آثارِ قدیمہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اختر بیگم کی پیدائش دہلی ہی میں ہوئی۔ اور یہیں پلی بڑھیں۔ بچپن ہی سے آپ نہایت تیز طبع۔ ذہین اور خوش مزاج تھیں۔ چار سال کی عمر میں آپ کو قرآن شریف پڑھنے بٹھایا گیا۔ اور پانچویں سال اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں آپ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث ہمیشہ اپنی ہم جماعتوں میں ممتاز رہیں۔ اور ہر سال انعامات حاصل کرتی رہیں۔ اسکول کے جلسوں وغیرہ میں آپ ہمیشہ نظمیں سناتیں؛ تقریریں کرتیں جس کے باعث آپ طلباء اور اساتذہ دونوں میں ہر دلعزیز تھیں۔

مضمون نگاری، شاعری، اور تصویر کشی کا آپ کو بچپن سے بیحد شوق تھا۔ چنانچہ بچپن میں اپنی استعداد سے بڑھ کر مختلف موضوعات پر مضامین اور کہانیاں لکھا کرتیں اور اپنے ماموں، چچا اور والد کے دوستوں کو دکھا کر خراجِ تحسین حاصل کرتیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی سے آپ نے اور بھی زیادہ ترقی کی۔ اور اپنے فرصت کے اوقات میں اُردو اور انگریزی کے مضامین لکھتی رہتیں۔

دہلی کے کوئن میری گرلز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنیکے بعد آپ اندر پرستھ گرلز کالج میں داخل ہوگئیں۔ کالج کی فضا میں آپکے ذہنِ رسا نے خوب ترقی کی۔ درسی تعلیم کے علاوہ آپ اکسٹرا کریکیولر ایکٹیوٹیز[1] میں نمایاں حصہ لیتی رہیں۔ کالج میں داخل ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد آپکو مضمون نگاری کے انعامی مقابلے میں اول انعام ملا۔

چونکہ تقریر کرنے میں آپ کو ابتدا سے ملکہ حاصل ہے اسلئے کالج کے اُردو اور انگریزی مباحثوں میں آپ کا نام ہمیشہ رکھا جاتا۔ تقریر کی روانی اور جوش۔ بلند پروازی اور شستگی صاف اور بلند آواز جو ایک قابل مقرر کے اوصاف ہیں آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کو متعدد مرتبہ کالج سے نمائندہ بنا کر مباحثات میں حصہ لینے اور تقریریں کرنیکے لئے بھیجا گیا۔ جہاں آپنے اکثر میڈل اور انعامات حاصل کئے۔

---

[1] غیر نصابی مشاغل

علاوہ ازیں آپ کو سوشل جلسوں میں بھی تقاریر کرنے کیلئے بلایا جاتا ہے۔ انتظامی قابلیت آپ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کالج میں آپ اکثر مباحثات کی صدارت کرتیں اور کالج کے ایسوسی ایشن کی سکریٹری تھیں۔

بی۔اے پاس کرنیکے بعد آپ بی۔ٹی کرنیکے واسطے علیگڑھ ٹریننگ کالج میں داخل ہوئیں۔ وہاں آپنے ذہانت اور معلومات عامّہ کے امتحان میں اوّل انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ دہلی میں محکمۂ تعلیم کے فرائض انجام دینے پر مامور ہو گئیں۔

آپ کی تقریریں بارہا آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ زیادہ تر آپ اپنے پسندیدہ موضوع سائیکولوجی اور جدید طریقہ ہائے تعلیم اور خانہ داری کے امور پر روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم کے علاوہ آپ دستکاری میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل ایکزیبیشن۔ علیگڑھ میں آپنے بہترین دستکاری پر فرسٹ پرائز (ایک سونے کا تمغہ) حاصل کیا۔

فرصت کے اوقات میں انگریزی اور اردو میں مضامین اور افسانے لکھنا آپ کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ان مضامین کو شائع کرانا آپ کا مقصد نہیں۔ البتہ کبھی کبھی ادبی رسائل کی ایڈیٹر نہ کی

۱؎ انجمن ۲؎ نفسیات ۳؎ مسلم تعلیمی نمائش

خواہش پر آپ کے مضامین شائع بھی ہوجاتے ہیں۔

کتابوں سے آپ کو عشق ہے۔ آپکے پاس انگریزی اور اُردو کی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے۔

آپ شوقیہ طور پر انگریزی اور اُردو میں نظمیں بھی لکھتی ہیں۔ لیکن حد درجہ مشغولیت کے باعث آپ کو ادبی کاموں کی طرف توجہ کرنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملتا۔ حال ہی میں آپنے ایک ڈرامہ "نور" تصنیف کیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

آپ اپنی قوم کی سچی ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ اور مسلمان خواتین میں بیداری پیدا کرنے کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔

ان صفات کو دیکھتے ہوئے قوی امید کی جاسکتی ہے کہ آپ ایک روز آسمانِ ادب پر درخشندہ ستارے کی مانند چمکیں گی۔ اور آپ کے علمی و ادبی کارناموں کی بناء پر قوم آپ کی ہستی پر فخر کریگی"۔

آپ اختر شیرانی کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں، کلام میں جذبات کی ترجمانی و رنگینی ہے، آپکے نغمے رومان پرور فضاؤں میں بہتے نظر آتے ہیں، طرزِ ادا صاف ہے گو اس میں ابھی پختگی نہیں لیکن اگر مشقِ سخن جاری رہی اور آپ برابر کہتی رہیں تو اُردو کی ایک اچھی شاعرہ ثابت ہوں گی۔

ذیل کا کلام خود محترمہ اختر قریشی کا انتخاب ہے جو آپنے ازراہِ عنایت اس تذکرہ کیلئے ارسال فرمایا ہے:۔

بھولے فسانے

مری ناکامیاں جب میرے دل کو توڑ دیتی ہیں
مری دلسوز اُمیدیں مجھے جب چھوڑ دیتی ہیں
مری بربادیاں جب آس میری توڑ دیتی ہیں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

بساطِ آسماں پر ماہِ روشن جب دمکتا ہے
ستاروں کا منور عکس پانی پر چمکتا ہے
تمنّاؤں کا شعلہ میرے سینے میں بھڑکتا ہے
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

کبھی محشر بپا کرتی ہیں موجیں آبشاروں میں
کبھی میرا گذر ہوتا ہے اونچے کوہساروں میں
کبھی جب کوکتی کوئل ہے دلکش شاخساروں میں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

جب آدھی رات کو سارا جہاں خاموش ہوتا ہے
فضا کا ذرہ ذرہ نیند سے مدہوش ہوتا ہے
ترا دلکش تصوّر جب عدوئے ہوش ہوتا ہے

دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

صبا کے چھیڑنے سے پھول جبدم مسکراتے ہیں
طیورِ خوش نوا جب گلستاں میں گیت گاتے ہیں
خیالاتِ پریشاں مجھکو اشکِ خوں رلاتے ہیں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

خیالِ عیش رفتہ اب تو ماضی کا فسانہ ہے
مگر پیشِ نظر اب بھی وہی رنگیں زمانہ ہے
وہی تیرا تصور اور الفت کا ترانہ ہے
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

گذشتہ راحتوں کی داستانیں مجھ سے مت پوچھو
مری مبہم خلش ہا کاوشوں کو مجھ سے مت پوچھو
تصور کس کا ہے اختر بس اس کو مجھ سے مت پوچھو
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

حمیرا کی یاد میں

——:(جواب دنیا میں نہیں ہے):——

دلِ غمگیں میں تصور ہے ترا شام و سحر
شب کو خوابوں میں مرے تو ہی نظر آتی ہے

تیرا پیکر ہے نہاں خندۂ گل میں شاید
تو مجھے کلیوں کی نکہت میں نظر آتی ہے
یا کہ تاروں میں چھپی بیٹھی ہے دنیا سے پرے
یا تو گھنگھور گھٹاؤں کی خبر لاتی ہے
ہے تصوّر میں مرے پیکرِ نورانی ترا
تو مجھے چاند کے ہالے میں نظر آتی ہے
یا کہ تو خوشۂ پروین میں روپوش ہوئی
چھپ کہاں جاتی ہے تو؟ جب کہ سحر آتی ہے
دلِ مہجور کی تسکین کو آ رشکِ قمر
آ کہ دنیا مجھے تاریک نظر آتی ہے[1]

---

[1] مؤلف احقر

"کسی تصوّرِ نرگس سے"

(۱)

خمارِ خواب سے تارے بھی اونگھتے تھے جب
کسی تصوّرِ نرگس سے گفتگو کی ہے
وفورِ کیف سے غنچے بھی جھومتے تھے جب
کسی کے روئے نگاہوں کی جستجو کی ہے

(۲)

کسی کی آنکھوں سے بہتی ہوئی بہاروں کو
چمن میں نرگسِ بیمار نے بھی دیکھا ہے
کسی کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے ستاروں کو
سحر کے تارۂ بیدار نے بھی دیکھا ہے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

مُطربہ [۱]

آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا
ہو چلی ہے کیا سہانی اب فضا
اس سہانی رُت میں تو اے مطربہ
دکھ بھرے لہجے میں کوئی گیت گا

[بقیہ پچھلے صفحہ سے]

(۳)
ترے خیال سے برسوں رہا ہوں گرم سخن
کبھی کبھی تو ستاروں سے گفتگو کی ہے
کبھی بہ بزمِ فلک، گاہ در بہارِ چمن
کہاں کہاں نہ تری میں نے جستجو کی ہے

(۴)
کبھی تو پوچھ تباہی کا میری افسانہ
کبھی تو حالتِ دل آ کے پوچھ بے دل سے
تری ہی یاد سے وابستہ ہے وہ دیوانہ
کہ جس کی یاد کو تو نے بھلا دیا دل سے

"ج"

---

[۱] خان صابر خلیلی کی نظم "مطربہ" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

وہ مہرِ عالمتاب چھپا
لو شام نے خیمہ تان دیا
اور ذرّہ ذرّہ عالم کا
ظلمت کی اوڑھ رہا ہے ردا
خاموشی کا ہے رنگ جما
ہر جانب ہے اک سناٹا
خوابیدہ ہے فطرت اس کو
ٹھوکر سے لَے کی جگا رے جا
اے مطربہ ساز بجا رے جا

وقت دیتا ہے تجھے پیغامِ جوش
اس جہاں پر چھا گیا ہے کیف سا
اس تغیّر سے تو ہو کے بے خبر
چھیڑ سازِ درد دھیمے سُر میں گا

آنئی برسات ہم مل کر منائیں
دل پہ میرے چھا گئی غم کی گھٹا
میں پھوہار اشکوں کی برساؤں اگر
بجلیاں آنکھوں سے اپنی تو گرا

میرے دل کی ہے کسی کو کیا خبر
کوئی سمجھے دل کا میرے راز کیا
کوئی جانے کیا کہ کیوں ہوں نوحہ گر
مطربہ للّٰلہ غمگیں لے میں گا

[پچھلے صفحہ سے]

ترے ساز میں ہیں کیا کیا نغمے
سر تا سر سوز فزا نغمے
پُرشور و تلاطم زا نغمے
آفت ہیں ہوش رُبا نغمے
دلکش بنیرنگ نما نغمے
کرتے ہیں حشر بپا نغمے

دریائے الست کی طغیانی میں
روح کو خوب بہائے جا

.... اے مطربہ ساز بجائے جا

اب ہم کو سنا دلچسپ نوا
ہاں چھیڑ کوئی نغمہ ایسا
جو سوز و اثر میں ہو ڈوبا
جو بجلیوں کا ہو گہوارہ
تن من میں دے اک آگ لگا
ہستی کا دے سب ساز جلا

سرد آہوں کا مری ہے کیا سبب؟ کھوئے سے رہنے کی آخر وجہ کیا؟
کیوں پریشانی سی ہے شام و سحر ؟
کیوں خلش سی دل میں رہتی ہے سدا؟
کاش سمجھے مطربہ تو دل کا راز کاش پوری کر دے میری التجا
کانپتے ہاتھوں سے بربط تھام کر
سوز کی اک شمع ہر دل میں جلا
چھیڑ دے اس دم برہ کا کوئی راگ ٹھیک ہے ہاں بس ابھی آئے میں ذرا
ڈال شانوں پر تو زلفیں کھول کر
انکھڑیوں کے جام بھی چھلکائے جا

[پچھلے صفحہ سے] جو آگ تو اہیں مضمر ہے
بھڑکائے جا بھڑکائے جا

.... اے مطربہ ساز بجائے جا

ہے چشم قیامت ساز تری ہے کاکل سحر نواز تری
جادو سے نگاہِ ناز تری نیرنگ نوائے راز تری
پُر افسوں ہے آواز تری لے تیری اے غماز تری
اس آتشیں لے میں گائے جا
تڑپائے جا، تڑپائے جا
.... اے مطربہ ساز بجائے جا

(بہارِ جاوداں مطبوعہ پنجاب اکاڈمی ۱۹۳۷ء صـ۱۱۶ تا صـ۱۲۱)

پھونک دے ہستی کو میری سوز سے
سرمدی لَے سے مجھے بیخود بنا

روح میری مطربہ بیدار کر
جوش سے پھر میں بھی ہوں نغمہ سرا

ساز اور آواز دونوں ساتھ ہوں
مطربہ اختر ہوں دونوں ہم نوا

دکھ بھرے لہجے میں گائیں گیت پھر
جیسے لہراتی ہے متوالی گھٹا

کسی سے

یہ ناممکن جفاؤں سے تری مایوس ہو جاؤں
یہ ناممکن کہ ناکامی سے میں مانوس ہو جاؤں
تری بے اعتنائی مجھ کو برہم کر نہیں سکتی
مری آزاد فطرت غم سے سر خم کر نہیں سکتی
یہ تیری بے رُخی بھی باعثِ وحشت نہیں ہوتی
تری یہ فتنہ انگیزی ، کلفت نہیں ہوتی
تری وابستگی کی غیر سے پرواہ نہیں مجھ کو
تری اس بیوفائی کا ذرا شکوہ نہیں مجھ کو
نہ مجنوں کی طرح صحرا نوردی پر ہوں آمادہ

نہ میں دشت و بیاباں کا نہ تنہائی کی دلدادہ
مرے نزدیک تیشہ مار کر مرنا نہیں بہتر
ہیں راہِ عشق میں فرہاد کی طرح نہیں ہتر
جنونِ عشق میں فریاد کرنے سے بھی کیا حاصل؟
خود اپنی زیست کو برباد کرنے سے بھی کیا حاصل؟

ہوائیں جب بہار و کیف سے لبریز ہوتی ہیں
فضائیں جب مرا صبر و سکون و ہوش کھوتی ہیں
جہاں جب چاندنی میں نور سے معمور ہوتا ہے
زمیں کا ذرّہ ذرّہ نیند سے مخمور ہوتا ہے
مری ننھی سی کشتی نقرئی لہروں پہ بہتی ہے
شراب و شعر میں جب روح میری کھوئی رہتی ہے
ترا دل کش تصوّر ہے میرے پیشِ نظر ہر دم
تری رعنائیوں کی یاد ہے شام و سحر ہر دم
تخیّل میں مرے ہر دم ہے تو گو دور ہے مجھ سے
مرے خوابوں کی جنّت ہے کہ پھر بھی دور ہے مجھ سے
مری ہستی کا مقصد تو مری روحِ رواں تو ہے
مرے دل پر عیاں ہے پھر بھی آنکھوں سے نہاں تو ہے
میں چپکے چپکے تیرا نام لے کر آہ بھرتی ہوں

فسوں آمیز تنہائی میں شب کی یاد کرتی ہوں
چمکتی نقرئی لہریں منوّر چاند اور تارے
تلاطم خیز موجیں، شوخ کلیاں اور شجر سارے
کہیں ایسا نہ ہو، ان پر عیاں ہو رازِ الفت کا
میں ڈرتی ہوں نہ چھڑ جائے کہیں یہ سازِ الفت کا
تمنّا ہے یہی اخترؔ کہ خاموشی سے جل جاؤں
مجسّم عشق بن جاؤں میں شمع بن کے جل جاؤں

اخترؔ - محترمہ ح، بیگم اختر صدیقی

آپ سندیلہ کی رہنے والی ایک حنفی المذہب، پردہ نشین خاتون ہیں، آپ زیادہ تر غزلیں لکھتی ہیں۔ خاتونِ مشرق اور عصمت وغیرہ میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے، کلام کا رنگ بہت صاف ہے۔ آپ کے اشعار میں سادگی سلاست اور روانی موجود ہے۔

غزل

بار بار اعتبار کرتے ہیں — تجربہ ایک بار کرتے ہیں
جو گنہ بے شمار کرتے ہیں — رحمتیں آشکار کرتے ہیں
جب نظر سوئے یار کرتے ہیں — آنکھوں آنکھوں میں پیار کرتے ہیں
جھوٹے وعدے ہزار کرتے ہیں — ہم یقیں بار بار کرتے ہیں

ہجر میں ذکرِ یار کرتے ہیں — یوں خزاں کو بہار کرتے ہیں

دیکھ کر حسنِ بے نقاب ان کا — سجدے بے اختیار کرتے ہیں

جن کو ہے ناز تیری رحمت پر — عصیاں لیل و نہار کرتے ہیں

وہ رہیں خوش یہ ہے دعا میری — جو مجھے بیقرار کرتے ہیں

کیا غرض ہم کو دیر و کعبے سے — سجدہ ہم سوئے یار کرتے ہیں

فرق باقی نہیں من و تو کا — اپنی ہستی کو پیار کرتے ہیں

شمع پر مر رہے ہیں پروانے — یوں فدا جانِ زار کرتے ہیں

سوئے در آنکھیں گوش بر آواز — اُن کا یوں انتظار کرتے ہیں

ان کے تیروں کا زخمی ہے جگر — شکریہ بار بار کرتے ہیں

اب بھی آ جا کہ دم ہے آنکھوں میں — نزع میں انتظار کرتے ہیں

غم مناتے ہیں مرگِ دشمن کا — وہ مجھے سوگوار کرتے ہیں

گریہ سے کشتِ دل ہوئی شاداب — ہم خزاں کو بہار کرتے ہیں

آپ اپنے پہ رشک آتا ہے — کہ تمنائے یار کرتے ہیں

جان دیتے ہیں ہجر میں اختر
لیجئے اختصار کرتے ہیں

اختر - محترمہ سیّدہ سردار بیگم

سیّدہ سردار بیگم نام اور اختر تخلص ہے۔ آپ اپنے آپ کو حیدر آبادی لکھتی ہیں، سکونت زیادہ تر کانپور رہتی ہے۔ آپ خان بہادر شیخ عبدالغنی صاحب گورنمنٹ آرمی کنٹریکٹر رئیس نصیر آباد کی زوجہ ہیں۔

سیّدہ سردار اختر صاحبہ کو اُردو ادب سے ایک گہرا لگاؤ ہے، آپ اُردو کی ایک قابلِ قدر ادیبہ، زبردست مقررہ اور نہایت خوش گو شاعرہ ہیں؛ ادب کے علاوہ آپ کو سیاسیات سے بھی گہری دلچسپی ہے اور آپ کی زندگی زیادہ تر قومی خدمات میں صرف ہوتی ہے، مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں آپ کی تقریر سے متاثر ہو کر مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے آپ کو خطیبۂ ہند کا خطاب دیا تھا۔ جو اب عموماً آپ کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے آپ یو۔پی سول ڈفینس کاؤنسل کی میمبر بھی ہیں۔ کلام اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

محترمہ سیّدہ سردار اختر دورِ حاضر کی ایک نہایت زبردست اور گرامی قدر شاعرہ ہیں، آپ نے ادب کی افادی حیثیت کو سمجھ لیا ہے اور شاعری سے پیغام و اصلاح کا کام لیا ہے۔ آپ کے کلام پر علامہ اقبالؒ کا بہت اثر پڑا ہے اور اس رنگ کی نہایت کامیاب اور پختہ مثالیں آپ نے پیش کی ہیں، علّامہ اقبالؒ کی طرح آپ بھی "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کی قائل ہیں، آپ اسلامی و مشرقی تہذیب و معاشرت کی مبلّغ ہیں اور مغرب کی حیاسوز

معاشرت کو قابلِ نفرت سمجھتی ہیں۔ آپ نے اپنی مشرقی بہنوں کو اس کی مفاہمت دلدوز تعلیم اپنے کلام کے ذریعہ دی ہے۔ تبلیغ و تعلیم دراصل روحِ شاعری کے منافی ہے مگر آپ کے یہاں اس قدر شاعرانہ لطافت موجود ہے کہ یہ تلقین و ہدایت بجائے گراں گزرنے کے بہت دلکش ہو گئی ہے اور اس سے نفسِ شاعری کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اس رنگ میں آپ نے جس پایہ کا کلام پیش کیا ہے اس کی مثالیں نہ صرف اُردو شاعرات میں، بلکہ خود اُردو شاعری میں ابھی کمیاب ہیں۔ آپ کے کلام میں بڑی زندگی اور صداقت ہے زندگی پر آپ کی نظریں ناقدانہ پڑتی ہیں۔ آپ نے زندگی کے حسن و قبح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے جذبات میں بہت گہرائی متانت اور سنجیدگی ہے۔

آپ کے یہاں قوم و ملّت کی محبّت بھی موجود ہے اور حبِ ملک و وطن بھی! کیف و اثر، جذبات کی گہرائی، اور صداقت آمیز ترجمانی سے پیدا ہوتا ہے، اور محترمہ کے کلام میں اس کی بھی بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں، علوِ خیال، نفاستِ جذبات اور جوشِ کلام محترمہ کے خاص جوہر ہیں۔ جوشِ کلام دراصل دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تو بڑے بڑے اور پُرشوکت الفاظ سے پیدا کیا جاتا ہے اور دوسرا جذبات کی شدّت اور طبیعت کے جوش سے پیدا ہوتا ہے پہلی قسم کا جوش ایک مصنوعی جوش ہے جس کا اثر سطحی ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا جوش جو صحیح معنوں میں جوش ہے پہلی قسم سے نسبتاً زیادہ مشکل، زیادہ موثر اور زیادہ پائندہ ہوتا ہے، محترمہ کے کلام میں سچّے جوش کی عمدہ مثالیں

موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "وطن کا سپاہی" پیش کی جا سکتی ہے۔
ساتھ ہی ساتھ مخترمہ غزل سے محترز یا متنفر نہیں۔ آپ نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ گو آپ کی غزلیں اتنی بلند نہیں جتنی آپ کی نظمیں ہیں۔ آپ کی ہستی پر اُردو شاعرات کی دنیا بجا طور پہ ناز کر سکتی ہے۔

سنگاپور میں ایک مسلم دوشیزہ کو محوِ رقص دیکھکر

حسن کی عریانیاں، باعثِ فخر و کمال
عظمتِ انسانیت آہ یہ تیرا زوال

کاش کہ ملتا مجھے جلوۂ ماضی ترا
آہ، ودیعت ہوا مجھکو ترا عہدِ حال

سنگ خرد، بارِ عقل، ہو ہی گیا کامیاب
آہی گیا آخرش شیشۂ ہستی میں بال

کتنی اداؤں کے ساتھ آج ہے محوِ خرام
گردنِ اخلاق پر خنجرِ تہذیبِ حال

جلوۂ افرنگ کی آہ یہ افسوں گری
کل کہ جو شے تھی حرام آج وہ شے ہی حلال

حسن کہاں، حسن کا صرف ہے وہم و فریب
عشق نہیں، عشق کا صرف ہے اک اختلال

حسن میں ہے اب کہاں دلکشی و زندگی
پست ہی ذوقِ نظر، مردہ ہی ذوقِ جمال

عشق کو افسوس ہے حسن کی تقدیر پر
ایک نگاہِ ہوس قیمتِ نازو جمال

سازِ رم ذوق میں بربطِ پرشوق میں
اب نہ سرودِ نیاز، اب نہ فغانِ بلالؓ

پی کے مئے مغربی ہو نہ بہت جوش میں
ہوش میں آ، ہوش میں، تیرا نہیں یہ کمال

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ آہ!
موت سے پہلے ترا سانحۂ انتقال

نذرِ ہوس بار بار، شوقِ نظر کامیاب
آہ لٹے اس طرح دولتِ حُسن و شباب

جلوۂ عریاں نہیں ذوقِ نظر کے لئے — حُسن جسے کہتے ہیں وہ تو ہی زیرِ نقاب

حُسن کا مرکز ہے عشق، حسن کا مظہر ہے عشق — کیسا تر و تازہ ہے شاخ میں اپنی گلاب

عشق کا آئین اور، حسن کا آئین اور ہے — اس کو تبسم گناہ، اس کو تبسم ثواب

کس کی نظر کھا گئی کس کی ادا لے اڑی — عشق کا خونیں جگر، حسن کا رنگیں نقاب

نغمۂ حاضر سے ہے قلب پریشاں بہت — مطربِ ماضی شوق چھیڑ دے اپنا رباب

ہے مرا خواب نمو، نغمۂ اللہ ہو — اور مری آرزو زندگی اضطراب

خود کو بھی ہشیار کر، مجھ کو بھی ہشیار دیکھ — اشہد ان لا الٰہ ہے مری تعبیر خواب

اشہد ان لا الٰہ، میری نواؤں میں ہے[1]

میری نواؤں میں ہے میری اداؤں میں ہے

حق سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز — مجھ کو سنا دیجئے پھر وہ نوائے راز

ذوقِ طلب ہے تو پھر سود و زیاں سے گزر — راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز

آ ہی گئی تھی آج نیند سنگِ درِ یار پر — بیخودیٔ آرزو، عمر ہو تیری دراز

پھر دلِ بیتاب کو چاہیے سوز و گداز — مطربِ آتش نفس چھیڑ دے اب اپنا ساز

کہہ چکے سب حالِ دل بارگہِ دوست میں

اخترِ خاموش چھیڑ، تو بھی حدیثِ نیاز

---

[1] علامہ اقبالؒ سے — شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے (بالِ جبریل)

تحفۂ علم

علم کے میخانہ میں ہو میگسارِ زندگی
علم ہے اک جاوداں کیف و خمارِ زندگی

علم سے قوموں کا بنتا ہے مزاجِ ارتقا
علم ہے اک نعمتِ پروردگارِ زندگی

علم سے کھلتی ہیں کلیاں آرزو و شوق کی
علم ہے اک مژدۂ فصلِ بہارِ زندگی

علم کر دیتا ہے قوموں کو جہاں میں سر بلند
علم ہے اک جادۂ عز و وقارِ زندگی

آج جو قومیں حصولِ علم سے ہیں فیضیاب
عہدِ حاضر میں وہی ہیں تاج دارِ زندگی

علم نے آکر بنایا مقصدِ درد حیات
علم سے پہلے کسے تھا اعتبارِ زندگی

ہند کی اے صنفِ نازک آشنائے علم بن
ہر ادائے علم ہے آئینہ دارِ زندگی

علم اگر تجھ میں نہیں تو زندگانی بھی نہیں
خواستگارِ علم ہو اے خواستگارِ زندگی

ناشناسِ علم! کیوں تیری نظر محدود ہے
علم تو انسانیت کا اولیں مقصود ہے

کھول آنکھیں کر خدارا اپنی ہستی پر نظر
کس قدر محدود ظلمت میں ہے تیرے شام و سحر

تجھ میں ذوقِ علم کی کوئی تڑپ باقی نہیں
کس قدر چھایا ہے تیرے جہل کا گہرا اثر

تیرے گلشن میں نہیں تہذیبِ رفتہ کی بہار
تیرے دامن میں نہیں ہے عہدِ حاضر کا ثمر

منزلِ مقصود کو دنیا نے حاصل کر لیا
اور تو اب تک گرفتارِ فریبِ رہگذر

ہوشیار اے بادہ نوشِ جہل پیہم ہوشیار
چونک خوابِ بے حسی سے اے اسیرِ بامِ و در

تیرے جلووں سے کبھی تھا بزمِ مشرق کو فروغ
کیوں بجھا دی تو نے اپنی مشعلِ علم و ہنر

کھو دیا افسوس تو نے عزمِ سیتا کا خروش
رضیہ و سلطانہ کا تجھ میں نہیں جوش و اثر

اپنے اوپر رحم کر بیدار ہو، بیدار ہو　　تیرا شیرازہ نہ ہو جائے کہیں زیر و زبر
تیری بیداری کلیدِ قفلِ بابِ ہند ہے
تو جمالِ ایشیا ہے آفتابِ ہند ہے

وطن کا سپاہی

بصد ناز و تمکیں، بصد کجکلاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی
وطن جس کا ایماں، وطن جس کا پیارا　　وطن کے مقدر کا روشن ستارا
جواں بازوؤں پر ردا پارہ پارہ　　جبیں سے نمایاں مگر نورِ شاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی
وہ تھرا اُٹھی ظلم و طاقت کی دنیا　　وہ گھبرا اُٹھی کبر و نخوت کی دنیا
وہ گرما اُٹھی عزم و ہمت کی دنیا　　وہ لہرا اُٹھا پرچمِ بے گناہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی
صبا دل کشائے چمن ہو رہی ہے　　کلی آج گرمِ سخن ہو رہی ہے
منور فضائے وطن ہو رہی ہے　　مبارک فروغِ مہِ نیم ماہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی
بہن کی خموش التجاؤں کو لے کر　　پریشاں دلہن کی وفاؤں کو لے کر
دلِ افگار ماں کی دعاؤں کو لے کر　　رواں بحرِ ہمت میں ہے مثلِ ماہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

نہ رتبہ کی خواہش، نہ شہرت کا طالب　　نہ زر کی تمنا، نہ دولت کا طالب
محبت کا بندہ، محبت کا طالب　　ز سرتا قدم مژدۂ خیر خواہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

ہر اندیشہ رخصت، ہر اندیشہ باطل　　خوشا عزم راسخ، زہے شوقِ کامل
تصدق ہر اک گام ہمت پہ منزل　　سلامت یہ رہرو، مبارک یہ راہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

شجاعت نے پایا حضورِ شجاعت　　شجاعت کو آیا سرورِ شجاعت
وہ چمکا فضاؤں میں نورِ شجاعت　　وہ چھٹنے لگی بزدلی کی سیاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

جفا کیا ہے روحِ جفا کانپتی ہے　　خوشا ابتدا، انتہا کانپتی ہے
زمیں کانپتی ہے، فضا کانپتی ہے　　عدو کی صفوں میں مچی ہے تباہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

عزائم کی تصویر، ہمت کا پیکر　　نظر جوہرِ تیغ کے آئینے پر
ہر اہلِ وطن کو مبارک ہو اختر　　وطن کی محبت کی "زندہ گواہی"
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

شاعرہ کی دعاء

نشاطِ کیفِ غلامی سے بے نیاز کرے　　مرے وطن کو خدا حریت نواز کرے
حیاتِ قوم کے معنی ہیں ہستیِ شاعر　　خدا کچھ اور مری عمر کو دراز کرے

سرورِ شوق سے سینہ ہو جا اک سینۂ گل
کلی بھی آنکھ کو گلشن میں نیم باز کرے

چمن تو کیا ہے زمانہ کی آنکھ کھل جائے
مری نوا کو کہاں تک اثر نواز کرے

ابھی نہیں ہے کوئی سوزِ نغمہ سے آگاہ
کچھ اور سینۂ ہندوستاں گداز کرے

شفا مآب ہوں بیمارِ بےحسی وجمود
مرا سخن اثرِ کار چارہ ساز کرے

مری نوا ہی کے پردے میں مطربِ کونین
وہ نغمہ چھیڑ مری شعریت بھی ناز کرے

ہوں اہلِ شوق کو اُس سے بصیرتیں حاصل
مری نگاہ جو کچھ انکشافِ راز کرے

ہر ایک دستِ طلب یوں بڑھے کہ اپنے لئے
درِ کمالِ سعادت کو پھر سے باز کرے

ہر ایک زبان پہ شورِ انا کے نغمے ہوں
جو دل ہو عظمتِ دار و رسن پہ ناز کرے

وہ مجھ کو بخشدے سوزِ دروں کہ جو اک دن
چراغِ خانۂ غربت کو شعلہ ساز کرے

جبینِ غزنوی جھک جائے میرے قدموں تک
جہاں میں بادشہی عظمتِ ایاز کرے

مری صدا میں ہو وہ مستیٔ اذانِ سحر
ہر ایک ذرے کو جو بیخود نماز کرے

نفس نفس کو مرے دے وہ جذبِ شوق کہ جو
نگاہِ قوم کا رخ جانبِ حجاز کرے

عجب نہیں کہ دعا سُن لے میری اے اختر
درِ قبول خدا مجھ پہ آج باز کرے

غمِ دوست

اے غمِ دوست بتاؤں تری قیمت کیا ہے
تو سلامت ہے تو پھر مجھکو ضرورت کیا ہے

عمر گذری اسی احساسِ محبت میں مگر
آج تک پھر بھی نہ سمجھے کہ محبت کیا ہے

سرِ سجدہ درِ میخانہ پہ ہو جا اختر
اور اربابِ محبت کی شریعت کیا ہے

مری ہے اور اختر آرزو کیا

کسی کھوئے ہوئے کی جستجو کیا
کسی بچھڑے ہوئے کی آرزو کیا
ترے رخسارِ رنگیں کے مقابل
گل و گلزار میں ہے رنگ و بو کیا
نمازِ عاشقاں ہیں اے عزیزو
تیمم کس کو کہتے ہیں، وضو کیا
نہ آئے آج تک تو روزِ محشر
وہ آئیں گے ہمارے روبرو کیا
پہنچ جاؤں شہِ لولاک کے پاس
مری ہے اور اختر آرزو کیا

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سہی مگر
بیخودیِ سیرِ کائنات اپنی طرف بھی اک نظر
انکی بھی آنکھ ہو گئی جوشِ الم سے آج تر
میں نے اٹھائی کیوں نگاہ عالمِ درد میں اُدھر
یوں نہ پہنچ سکیگا تو انکی حریمِ ناز میں
عشق کی تیغِ تیز سے عقل سے پہلے جنگ کر
شکل حسیں دکھائے جا پردۂ درمیاں اٹھا
شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر
میرے تمیزِ شوق کو ایک زمانہ چاہئے
تیرا لہو ابھی ہے سرد میری نوا ہے گرم تر
آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے
وہ ہیں کہ مجھسے بے نیاز اور میں انسے بیخبر
تیری ہی فغاں نے کر دیا سینۂ گل کو چاک چاک
اختر خوش نوا خموش، اختر خوش نوا ٹھہر

اختر۔ محترمہ م۔ج بیگم

م۔ج بیگم نام اور اختر تخلص ہے۔ آپ گورکھپور کی رہنے والی ہیں۔
کلام کا رنگ پختہ ہے۔ اشعار نہایت پُرکیف و پُراثر ہیں۔

اوڑھائی کیوں رنگ و بو کی چادر فریب ہستی نے آدمی کو
جب اس کی محدود ہو چکی حد، تو خاک حاصل ہو زندگی کو

میں اپنے ذوقِ خدا پرستی کو ایسے مرکز پہ لا رہی ہوں
جہاں نہ دیر و حرم کے بندے ذلیل کرتے ہوں بندگی کو

قسم ہے ذوق عمل کی تجھکو، قدم بڑھا اضطراب ہستی
خلش طلب کی نہیں ہے جس میں وہ خاک پائیگا زندگی کو

چراغ ہستی جلا رہی ہوں، ہوا کی تیزی کا ڈر نہیں ہے
کہ میرا ذوقِ یقیں بجھانے نہ دیگا محفل کی روشنی کو

نظر میں کوئی سما رہا ہے، تمام ہستی پہ چھا رہا ہے
چھپے چھپے لُٹ رہی ہوں اختر بچاؤں کیسے میں زندگی کو

ادا۔ محترمہ عزیز جہاں

اُردو کی اس ممتاز اور گرامی قدر شاعرہ نے بدایوں کی ادب پرور فضاؤں
میں آنکھ کھولی ہے آپ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن مسز بی۔حق نے
ارسال فرمائے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

عزیز جہاں بیگم نام اور اَدا تخلص ہے۔ قاضی بدرالحسن مرحوم (سپرنٹنڈنٹ محکمۂ زراعت) بدایونی کی تیسری صاحبزادی ہیں۔ تاریخ پیدائش اگست ۱۹۲۴ء ہے۔ شاعرہ ابھی دنیا کی قید و بند سے آزاد ہے باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ ماں کی قابل تربیت نے گھر پر تعلیم دلا کر ۱۹۴۰ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کروایا۔ اردو کے مضمون میں امتیاز خصوصی حاصل کیا۔ آجکل فارسی اور ہندی سے شوق ہے۔

شاعری کی عمر پانچ سال ہے۔ ۱۹۳۹ء تک جناب اختر شیرانی سے استفادہ کیا۔ پھر حضرت جعفر علیخاں آثر لکھنوی سے اصلاح لی اور ان کے کشمیر چلے جانے کے بعد بھی ان کا دامن نہ چھوڑا۔ بالآخر ۱۹۴۱ء میں آثر صاحب نے فرمایا "بیٹی اب تمھیں اصلاح کی ضرورت نہیں" (مسز بی۔ حق)

یہ نوخیز و نودمیدہ کلی آبروئے گلستاں ہے، اس نوعمر گرامی قدر شاعرہ کی ہستی پر اُردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

محترمہ اَدا کے یہاں روح شاعری صحیح معنوں میں جلوہ گر ہے، شاعری قافیہ پیمائی، اور انتخابِ الفاظ کا نام نہیں، شاعری نظم و غزل، قصیدہ و مثنوی کا نام نہیں۔ شاعری نام ہے ترجمانیٔ جذبات کا، اور محترمہ اَدا کے یہاں ذاتی اور شخصی طور پر محسوس کیئے ہوئے نہایت شدید جذبات کا ایک سمندر ہے جو موجیں مارتا نظر آتا ہے جس نے آپ کے کلام کو اس قدر پُر تاثیر، اس قدر دلدوز، اور اس قدر لطیف بنا دیا ہے کہ اُردو شاعری میں اس کی مثالیں ابھی شاذ ہیں، اور اس سلسلہ میں آپ نے اس قدر پختہ آرٹ کی

مثالیں پیش کی ہیں کہ آپ کو حیاتِ انسانی کے جذبۂ لطیف کی شاعرہ کہا جا سکتا ہے۔

محترمہ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے' جذبات کی صحیح ترجمانی کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب دنیائے ادب کا ایک نہایت مشکل مرحلہ ہے' اور محترمہ اس میں بطورِ احسن کامیاب ہیں' آپ کی زبان میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے' اس میں بڑی سلاست و شستگی' بڑی صفائی اور روانی موجود ہے' بعض بعض جگہ محترمہ اساتذۂ سلف کی طرح تکرارِ الفاظ سے بڑا کیف و لطف پیدا کر دیتی ہیں اور اس تکرار سے جذبات میں بڑی شدّت اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تکرار وجدانی اعتبار سے شعر کو بہت بلند اور پُر اثر بنا دیتی ہے اس کی اکثر عمدہ مثالیں محترمہ کی نظم "خیر مقدم" میں موجود ہیں تشبیہات و استعارات پر محترمہ کو بڑی قدرت حاصل ہے آپ کی تشبیہات نادر' لطیف اور پُر کیف ہوتی ہیں ان میں بڑی تازگی اور شاعرانہ نازک خیالی موجود ہے' اس قسم کی کچھ اچھی مثالیں آپ کی نظمیں 'کرمکِ شب تاب' 'جھیل' - 'بہار کا پہلا پھول' وغیرہ ہیں۔

منظر نگاری میں انسانی جذبات کی کامیاب آمیزش محاکات کا ایک کارنامہ ہے۔ اور محترمہ کے یہاں اس قسم کی بھی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں اس سلسلہ میں آپ کی نظم "جوہی کی کلیاں" پیش کی جا سکتی ہے۔

محترمہ کے کلام پر سب سے زیادہ اور سب سے گہرا اثر اختر شیرانی کا پایا جاتا ہے' آپ کے نغمے رومان پرور' اور رومان انگیز کیفیات سے معمول ہیں'

محترمہ نے اس رنگ کی اس قدر پختہ اور کامیاب مثالیں پیش کی ہیں کہ ان کا حریف تلاش کرنا مشکل ہے۔ اختر شیرانی کے علاوہ آپ آثر لکھنوی کے رنگ سے بھی متاثر ہوئی ہیں اور کلام میں اکثر آثر کی تاثیر اور سادگی کے نمونے موجود ہیں۔ کہیں کہیں علامہ اقبالؒ کے رنگ کی بھی جھلک آپ کے یہاں ملتی ہے۔ آپ شاعرات حاضرہ کی صف اوّل میں ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

سطور ذیل میں محترمہ کے کلام کا جو انتخاب ہے اس میں "خیر مقدم" "یادِ ماضی"۔ غزل:۔"جوش کہاں تڑپ کہاں لذّتِ جستجو کہاں"۔ "پروین کے نام" "احساسِ اوّلیں" "بہار کا پہلا پھول"۔ "جھیل"۔ "تعبیر تو"۔ "کرمکِ شب تاب" خود محترمہ آدا کا انتخاب ہے۔ جو انھوں نے اس کتاب کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ بقیہ کلام راقم السطور کا انتخاب ہے۔

"خیر مقدم"!

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کئے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے ان کو میہماں کئے ہوئے[1]
سرودِ عیش، تلخیٔ حیات نے بھلا دیا
دلِ حزیں ہے بیکسی کو حرزِ جاں کئے ہوئے

---

[1] غالب ؎
مدّت ہوئی ہے یار کو میہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

بہارِ حسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے
کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے
سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکون دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے
حدیث آہِ نیم شب سناؤنگی سناؤں گی
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کئے ہوئے
وہ آرزوئے دل کی ہمتیں بڑھائیں شوق سے
غرورِ عشق بے نوا کو کامراں کئے ہوئے
وفورِ شوق و بے خودی، ٹھہر ٹھہر دلِ حزیں!
نگاہِ شوق و بے خودی کا امتحاں کئے ہوئے
تجلیاں لئے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو لامکاں کئے ہوئے
وہ آئیں گے تو آئینگے جنونِ شوق ابھارنے
وہ جائیں گے تو جائینگے تباہیاں کئے ہوئے
متاع صبر و ہوش کو لٹاؤں ان کی راہ میں
وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کئے ہوئے
میں ان کی بھی نگاہ سے چھپا کے انکو دیکھ لوں

کہ ان سے بھی ہے آج رشک بدگماں کیے ہوئے[1]

وقارِ عشق تو یہی کریں وہ اعترافِ غم
نظر کو دل کی دھڑکنوں کا رازداں کیے ہوئے

سرِ نیاز و پائے ناز ابتدا تھی عشق کی
اب انتہائے بیخودی ہے سرگراں کیے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظارِ دلستاں کیے ہوئے

یادِ ماضی

آغوشِ فلک میں ہیں جھلکتے ہوئے تارے
یا ساغرِ زر ساقیٔ مہوش نے سنوارے

کشتی ہے یہ پھولوں کی چمن میں کہ مہِ نو
بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے

تاروں بھرا آکاش ہے یا نیند کی دیوی
پیشانیٔ زرپاش پہ افشاں کو سنوارے

---

[1] غالبؔ کا رشک کچھ اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ؛ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
جگرؔ مرادآبادی نے محترمہ کے پہلے مصرعہ کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:۔
فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ؛ ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے مہتاب درخشاں
پہلو میں لئے ماضئ سوزاں کے شرارے
یا حلقۂ سیمینِ حسینانِ جہاں میں
ہے آئینۂ سیما کوئی چہرے کو نکھارے
ہاں ابر سیہ انجمِ رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصوّر میں ہیں روشن
وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گزارے
اظہارِ محبت میں بھی اک طرزِ تغافل
پھر طرزِ تغافل میں توجّہ کے اشارے
آنکھوں سے اِدھر اشکِ گہر تاب کی بارش
گردوں پہ اُدھر سسکیاں بھرتے ہوئے تارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں گنگا کے کنارے
بھولے سے نہ وہ جن کو کبھی یاد کریں گے
جیتا ہے کوئی اب انھیں یادوں کے سہارے
دیدار میسّر ہو جو نظروں کو دوبارہ
روشن کروں سینے میں تمنّا کے شرارے
میرے مہ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے

تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے!!

غزل

جوش کہاں، تڑپ کہاں، لذتِ جستجو کہاں
ملنے کو وہ تو مل گئے ان کی اب آرزو کہاں؟
ہجر تھا سوزِ زندگی، نغمۂ سازِ زندگی
اب نہ رہے وہ ولولے، وصل میں آرزو کہاں!
پردے میں تھے تو رت نئے رازونیاز رہتے تھے
اب ہیں نظر کے سامنے، عشرتِ گفتگو کہاں!
سامنے وہ نہ آئیں تو سامنا ان کا ہو سکے
تابِ نظارۂ عشق کو حسن کے روبرو کہاں!
شمع پہ مر مٹا پتنگ، مدعیٔ وفا نہ تھا
محفلِ جذبۂ سوز میں رخصتِ ہائے و ہو کہاں!
گوہرِ آبدار یہ نوکِ مژہ پہ خوب ہے
خاک میں مل گیا تو پھر اشک کی آبرو کہاں[1]!
میری ہی چشمِ شوق نے آئینہ ان کو دیدیا
رحم نگاہِ ناشکیب! ڈھونڈھئے کو بکو کہاں!

---

[1] میر:- پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ ؛ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

دل تھا تو لاکھ جلوے تھے دل جو نہیں تو کچھ نہیں
آئینے کو آئے گی بہار دعوتِ رنگ و بو کہاں!
دامنِ گل ہے عنبریں اس میں تو شک نہیں ادا
نکہتِ رائیگاں کہاں گیسوئے مشکبو کہاں

پروین کے نام

خدا کرے تجھے ہم تابِ مہر و مہ پروین
مثالِ انجمِ رخشندہ سرفراز رہے
سبق لے گوہرِ تاباں سے تیری معصومی
جہانِ حرص و ہوا میں بھی پاکباز رہے[1]
یہ کائنات کہ مدفن ہے آرزوؤں کا
تو اس دیار میں مثلِ نوائے ساز رہے
خدا سے چشمِ حقیقت نگر ملے تجھ کو
کہ تو کبھی نہ اسیرِ حق و مجاز رہے
سرِ شکِ چشمِ مصیبت زدہ پہ کانپ اُٹھے
کسی کے دل کو دکھانے سے احتراز رہے
ترے دماغ کو وہ عزمِ استوار ملے
کہ تیری راہ میں کوہِ گراں گداز رہے
دلِ ایاز کو بخشے مذاقِ آزادی
نیاز میں بھی اک اندازِ مشقِ ناز رہے
عطا ترے دلِ نازک کو ہو وہ سوزِ حیات
کہ تیرے دم سے تری قوم سرفراز رہے
مٹا دے ہند سے تفریقِ حاکم و محکوم
تو وہ کلی ہو گلستاں کو جس پہ ناز رہے!

---

[1] علامہ اقبال ؒ ے حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

احساسِ اوّلیں

ایک موہوم اضطراب سا ہے
اک تلاطم سا، پیچ و تاب سا ہے

اُمڈے آتے ہیں خود بخود آنسو
دل پہ قابو نہ آنکھ پر قابو

دل میں اک درد میٹھا میٹھا سا
رنگ چہرے کا پھیکا پھیکا سا

زلف بکھری ہوئی پریشاں حال
دل ہے ناشاد اور جی ہے نڈھال

سینے میں اک چبھن سی ہوتی ہے
آنکھوں میں اک جلن سی ہوتی ہے

رنج سیرِ چمن سے ہوتا ہے
خفقاں انجمن سے ہوتا ہے

سر میں پنہاں تصوّرِ موہوم
دل میں اک آرزوئے نامعلوم

ایک نالہ سا ہے بغیر آواز
ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز

روح میں انتشار سا کیا ہے
دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

کیوں یہ حالت ہے بیقراری کی
سانس لی یا کسی نے چٹکی لی

گھٹ کے رہتے ہیں صدمے سہتے ہیں
کیا محبت اسی کو کہتے ہیں؟[1]

---

[1] اسی جذبہ کو حضرت روش صدیقی نے بھی اپنی ایک نظم "محبت" میں ادا کیا ہے ملاحظہ ہو:-

محبت

(۱)

کبھی مدہوشیوں سے الفت ہے
کبھی خاموشیوں پہ حیرت ہے

کبھی ایک ایک شے کی حسرت ہے
کبھی ایک ایک شے سے نفرت ہے

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

بہار کا پہلا پھول

ہے زیب شاخ حسن گلستاں کہیں جسے
اک پھول جان کیف بہاراں کہیں جسے

یا خامۂ مصوّرِ رنگیں نگار کا
وہ نقش اوّلیں کہ پریشاں کہیں جسے

ابرِ کرم کا قطرۂ اوّل گہر بکف
افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جسے

طفلی کا ایک گام سوئے منزل شباب
سرنامۂ صحیفۂ ارماں کہیں جسے

اک حرف آرزو جسے شوقِ گنہ کہیں
اک منفعل نگاہ پشیماں کہیں جسے

---

(۲)

اک خلش سی چبھی ہوئی دل میں
کوئی "لیلیٰ" حجاب محمل میں

اک مسافر کنارہ منزل میں
یا کوئی شمع قلبِ محفل میں

اے خدا! کیا یہی محبّت ہے؟

(۳)

کبھی دیوانگی میں ہشیاری
کبھی وارفتگی میں خودداری

کبھی تخئیل کی سحر کاری
کبھی ہر شے سے عزم بیزاری

اے خدا! کیا یہی محبّت ہے؟

(۴)

ایک شعلہ سا اور بھڑکتا ہے
ایک جلوہ سا اور لپکتا ہے

ایک نغمہ سا اور کھنکتا ہے
ایک نشّہ سا اور بہکتا ہے

اے خدا! کیا یہی محبّت ہے؟

(۵)

کبھی محوِ نگارہ ہو جانا!
کبھی بے اختیار ہو جانا

آپ ہی بے قرار ہو جانا
خود بخود اشکبار ہو جانا

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

عصیاں کی بزمِ تیرہ میں ایک نور کی کرن
اہلِ نظر بھی حاصلِ ایماں کہیں جسے
یا آرزوئے عشقِ نہفتہ کی قلب میں
پہلی تڑپ جراحتِ مژگاں کہیں جسے
کھویا ہوا سا خواب جوانی بہار کا
تجدیدِ اضطراب کا ساماں کہیں جسے
یا جستجوئے جلوۂ رنگینِ دوست میں
وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جسے
یا اوّلیں سرشکِ محبت سرِ مژہ
محرومیٔ نشاط کا عنواں کہیں جسے

کرمکِ شب تاب

(قطعہ)

شبِ سیاہ میں روشن ہے شمع جگنو کی
دیارِ غریب کا جس طرح ٹمٹماتا ہوا
ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے پنکھڑی گُل کی
رُکا ہوا سرِ مژگاں ہے قطرہ آنسو کا
فضائے ساکن و تیرہ میں جس طرح کوئی
لرز رہا ہو فلک سے گِرا ہوا تارا
سزا کے خوف سے یا ایک لمحہ کو جیسے
گناہ گار کے دل میں خیال رحمت کا

جھیل

آغوش میں زمیں کے یہ جھیل سو رہی ہے

یا چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے
صحرا کی نازنیں کا یا یہ دلِ حسیں ہے
دنیا کے جھنجھٹوں سے جو آشنا نہیں ہے
دیدار کو تھی مضطر ماہِ فلک نشیں کے
آنسو ٹھہر گیا ہے رخسار پر زمیں کے
مسحور ہیں فضائیں کتنی خموش ہے یہ
جنّت کی حور کوئی مینا بدوش ہے یہ
کیفِ شراب میں ہے ڈوبا ہوا نظارا
سویا ہوا نظارا، کھویا ہوا نظارا
پتّوں کی آڑ لے کر مہتاب جھانکتا ہے
یا نو عروسِ شب نے گھونگٹ الٹ دیا ہے
محوِ خرام دلکش دوشیزۂ صبا ہے
سبزے کی جنبشوں میں اک دل دھڑک رہا ہے
ہو ہو کے مست بے خود نذریں چڑھا رہی ہے
شبنم کی شاہزادی موتی لٹا رہی ہے
برنائیاں نچھاور عکسِ مہِ جواں پر
اک چاند ہے زمیں پر اک چاند آسماں پر
لہروں کی سلوٹوں میں کچھ پھول کانپتے ہیں
بستر جو پُر شکن ہے پہلو بدل رہے ہیں

تاروں کا عکس دلکش ہے سطحِ مرمریں پر
افشاں چُنی ہوئی ہے پیشانیٔ حسیں پر
لرزاں ہے کس لئے یوں ہی کیوں شکن جبیں پر
کیا یاد آ رہا ہے؟ کیوں ہو رہی ہے مضطر؟
کیوں دل دھڑک رہا ہے، یوں بیقرار کیوں ہے؟
سوئے فلک نگاہِ حسرت شعار کیوں ہے؟
"مضطر ہوں اس لئے میں ناساز ہے سکوں اب
تقدیر کا ہے منشا بیچین ہی رہوں اب
تارہ سمجھ کے ایک اک ذرّے کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اسکو ڈھونڈتی ہوں
تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان و آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں
عہدِ نشاط گذرا وہ دل نہ سرخوشی ہے
پھر لوٹ آئے شاید بس آس یہ لگی ہے
لیکن تو اے حسینہ! یوں غم نواز کیوں ہے
پُرنم سرشکِ خوں سے یہ چشمِ ناز کیوں ہے
اُمید کے محل کو پل میں گرا دیا ہے
تجھکو بھی کیا کسی نے دل سے بھلا دیا ہے،

~~~~~~
~~~~~~

تعمیرِ نو!

محرومئ تقدیر کا الزام کہاں تک
شرمندگئ کوششِ ناکام کہاں تک

دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی
سرگشتہ رہیگا صفتِ جام کہاں تک

کبتک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رخِ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک

گیسوئے سیہ تاب و رخِ صاعقہ پرور
یہ مرگ و حیاتِ سحر و شام کہاں تک

لیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کہیں دوچار
خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک

رخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود
ناداں! گلۂ گردشِ ایام کہاں تک

کبتک ترے سینہ میں خلش تیرِ مژہ کی
یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک

اے ذرۂ ناچیز! اخجل مہر کو کر دے
افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہاں تک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہِ دام کہاں تک

تنہا ہی مجھے رہنے دے!

دل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے
مجبورِ محبت کو مجبور ہی رہنے دے

اُمید کی دنیا کو بے نور ہی رہنے دے
معصومِ محبت کو مسحور ہی رہنے دے

جس حال میں بھی میں ہوں تنہا ہی مجھے رہنے دے

دل پھول کی صورت ہی مُرجھا کے نہ رہ جائے
آغوشِ تمنا میں لہرا کے نہ رہ جائے

ڈر ہے نگہِ حیراں شرما کے نہ رہ جائے
ترسا کے نہ رہ جائے تڑپا کے نہ رہ جائے

جس حال میں بھی میں ہوں تنہا ہی مجھے رہنے دے

محدود ہی رہنے دے معصوم کی دنیا کو
ناشاد ہی رہنے دے مغموم کی دنیا کو
برباد ہی رہنے دے مظلوم کی دنیا کو
پامال ہی رہنے دے محروم کی دنیا کو
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

اک پریم پجارن کو سنسار سے کیا مطلب
مدہوشِ محبّت کو ہشیار سے کیا مطلب
بیگانۂ دنیا کو آزار سے کیا مطلب
دیوانۂ فطرت کو افکار سے کیا مطلب
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

ایوانِ محبّت میں رہزن کا گزر کیوں ہے؟
تقدیس کی جنّت پر ظلمت کا اثر کیوں ہو؟
اک طائرِ بیکس کو صیّاد کا ڈر کیوں ہے؟
ناداں گلِ صحرا پہ گلچیں کی نظر کیوں ہے؟
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

اُمید کے خرمن کو آہوں سے جلانا کیا
شمع رہِ منزل کو اشکوں سے بجھانا کیا
خوابیدہ تمنّا کو نالوں سے جگانا کیا
معیارِ محبّت کو نظروں سے گرانا کیا
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

عیدِ نظارہ

مژدہ نگاہِ شوق کہ عیدِ نظارہ ہے
پلکیں کسی کی راہگذر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی
سو طرح نمکدے کو بھی اپنے سجاؤں میں
خورشید کی جبیں سے کرن مستعار لوں
مہتاب سے ضیائے جواں مانگ لاؤں میں
دامانِ ابرِ تیرہ سے گوسر سمیٹ لوں
قوسِ قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں
باغِ ارم سے آرزوئے رنگ و بو کروں
روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں

شبنم سے اشکہائے گہرتاب چھین لوں
غنچہ کے لعل لب سے تبسم چراؤں میں
بلبل سے پاکبازئی الفت طلب کروں
معصومی شباب کو پھولوں کے چھاؤں میں
جذب وفا و ہمت پروانہ چاہیئے
پھر گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں
ظلمت میں ہو نہ نورفشاں ماہ نیم ماہ
پھر نثار ساغر انجم منگاؤں میں
وہ اور میرے گھر میں ہوں مہمان خوشا نصیب
گلہائے اشک سرخ سے دیپک جلاؤں میں
آنکھوں کو میری دولت دیدار ہے نصیب
خود کو نہ انکے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں
وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیث غم
بلبل کی طرز نغمۂ رنگیں اڑاؤں میں
جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہو اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں روٹھ جاؤں میں
اے اضطراب شوق سنبھلنے دے اسقدر
ہاتھوں پہ رکھکے دل کو پئے نذر لاؤں میں
اور اسکے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلع آدا کا سناؤں میں
اے چشم مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انھیں بھی جگاؤں میں[1]

---

[1] فیض احمد فیض

مرگ سوز محبت

آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسن ماہ سے دل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراق قامت و رخسار یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانئ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لیکے دامن ابر بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم
سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں نہ جائیں کہ جائیں ہم

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

جوہی کی کلیاں

بہارِ خلد منظر جلوہ گر ہے ہجومِ سبزہ تا حدِ نظر ہے
ہوائے مست ہے بہکی ہوئی سی فضائے عنبریں مہکی ہوئی سی
سکوتِ شب تحیر آزما ہے جمالِ ماہ کیفیت فزا ہے
ہوائے نرم و نازک جیسے آہیں کہ خوابِ ناز کی بے ربط سانسیں
سپہرِ نیلگوں اور نورِ اختر کہ اوڑھی ہے حسیں فطرت نے چادر
فلک سے مہ کی بے تابانہ کرنیں وفورِ شوق سے مستانہ کرنیں
برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں! زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں
ستارے آسماں سے گر پڑے ہیں کہ جوہی کے شگوفے کھل رہے ہیں
نزاکت آفریں رعنا سمن بر تخیل کے نشاط انگیز پیکر
کتابِ حسن کا عنوانِ رنگیں جواں فطرت کا ارمانِ بہاریں
جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے عرق آلود روئے نازنیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں
بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں مئے عشرت کی متوالی ہوئی ہیں

برائے نذرِ شاعر خونِ دل سے
یہ گلدستہ بنایا ہے زمیں نے!

پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم ["نقشِ فریاد"، ص ۱۰۷-۱۰۸]

محترمہ نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن مقامِ شکر ہے کہ انھوں نے "آزاد نظم" کی صحیح اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس عریانی اور فحاشی سے احتراز کیا ہے جو "ترقی پسند" ادیبوں کے ہاتھ میں آ کر "آزاد نظم" [1] کا ایک جزو بن گئی ہے۔ ذیل میں محترمہ کی اس قسم کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

بیزاری

زیست ایک خواب طربناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی ایک دلنشیں آواز سہی
فرشِ مخمل بھی، زر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنت دید بھی ہے عشرتِ گفتار بھی ہے
چشم سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی

---

[1] اردو میں "بلینک ورس" (Blank Verse) یا "آزاد نظم" دراصل انگریزی ادب کی منت کش ہے اور ردیف و قافیہ کی قیود سے بغاوت کا نتیجہ ہے "آزاد نظم" اگر صرف ردیف و قافیہ ہی سے آزاد رہتی تو غالباً شعراء کی یہ کوشش مستحسن ہوتی لیکن اکثر "ترقی پسند" شعراء و ادباء کے ہاتھوں میں آکر یہ چیز صرف صوری حیثیت سے ردیف و قافیہ ہی سے نہیں بلکہ معنوی حیثیت سے مشرقی تہذیب و معاشرت، اخلاق و مذہب کی قیود سے بھی آزاد ہوگئی ہے اس

قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلّی، یہ گرانبارِ سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا در باز نہیں

[پچھلے صفحہ سے] وقت "آزاد نظم" کے سب سے بڑے علمبردار ن م۔ راشد مصنف "ماورا" ہیں "آزاد نظم" کے علمبرداروں میں ن۔م۔ راشد کے ساتھ عموماً فیض احمد فیض مصنف "نقش فریادی" کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فیض نے آزاد نظمیں لکھی ہیں، لیکن نسبتاً کم لکھی ہیں "نقش فریادی" میں صرف چند آزاد نظمیں ہیں لیکن وہ بھی صوری و معنوی "آزادی" کی اس شدت سے عاری ہیں جو راشد کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جیسا کہ "نقش فریادی" کے "دیباچہ" میں خود فیض نے لکھا ہے "ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے اور بس"۔ اس لئے "نقش فریادی" کے فیض کو اس معنی میں "آزاد نظم" کا علمبردار کہنا جس میں "ماورا" کے راشد کو کہا جاتا ہے، نہ صرف غلط بلکہ فیض پر ایک بیجا اتہام ہے۔ فیض کا "نقش فریادی" جذباتی شاعری کا ایک بلندپایہ زبردست اور شاندار نمونہ ہے۔ یہاں "آزاد نظم" سے میری مراد وہ "آزاد نظم" ہے جس کی مثالیں راشد اور متبعینِ راشد [باقی اگلے صفحہ پر]

جسم آسودہ سہی، روح مگر ہے بیتاب
اک بے نام تغیّر کے لئے
درد کی ٹیس سہی، لذّتِ جاوید نہیں

[پچھلے صفحہ سے] پیش کر رہے ہیں۔ مجھے اس میں کلام نہیں کہ انکے یہاں خیالات کی گہرائی و سنجیدگی موجود ہے مگر اس کے باوجود یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا و مذہب سے بغاوت، اخلاق کے قدیم معیاروں سے تصادم، فواحشات کی ترغیب و ہوس پرستی کی خواہش، اور مغربیت کی غلامانہ تقلید انکی شاعری کی ممتاز اور نمایاں خصوصیات ہیں۔ چند مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

خدا و مذہب سے بغاوت

"دریچے کے قریب" جو راشد کے مبصّر اور مقدمہ نگار کرشن چندر کے خیال میں "فکری اور فنّی اعتبار سے راشد کی بہترین نظم ہے"۔ وہ ایک پرانی مسجد کے بلند مینار کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے :۔

اس مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی،
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے،
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

نغمۂ اُمید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود

[پچھلے صفحہ سے] ایک عفریت — اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی"
["ماورا" ص۱۰۶]

یا مثلاً نظم "فطرت اور عہدِ نو کا انسان" میں انسان فطرت سے کہتا ہے:-
" شکر ہے زندانیٔ اہرمن و یزداں نہیں
ان سے بڑھکر کچھ بھی وجہہ کاوشِ انساں نہیں" ["ماورا" ص۵۴]

اسکے مقابلہ میں فیض اپنے تمام "نقشِ فریادی" میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔
سیکھی ہیں مرے دِل کافرنے بندگی ربِّ کریم ہے تو تری رہگزر میں ہے
["نقشِ فریادی" ص۱۰]

اسکی جراُت معصیت کی حد یہ ہے کہ
اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن دیکھے ہیں ہمنے حوصلے پروردگار کے
[نقشِ فریادی ص۸۶]

اخلاق کے قدیم معیاروں سے تصادم

" آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حسن بیچارے کو دھوکا سا دیے جاتا ہے [بقیہ اگلے صفحہ پر]

سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل
یہ حیاتِ جامد

[پچھلے صفحہ سے] ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے!
ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب"

["ماورا" نظم حزن انساں" ص۸۵]

"رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انھیں
یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
لو آگئی ہیں وہ بنکر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جنکا کیا تھا خوں میں نے
مگر یہ جتنی اذیت بھی دیں مجھے کم ہے
کیا ہے روح کو اپنی بہت زبوں میں نے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال،
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرۂ و محدود و اداس

(پچھلے صفحہ سے) اسے نہ ہونے دیا میں نے ہمنوائے شباب
نہ اس پہ چلنے دیا شوق کا فسوں میں نے
اسے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا'
"گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے"

["ماورا" نظم "مکافات" صد۵ تا ۵۸]

فیضؔ نے اس سلسلہ میں صرف اتنا کہا ہے — اور بجا طور پر کہا ہے :-

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے' پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے' ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سوز تڑپ' جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

["نقش فریادی" نظم "چند روز" اور "مری جاں"! صد۱۰۵-۱۰۶]

فواحشات کی ترغیب و ہوس پرستی کی خواہش

"اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال

[پچھلے صفحہ سے] اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

["ماورا" نظم "انتقام" ص ۱۱۶]

"روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں،
آ، اسی لذّتِ جاوید کا آغاز کریں،
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے!"

["ماورا" نظم "اتفاقات" ص ۸۳]

"دیکھ اس جذبات کے نشّے کو دیکھ،
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو گئی!
زندگی کی لذّتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے [بقیہ اگلے صفحہ پر]

کاش پڑجائے کہیں ایک خراش — ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی

[پچھلے صفحہ سے] مجھ کو اپنی روح کی تکمیل کر لینے بھی دے!"
—————[نادرا" نظم "طلسمِ جاوداں" ص۷۷]

"تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بیکراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا، مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
["نادرا" نظم "بیکراں رات کے سناٹے میں" ص۱۱۱]

لیکن یہاں بھی فیض نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا :-

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے"
—————["نقش فریادی" نظم "موضوع سخن" ص۱۲۱]

یا

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے — اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود — ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آ نکلے

[پچھلے صفحہ سے] زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ"
["نقش فریادی"۔ نظم "آج کی رات"۔ ص ۹۸]

مغرب پرستی

"قہوہ خانہ کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں،
آج کی شب تیرا دُزدانہ ورود!
عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب
تیری آنکھ اور میرا دل
عنکبوت اور اسکا بیچارہ شکار!"
["ماورا" نظم "آنکھوں کے جال" ص ۹۵-۹۶]

"آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جاں کہ میں،
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
["ماورا" نظم "شرابی" ص ۱۱۳]

ایک لمحہ کے لئے
میرے تاریک گھروندے میں اُجالا ہو جائے

ادا محترمہ ف۔ بیگم :-

آپ اپنا پورا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ ف بیگم نام اور ادا تخلص ہے آپ کی جائے ولادت لکھنؤ ہے۔ مگر تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی آپ حضرت جلیل کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو، فارسی، عربی کی تعلیم خانگی طور پر پائی اور اچھی قابلیت حاصل کر لی۔ شاعری کا ذوق اور ادبی رجحان اور دلچسپی اوائلِ عمر ہی سے ہے۔ نظم و نثر دونوں میں اچھی مہارت ہے:-

---

[پچھلے صفحہ سے] یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، ورنہ "آزاد نظم" کی تائید و مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن ان بحثوں سے قطع نظر، ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے، اہل زبان اور صاحب نظر اصحاب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوم کی طرح زبان کی بھی ایک زندگی اور ایک انفرادیت ہوتی ہے جو اس قوم کی تہذیب و تمدن، اس کے اخلاق و معاشرت، اس کے رسم و رواج اور اسکے افکار و خیالات سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ کسی ایک زبان کے نازک اور لطیف خیالات کی کماحقہٗ کوئی دوسری زبان متحمل نہیں ہو سکتی اور یہ کوشش اس سے کم مضحک نہیں ہوتی جتنی مشرقی فضاؤں کی پروردہ خاتون کو مغربی سایہ پہنا کر اس کو خالص مغربی عورت سمجھ بیٹھنے کی ہوتی ہے۔ "ج"

جب فضا میں سکوت ہوتا ہے | ذرّہ ذرّہ جہاں کا سوتا ہے
جب فلک پر گھٹائیں چھاتی ہیں | بجلیاں کوند کر ڈراتی ہیں
اور جب کوئی خوف کھاتا ہے | رخِ رنگیں کو ڈھانپ لیتا ہے
سب مجھے معلوم ہوتا ہے ایسا | کہ تمہاری جبیں کی ہے یہ ضیا
محو پہروں اسی میں رہتی ہوں | دل کو تسکین یوں ہی دیتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے

ادیب محترمہ شبیر خالدہ

آپ موجودہ دور کی ایک خوشگو شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر زنانے رسائل خصوصاً عصمت اور خاتونِ مشرق میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے کلام سے آپ کے علمی ذوق اور خوشگوئی کا اندازہ ہوتا ہے، کلام میں بڑا کیف و سرور، اور جذبات کی فراوانی ہے۔

اے نسیمِ صبحدم، اے باعثِ آرامِ جاں | تیری نکہت آفریں رفتار سے ہوں شادماں
تیرے جھونکوں سے دماغ و دل ہیں محوِ انبساط | دردِ دل ہجراں کشیدہ جو تھا محرومِ نشاط
حسرتِ دیدار ہر دم خوں رلاتی ہے مجھے | تیرے آنے سے کسی کی یاد آتی ہے مجھے
صبح کا دلچسپ منظر، تازگی بخشِ نظر | ہے تو اس نظارۂ سیمیں میں ڈوبی کسقدر
پُر فضا اونچے پہاڑوں سے طلوعِ آفتاب | ہے نمایاں تیرے ہر انداز سے کیفِ شراب
وہ تمنائے بہار آلودہ میرے دل میں ہے | کچھ اثر واماندگی کا پہلے ہی منظر میں ہے
حسرتوں کی [illegible] ہے دل پہ کچھ پژمردگی | بن گئی ہوں میں سراپا مرکزِ افسردگی

دل شکستہ ہو گیا اتنی بڑھیں ناکامیاں
پھر بھی ہی بیتا ہوں کا رنگ چہرے سے عیاں

دیدیا ہمت نے میری مجھکو افسردہ جواب
اور اندازِ سکوں میں ہے نشانِ اضطراب

ہو رہے ہیں خوب ہی جھونکے ترِ عرقِ شمیم
ہو اگر تیرا گزر کوچہ میں اسکے اے نسیم

اپنے دامن میں لئے پھرتی ہی خوشبودار پھول
نذر کر دینا مری جانب سے بھی دو چار پھول

لیکن ایسے پھول جو افسانۂ جذبات ہوں
الفتِ صادق میں جو دیوانۂ جذبات ہوں

جن کی ہر اک پنکھڑی پر ہو کھنچی تصویرِ دل
ہر رگ و ریشہ پہ ہو جنکے لکھی تحریرِ دل

اسیر

رحمت بیگم المتخلص بہ اسیر ڈاکٹر عبد الوہاب صاحب حیدر آبادی کی دختر اور رحمت اللہ شریف صاحب حیدر آبادی اول تعلقدار کی شریکِ حیات ہیں ۔ تعلیم خانگی طور سے ہوئی شعر گوئی کا اچھا ذوق ہے گو کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔ رسالہ شہاب میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے پاکیزہ و سنجیدہ ہوتا ہے خیالات میں بلندی اور جدت پائی جاتی ہے اسی طرح آپ کے مضامین پُر از معلومات اور مفید ہوتے ہیں، زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہوتا ہے کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

فکرِ فردا ہے نہ اب ہم کو خیالِ دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

بڑھ گئی ہیں بحرِ آزادی کی طوفاں خیزیاں

اک سفینہ وہ بھی اب طوفاں سے ہم آغوش ہے
دعوتِ دیوانگی دیتی ہے یہ وارفتگی
موجِ صہبائے تفکر بھی جنوں بردوش ہے
مائلِ تقلید کیوں ہے آجکل ذوقِ سلیم
چشمِ بینا بند ہے در عقل بھی روپوش ہے
کس قدر پابندیٔ آئینِ فطرت سے اسیر
روحِ آزادی کا یہ جذبہ جراحت کوش ہے

وہ ماہ انور کی ضیا وہ نور کی سیمیں ردا اوڑھے ہوئے ساری فضا
ایک ایک ذرّہ ارض کا
ہے دشت میں تیری ضیا صحرا میں تابانی تری صحنِ چمن میں بھی وہی
ہے نور افشانی تری

اظہری محترمہ اظہر سلطانہ معظم

اظہر سلطانہ نام اور اظہری تخلص ہے بھوپال کی رہنے والی اور دورِ جدید کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے :-

سنہری کرن نیلگوں آسماں پر ہو پیدا ہوا نور سارے جہاں پر
ہوا فرش گستر وہ اب سیم و زر کا کہ شبنم پہ ہوتا ہے دھوکا گہر کا
وہ کوئل درختوں پہ کرتی ہے کوکو ہے قمری بھی گلشن میں کہتی تو ہی تو

سیدہ سردار 'اختر'

اذانوں کا ہے شور اب مسجدوں میں
اُٹھا شورِ ناقوس بھی مندروں میں
وہ دیکھو چلے مسجدوں کو نمازی
جگاتا ہے دیوی کو ان کا پجاری
سہانا سماں صبح کا تو نے کھویا
بہاریں مناظر کا بھی لطف کھویا

کہاں تک سب تجھے اظہری کہہ سنائے
جو سوئے سو کھوئے جو جاگے سو پائے

اعجاز

ملکۂ دکن حضرت دولہن پاشا بیگم صاحبہ کا تخلص ہے، دکن کی تاریخ میں آپ سب سے پہلی ملکہ ہیں جنھوں نے اُردو شعر کہے۔ آپ کا جو کلام شائع ہوا ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں تاثیر، پختگی، زبان کی سادگی وصفائی اور خیالات کی بلندی موجود ہے۔

ان کو عہدِ وفا کی لاج نہیں
دردِ دل کا کوئی علاج نہیں
دو ہی دن میں بدل گیا وہ رنگ
کل جو تھا لطف مجھ پہ آج نہیں
درد دینے لگا مزا دل کو
اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
سچ ہے اب خسروِ دکن کے سوا
کوئی شایانِ تخت و تاج نہیں
سارا عالم ہے بندۂ اخلاق
کوئی سلطاں سا خوش مزاج نہیں

آفتاب

آفتاب جہاں نام اور آفتاب تخلص ہے۔ دہلی کی ایک صاحبِ ذوق اور

عفت مآب خاتون ہیں۔ اکثر زنانہ مشاعروں میں بھی حصّہ لیتی ہیں۔ ذیل کی غزل ایک مشاعرہ ہی کی غزل ہے جو محترمہ نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی جو بصدارت محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی منعقد ہوا تھا۔

آپ کا شاعرانہ مذاق سنجیدہ و بلند ہے، زبان شستہ اور صاف لکھتی ہیں، جذباتی اعتبار سے بھی آپ کا کلام قابلِ قدر ہے :-

خوشی کا ذکر کیا غم کا گلا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نہیں ملتا محبت کا نشاں بھی　　یہ بدلی ہے زمانے کی ہوا کیا
گناہِ عشق کی ہیں مرتکب ہم　　ذرا دیکھیں وہ دیتے ہیں سزا کیا
تصوّر میں وہی باتیں ہیں اُنسے　　جدا ہو کر وہ ہوتے ہیں جدا کیا
کرم کرتے نہیں چلئے نہ کیجے　　ستم کی لذتوں کا پوچھنا کیا
ڈرے میری بلا سیلابِ غم سے　　خدا جب آشنا ہے ناخدا کیا
نہیں کچھ اعتبارِ زندگانی　　مگر دل میں تمنائیں ہیں کیا کیا
مسرت ہے، نہ الفت ہے نہ راحت　　الٰہی تیری دنیا کو ہوا کیا

جہاں ہو آفتابِ عالم آرا
وہاں کی روشنی کا پوچھنا کیا

اکبری محترمہ اکبری خانم۔ بیرا بگینیاں

رسالہ عصمت کی شاعرہ ہیں، زیادہ تر مذہبی و اخلاقی مضامین نظم کرتی ہیں۔ ذیل کی مناجات آپ کے مخصوص رنگ کا ایک نمونہ ہے:-

ایک گنہگار کی دعاء

کریں التجا کس سے ہم اے خدا — نہیں دوسرا کوئی تیرے سوا
سوا تیرے مشکلکشا کون ہے — غریبوں کا والی بتا کون ہے
تو فرمانروا ہم ہیں فرماں پذیر — ہم افتادہ بیکس ہیں تو دستگیر
کیا ہم نے یہ جان و دل سے قبول — کہ سچا ہے تو اور تیرا رسول
ہمارا یہ ایمان بالغیب ہے — کہ تو سب کا معبود لاریب ہے
بھلا کیونکہ ہو یہ ہماری مجال — نہ مانیں تیرا حکم اے ذوالجلال
مگر نفس غافل کے مکر و فریب — لئے لیتے ہیں عقل و صبر و شکیب
جہاں پھونکا اک وسوسہ کان میں — تزلزل پڑا دین و ایمان میں
پڑا جس گھڑی معصیت کا حجاب — نہیں سوجھتا کچھ ثواب و عذاب
کٹی ہائے غفلت میں عمر عزیز — نہ کی نیک و بد میں کبھی کچھ تمیز
کئے فعل ہم نے بہت ناسزا — ہوئی ہم سے واقع خطا پر خطا
ہے افسوس پاس اک بھی خوشہ نہیں — سفر دور کا اور توشہ نہیں
مدد میری اے میرے رحمٰن کر — میری سخت مشکل کو آسان کر
رکھ ایسا محبت میں ثابت قدم — کہ غافل نہ ہوں تجھ سے میں ایکدم
رہوں یا کہ دنیا سے جاؤں گذر — نہ نکلوں تیرے حکم سے ذرہ بھر
ہیں دنیا میں جو مہربان و شفیق — یہ سب جیتے دم کے ہیں اپنے رفیق
نہ پوچھے گا تربت پہ آ کر کوئی — کہ اے خستہ تن کیا ہے حالت تری

مگر تجھ سے امید ہے اے خدا
کہ ہر حال میں تو ہے مونس مرا

نہ رسوا مجھے اے خدا کیجیو
میری شرم محشر میں رکھ لیجیو

نہ تکیہ عمل پر ہے بالکل مجھے
نبیؐ کا فقط ہے توسّل مجھے

خطائیں میری عفو کر اے کریم
کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

خطائیں میری بخش دینا تمام
طفیل پیمبر علیہ السلامؑ

اُما

مسز منی لیلا دیوی نام اور اُما تخلص ہے۔ آپ لاہور کی رہنے والی ہیں، اُردو سے بڑا لگاؤ ہے اور اس میں اکثر کہتی رہتی ہیں۔ آپ کا کلام صاف ستھرا اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ زبان عمدہ لکھتی ہیں۔ مولانا راشد الخیری کی وفات پر آپ نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے کچھ بند مندرجہ ذیل ہیں:۔

ختم دنیا نہ کبھی ہوگا یہ رونا تیرا
اشک غم سے ترے رخسار کو دھونا تیرا

ہائے اے اہل جہاں ہیچ ہے ہونا تیرا
جسکو سمجھا یا کبھی بیکار نہ ہونا تیرا

اٹھ گیا کیسا قلمکار، قلم کا افسر
داغ ہے راشد خیری کا ادب کے دل پر

صنف نازک کیلئے کیسے اٹھائے صدمے
رات دن ایک کئے کیا کیا مضامین لکھے

غم نسواں کے وہ حضرت نے مرقعے کھینچے
اب دیکھیں گے، نہ دیکھے کبھی ہم مرکے

کس طرح بھولیں گے احسان تمہارے خیری

اب کیسے کہہ کے پکاریں گے ہمارے خیری

دفترِ ہند کی موجودہ مصیبت کیلئے ‏ ‏ پیشِ خالق وہ اُٹھا پہنچیں ہیں براٗت کیلئے

انجم

عارفہ بیگم نام اور انجم تخلص ہے۔ اکبر آباد کی رہنے والی ہیں۔ آپ جوش ملیح آبادی کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں۔ کلام میں سادگی و صفائی ہے۔ آپ کے یہاں محاکات اور منظر نگاری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں، کلام میں بڑی روانی ہے۔

سیرِ کشمیر

ہماری نگاہیں کدھر جا رہی ہیں ‏ ‏ یہ کیا دیکھتی ہیں کہ اِترا رہی ہیں
رہے اپنی نظروں کا اوجِ رسائی ‏ ‏ بہشتِ بریں کی خبر لا رہی ہیں
یہ کشمیر کا گلستاں اللہ اللہ ‏ ‏ بہاریں فرشتوں کو للچا رہی ہیں
یہ اتوار کا دن بھی یومِ طرب ہے ‏ ‏ وہ گلشن کی شہزادیاں گا رہی ہیں
جدھر دیکھئے صورتیں پیاری پیاری ‏ ‏ حسینانِ جنت کو شرما رہی ہیں
یہ معلوم ہوتا ہے دوشیزہ پریاں ‏ ‏ خراماں خراماں چلی آ رہی ہیں
نہ دیکھو ہٹا لو نظر انکے رُخ سے ‏ ‏ حیادار آنکھیں جھکی جا رہی ہیں
یہ پُر کیف منظر ہے کیا روح پرور ‏ ‏ نگاہیں نگاہوں کو شرما رہی ہیں
یہ گردش میں ہیں انکی مستانہ آنکھیں ‏ ‏ کہ گلزار میں جام چھلکا رہی ہیں

دلہن کی طرح باغ آراستہ ہے ہوائیں درِ خلد سے آرہی ہیں
سلاطینِ اسلام کی سیرگاہیں جو برسوں خیابانِ طوبیٰ رہی ہیں ق
لطافت میں ڈوبی ہوئی ہیں ابھی تک مشامِ تمنّا کو مہکا رہی ہیں
خواتینِ مغلیہ کی پاک شکلیں یہاں مدّتوں جلوہ آرا رہی ہیں
کہ جن کی تمنّا میں موجیں ہوا کی سر اپنا پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں

انجم

عقیلہ خاتون نام اور انجم تخلص ہے سیکری کی رہنے والی ہیں آپ کا کلام کبھی کبھی عصمت اور خاتونِ مشرق وغیرہ رسالوں میں شائع ہوتا ہے سادگی و صفائی آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔

یادِ ماضی

یاد ہے مجھکو مرا گذرا زمانہ یاد ہے محفلِ عشرت کا وہ رنگیں فسانہ یاد ہے
آہ وہ شوخی شرارت، آہ وہ بچپن کے دن وہ سکوں پرور زمانہ اور وہ دورِ مطمئن
آہ وہ ساون کی رت، وہ گیت گاتے جھولنا ہر سہیلی کا وہ لڑنا اور لڑکر بھولنا
شاد رہتی تھی سدا اور رنج و غم کافور تھا دل مرا بچپن کی مے سے جب کبھی مسرور تھا
مثلِ گل بزمِ چمن میں مرکزِ الفت تھی میں واسطے ماں باپ کے سرمایۂ عشرت تھی میں
یادِ بچپن کی مجھے جب دم ستاتی ہے بہت چشمِ مضطر اشکِ خوں پہروں بہاتی ہے بہت
کیا ہوا اب یا الٰہی آہ وہ دلکش سماں!
یاد سے جس کی ہوئی جاتی ہے انجم نیم جاں

انور

انور جہاں بیگم نام اور انور تخلص ہے۔ آپ جناب سراج الدین صاحب سابق دوم تعلقدار حیدر آباد دکن کی دختر ہیں۔ اورنگ آباد میں قیام ہے۔ تعلیم خانگی طور پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی ہے آپ کی منقبت "پیشکش امام مظلوم" اچھی نظم ہے، اور معنوی و لفظی حیثیت سے بہت پُر شوکت ہے۔ اس نظم سے محسن کاکوروی کا رنگ جھلکتا ہے۔

پیشکش امام مظلوم

اے شہِ تشنہ لبؑ راحتِ جانِ زہرؓا
اے جگر بندِ علیؓ فخرِ حجاز و بطحا

اے حسینؑ مدنی سرورِ ریاضِ احمدؐ
صدفِ بحرِ کرامات کے دُرِّ یکتا

ساقیٔ کوثر و تسنیم مکینِ فردوس
کسقدر رتبۂ عالی تھیں حق نے بخشا

وارثِ خلقِ حسنؑ حاملِ حسنِ نبویؐ
چشمۂ رحم و کرم شاہِ شہیدانِ بلا

نورِ ایمان سے پُر نور جبینِ انور
عشق اللہ سے معمور دلِ حسرت زا

خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے خاموش رہا
کیا قناعت تھی تری پیکرِ تسلیم و رضا

صبر ایوبی کی تصویر دکھا دی تو نے
اپنے ہاتھوں سے جواں لختِ جگر دفن کیا

دورِ خزاں

چمن کے چپہ چپہ سے ہویدا رنگِ بربادی
نہ باقی اب وہ رعنائی نہ رنگینی نہ شادابی
سمومِ بادِ صرصر سے گلستاں بن گیا صحرا

غضب کا چھا گیا گلشن کے بامِ در پہ سناٹا
روانی تھم گئی موجوں کی چشمے خشک ساکن ہیں
جو گلشن رشکِ گلزارِ جناں تھے اب وہی بن ہیں
شمیمِ روح پرور شعلہ آتش بنی یکسر
شجرہائے گلستاں خاک کر ڈالے شرر بن کر
شعاعِ مہرِ تاباں نے لگادی آگ سبزے میں
نسیمِ صبح گاہی خاک بر سر جس کے ماتم میں
نگاہِ یاس سے تکتے ہیں طائر اپنی ویرانی
کہیں کس سے ستم کش دورِ گردوں کی ستم رانی

آہ

میمونہ بیگم نام اور آہ تخلص ہے آپ نے نامپلی زنانہ کالج میں تعلیم پائی اور وہیں سے انٹرمیجیٹ کا امتحان پاس کیا۔ کلام میں واقعہ نگاری، اور وارداتِ قلب کی ترجمانی ہے۔ گو ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ہر گھڑی تم کو یاد کرتی ہوں ہر گھڑی آہ سرد بھرتی ہوں
گاہ جیتی ہوں، گاہ مرتی ہوں شکر پروردگار کرتی ہوں
دن تو جوں توں گزر ہی جاتا ہے شب کو تارے شمار کرتی ہوں
بس پریشانیوں میں بھی ہر دم دم تری دوستی کا بھرتی ہوں
دل میں جو ہے زباں پہ کیا لاؤں بات کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں

پھول کھلتے ہیں باغِ حسرت کے | جب کبھی آہ سحر دبھرتی ہوں
گاہ تارے، تو گاہ تارِ نفس | رات بھر میں شمار کرتی ہوں
زندگی موت سے بھی بدتر ہے | سو کے جیتی ہوں اُٹھ کے مرتی ہوں
امتحاں کیسا اور کہاں کا سبق | میں فقط تم کو یاد کرتی ہوں

آہ کے ساتھ ہے تمھاری یاد
یاد کے ساتھ آہ کرتی ہوں

(ب)

باطن

آپ کا نام حسینی بیگم اور تخلص باطن ہے۔ آپ کا تعلق ریاست حیدرآباد سے ہے۔ اردو کے علاوہ آپ فارسی اور عربی میں بھی اچھی قابلیت رکھتی ہیں، قرأت سے بھی واقف ہیں، "حمایت الاسلام" کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی ہے جس میں فرائض اور اخلاق کا تذکرہ ہے۔ اردو شاعری کا بھی ذوق ہے ؎

خاک کا پتلا ہے باطن آدمی | دل کو دیکھے آزمایا کون تھا
شاہِ دکن کی ہم پہ عنایت عظیم ہے | اہلِ دکن کے ساتھ محبت عظیم ہے

بانو محترمہ جہاں بانو بیگم ام۔اے حیدرآبادی

محترمہ جہاں بانو بیگم حیدرآباد کی ان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کی علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل

کرلی ہے۔ ان کے والد ابو رضا بیرسٹر مرحوم حیدرآباد میں ناظم فوجداری بلدہ، اور اُن کے دادا مولوی دلیل الدین صاحب احترام جنگ، اورنگ آباد کے صوبہ دار، اور مجلسِ مالگذاری کے رُکن تھے۔

جہاں بانو بیگم صاحبہ کے نانا مرزا نصر اللہ خاں المخاطب دولت یار جنگ مرحوم نہ صرف مشاہیر ایران سے تھے۔ بلکہ سرکار نظام کے اعلیٰ عہدہ دار اور بلند پایہ مورخ اور ادیب تھے ان کی کتابیں "تاریخ دکن" اور "داستان ترکتازانِ ہند" فارسی زبان کی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

محترمہ جہاں بانو بیگم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم ابتدا سے زنانہ ہائی اسکول نام پلی میں ہوئی۔ بی۔اے اور ام۔اے کی ڈگریاں جامعہ عثمانیہ سے حاصل کیں جب آپ ام۔اے میں زیرِ تعلیم تھیں۔ اس وقت کلیہ اناث حیدرآباد میں لیکچرار کی خدمت پر مامور ہو گئی تھیں۔

آپ کو بچپن سے علمی ماحول نصیب ہوا۔ خاندانی روایات کے بموجب لکھنے پڑھنے سے خاص شغف رہا۔ گویا وراثتاً آپ کو علم کی خدمت گزاری ودیعت ہوئی تھی۔

اُردو زبان کی خدمت آپ نثر، نظم، تقریر، ایڈیٹری اور تدریس وغیرہ کے ذریعے کرتی ہیں۔ آپ عصمت کی مشہور مضمون نگاروں میں سے ہیں، نظم کم لکھتی ہیں مگر خوب لکھتی ہیں، خیالات کی بلندی، اسلوب کی صفائی، اور پاکیزگی، لطافت اور رنگینی آپ کے کلام میں موجود

ہیں، آپ کے خیالات پر علامہ اقبالؒ کا بھی کافی اثر پڑا ہے:

تضمین بر نظم شبلی

تنگ آیا ہوں زندگانی سے اپنی قسمت کی بے زبانی سے
شورش و کاوشِ جہانی سے ہے تمنّا کہ چھوٹ جاؤں میں
جس طرح بوئے گل ہو گل سے جدا

جیسے محفل وداعِ یار کے بعد جیسے پروانہ شمع زار کے بعد
جیسے دل رخصتِ قرار کے بعد ہوں پریشان کدھر کو جاؤں میں
ہو گئے اب اپنے باغ و گل سے جدا

نکہت و بوئے گل گلوں کے ساتھ عشوۂ برق بادلوں کے ساتھ
دردِ دل پُر زغم دلوں کے ساتھ کیا کہوں تجھ سے اپنی حالتِ زار
ساتھ تیرے مری خوشی بھی رہی

صبح مستی آشنا ہے شام ہستی ہو چلی مہرِ تاباں کی درخشانی میں پستی ہو چلی
شاہِ انجم چھپ گیا تاروں کی بستی ہو چلی اور مسلط چارسو یک گونہ مستی ہو چلی
شام کے آغوش میں مہرِ تپاں روپوش ہے شب کی تاریکی میں دنیائے عمل بیہوش ہے

صبح کا نکلا ہوا اب کاروانِ منزل میں ہے لیلیٰ شب محوِ خوابِ جانفزا منزل میں ہے
ایک فقط بلبل نوا سنج فغاں محفل میں ہے اور اک ہیجان برپا اس دلِ بسمل میں ہے[۱]

۱؎ علامہ اقبالؒ ؎ ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

ربط ہم دونوں میں دیرینہ ہے نالے ایک ہیں
کشتگانِ غم ہیں اپنے دل کے چھالے ایک ہیں

ہیں رہِ غم کے مسافر اپنی منزل دور ہے
مرحلے طے کرنے ہیں راہِ عمل بے نور ہے[1]
لن ترانی کی صدا باقی ہے کوہ طور ہے
ہاں تنازع للبقا کا جاوداں دستور ہے
اے کہ سن گر آرزوئے منزلِ مقصود ہے
حرکت لامنتہا ہی رازِ ہست و بود ہے

سونے والے جاگ غفلت سے سحر ہونے کو ہے
پھر ہم آغوشِ تجلّی برگ و بر ہونے کو ہے
قافلہ کا کوچ پھر اے بےخبر ہونے کو ہے
تو پڑا سوتا ہے کیوں؟ کیا دیر ہونے کو ہے

بدرؔ محترمہ بدرالنسا حیدرآبادی

بدرالنساء نام اور بدرؔ تخلص ہے۔ مولوی آغا یاور علی صاحب ناظم کورٹ آف وارڈ ریاست حیدرآباد کی شریکِ حیات ہیں، تعلیم خانگی طور پر ہوئی ہے، نثر اور نظم دونوں لکھتی ہیں، کلام کا انداز یہ ہے:-

سنبھل اے عندلیبِ زار بیتابی سے کیا حاصل
چمن میں رہ گئی فصلِ بہار آہستہ آہستہ
بدرؔ آواز آتی ہے کفن سے کشتۂ غم کی

---

[1] اس بند اور آخری بند کے خیالات پر علامہ اقبالؒ کا اثر نمایاں ہے اس بند کو پڑھ کر علامہ اقبالؒ کے عمل اور خودی کا درس یاد آ جاتا ہے اور آخری بند میں علامہ کی امید کی جھلک موجود ہے،

لحد پر ڈالے مسنتِ غبار آہستہ آہستہ [1]

بدرؔ ۔ محترمہ بدر جہاں قریشی

بدر جہاں نام اور بدرؔ تخلص ہے ۔ آپ کا وطن خورجہ ہے ۔ شعر و شاعری کی طرف فطری رجحان ہے آپ کا ذوقِ سلیم اور مذاق ستھرا ہے ۔ آپ کے کلام میں رومانیت کے چھینٹے بھی ملتے ہیں ۔

لطفِ شام

شام کی کالی زلفوں میں اک تارا جھلمل کرتا ہے
پیشانی پر بندی ہے، یا شب کا حُسن نکھرتا ہے
دن کی اُلجھن ختم ہوئی، مدہوش جوانی سے کہہ دو
منزل رہ رہ کر کاٹے، دریا کی روانی سے کہہ دو
رنگِ مشکیں چھایا ہے، اک بوئے عنبر مہکی ہے،
غنچہ غنچہ بیخود ہے، پتّی پتّی مہکی ہے
فطرت اپنے نازوں کے پالوں کو لوری دیتی ہے،
دن بھر کا غم، غم کی کلفت، گویا چھینے لیتی ہے
بدرؔ چلو کچھ دل بہلائیں باغ کے رنگیں گوشوں میں
قدرت کی گلکاری دیکھیں پودوں اور گلبوٹوں میں

---

[1] آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزارِ ما بس نازک است شیشہ دل در کنارِ ما
یہ فارسی شعر شاہزادی زیب النساء مخفی کا بتایا جاتا ہے ۔

فنا ہی کیا، نہ زیست کیا، راز بقا کیا
جب اسکے ہیں پھر اس کا پوچھنا کیا

نہیں منت کش سحر مسیحا
دیا ہے اس نے دردِ لا دوا کیا

ہوئی مدہوش اک ساغر میں محفل
یہ مے شیشہ میں تھی نورِ خدا کیا

نہیں دنیا میں کوئی محرمِ راز
سناؤں حال دل اپنا بھلا کیا[2]

سمجھ تو دولت کونین پالی
ملا ہے یہ دلِ دردآشنا کیا

نگاہیں کر رہی ہیں رازِ دل فاش
ترے خاموش رہنے سے ہوا کیا

فنا میں ہے بقا کا رازِ پنہاں
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

وفا ہی اُٹھ گئی دنیا سے جب بدرؔ
پھر اپنے اور پرائے کا گلا کیا

بشیرؔ ۔ محترمہ بشیر النساء حیدر آبادی

بشیر النساء نام اور بشیرؔ تخلص ہے، مولوی ضامن علی صاحب کنٹریکٹر کی شریکِ حیات ہیں، حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ خانگی طور سے تعلیم پائی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہے۔ کلام میں لطافت اور پاکیزگی موجود ہے آپ اکثر زنانہ جلسوں میں بھی نظمیں سناتی ہیں، آپ عصمت کی مخصوص شاعرات سے ہیں۔

---

[1] محترمہ نے یہ غزل دہلی کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی جو ۲۶ / مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی زیرِ صدارت ہوا تھا۔

[2] غالبؔ ؎ آشنا غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا ؛ ورنہ کسکو میرے افسانہ کی تابِ استماع

ہوا خواہانِ دولت نے ارادت کا ثمر پایا
بہار آئی، سنہری رُخ پہ پھولوں کے نکھار آیا
زبرجد سے مزیّن تختہ ہائے مرغزاراں ہیں
کہیں قمری کے نغمے ہیں کہیں طاؤس رقصاں ہیں
سپیدی چھا رہی ہے لاجوردی آسمانوں پر
چلی ہیں رات کی تاریکیاں انجم کے شانوں پر
طیورِ خوشنوا شاخِ شجر پہ چہچہاتے ہیں
تبسّم ریز ہیں غنچے، گُلِ تر کھِل کھلاتے ہیں
کدورت دل سے دھوتی ہیں یہ موجیں جوئیاروں کی
طیورِ صبح کی تانیں، صدائیں آبشاروں کی
گیاہِ سبز پر بکھرے ہوئے شبنم کے موتی ہیں
عروسانِ بہاری صبحدم موتی پروتی ہیں
عجب پُر کیف عالم ہے، عجب دلچسپ منظر ہے
مسرت بانٹنے میں منہمک قدرت سراسر ہے

محسنِ اعظم

راشد المخبری ادیبِ پاک ہیں روشن ضمیر
آج تک ہے نیری ہستی آپ ہی اپنی نظیر
تیرے زرّیں کارناموں پر ہے نازاں زندگی

تو نے دی ہندوستاں کو خانگی آسودگی
آہ وہ دورِ تباہی وجودِ خانہ سوز
یاد ہے وہ عہدِ رفتہ کا سبق ہم کو ہنوز
صنفِ نازک نام ہے جن ناتواں افراد کا
ہر زمانے میں رہا جس کو گلہ بیداد کا
ظلم کیا کیا ڈھائے اس پر جذبۂ خود کام نے
کب رکھا آسودہ اس کو گردشِ ایام نے
الغرض کیا زمانہ اس پہ گذرا ناگہاں
بادۂ غفلت سے جب سرشار تھا ہندوستاں
تختۂ مشقِ ستم تھی مورد آفات تھی
ایک مٹی کا کھلونا یعنی عورت ذات تھی
خود شریک زندگی سے آدمی کو عار تھا
خاک آلودہ سراسر دامنِ زر تار تھا
علم کی تحصیل سم اس کے لئے لاریب تھا
خواہ کچھ پڑھ لے، مگر لکھنا سراسر عیب تھا
ایک کمسن طفل کی گھڑکی سے ڈر جاتی تھی وہ
زندگی بھر اس طرح گھٹ گھٹ کے مر جاتی تھی وہ
تھا ستم کا دور دورہ دادرس کوئی نہ تھا
شمع محفل تھی فروزاں ہم نفس کوئی نہ تھا

گھر جہنم بن چکے تھے جہل کی بیداد سے
ایسے میں اک غمگسار تھا جہاں آباد سے
مرحبا اے راشد الخیری ادیبِ حق شناس
برگزیدہ تیری ہستی پاک تھا تیرا قیاس
مرحبا اے حامئ نسواں شفیقِ بے کساں
اے سزاوارِ عقیدت نازشِ ہندوستاں
اے پرستارِ صداقت قابلِ صد احترام
آج تک زندہ ہے اور جاں بخش ہے تیرا پیام
اے ادیبِ پاک طینت، اے حکیمِ دادرس
کتنے موزوں وقت پر تو نے بجایا ہے جرس
تیرے دردانگیز نالے کارگر کیسے ہوئے
تیرے دلکش ساز سے آباد ہندی گھر ہوئے
خامہ فردوس آفریں تھا اور نوائیں خانہ ساز
تیری ہر اک آہ سمجھاتی رہی فطرت کے راز
حق و باطل، خیر و شر سے باخبر تو نے کیا
نظمِ استبداد کو زیر و زبر تو نے کیا
تو نے بخشی ہے حقوق و حریت سے آگہی
پھونک دی تو نے گھروں کی زندگی میں زندگی
خون رو رو کر رلایا سنگ دل افراد کو

تیری آہوں نے تپایا ہے دلِ فولاد کو
طبقۂ اہلِ قلم گم شعبدہ کاری میں تھا
اور تو تنہا خواتین کی طرفداری میں تھا
کوششیں تیری رہیں ذرۂ درخشاں کے لئے
وقف کر دی زندگی امدادِ نسواں کے لئے
تیری جاں سوزی برائے طبقۂ مظلوم تھی
تیری تحریروں کی دنیائے ادب میں دھوم تھی
لکھنے والوں سے جدا لکھنے کا تیرے ڈھنگ تھا
رنگ آمیزی پہ تیری اک زمانہ دنگ تھا
تیری صبح و شام سے ہر پانشانِ زندگی
تیری صبح و شام و شب سے زندگی پائندگی
توڑ ڈالے ہیں بندِ غلامی تیری تحریکات نے
گُر پنپنے کے سکھائے تیری تصنیفات نے
تیری دلسوزی کا نسوانی ادب ممنون ہے
جس کی رگ رگ میں رواں تیرے جگر کا خون ہے
زندۂ جاوید تیرے کارنامے اور پیام
صنفِ نسواں پر سدا واجب ہے تیرا احترام
آج اے غمخوارِ نسواں بے نیازِ غم ہے تو
دامنِ رحمت میں شاداں محسنِ اعظم ہے تو

بیگم اسمٰعیل

آپ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کی شریکِ حیات تھیں۔ اور اشرف زمانی نام تھا۔ آپ نے مئی ۱۹۴۰ء میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ آپ کے دل میں بڑا قومی و اسلامی درد تھا۔ ادب سے آپ کو خاص شغف تھا۔ آپ کے ادبی کارنامے اور قومی جذبات قابلِ یادگار ہیں۔ آپ میرٹھ میں ایک حمیدیہ زنانہ اسکول قائم کر گئی ہیں۔ شعر بھی کہتی تھیں آپ کے کلام سے بھی قومی و ملّی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا
توکل دولتِ دارین کا طبل و نشاں ہوگا

خدا کے واسطے اے مسلمِ خوابیدہ اٹھ تو بھی
ترا یہ خوابِ غفلت ایک دن خوابِ گراں ہوگا

مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساسِ خودداری
نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اسے خواہراں ہوگا

اگر ہو جائے پیدا تیرے دل میں جذبۂ خدمت
ق
تو اے خاتونِ مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا

کہ تیری گود میں پلتی ہے قومِ مسلمِ عالی
توجہ سے تری ہر فرد، فردِ رفتگاں ہوگا

بیگم افضال

آپ ڈاکٹر محمد افضال حسن صاحب کی شریکِ حیات ہیں۔ کلام

اکثر خاتونِ مشرق میں شائع ہوتا ہے۔ اکثر اسلامی شاعری کرتی ہیں اور حفیظ جالندھری کے "شاہنامہ اسلام" کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔

تعمیرِ حرم

اٹھائی جا رہی تھیں جب خدا کے گھر کی دیواریں
تو معمارانِ بیت اللہ نے سوچا کہ کیا مانگیں
معاً آئی لبوں پہ یہ دعا اے خالقِ اکبر
تری رحمت ہو اس گھر پہ یہاں کے رہنے والوں پر
کرم سے تیرے اس صحرا میں ایسا شخص پیدا ہو
کہ جس کی ذات، الطافِ خداوندی کا چشمہ ہو
جو بیت اللہ کے آداب انسانوں کو سکھلائے
طریقے جو عباداتِ خداوندی کے تبلائے
جو قلب و ذہنِ انسانی کو اک تابندگی بخشے
جہانِ کُن فکاں کی روح کو اک زندگی بخشے
وہ اُمّی جو کتابِ زندگی پڑھتا ہوا آئے
خدائی علم و حکمت کی یہاں تعلیم فرمائے
ہوئی مقبول معمارِ حرم کی یہ دعا ساری
کہ جلوہ ہے ہوا وہ چشمۂ لطفِ خدا جاری
جو ساری نوعِ انسانی کا رہبر اور ہادی ہے
وہ جس کے نقشِ پا سے شاداب ہر صحرا و وادی ہے

جو حامل ہے کتاب اللہ و قانون الٰہی کا
وہی ہے رہنمائے آخری ساری خدائی کا
لوا و الحمد جس کے ہاتھ میں ہو گا قیامت میں
اسی کی بس سنی جائے گی انساں کی شفاعت میں

بیگم رضا

آپ محترم جناب رضا صاحب کی شریک زندگی ہیں، اور صادق منڈی میں مقیم ہیں۔ خاتون مشرق کی شاعرہ ہیں۔ کلام کا رنگ پختہ ہے۔ اس میں جذبات کی گہرائی، صداقت جوش اور اثر موجود ہے۔ آپ کی غزلیں بہت پُر کیف ہوتی ہیں۔

علاج گردش لیل و نہار کر نہ سکی

خزاں نصیبی کی حد ہو چکی کہ سنتی ہیں
کبھی تصور فصل بہار کر نہ سکی
فریب خوردہ طبیعت نے تیرے وعدوں پر
ہزار چاہا مگر اعتبار کر نہ سکی
تڑپ تڑپ کے کٹی عمر سوز حسرت میں
کبھی یہ درد جگر آشکار کر نہ سکی
فلک نے چھین دیا دل کی آرزوؤں کو
علاج گردش لیل و نہار کر نہ سکی
نہ چین لینے دیا دل کی بے کلی نے مجھے
یہ ٹیس مجھکو فراغت شعار کر نہ سکی

بیگم رسوا

آپ حضرت رسوا رنگپوری کی زوجہ ہیں، کلام میں پختگی و متانت ہے:

خیالات بلند اور طرزِ بیان پاکیزہ و لطیف ہے -

فنا ہو کے مجھے لطفِ بقا معلوم ہوتا ہے　　جدھر آنکھیں اُٹھاتا ہوں خدا معلوم ہوتا ہے
بلائے ہاں بلائے بیکسی گورِ غریباں کی　　کوئی بھری لحد کو ڈھونڈھتا معلوم ہوتا ہے
الٰہی خیر پھر مجھکو کسی کی یاد آئی ہے　　جگر میں آج درد اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے
ابھی ٹوٹی ہوئی امید میں کچھ جان باقی ہے　　ابھی اے ہمنشیں کچھ آسرا معلوم ہوتا ہے

وہی کعبہ میں ہے رسوا وہی بتخانہ میں بھی ہے
ہمیں تو ذرّے ذرّے میں خدا معلوم ہوتا ہے

بیگم عروج

آپ حضرت عروج بدایونی کی شریک حیات ہیں، خاتونِ مشرق کی شاعرہ ہیں، عموماً نعتیہ مضامین نظم کرتی ہیں - کلام میں صفائی و روانی موجود ہے -

نعت

بشر کیا لکھ سکے گا مدحت پُرعظمت محمدؐ کی
خدا قرآن میں کرتا ہے خود مدحت محمدؐ کی

نہ کیوں روشن تریں ہو عزت و حرمت محمدؐ کی
عیاں ہے سورۂ والشمس سے صورت محمدؐ کی

تمنّا خون بنکر دوڑتی پھرتی ہے رگ رگ میں
مری ہستی کی گویا روح ہے الفت محمدؐ کی

ھو اللہ احد کا نعرہ سنکر بت ہوئے اوندھے
تعالی اللہ چھائی اس طرح ہیبت محمد کی[1]

اسامہؓ سے انسؓ سے اور بلالؓ و زیدؓ سے پوچھو
کہ ان سب پر رہی ہے کس قدر شفقت محمد کی

کھلے جنت کے دروازے بڑھے رضواں بھی لینے کو
گنہگاروں کو لیکر آئی جب رحمت محمد کی

بشر کی کیا حقیقت ہے وہ مخدوم دو عالم ہیں
کیا کرتے تھے جبرئیلِ امیں خدمت محمد کی

ہوئی معراج پہنچے عرش پر خالق سے باتیں کیں
یہ عزت ہے محمد کی، یہ رفعت ہے محمد کی

قسم کھا کر کہا ہے نحن اقرب کہنے والے نے
وہ مجھ سے دور ہے جس پر نہیں رحمت محمد کی

(پ)

پروین

زینت پروین نام اور پروین تخلص ہے، بدایوں کی رہنے والی ہیں، عموماً

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے (شکوہ)

اخلاقی و اصلاحی مضامین نظم کرتی ہیں۔

معصوم بچوں سے خطاب

صنعتِ صانعِ قدرت کا کرشمہ تم ہو
حسنِ معصوم کا معصوم نمونہ تم ہو
سارے گھر کے لئے دلچسپ تماشہ تم ہو
پر میں واقف ہوں کہ ناواقفِ دنیا تم ہو

اس لئے فرض ہے مجھ پر کہ دعا دوں تم کو
اور پھر عالمِ دنیا بھی دکھا دوں تم کو

چادرِ فاطمہ زہراؑ کا ہو سایہ تم پر
پرتوِ عصمتِ مریمؑ ہو ہمیشہ تم پر
نظرِ خاصۂ خاصاں ہو خدایا تم پر
لطفِ باری تعالیٰ ہو ہمیشہ تم پر

قوم کی اپنی روایات تمھیں یاد رہیں
فاطمہ بی بیؑ کی عادات تمھیں یاد رہیں

گلشنِ علم کی نوخیز کلی بن کے رہو
نورِ انجم کی شعاعِ ازلی بن کے رہو
صفحۂ زیست کا عنوانِ جلی بن کے رہو
اپنے بیگانوں کی نظروں میں بھلی بن کے رہو

حسنِ انوار سے تسخیر دوبالا ہو جائے
نورِ عادات سے گھر بھر میں اُجالا ہو جائے

باعثِ زینتِ کاشانۂ انجم بن کر
اور نسیمِ چمنستاں کا تبسم بن کر
بربطِ خلق کا پاکیزہ ترنم بن کر
شکلِ معصوم کا دلچسپ تکلم بن کر

حسنِ سیرت کا سبق سیکھ کے ماں سے اپنی
ساری دنیا کو سنا دینا زباں سے اپنی

پروین۔ محترمہ عابدہ خانم

حالات اور کلام کے لئے دیکھئے "نسرین"

پنہاں۔ محترمہ سپہر آرا خاتون المخاطب بہ رابعہ بریلوی

آپ کے حالات آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے اپنی نگرانی میں لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

"محترمہ رابعہ خاتون پنہاں بریلوی دختر دوئم مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی پی آئی آفس الہ آباد ۷ اگست ۱۹۰۶ء کو بمقام سہارنپور تولد ہوئیں۔ بریلی کے ایک شریف اور ممتاز خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی تعلیم کافی حد تک اپنے والدِ مرحوم سے گھر پر حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی۔ آپ کی نثر ابتدا ہی سے آپ کے ستھرے، پاکیزہ اور سنجیدہ دماغ کی آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی آپ کا سوادِ خط بھی بہت پاکیزہ ہے۔ رسائل نے آپکا عکس سوادِ خط بھی شائع کیا ہے ۱۹۲۱ء سے شاعری کا ذوقِ فطری منصۂ شہود پر آیا۔ ابتداءِ شاعری ہی سے فارسی سے زیادہ شوق رہا اور ابتدائی فارسی غزلیں اور نظمیں ایسی تحریر کیں کہ استادانِ وقت نے لوہا مان لیا۔ ابتداءِ ذوق میں قبلہ ماجد علی صاحب سے اصلاحِ سخن حاصل کی۔ ایک سال بعد قبلہ نے آپ کو طالب علی صاحب ایڈوکیٹ الہ آبادی کی شاگردی میں دیدیا

چنانچہ دو سال طالب علی صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی الہ آبادی نے اصلاح سخن و نثر کی۔ پھر جناب نے نثر و نظم کا پروانہ معراج دیدیا اور ضرورت اصلاح سے بالاکردیا۔ آپ کا اُردو۔ فارسی کلام شروع ہی سے پختہ اور عمیق رہا۔ شروع زمانہ سے نظمیں۔ غزلیات اور افسانے وغیرہ برابر ملک کے چیدہ رسائل و اخبارات میں نہایت اعزاز و افتخار کے ساتھ شائع ہوتے رہے ۱۹۲۵ء میں محترمہ اپنے عزیز والد صاحب قبلہ کی وفات سے بہت دل شکستہ ہوگئیں اور اسی سال الہ آباد سے اپنے وطنِ مالوف بریلی تشریف لے آئیں۔

جنوری ۱۹۲۸ء میں آپ کی شادی آپ کے خاندانی عزیز جناب صوفی صغیر حسن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی پرنسپل اسلامیہ کالج الہ آباد سے ہوئی جن کے ساتھ آپ کچھ عرصہ دہلی مقیم رہیں اور آج کل الہ آباد میں قیام پذیر ہیں۔ یہ شادی آپ کی والدہ صاحبہ اور آپ کے دیگر اعزا نے اپنے حسبِ منشا کی، اور بفضلہ تعالیٰ آپ نے اپنی حسبِ طبیعت نہایت عالی دماغ اور لٹریری شوہر پایا۔

اپنے والد کی یاد میں آپ نے ۱۹۲۹ء میں ایک منظوم مجموعہ بعنوان "اشکِ خونیں" شائع کرایا تھا جس سے آپ کے اس عشق کا جو آپ کو والد صاحب مرحوم سے تھا، پتہ چلتا ہے۔

آپ کے نظموں اور افسانوں کے مجموعے عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔

آپ ابتداءِ عمر سے نہایت متشرع اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔ بشرعی پردہ کو پسند فرماتی ہیں۔ آپ کو دستکاری، سلائی، کھانا پکانا۔ اور جملہ امور

خانہ داری میں کافی درک ہے۔ آپ کے پانچ بچے ہیں جس میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ آپ کے خصائل نہایت پاکیزہ ہیں۔ آپ رقیق القلب، خوش طبع، خوش خلق، اور ہمدرد ہیں، اور زنانہ سوسائٹی میں آپ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔"

محترمہ رابعہ خاتون پنہاںؔ کا شمار موجودہ دور کی چند مخصوص اور ممتاز ترین شاعرات میں ہے۔ آپ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی کی بھی اچھی شاعرہ ہیں[1] کلام میں پختگی موجود ہے، جذبات اور واردات قلب کی ترجمانی پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ بڑی خوش فکر اور خوش گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے اشعار لطافت لطیف و پُر کیف ہوتے ہیں اور آپ کی قادر الکلامی کا پتہ دیتے ہیں آپ کی زبان پُروقار ہے اس میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہے۔ ایسی اُردو شاعرات میں اس قدر بلند اور عمدہ کہنے والی خواتین کم ہیں۔

---

[1] محترمہ پنہاںؔ کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے :-

گفتند کہ از عشق طپاں رستہ نکوتر　　گفتم کہ با وج طپشش رُستہ نکوتر
گفتند دریں راہ خبر ہیچ نہ آید　　گفتم کہ ز دانستہ نہ دانستہ نکوتر
گفتند کہ چشمش ہمہ دم خونِ جگر ریزد　　گفتم کہ ز آلایش غم شستہ نکوتر

ولا از رمزِ ہستی باخبر زی

ز سودائے سکوں بیگانہ تر زی

خود محترمہ نے اپنے کلام کا جو انتخاب ارسال فرمایا ہے یہ ہے:۔

تجلّیوں نے نقاب اُلٹا۔ لبوں پہ آیا حسین تبسّم
نوید آئینۂ تخیّل تجھے وہ بےخود بنا رہے ہیں
عزیز خاطر ہے باغباں کی قفس کے خوگر بھی ہو گئے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے فصلِ گل میں نشیمن اپنا مٹا رہے ہیں

زیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ ششیۂ چشم میں شراب کا رنگ

[پچھلے صفحہ سے] لیلۃ المعراج

نہادہ بہ فرقِ فلک تاجِ امشب شدہ بحرِ انوار موّاج امشب
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

عطا کردہ تابش بہ عقدِ ثریّا ضیائے منزّہ دہد اختراں را
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

بہ فردوس رنگیں پیامِ مسرت چمن در چمن اہتمام مسرت
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

بہ اطراف گردوں بہارِ تجلّی بہ قرصِ قمر لالہ زارِ تجلّی
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

مژدہ باد اجذبۂ خاموشِ شوق — اک تجلّی آج زیرِ بام ہے
پیچ و تابِ زلفِ پیچاں خم بہ خم — کون کہتا ہے جنوں ناکام ہے
کارواں کیا نزدِ منزل آگیا — آستاں پر کیوں ہجومِ عام ہے
شیشۂ مینا میں پنہاں برق ہے — حسنِ پُرفن آج زیرِ دام ہے

نیاز و ناز نامقبول دونوں[1] — یہ سمجھی ہیں کہ ہے تیری رضا کیا
جبینِ حسن پہ سرخی سی دوڑی — نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا

---

[1] ۔ روشؔ صدیقی ؎ تمنّا خطا جرم ترکِ تمنا ؛ خطا کاریاں ہیں خطا کاریاں ہیں

(پچھلے صفحہ سے)

جمالش زینتِ دل بود شب جائیکہ من بودم — بہ چشمِ دہر باطل بود شب جائیکہ من بودم
زتیغِ جنبشِ ابروئے آں شوخ کماں سازی — دلِ من نیم بسمل بود شب جائیکہ من بودم
نگاہم بر تجلّائے رخِ آئینہ رخسارے — سرم بر پائے قاتل بود شب جائیکہ من بودم
بپرس از رہروِ کاملِ طریقِ عشق والفت را — سرِ تلوار منزل بود شب جائیکہ من بودم
خروش را من ندانستم چو دانم صدرا صوفی — گل صد برگ محفل بود شب جائیکہ من بودم
دلم پرداخت با بادِ جمالِ دوستِ او بامن — وجودِ غیر باطل بود شب جائیکہ من بودم
چساں دل محو میا زد زبادم کیف دوشینہ — دلم نخچیرِ قاتل بود شب جائیکہ من بودم
زفیضِ نرگسِ مستانِ ساقی شد بپا محشر — جہانِ بیخبرِ دل بود شب جائیکہ من بودم
خطِ زنجیں کہ بر پیشانیٔ بسمل کشیدہ تیغ — نشانِ عشقِ کامل بود شب جائیکہ من بودم
خمِ زلفِ نگارِ کرد پنہاں طرفہ اعجازے — خیالم در سلاسل بود شب جائیکہ من بودم

نہ جانے کیا سمجھکر ہنس پڑے ہیں
یہ ہے تمہید ذوقِ اعتنا کیا

نہ ہونا بھی بقدر یک نفس ہے
ہماری ابتدا کیا ۔ انتہا کیا

جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں
خدا معلوم، ہے رسمِ وفا کیا[1]

---

[1] یہ ایک طرحی غزل کے کچھ اشعار ہیں ۔

[پچھلے صفحہ سے] محترمہ کی یہ غزل بہت بلند اور قابل تحسین وستایش ہے مگر اس زمین میں جو امیر خسروؒ کی نکالی ہوئی ہے خود امیر خسروؒ کی غزل آج بھی اپنا حریف تلاش کررہی ہے ۔ ملاحظہ

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری پیکر نگارے سروقدے لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

رقیباں گوش برآواز او در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

اسی زمین میں شاہ تراب علیؒ اور اوحدیؒ نے بھی اچھی غزلیں لکھی ہیں ۔
شاہ تراب علیؒ کی غزل یہ ہے ۔

نہ ہوشم بود نے دل بود شب جائیکہ من بودم
نمی دانم چہ محفل بود شب جائیکہ من بودم

رقیباں در پرش بودند من دور از درش ہیہات
چہ حسرتہا کہ حاصل بود شب جائیکہ من بودم

نشد از زلفِ خونخوارش مجال بوس رخسارش
بہ مخزن مار حائل بود شب جائیکہ من بودم

بدل ہرگز نہ آید بازہ از کوئش کسے یارب
بدلچسپی چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم

ذیل کا مزید انتخاب راقم الحروف کا کیا ہوا ہے

آہ وہ ایامِ عشرت آہ وہ لیل و نہار
واپس آ سکتے نہیں اس زندگی میں نہار
دورِ خوش کامی گیا عہدِ نشاط افزا گیا
بن گئی بزمِ مسرت آہ اک ماتم سرا
زندہ اب وہ محفلِ ویرینہ ہو سکتی نہیں
آہ وہ عہدِ مسرت مل نہیں سکتا کہیں
چشم ارماں خونچکاں قلبِ تمنا بیقرار
آہ اُمیدیں ہیں یوں ماتم زدہ و سوگوار
کیا خبر تھی اسطرح لٹ جائیگا یہ کارواں
کیا خبر تھی درپئے آزار ہے یوں آسماں
آہ یہ عصر مسرت خواب سا ہو جائے گا
حشر تک اسکا تصور آہ یوں تڑپائیگا

(پچھلے صفحہ سے) تراب از تیرِ مژگانش جہانے نیمجاں می شد
عجب انبوہِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

اور اوحدیؔ کی غزل یہ ہے :-

نقاب از روئے او وا بود شب جائیکہ من بودم
زجنبش شور و غوغا بود شب جائیکہ من بودم
ہمہ مستی و مدہوشی حریفاں را کہ بود آخر
زچشمِ ساقیٔ ما بود شب جائیکہ من بودم
زپیشِ شمع رخسارِ نگارِ ما چو پروانہ
زہر سو رقص دلہا بود شب جائیکہ من بودم
غم دخمخانہ دہم بلوہ وہم جام وہم مطرب
ہماں آں دلبر ما بود شب جائیکہ من بودم
زجامِ لعل اوحدی پیرِ مغاں ساقی
ہمہ مدہوش و شیدا بود شب جائیکہ من بودم

فغانِ پنہاں

وہ دن کہاں ہیں یارب جب ہم بھی شادماں تھے
جب ہم نوا ہمارے یہ ارض و آسماں تھے
رنگینیٔ عدن سے معمور تھا گلستاں!
نکہت فروشِ گل تھے اشجار گل فشاں تھے
تھیں عنبریں ہوائیں مخمور تھیں فضائیں
قطراتِ ابرِ رحمت سبزہ پہ دُرفشاں تھے
نہروں کا وہ ترنّم، موجوں کا وہ تراکم
اس زمزمہ پہ نازاں ہاں نغمۂ جناں تھے
صُبحیں صباحت افزا شامیں تھیں عطر آرا
راتیں مہ منوّر دن شمس ضوفشاں تھے

(اشکِ خونیں صفحہ ۱۹، ۲۰)

بیکسی کی ایک دنیا دیدۂ لبریزِ خوں　　آہ انفاسِ دلِ مضطر ہیں محرومِ سکوں

(اشکِ خونیں صـ۳۵)

ہاں پدر کا غم یتیمِ مضطرب کے دل سے پوچھ　　حسرتِ منزل کسی گم کردۂ منزل سے پوچھ
لذتیں دردِ تپش کی دیدۂ بسمل سے پوچھ　　آہ ناکامی کی حسرت سعیٔ لاحاصل سے پوچھ

(اشکِ خونیں صـ۳۵-۳۶)

میری قسمت کی طرح اُف تم بھی اب خاموش ہو　　میں سمجھتی تھی کہ تم غمخوار ہو غم کوش ہو

میری حسرت کی طرح تم پر تو ایسی چھا گئی
دل تمھارا اُف نہ میری آہ کچھ تڑپا گئی

یہ خموشی یہ سکوت اُف کس خطا کی ہے سزا
کچھ تو بتلاؤ مجھے بہر خدا بہر خدا

کی تمھاری گفتگو نے بھی خموشی اختیار
رہ گئی خاموش ہو کر آہ چشم بیقرار

[اشک خونیں سنہ ۳-۳۷]

الہ آباد سے

اے الہ آباد اے بیت السکون دار الاماں
زینت گردون گرداں روکش حسن جہاں

اے کہ تیرا نام تھا سرمایۂ صد آرزو
ذات تیری گوہر امید کی تھی آبرو

اے کہ تیرا ذکر نور دیدۂ مشتاق تھا
اے کہ تو قلب حزیں کا وجہ صد تسکیں رہا

اے کہ تھیں تیری ہوائیں نکہت بستاں فروش
اے کہ تھیں تیری فضائیں گلشن رضواں فروش

اے کہ دریا تھے ترے تسنیم و کوثر آشنا
قطرہ قطرہ جن کا رشک چشمۂ حیواں تھا

اے کہ تیرے خار تھے گلہائے جنت آفریں
تھی گیاہ خشک رشک گلبن غنچہ نشیں

اے کہ تیرے روز روشن تھے جہان انبساط
جن کے ہر لمحہ سے عنبر پاش تھی بوئے نشاط

اے کہ تھیں راتیں تری اک بقعۂ نور سکوں
جن کی خاموشی طمانیت کا تھی حسن فسوں

جنت رنگیں تھیں شامیں تیری برسات کی
بادۂ کوثر سے اٹھتی تھیں گھٹائیں رات کی

اے کہ تیری فصل گل تھی روکش صبح جناں
لالہ و گل سے ٹپکتی تھی شراب ارغواں

اے کہ تیرے ذرہ ذرہ میں تھا اک نور نشاط
اے کہ ہر ذرہ میں تھی دنیائے مسرور نشاط

یاد بھی تجھکو کبھی آتا ہے اے رنگیں ادا
سر فروشان رہ الفت کا انداز وفا

یاد بھی آتا ہے اے بستان جنت آشنا
نغمۂ [illegible] محبت بلبل بیدل کا

یاد بھی آتی ہے تجھکو اے گلِ جنت فروش
اپنی جاں افزا شمیم نکہتِ اُلفت فروش

یاد بھی آتی ہے تجھکو اے فلکِ رفعت کبھی
اپنے خورشیدِ منزہ کی درخشاں روشنی

محفلِ عیش و مسرت کچھ تجھے آتی ہے یاد
شمعِ خورشید آستاں کی ضوئے نور خندہ زاد

یاد ہیں کچھ خاتمِ جذبِ وفا کے دل نشیں
وہ نقوشِ الفت و صدق و محبت آفریں

جن کی ہر تابش میں تھی دنیائے رنگین وفا
جس کے ہر لمحہ میں تھی صدق و محبت کی ضیا

آہ لیکن اے تغافل آزما غفلت نواز
کس قدر جانسوز ہے تیرا طریقِ بے نیاز

کر دیے نذرِ فراموشی وہ رخشندہ گہر
جن کے ضو پر اہلِ دل قربان کرتے تھے سر

توڑ ڈالا شیشۂ خورشید آرائے وفا
جس کی تابش پر فدا کرتے تھے دل اہلِ صفا

آہ وہ پیمانِ الفت، آہ وہ عہدِ وفا
تو نے سنگِ بے نیازی سے شکستہ کر دیا

"اہلِ دل نقشِ وفا کو یوں مٹا دیتے نہیں"
دولتِ صدق و صفا کو یوں لٹا دیتے نہیں

ہے کسی کے سر میں الفت کا جنوں اب تک وہی
ہے دلوں میں آج تک شمعِ وفا کی روشنی

ہاں پرستارانِ الفت آج تک بیتاب ہیں
تیرے شوقِ دید میں اُف ماہیِ بے آب ہیں

ہے ابھی تک دل میں برپا یہ ہجومِ آرزو
کاش آ جائے کہیں سے تیری عنبر بیز بو

جنبشِ تیغِ اجل کی یہ ستم آرا جفا
تیری جنت زا فضاؤں سے جدا یوں کر دیا

دورِ گردوں نے چھڑایا اف تری آغوش سے
دور پھینکا آہ تجھ سے گردشِ ایام نے

شکل تیری کاش پھر اک بار آ جائے نظر
یہ تجلّی دیدۂ بیتاب کو کر دے — قمر

کاش تیری خاک سے آنکھوں کی پھر تابش بڑھے
دل ہرا جنت بنے اُف پھر ترے دیدار سے

غم کا دریا موجزن ہے بحرِ محسوسات میں
اشکِ خونیں کا تلاطم قلزمِ جذبات میں

جوشِ غم سے طاقتِ گفتار ہوتی ہی تمام
السلام اے مرکزِ جذبِ تمنا السلام

(اشکِ خونیں صنہ ۴۳ و ۲۴۴)

ہلالِ رمضاں

مژدہ باد اے مومنانِ تشنہ کام / جلوہ افگن ہو گیا ماہِ صیام
چشمِ روشن ہے تجلّی آفریں / مرجعِ تنویرِ محرابِ جبیں
جنبشِ مژگاں ہے پیغامِ سرور / عکسِ ابرو بارشِ امواجِ نور
ہیں لبِ نازک تبسّم آشنا / جلوۂ رخسار ہے تقدیس زا
آگیا ماہِ مبارک مژدہ باد / قلب و دل ہیں کس قدر مسرور و شاد
السّلام اے مخزنِ فیضِ عطا / السّلام اے معدنِ صدق و صفا
السّلام اے رحمتِ ربِّ کریم / السّلام اے لطفِ رحمٰنِ رحیم
عظمتِ توحید کے سرمایہ دار / برکتِ تقدیس کی رنگیں بہار
ہیں جلو میں رحمتیں جلوہ نشاں / ہر قدم سے قدس کی تابانیاں
نوبہارِ گلشنِ اسلام ہے / باخدا کا بہتریں انعام ہے
ہے دوائے دردمندانِ حزیں / مرہمِ تسکینِ قلبِ غم نشیں
منبعِ راحت ہے بہرِ عاشقاں / مژدۂ رحمت برائے عامیاں
قاصدِ رنگیں لقائے دوست ہے / تو پیامِ دلربائے دوست ہے
متصل کرتا ہے تو معبود سے / روحِ ساجد کو درِ مسجود سے
قرب بندوں کو خدائے پاک کا / دامنوں میں تیرے ہوتا ہے عطا
برکتیں ہیں ہر قدم سے جلوہ بار / رحمتیں ہیں ساتھ تیرے بےشمار
ہیں پیامِ لطف یہ لیل و نہار / شانِ رحمت ہر طرف ہے آشکار

بخششِ مولا کا ہوتا ہے وفور
رحمتِ رحمان کرتی ہے ظہور

جوش میں آتا ہے دریائے کرم
بخششیں ہوتی ہیں ہر لحہ رقم

عفو ہوتی ہیں خطائیں روز و شب
رحمتیں ہوتی ہیں حاصل بے طلب

اے مہ تقدیس پرور دائما
تو رہے اسلام پر رحمت فزا

برکتیں تیری تجلّی زار ہیں
تا قیامت گلشنِ اسلام میں

مومنوں کو اے خدا توفیق ہو
وہ بجا لائیں ترے احکام کو

منحرف ہرگز نہ ہوں اسلام سے
حُبِّ مذہب اُن کی رگ رگ میں رہے

ہے دعا پنہاں کی اے ربِّ جہاں
نورِ ایماں سے رہے دل ضوفشاں

شبِ ماہ

حُسن کی شفاف لہریں مصدرِ صد خامشی
ایک سکوتِ مستقل برسا رہی ہے روشنی

منبع انوار تاباں ہے بساطِ آسماں
ہو گیا ہے مانندِ رنگِ ارغوان کہکشاں

جلوہ آرا ہے بصد اندازِ محبوبیٔ قمر
عارضِ روشن میں امواجِ تجلّی منتشر

ہر ادا سے اک سکوتِ دلربا جلوہ نما
ہے نگاہوں کا تموّج بھی باندازِ حیا

ڈھل گئے ہیں نور کی موجوں سے رخسارِ فضا
ذرّہ ذرّہ مرکزِ تنویر ہے آئینہ سا

ہے بساطِ سبزۂ رنگیں جوابِ آسماں
سرد اور شفاف قطرے ہیں گلوں پہ دُرچکاں

نازنیں پودوں کی شاخیں بےخبر ہیں محوِ خواب
جھک گئی ہے نیند سے نرگس کی چشمِ سیم تاب

ہے ردائے نور میں ملفوف نظمِ کائنات
ایک سنجیدہ سکوں میں غرق بزمِ شش جہات

غرقِ بحرِ نور ہیں ہے دامنِ بزمِ فلک
پڑ گئی پھیکی کواکب کی ضیا افشاں جھلک

چشمِ نازاں کا تموّج نازشِ تنویر ہے
خندۂ لب ہائے رنگیں کیف کی تفسیر ہے

ہر قدم پر ہو رہی ہے اک متانت سی نثار
جنبشِ ابروئے محرابی ہے حسنِ صد وقار

ہیں سبک رفتار امواجِ نسیمِ مشکبار
پتّی پتّی پر توِ انوار سے تابش نثار

چپکے چپکے کچھ شگوفے کھل رہے ہیں نازسے
نسترن ہے عطر افشاں دلربا انداز سے

ہے تجلّی ریز جس سے شبنمی تاروں کا نور
سرنگوں پتوں پہ ہیں بکھری ہوئی روشن سطور

پتّیاں چمپا کی کیفِ نوم سے مخمور ہیں
دامنِ مژگاں ہیں لیکن نکہتیں مستور ہیں

سیم گوں چشموں کی موجیں محوِ راحت ہو گئیں
نیلوفر کی نرم کلیاں بےخبر سی سو گئیں

زرفشاں آئینۂ جو میں ہیں رخسارِ قمر
چاندنی پھیلی ہوئی ہے یا ردائے آب پر

اے مہِ تاباں یہ تیرا طرزِ رفتارِ خموش
بہرِ گوشِ قلب ہے پیغامِ عرفان و سروش

گوشِ دل سنتا ہے آوازِ درائے کارواں
چشمِ بینا دیکھتی ہے نقشِ پائے رفتگاں

ڈھونڈتی ہے روح راہِ ارتقائے زندگی
چاہتا ہے دل کہ حاصل ہو حقیقی خرّمی

قلب کی گہرائیوں سے یہ نکلتی ہے دعا
روح کی وابستگی کو مطلقاً کر دے جدا

تابشِ عرفاں دلِ تاریک پر ہو جلوہ گر
قلبِ پنہاں میں ہو ضو افگن جمالِ منتظر

رک گیا ہے دامنِ ساحل میں اب آبِ رواں
ہو گئیں ساکن کنارِ جو کنول کی ڈالیاں

نوعروسِ نازنیں جیسے باندازِ و ادا
موجزن پانی میں ہے یا ایک دریا نور کا

یہ نگاہوں کا تحیّر یہ سکوتِ متّصل
سرِّ پنہاں منکشف ہوتے ہیں پیشِ چشمِ دل

قلب پر کھلتے ہیں اسرارِ تماشائے حیات
منحرف کرتی ہے دل کو زندگی بےثبات

راحتِ اصلی کو ہوتی ہے نظر کی جستجو
آنکھ کو بے کیف آتے ہیں نظر یہ رنگ و بو

اس حیاتِ منتشر سے اے خدائے لایزال　　کر عطا جذبِ حقیقت سے حقیقی اتصال
مست کر دے روح کو سکرِ خمارِ معرفت　　چشمِ دل ہو محوِ دیدارِ نگارِ معرفت

ہے آہ درد و سوز کی دنیا لئے ہوئے　　طوفانِ اشکِ خونِ تمنا لئے ہوئے
میں ایک طرف ہوں شکلِ خزاں پائمال یاس　　اک سمت وہ بہار کا جلوہ لئے ہوئے
مجنوں سے تو حقیقتِ صحرائے نجد پوچھ　　ہے ذرّہ ذرّہ جلوۂ لیلےٰ لئے ہوئے
عشقِ جنوں نواز چلا بزمِ ناز میں　　اک اضطرابِ شوق کی دنیا لئے ہوئے
میری تو ہر نگاہ ہے وقفِ عبودیت　　وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا لئے ہوئے

اے اجل تجھکو مبارک ہوں یہ ظلم آرائیاں　　لوٹ لے دل کھول کر ظالم یہ گلزارِ جہاں
ہے مزین اپنی ہستی سے ترا دربارِ ظلم　　ہے ہمارے خون سے لبریز یہ مینائے ظلم
میری بربادی میں مضمر تیرا رازِ زندگی　　سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی
آہ ہو جائے شکستہ کاش یہ تارِ نفس　　ہو کہیں آزاد یہ مرغِ گرفتارِ نفس
کر دے اے بادِ اجل گل اب مری شمعِ حیات　　میرے روزِ زندگی کی کاش اب ہو جائے رات

کاش پہنچے[1] تجھ تلک میرا پیامِ اشتیاق
کاش سُن لے آج تو بھی قصۂ دردِ فراق

---

[1] یہ اشعار ایک نظم سے لئے گئے ہیں جو موصوفہ نے محترمہ خاتون اکرم کی ذات پر لکھی تھی۔

کیا کہوں تیری جدائی نے کیے کیا کیا ستم
ترجمانِ قلبِ مضطر ہے مری مژگانِ غم
تیرا جانا اک قیامت ہی دلوں کے واسطے
روح فرسا کیا کہوں کس درجہ تیرا ہجر ہے
قلبِ مضطر، چشم نم، سینہ تپاں، مثل شرر
جنبشِ مژگانِ تر برساتی ہے خونِ جگر

تہنیت

آسمانِ نیلگوں پر ضوفشاں ہے ماہتاب
سلکِ گوہر کی طرح بکھری ہے، سلک کہکشاں
ٹمٹماتے ہیں ستارے جس طرح چشمِ حباب
ہے فضا ساکن، زمیں خاموش، ساکت آسماں

ہے تقاطرِ شبنمِ گلریز کا گوہر تراش
پاس کے سیمگوں غنچے بھی ہیں سوئے ہوئے
برگ گلہائے حسیں اک کیف میں کھوئے ہوئے
اک شعاع نور سی ہے آسماں سیم پاش

رک گئیں امواج، ساکن ہو گیا آبِ رواں
نیلوفر آغوشِ جو میں سو رہا ہے بے حجاب
جھک گئیں خاموش چشمے کے کنارے ڈالیاں
عکسِ مہ سے اک تجلّی ہے تہِ دامانِ آب

اک فضائے کیف آور میں یہ بزمِ رنگ و بُو
محفلِ رنگیں میں جوشِ شوق و سامانِ طرب
ذرّہ ذرّہ سے نمایاں انبساطِ آرزو
پتّہ پتّہ گل بداماں گل بدوش و گل بکف

مرحبا جوشِ تمنّا حبّذا شوقِ سرور
عشرتِ رنگیں سے ہے تابش فزا تارِ نظر
مرتعش ہے قلب کے پردوں میں اک کیفِ ظہور
ہے شبِ اُمید میں عکسِ تجلّائے سحر

آرزوئے دیرینہ امیدوں کی برآئی ہے آج
عشرتِ شامِ تمنّا رشکِ صبحِ عید ہے
لے رہی ہے رونقِ شب صبحِ فردا سے خراج
فضلِ ربّانی کی شامل اس طرح تائید ہے

ہو مبارک آپ کو اے ہمنوایانِ چمن
محفلِ عشرت فروزاں جلسۂ شوق آفریں
ہو مبارک آپکو اے نکتہ سنجانِ سخن
مجلسِ شعر و ادب بزمِ لطیف و دلنشیں

یہ گلستاں حشر تک گل ریز و گل افشاں رہے
اہلِ گلشن کی نوائیں آسماں افراز ہوں
یہ چمن زارِ ادب پنہاں طرب ساماں رہے
اب دعا میں اہلِ محفل میری ہم آواز ہوں
تا ابد بزمِ سخن ہو ربِّ عالم پُر بہار
گل بدوش و گل بداماں گل بکف گل در کنار[1]

---

[1] ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ایک زنانہ مشاعرہ ہوا تھا یہ نظم اس کے آغاز میں پڑھی گئی تھی۔

ت

تسنیم

جمیلہ خاتون نام اور تسنیم تخلص ہے۔ ملیح آباد کی رہنے والی ہیں۔ آپ دورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز و حسرت ہے۔ اشعار جذبات کے ترجمان اور کیفیاتِ قلب کے آئینہ دار ہیں۔

زندگی کو ایک بحرِ بیکراں پاتی ہوں میں
ان کے ہاتھوں مٹ کے عمرِ جاوداں پاتی ہوں میں

خود بخود دل ہو گیا دونوں جہاں سے بے نیاز
اب زمینِ عشق گویا آسماں پاتی ہوں میں

جھٹپٹے سے دل بجھا رہتا ہے تیری یاد میں
چاندنی راتوں میں آنکھوں کو رواں پاتی ہوں میں

سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبینِ شوق میں
اے حقیقت تیرا نقشِ پا کہاں پاتی ہوں میں

اب بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں کسی کی یاد میں
عندلیبِ زار کو جب نوحہ خواں پاتی ہوں میں

اپنا اے تسنیم اس دنیا سے گھبراتا ہے دل
یاں کی ہر شے کو فقط وہم و گماں پاتی ہوں میں

ث

ثریا

احمد النساء بیگم نام اور ثریا تخلص ہے۔ سید ظہور الحق صاحب سابق مہتمم دائرۃ المعارف (حیدر آباد دکن) کی دختر ہیں۔ محترمہ احمد النساء کی پیدائش ۲۷ رمضان ۱۳۴۰ھ یوم جمعہ کو ہوئی۔ ابتدائی فارسی اور اُردو تعلیم

گھر پر ہوئی - اس کے بعد مدرسہ تعلیم المعلمات میں شریک ہوئیں - پھر مدرسہ فوقانیہ اندرونِ شہر سے عثمانیہ میٹرک کا امتحان پاس کیا - پھر کلّیہ اناث میں تعلیم پائی -

اُردو زبان کی ادبی خدمت نظم نگاری، تراجم، اور مضمون نگاری کے ذریعہ کر رہی ہیں - شمالی ہند اور حیدرآباد کے رسالوں میں کلام اور مضامین شائع ہوتے ہیں - شاعری میں آپ کو اپنے والد سے تلمذ حاصل ہے - کلام میں صفائی موجود ہے - اسلوبِ بیان صاف اور سادہ ہے -

آپ فارسی میں بھی کہتی ہیں، جلسوں وغیرہ میں بھی اکثر نظمیں سناتی ہیں - ذیل کی غزل آپ نے بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل پر لکھی ہے مگر وہ رنگ نبھ نہیں سکا -

میں فلک کی آنکھ میں خار تھی، میں زمیں کے دوش پہ بار تھی
نگہِ زمانہ میں عار تھی، اسی غم میں سینہ فگار تھی

ترے لطف نے مجھے چن لیا، مرے دل کی بات کو سُن لیا
میرا عیب چھوڑ کے گن لیا، مرے گن کو اور بھی دُھن لیا

ترے لطفِ عام نے بے صلہ، مجھے اپنی بزم میں دی جگہ
ترا لطفِ عام ہی بے شبہ ہے مرے سکون کا واسطا

تری آرزوئیں تمام ہوں، تجھے عمرِ خضر کی ہو عطا
تو ہمیشہ پائے ترقیاں، رکھے نیک نام تجھے خدا

دل ہے تمھاری جانب نظریں اِدھر اُدھر ہیں
سمجھے نہ کوئی تاکہ منظور میری تم ہو

سچ ہے پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

ثریا

ثریا تسلیم نام اور ثریا تخلص ہے' بی ۔ اے تک تعلیم پائی ہے ؛ دورِ جدید کی ایک خوش ذوق و خوش گو شاعرہ ہیں ۔ آپ کے اشعار بلند ہوتے ہیں ۔ آپ کے یہاں غیرت' خودداری' اور خیالات کی بلندی موجود ہے ۔ آپ کا اسلوب بیان پاکیزہ اور زبان شستہ ہے ۔

رودادِ تخیل

اُمید سے تو جنتِ رقصاں نہ طلب کر
بن یاس مگر عیش گریزاں نہ طلب کر

محنت ہے جہنم تو سمجھ لے اسے گلزار
گلزار ہے عشرت تو گلستاں نہ طلب کر

شیرینیِ احسان کی ہے تلخی سمِ قاتل
اس زہر کو اے بندۂ احساں نہ طلب کر

آنکھوں سے ڈھلکتے رہیں گر خون کے آنسو
عمان سے بھی تو گوہرِ غلطاں نہ طلب کر

جل بُجھ تو اسی آگ میں جو دل سے لگی ہے
خرمن کیلئے شعلۂ رقصاں نہ طلب کر

تو ولولۂ شوق کی منزل سے گزر جا
منزل کیلئے جادۂ حیراں نہ طلب کر

بجلی کے خزانے ہیں تیرے قلبِ تپاں میں
حاسد کیلئے برقِ خراماں نہ طلب کر

گر موجِ قناعت تیرے ساحل ہی سے ہو جو
دولت سے اُمنڈتا ہوا طوفاں نہ طلب کر

سرمایۂ اندوہ فراواں نہ طلب کر رہتا ہے سبکبار تو آئینِ عمل سے
تقدیر کے غم میں گل و ریحاں نہ طلب کر تدبیر کے ہر پھول میں فردوسِ عمل ہے

ثریاؔ

محترمہ عائشہ حسین ثریاؔ کاکوری کی شاعرہ ہیں، کلام اکثر عصمت، خاتونِ مشرق، ایشیا وغیرہ رسالوں میں چھپتا ہے۔ آپ محاکات خوب لکھتی ہیں۔ آپ کا بڑا جوہر منظر نگاری میں جذبات کی آمیزش ہے، طرزِ ادا نہایت لطیف و پُر کیف ہے۔

چشمہ

آکاش کے نیلے دامن کے تاریک و منور سایوں میں
سر سبز زمیں کے سینے پر قدرت کے حسیں کہساروں میں
پھولوں کی رنگیں بستی سے کھیتوں کے حسیں میدانوں میں
فطرت کے حسیں ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں
کہسار کے سنگیں سینے کا بے چین سا رازِ سربستہ
رخسارہ پہ کوہی میداں کے اک اشک ہوں چشمِ فطرت کا[1]
قدرت کے دوش پہ گیسو ہوں بکھرا سا اور بکھرایا سا

---

[1] محترمہ اداؔ بدایونی نے بھی اپنی نظم "جھیل" میں جھیل کے لئے یہی تشبیہ اختیار کی ہے ع "آنسو ٹھہر گیا ہے رخسار پر زمیں کے"

فطرت کے حسیں ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

کل دنیا سپنوں میں گم ہے — اور سانس کی بھی آواز نہیں
سوتے ہیں نواسنجانِ چمن — مصروفیتِ پرواز نہیں
کچھ محفل سونی سونی ہے — وہ نغمہ نہیں وہ ساز نہیں
تاروں کی چپ چپ چھاؤں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

اس وقت فضا کی مدہوشی — پُرکیف ہوا کے جھونکوں سے
مہتاب کی زرّیں کشتی کو — تاروں کی چمکتی آنکھوں سے
پوشیدہ زمیں پر لاتی ہے — کہنے کو سنہری کرنوں سے
ہر ذرّہ رشک سے تکتا ہے
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

ثروت :-

ثروت جمیل نام - اور ثروت تخلص ہے۔ آپ کا تعلق مظفر نگر سے ہی آپ کے دل میں قوم و ملت کا بڑا درد ہے۔ کلام میں بڑا جوش و کیف ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ آپ حالی اور خصوصاً اقبالؒ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کا کلام قومی و ملی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

راہ گم کردہ کو پھر راہ دکھا دے یارب — موجِ گم گشتہ کو دریا سے ملا دے یارب
"کون ہے" پھر یہ زمانے کو بتا دے یارب — بندۂ حق کو غلامی سے چھڑا دے یارب
ظلمتِ کفر کا ادبار مٹا دے یارب — شمعِ خاموش کو پھر آج جلا دے یارب
رشکِ خورشید تو ذرّے کو بنا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

پھر سرِ دوشِ ثریا ہو مقامِ مسلم
غیرتِ مہر ضیا بار ہو نامِ مسلم
مئے توحید سے لبریز ہو جامِ مسلم
پھر صنم خانۂ ہستی ہو غلامِ مسلم
کندۂ دہر پہ ہو پھر نقشِ دوامِ مسلم
کاش پھر زندۂ جاوید ہو نامِ مسلم

مردِ مومن کو پھر آزاد بنا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

ناخدا سے ہوئے بیگانہ جو اہلِ کشتی
کون تھے آہ رسولِ مدنی بھول گئے[1]
اس قدر مست ہوئے پی کے غلامی کی شراب
اپنا افسانۂ شیشہ شکنی بھول گئے
نشۂ عیش میں غافل ہیں مجاہد تیرے
ہر تلوار یہ تشنہ دہنی بھول گئے

رازِ توحید مسلماں کو بتا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

زخم کھا کھا کے جو دشمن کو دعا دیتے تھے
آج باہم وہی لڑ لڑ کے مرے جاتے ہیں
جن کے سینوں میں تھا گنجینۂ ضبط و الفت
حال پر اپنے وہ اغیار کو ہنسواتے ہیں
خونِ مسلم کے ہوئے خود ہی مسلماں پیاسے
اپنے گھر آگ لگانے نہیں شرماتے ہیں

خانہ جنگی کو ہماری تو مٹا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

---

[1] علامہ اقبال ؒ

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصرِ ما ، با ما چہ کرد
عصرِ ما ، مارا ز ما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد
(مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" ص۳۸)

جوش میں کاش پھر آجائے مسلماں کا لہو　　　توڑ دیں بند غلامی تیرے آزاد غلام
ماہ و انجم کو گلے اٹھ کے ملا دیں باہم　　　حرّیت الفت و توحید کا لیکر پیغام
تیشۂ حق سے کریں قطع حصار باطل　　　ظلمت دہر میں ہو روشنی شمع کلام

قلب پر تمغۂ ایمان لگا دے یارب
بخت خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

عرصۂ جہد میں سرگرم عمل ہو مسلم　　　مردہ دل قوموں کو پھر دولت جانبازی دے[1]
خلق اسلاف کی تقلید میسر ہو ہمیں　　　پائے خاموش کو پھر ہمت آبائی دے
لیکے فریاد ترے در پہ کھڑی ہے ثروت　　　روح مسلم ہے گرفتار پھر آزادی دے

دست الطاف پھر اس سمت بڑھا دے یارب
بخت خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

ج

جمال - جمالہ - محترمہ بلقیس جمال بریلوی

محترمہ بلقیس جمال دورِ جدید کی ایک نہایت ممتاز اور قابلِ فخر شاعرہ ہیں

---

[1] علامہ اقبال ؒ سے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے ؛ برق دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے　(شکوہ)

آپ کا شمار دورِ حاضر کی ان شاعرات میں ہے جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ آپ کی ہستی اردو شاعری کیلئے قابل فخر ہے۔ آپ کے کلام کا رنگ پختہ ہے۔ مایوس و خونچکاں جذبات کی ترجمانی آپ کا خاص جوہر ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے قدرت کی باریکیوں کا بھی خوب مطالعہ کیا ہے، آپ کی نظمیں مناظر فطرت کی مصوری کا دلآویز نمونہ ہوتی ہیں۔ آپ کی تاریخی، قومی، ملی، اخلاقی، جذباتی اور رومانی نظمیں بہت پُر کیف ہیں اور شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔

آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے آپ کے جو حالات اپنی زیر نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

"محترمہ بلقیس جمال بریلوی دختر سوئم شیخ مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ پی۔ آئی۔ آفس الہ آباد ۸ دسمبر ۱۹۰۹ء کو بریلی میں پیدا ہوئیں۔ اور طفولیت میں اپنے والد کی جائے ملازمت الہ آباد چلی گئیں۔ ۸ سال کی عمر میں قرآن شریف اور اردو وغیرہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکی تھیں پھر فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنی ہمشیرہ محترمہ رابعہ خاتون نہاں بریلوی سے حاصل کی، ۹ سال کی عمر میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ شروع ہی سے آپ کی تحریر کا خاص ادیبانہ رنگ تھا۔ چنانچہ اول دن ہی سے ملک کے جملہ اخبار و رسائل نے نہایت ذوق و شوق و امتیاز کے ساتھ آپ کی تحریریں شائع کرنا شروع کیں۔ طبیعت بچپن ہی سے شاعرانہ تھی! اور اوائل عمر سے جذبات میں درد اور سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کے جملہ افسانے حزنیہ اور دردناک ہوتے تھے

صغر سنی میں اساتذہ کا بیشمار کلام نوکِ زبان تھا۔ جسے آپ کے والد صاحب مرحوم اپنے صاحبِ ذوق دوستوں کو سنوا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ آٹھ برس کی عمر نو سال ہوئے پر اسلامی جذبات نے برانگیختہ ہو کر قصیدۂ اوّل کی شکل اختیار کی۔ اور اسی وقت سے شاعری کی بھی ابتدا ہو گئی۔ نثر کی اصلاح تو خود والد صاحب قبلہ فرماتے تھے لیکن چونکہ وہ عروض سے ناواقف تھے اس لئے آپ نے غزلوں اور نظموں کی اصلاح قبلہ ماجد علی صاحب مرحوم و مغفور کے سپرد فرمادی۔ استادِ مرحوم نے کچھ عرصہ کے بعد اپنے بھتیجے سید طالب علی صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ایڈووکیٹ الہ آبادی کی شاگردی میں دے دیا چنانچہ دو سال قبلہ طالب علی الہ آبادی نے نظم و نثر کی اصلاح دی، اور پھر سندِ کامل دے دی۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ کے والد صاحب نے وفات پائی۔ اور آپ اپنی والدہ صاحبہ کے ہمراہ بریلی تشریف لے آئیں۔ جہاں دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کی شادی مولانا حافظ عبدالجلیل صاحب بی۔ایس۔سی۔ایل۔ایل۔بی وکیل سے ہو گئی جن سے آپ کے والدِ مرحوم کچھ عرصہ گزرے خود رشتہ فرما چکے تھے — حافظ صاحب مرحوم آپ کے والد کے قریبی عزیز تھے۔ آپ کے والد نے آپ کا رشتہ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ بعد شادی آپ اپنے عزیز شوہر کے ہمراہ کچھ عرصہ مظفر نگر اور پھر میرٹھ میں مقیم رہیں جہاں وہ وکالت کرتے تھے۔ ۲۵ جون سنہ ۱۹۴۰ء کو آپ کے رفیقِ زندگی نے اچانک داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور عرصہ تین سال سے جب سے آپ کے شریکِ زندگی نے ساتھ چھوڑا ہے

آپ کی دماغی حالت اس شدید صدمہ کی وجہ سے ازحد مضروب ہے۔ اورآپ کے علمی ادبی مشغلے سب مُردہ ہوگئے ہیں۔آپ کا کلام اوّل دن سے ازحد مقبول ہوا، چونکہ ابتداہی سے رنگین و پُرسوز تھا۔ ملک کی بیشتر شاعرات نے آپ سے اصلاحِ سخن حاصل کی اورآپ کی شاگردی اختیار کی آپ کی نظموں کے دو مجموعے "آئینۂ جمال" اور "قوس قزح" شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ اورآپکے افسانوں کے مجموعے زیرِاشاعت ہیں۔آپ پابندِ صوم وصلوٰۃ اور مشرقی تہذیب کی پرستار ہیں چنانچہ شرعی پردے کو پسند فرماتی ہیں۔ اسی وجہ سے باوجود سخت کوشش وجستجو آپ کا فوٹو کبھی کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔آپ کے پانچ بچے ہیں جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں،۔آپ نہایت رقیق القلب۔ دردمند اور خوش مزاج ہیں طبیعت سادگی پسند اور تصنع سے مبرا ہے۔"

خود محترمہ کا انتخاب جو آپ نے اس تذکرہ کے لئے عنایت فرمایا ہے یہ ہے:۔

ملا جنوں کو جو پیغام خارِ پیمائی — وہاں دشت سے آوازِ الاماں آئی

عدم سے جوششِ وحشت میں تا وجود آئی — کہاں سے کھینچ کے مجکو قضا کہاں لائی

نقب لگا کے مری آہ ان کی پلکوں میں — نگاہِ ناز سے کچھ بجلیاں چُرا لائی

یہاں تو گوشۂ دل ہی میں جانے کیا دیکھا — کلیم طور پہ کرتے ہیں خارہ پیمائی

جمالِ زار کی جانب نگاہ کیوں اُٹھے
نظر کو ان کی ہے اندیشۂ مسیحائی

قلب جب آئینۂ آغاز ہے
آنکھ کیوں ناآشنائے راز ہے
کشمکش ہے کفر و ایماں کی فضول
آخری آنسو کشود باز ہے
لغزشِ پیہم کی پردہ داریاں
چشم ساقی کا نیا انداز ہے
نقشِ سجدہ ہے سرِ منزل جہاں
بس وہیں بابِ حریم ناز ہے
کب ہوئی ضائع متاعِ دردِ دل
میرا اک آنسو بقائے راز ہے

نگاہِ تمنا کی خاموش وسعت
کھنچی آرہی ہے دو عالم کی دولت
اٹھا دو ذرا آنکھ سے میری پردہ
دکھا دو مجھے حاصلِ دردِ الفت

تار میں اشک کے پرولوں میں
گوہرِ سیم تاب، آ تو سہی
میری آنکھیں ہیں بحرِ اشک رواں
دُرِّ مکنوں خطاب آ تو سہی
چاندہو ماند چاندنی پھیکی
غیرتِ ماہتاب آ تو سہی
لالہ و گل پہ اوس پڑ جائے
بالبِ خوش گلاب آ تو سہی
پانی پانی ہو دیکھ کر شبنم
دُرِ دنداں کتاب آ تو سہی
پردۂ دل تجھے چھپائے گا
تو کبھی بے نقاب آ تو سہی

سرِ محشر وہ کہتے ہیں تو ہے کون؟
جبیں سے مٹ گیا نقشِ وفا کیا
کسی کی جستجو منزل بہ منزل
جمالہ اس جنوں سے فائدہ کیا

تربت پہ چڑھیں پھول نہ بتی نہ دیا ہو
اک داغ ابھر آئے جوانِ سبب سے سوا ہو
آئینۂ دل چور ہوا ایک ضرب سے ہو کی
ٹوٹے ہوئے ہر ٹکڑے میں تو جلوہ نما ہو

در پردہ یہ عالم ہے کہ ہر آنکھ نے دیکھا　　　ظاہر میں یہ پردہ نہ کوئی دیکھ رہا ہو
پیمانۂ ہستی ہمیں ہر سے ہونٹوں سے لگا کر　　　ارشاد یہ ہوتا ہے کہ سرزد نہ خطا ہو

سطورِ ذیل میں محترمہ کا مزید انتخاب کلام درج کیا جاتا ہے جو راقم السطور نے کیا ہے

آیا فضائے گل میں پیغامِ زندگانی (۱)　　　کلیوں کی خامشی کو بخشی نئی جوانی

نمونہ فارسی کلام

بہ دست ظلمتِ شب ہائے غربت　　　سوادِ ماہِ منزل می فروشم
نگاہِ ناز در چشم نہاں شد　　　کہ من قاتل بہ بسمل می فروشم

چشمِ غماز فغاں ایوائے دلداری نہ کرد　　　رازِ پنہانی زیک اشک پُرآب آید بروں[۱]
جوں تماشائے دو عالم در نظر پوشیدہ　　　اے چراتا رِ نگاہت از حجاب آید بروں

تبسم ہائے گوناگوں۔ بہ چشمت برق اندازے　　　بہ دانم خندۂ تقدیرِ من در پردۂ نازے
پریشاں گشتہ ام از دردِ بیداری بہ خواب آیم　　　بہ دیدم کنجِ تنگِ ظلمت آرائے بلا سازے

نوٹ:۔ ۱؎ اس زمین میں سب سے مشہور غزل مولانا جامی کی ہے جس کا مطلع یہ ہے

ایں قدر مستم کہ از چشمم شراب آید بروں　　　وز دلِ پر حسرتم بوئے کباب آید بروں

اس زمین میں بسمل نے بھی اچھی غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

تا کجا از چشم زارم خونِ ناب آید بروں　　　کاش از پہلو دلِ پُر اضطراب آید بروں "نج"

پُرکیف وادیوں میں شاخوں کی گل فشانی — شبنم نواز غنچے اک حسنِ ارغوانی
کلیوں کی بیہوشی کو بادِ صبا نے توڑا — (۲) سبزہ کی خامشی میں نغمہ سا کچھ ہے پیدا
پتوں نے ہلکے ہلکے اک مست راگ گایا — مدہوشِ کیف ہوکر شاخوں نے ساز چھیڑا
پھر رفتہ رفتہ گونجا، اک میٹھا ترانہ — (۳) رنگینیٔ فضا سے آئی صدائے نغمہ
تھا ہمنوائے الفت ہر ذرہ اور قطرہ — تھا ہم صدائے عشرت ہر نخل ہر شگوفہ
رنگِ چمن کو یارب حسنِ فضا مبارک — (۴) غنچوں کو صبح نو میں تازہ ہوا مبارک
کلیوں کی خامشی کو نغمِ صبا مبارک — پھولوں کو بلبلوں کی رنگیں نوا مبارک
یارب بصد تمنا یہ عرضِ مدعا ہے — (۵) دن پھیر دے الٰہی خاموش التجا ہے
یہ عمرِ دو حبالہ لذت کشِ دعا ہے — ناکامِ آرزو کو تیرا ہی آسرا ہے

"مولانا راشد الخیری کی وفات پر"

عجب غمناک ہے اے زندگی اب تیرا مستقبل
فسانہ دورِ ماضی کا خدارا مت سُنا اے دل
ہیں بحرِ یاس کی موجیں، نظر آتا نہیں ساحل
ٹٹولوں راہ اب کیسے ہوئی گُل مشعلِ منزل
پکاریں آہ اب کس کو، نہیں ہے ناخدا کوئی
اجل تجھ کو مبارک ہو تیرا یہ ذوقِ بیدردی

تصوّرِ خاتونؔ میں[1]

کیفِ غم میں خاک ہے جامِ شرابِ زندگی
آبشارِ درد ہے بحرِ سرابِ زندگی

دیکھ آنکھیں کھول کر اے محوِ خوابِ زندگی
جاں بلب بادِ اجل سے ہے حبابِ زندگی

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ آمد و شد بے خبر
دم زدن میں ہوگا برہم آہ خوابِ زندگی

منتشر ہو جائیں گے سب نغمہائے انبساط
جس گھڑی ٹوٹا کوئی تارِ ربابِ زندگی

یا کبھی شبنم بداماں گل گریباں چاک ہیں
منظرِ حسرت ہے نیرنگِ شبابِ زندگی

آسمانِ زیست پر دکھلا کے جلوہ دوپہر
گوشۂ مرقد میں ڈوبا آفتابِ زندگی

خاک اُڑتی ہے گلوں کی بلبلیں خاموش ہیں
مختصر سا ہے یہی بابِ کتابِ زندگی

وقفِ ناکامی ہر اک ذرۂ بزمِ جہاں
کون کہہ سکتا ہے میں ہوں کامیابِ زندگی

کھیل ہے بچوں کا سازِ زندگی کا مشغلہ
موت کی آنکھوں سے دیکھے کوئی خوابِ زندگی

موت نے خاتونِ اکرم کی اشارہ کر دیا
دل کی حسرت آفریں آنکھوں کو بینا کر دیا

آہ اے خاتونِ اکرم جلوہ فرمائی تری
یاد ہے آنکھوں کو وہ تصویرِ عنائی تری

بذلہ سنجی کی ادائیں مرتسم ہیں قلب پر
جلوہ گر آنکھوں میں ہے جذبات فرمائی تری

لوحِ دل پر نقش ہائے تازہ تر منقوش ہیں
بحرِ جاں میں آج تک ہے موج افزائی تری

تو نے رازِ دہرِ فانی آشکارا کر دئے
حاصلِ صد زندگانی تھی حیا زائی تری

آشنا ہے لذّتِ حرماں تھی چشم پر حجاب
درد میں ڈوبی ہوئی ہر جذبہ آرائی تری

---

[1] محترمہ خاتون اکرم صاحبہ

یہ جمالِ مضطرب ہے آہ بیزارِ حیات کاش مل جائے اسے بھی نقش پیمائی تری
کشمکش ہائے زمانہ سے بہت بیچین ہوں
کب تلک یوں زہر نوشِ عالمِ فانی تری؟

یہ میرے بعد اے صیاد رنگ گلستاں ہوگا لہو رو ئیں گے غنچے گل کا دامن دھجیاں ہوگا
ستارے ڈوبتے ہیں شمع کا بھی سانس آخر ہے خدایا کون اب رو دِ نہاں کا رازداں ہوگا

چلے تلاش میں اسکی رہِ طلب میں مگر کچھ ایسے کھوئے کہ اپنی خبر بھی پا نہ سکے
جفائے اہلِ وطن کی یہ انتہا ہے جمال ستم تک اپنے وطن کی ہم آہ کھا نہ سکے

انتخاب از "قوسِ قزح"

رنگیں شام ہے عالم آرا منظر ہے کچھ بھیگا بھیگا
رنگ شفق ہے ہلکا ہلکا گلشن گلشن، صحرا صحرا
ساغرِ میگوں ہے ہر ذرّہ بادۂ کوثر ہے ہر قطرہ

صحنِ چمن ہے کیف کا دریا مست ہوئی ہے ساری دنیا
موجِ ہوا میں ہے اک نغمہ موجودات ہے غرقِ صہبا
قوسِ قزح کا دیکھ کے جلوا حیرت میں ہے چشم بینا

اُف یہ دھنک کا جلوۂ رنگیں ہر وادی ہے دامن گلچیں
سرخ لبوں میں بادۂ شیریں آنکھیں نرگیں عارض سیمیں

نازِ بداماں محشر آگیں — دامنِ رنگیں، پلّو زرّیں

آنکھوں میں اک جامِ تبسّم — پتلی میں آرامِ تبسّم
ابرو میں اک دامِ تبسّم — زلفوں میں اک شامِ تبسّم
ہونٹوں پہ پیغامِ تبسّم — سرتاپا الہامِ تبسّم

(۱۹۳۷ء)

"گنگا کنارے"

جب غم کا اندھیرا چھاتا ہے — جب دنیا سے گھبراتی ہوں
دل میرا جب بھر آتا ہے — جب یاس زدہ ہو جاتی ہوں
جی شورش سے گھبراتا ہے — ہر بات سے جب اُکتاتی ہوں
خود پاؤں مرا اُٹھ جاتا ہے — گنگا کے کنارے آتی ہوں

(۱۹ء)

"پیغامِ عمل"

آ سکوتِ شام میں پھر نالۂ پیہم کریں — آ لبِ خاموش کو پھر واقفِ ماتم کریں[1]
آہِ دل کا شمع محفل کو بنا دیں رازدار — کرمکِ سوزاں کو سوزِ زیست کا محرم کریں
کھینچ لیں سینے سے پھر پوشیدہ نوکیں تیر کی — زخمہائے چاکِ دل شرمندۂ مرہم کریں
آہ گلشن میں ہے زخمِ غنچہ محتاجِ رفو — بلبلوں میں پھر بپا ہنگامۂ ماتم کریں

---

[1] علامہ اقبالؒ

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں (بانگِ درا)

شبنمی گوں کلیوں کو رنگِ زندگی سحر رنگ دیں برگہائے خفتہ کو بیدار خوابِ غم کریں
اک شعاعِ نور چمکائیں جبینِ ماہ پر
ثبت کر دیں ایک آنسو آستینِ ماہ پر (ص ۳۲)

شمع

آ، کہ تجھ میں جذب ہو کر میں بنوں جذبات نوش
آ، کہ تیری مستیاں ہیں میری مخموری کا جوش
آ، کہ تیرے زمزمے ہیں میری ہستی کا خروش
آ، کہ تجھ میں میرے نالے ہیں تجلیاتِ پوش
تیرے نغموں میں نہاں ہے رمز و اسرارِ حیات
تیری آہوں کا دھواں ہے آبرو وارِ حیات
دونوں مِل کر جل بجھیں افسانۂ بیہوش میں
یعنی دونوں خاک ہو جائیں شرارِ جوش میں
دونوں خاکستر ہوں آتش خانۂ خاموش میں
پھونکدیں ہستی کو اپنی الفتِ مدہوش میں
آگ جو تجھ میں ہے وہ میرے دلِ غمگیں میں ہے
لاگ جو تجھ میں ہے میری آہِ آتش چیں میں ہے (ص ۲۶)

۱؎ علامہ اقبالؒ

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں [بانگِ درا]

"پروانہ"

میں محوِ سوز و ساز ہوں — خروشِ دل گداز ہوں
قتیلِ چشمِ ناز ہوں — شہیدِ صد نیاز ہوں

میں نغمۂ خموش ہوں — پیامِ سوز و جوش ہوں
شرر کدہ بدوش ہوں — نوائے خوں فروش ہوں

کہانیٔ غمِ جہاں — فسانۂ شرر چکاں
تباہیوں کی داستاں — شرر چکان و خوں فشاں

غمِ دوامِ عشق ہوں — کہ صبح و شامِ عشق ہوں
شہیدِ نامِ عشق ہوں — کہ اک پیامِ عشق ہوں

جو ہے تلاشِ بیخودی — تو اے دماغِ آدمی
تلاش کردہ زندگی — کہ جو فقط مجھے ملی

میری حیاتِ مشتعل — ہے ایک سوزِ مستقل
یہی جہانِ آب و گل — یہی ہے جاں یہی ہے دل

فزوں ہے سوزشِ جگر — دہک رہے ہیں بال و پر
نظر اٹھا، اٹھا نظر — ہے شمع میری منتظر

لگی ہے آگ سر بسر
سلام! عمرِ مختصر

(ص ۲۷ تا ۲۹)

"نغمۂ تمنّا"

اے برقِ تاباں جلوے دکھا جا
اے ساقئ جاں ساغر پلا جا
اے نغمہ ساماں نغمے سنا جا
بیخود بنا جا، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
غمزوں کا مسکن چشمِ تمنّا
جلووں سے روشن ہو دل کی دنیا
ہو جائے گلشن میرا بھی صحرا
اے حُسنِ رعنا، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
پردے اُٹھا دے او پردہ ساماں
جلوے دکھا دے او جلوہ افشاں
کافر بنا دے او کفر ساماں
اے سحرِ عریاں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
آنکھوں کی سُرخی میخانہ ساماں
پتلی کی بجلی اک قلبِ لرزاں
رخ کی تجلی، ایمن بہ داماں

حُسنِ فراواں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
بیدار کر دے، اے صبحِ سیمیں
ہشیار کر دے اے صورِ شیریں
سرشار کر دے ساقی رنگیں
اے حسنِ نمکیں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
پُر نور کر دے اے ماہِ رخشاں
مخمور کر دے اے کیف ساماں
مسحور کر دے اے سحرِ عریاں
اے کیفِ عُریاں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
او جانِ دلبر کب تک یہ غمزہ
او شوخ کافر کب تک یہ عشوہ
ہے سنگِ در پر بیخود جمالہؔ
او وجہِ سجدہ، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا

(ص ۲۹-۳۰)

"صبح نیاز"

جذبات ہیں اندوہگیں[1] احساس ہے غم آفریں
ارمانِ دل، دل کے مکیں اور حسرتیں پہلو نشیں
برباد ہے قلبِ حزیں ویراں ہے روحِ آتشیں
تیری نوا ہے دل نشیں رازِ محبت کی امیں
آ، دل میں لے ناز آفریں جھکنے کو ہے میری جبیں
ہاں اے مؤذن دے اذاں
(ص۳۲-۳۳)

---

[1] ویران ہے یہ سینہ طوفاں زدہ سفینہ
طوفاں اُٹھانے والے
اب آن کر بچالے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی
اے ناخدا دعا لے
برباد دل کی بستی ساکت ہے سازِ ہستی
عالم ہے ایک ہُو کا
بے جہت رنگ و بو کا
پھر بھی دلِ حزیں ہے
کاشانہ آرزو کا
ہاں پھر ہو جلوہ افگن دونوں جہاں ہوں روشن

"معصوم جادو"

اک حورِ صحرا، معصوم صورت　　اک حُسن سادہ روحِ ملاحت
اک شوخ جلوہ کیفِ لطافت　　اک نورِ رعنا جانِ نزاکت

تبریکِ جنت، سادہ نگارا
بوئے نزاکت، نازک ستارا

پُرکیف رنگت، ساری گلابی　　صبحِ قیامت، رخ آفتابی
مخمورِ اُلفت آنکھیں شرابی　　شانِ نزاکت لب ماہتابی

سادہ ادائیں ممنونِ عفت
رنگیں نگاہیں مرہونِ عصمت

[پچھلے صفحہ سے]

پھر لرزشِ تبسّم
تھرائیں جس سے انجم
ذرّے ہوں وجد سامان
کونین میں تلاطم
تو سامنے نکل آ　　اے مہرِ عالم آرا
عالم میں نور بھر دے
دل رشکِ طور کر دے
ہاں ہاں نظر اٹھا کر
ہستی کو چُور کر دے

"حج"

محوِ جراحت پلکوں کے نشتر وقفِ قیامت بدست ٹھوکر
ہونٹوں میں حبّت، پہلو میں گاگر اُف! یہ قیامت، دامانِ جو پر

بہ جرم صحرا اکفر لبِ جو
دیکھا جمالہ معصوم جادو

تیری محبّت

تجھ کو اپنے نافۂ گیسوئے پیچاں کی قسم
تجھ کو اپنے دوش پر زلفِ پریشاں کی قسم

تجھ کو اپنے سرمۂ چشمِ غزالیں کی قسم
تجھ کو اپنے جلوۂ بیباک و رنگیں کی قسم

تجھ کو میرے جذبۂ و جوشِ تمنا کی قسم
تجھ کو اپنے عشوۂ و اندازِ رعنا کی قسم

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سُن
داستانِ دردِ تاریخِ دلِ بیمار سُن

تیری اُلفت مرہمِ زخمِ دلِ مجبور تھی
تیری اُلفت روح و جانِ عاشقِ رنجور تھی

تیری اُلفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی
تیری اُلفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی

تیری الفت کا مغنّی تھا ہر اک تارِ نفس

نام لیتی تھی ترا آخر ہر یک آوازِ نفس

اس نے دیکھی ہیں ہو آمیز راتیں ہجر کی
اس نے دیکھا ہے مرے احساس کی آشفتگی

اونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے
تیری الفت جاگ اٹھتی تھی کنارِ خواب سے

سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں
تیری الفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں

چاندنی راتوں کی کیف آگیں تجلیات میں
تیری الفت نور تھی غمخانۂ جذبات میں

الغرض تیری محبت تھی ہر اسرِ حیات
کائنات الفت تھی مجھکو تیری الفت کائنات

آہ! اب کیونکر سناؤں عاشقی کا ماجرا
کس طرح الفت کو تیری مجھ سے پھر لوٹا گیا

رخصت اے صبحِ جمالِ آرزوئے تشنہ کام
السلام! اے مرکزِ حسنِ تمنا السلام

ص۲۶ تا ۴۸

(ح)

حافظ

افسر النساء بیگم نام اور حافظ تخلص ہے۔ دکن کی شاعرہ ہیں۔ رسالہ عصمت

ہیں اکثر کلام چھپتا ہے۔ نظمیں خاصی کہہ لیتی ہیں، کلام سے نومشقی ظاہر ہوتی ہے۔

بیٹھے بیٹھے آ گیا اک دن خیال
اس کے آنے سے ہوا ایجد ملال

یاد تڑپانے لگی ماں باپ کی
قدر جن کی زندگی میں کی نہ تھی

چل بسے دنیا سے آیا ہوش تب
رنج کرنا اس گھڑی تھا بے سبب

جا کے قبرستان میں مل لیجئے
حالِ دل کچھ اپنا کہہ سن لیجئے

الغرض شہرِ خموشاں کو رواں
ہو گئی میں دل کو تھامے ناتواں

جب پڑی مرقد پہ پیاروں کے نظر
خاک میں سوئے پڑے تھے بیخبر

ایک برچھی آن کر دل پر لگی
تھام ہاتھوں سے کلیجہ میں جھکی

حجاب۔ محترمہ شہزادی تیمور جہاں۔ دہلوی

شاہزادی تیمور جہاں حجاب مغلوں کے قافلۂ رفتہ کی ایک پس ماندہ مسافر ہیں، ان مغلوں کی یادگار۔ جن کے دامن میں ہماری زبان کی تربیت ہوئی تھی جن کی آغوش میں ہماری شاعری نے پرورش پائی تھی۔ وہ مغل جن کے دور میں ہندوستان نے اپنی عظمت کا سب سے پُرشوکت خواب دیکھا تھا۔ مگر جو آج گردشِ زمانہ کے ہاتھوں خود ایک خواب بن چکے ہیں!۔ محترمہ حجاب اس دودمانِ مغلیہ کی چشم و چراغ ہیں، ماضی کے اس پُرشوکت خواب کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہیں!

محترمہ کے موصولہ حالات درج ذیل ہیں:۔

حجابؔ نواب تیمور جہاں بیگم بنت شاہزادہ مرزا سلیم محمد شاہ مرحوم خاندان شاہی کی چشم و چراغ ہیں۔ انکے نانا شاہزادہ مرزا سلیمان شاہ صاحب اور دادا شاہزادہ مرزا کیوان شاہ (ثریا جاہ) علی الترتیب سرپرست معزول خاندان تیموریہ شاہی رہے - پندرہ سولہ سال کی عمر سے شعر کہتی ہیں - ابتداءً نظم سے ہوئی غزلیں بھی کہتی رہیں اور کافی مشق بہم پہنچائی۔ زنانہ مشاعروں میں غزلیں اور نظمیں خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں۔ اکثر خطوط میں خیالات رنگ برنگ کے گلدستے ہوتے ہیں۔ انگریزی بے تکلف بولتی ہیں فرقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت و حقوق نسواں کی بہت شدت سے حامی ہیں۔ مختلف زنانہ کانفرنسوں اور تعلیمی کمیٹیوں میں سرگرمی سے شریک ہوتی ہیں تقریر اور تحریر کے علاوہ قدمے، درمے بھی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہتی ہیں - ارکانِ اسلام کی پابند اور اسلامی تہذیب کو ہر مسلمان کے لئے ضروری سمجھتی ہیں ان کے شوہر شاہزادہ مرزا دارا بخت صاحب بنارس کی رائل فیملی کے معزز رکن ہیں -

تیمور جہاں حجاب کی طبیعت میں ایثار - ہمدردی - رحم و صداقت ہے۔ دنیا کی نمائشی چیزوں سے نفرت کرتی ہیں "

محترمہ کا آبائی وطن دہلی ہے مگر چونکہ آپ کے شوہر مرزا دارا بخت (جو محکمہ اکسائز میں انجارج ہیں) فی الحال بسلسلۂ ملازمت بریلی میں ہیں اس لئے محترمہ بھی فی الحال بریلی مقیم ہیں۔

محترمہ موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ روشن دماغ اور بالغ نظر خاتون ہیں

انگریزی۔اردو۔فارسی تینوں زبانوں میں آپ کو دستگاہ حاصل ہے، اور تینوں زبانیں آپ بے تکلّف استعمال کرتی ہیں۔ مسائلِ حاضرہ سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور خصوصاً تعلیم کی اشاعت کے لئے آپ بہت کوشاں رہتی ہیں۔

محترمہ کا درجہ شاعری میں بہت بلند ہے، آپ موجودہ دَور کی ایک نہایت ممتاز، خوشگو، اور گرامی قدر شاعرہ ہیں آپکا کلام بہت سنجیدہ اور پُروقار ہے اور اس میں پختگی موجود ہے، جذبات کی بے دھڑک نمائش (اگر وہ ناپختہ کار صنّاع کے ہاتھوں عمل میں آئے) اُن جذبات کو بے وقار اور چھچھورا سا بنا دیتی ہے[۱]۔ علاوہ ازیں اخلاقی اعتبار سے بھی یہ چیز قابلِ اعتراض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ جذبات کی اس قسم کی نمائش سے ارادۃً محترز رہتی ہیں، آپ کے کلام میں نہایت سنجیدگی و شایستگی موجود ہے۔

آپ کے یہاں قومی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں ــ خصوصاً ان کی طرزِ ادا ــ میں آپ علامہ اقبالؒ کے رنگ سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں، جس دل میں مغلیہ خون اب تک دوڑ رہا ہو ظاہر ہے کہ وہ ان پُرشوکت مغلوں کی تباہی پر کیا کچھ نہ دُکھا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کی بربادی اور مسلمانوں کی زبوں حالی آپ کے مرغوب موضوع بن گئے ہیں۔ اس سانحہ پر آپ کی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں اور دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے۔ آپ نے اس

---

[۱] اس نکتہ کو میر نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ ؛ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

سوز و گداز کا اظہار اکثر نظموں اور رباعیوں میں کیا ہے جن میں سچّے جذبات کی تپش و حرارت موجود ہے، آپ پر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

محترمہ کا وہ مسدّس جو سطورِ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے، اس قسم کی ایک عمدہ نظم ہے، طرزِ ادا میں علامہ اقبالؒ کا پُر شوکت رنگ جھلکتا ہے، خیالات میں ارتقائی مدارج صاف نظر آتے ہیں۔ پہلے اس لٹے لٹائے برباد قافلہ کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا اظہار ہے، پھر ان کو اُن کی وہ دیرینہ عظمت و شوکت یاد دلائی گئی ہے جس کو آج وہ خود بھی بھول چکے ہیں، اس موجودہ پستی اور دیرینہ عظمت کی یاد سے ان کی طبیعت میں ایک جوش اور خون میں گرمی پیدا کرنے کے بعد اُن کو دعوتِ پیکار و عمل دی گئی ہے اور آخر میں اُمید کی بہت افزا جھلک ہے۔

محترمہ نے نظم کے علاوہ غزل اور رباعی پر بھی قلم اُٹھایا ہے، جذبات کی شائستگی و سنجیدگی آپ کی غزلوں میں بھی قائم ہے۔ خصوصاً آپ کی رباعیاں نہایت پُر کیف اور بلند پایہ ہیں۔

خود محترمہ نے راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں اپنی شاعری کے متعلق غالباً غیر ارادۃً کچھ اظہارِ خیال فرمایا ہے جو آپ کے نظریۂ شاعری اور آپ کے کلام پر ایک اچھا تبصرہ ہے، خود محترمہ کے الفاظ میں سنئے :-

"شعر دلی ترجمانی کا نام ہے۔ جب واقعاتِ حیات ضمیر اور تخیلات کے خلاف ٹکر کھاتے ہیں تو ایک نغمہ اس قسم کا پیدا ہوتا ہے جس میں زبان کے

ساتھ آرٹ مشتمل ہو۔ اسی آواز کی لہروں کا نام شعر ہے۔ یہ ہی چیز میرے کلام میں آپ کو ملے گی۔ میرا بیشتر کلام قومی رنگ میں ہے۔ تغزل کے رنگ کا دوسرا نام گل و بلبل کا قصہ ہے۔ مگر میں اس قسم کی شاعری عورتوں کے لئے پسند نہیں کرتی۔ کبھی کبھی غزل جو لکھتی ہوں تو کوشش کرتی ہوں کہ عریاں اشعار نسوانی خودداری کے خلاف سانچے میں نہ ڈھلنے پائیں۔ گو تغزل کی صورت چاشنی کے بغیر پسند نہیں آسکتی لیکن طرزِ بیان اس کا مہذب ضرور ہونا چاہیئے ...."

سطورِ ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے وہ خود محترمہ کا مرسلہ انتخاب ہے۔ افسوس ہے کہ محترمہ اپنی مسلسل بیماریوں اور پریشانیوں کے باعث مزید انتخاب ارسال نہیں فرما سکیں۔

مسدس

عہدِ تیمور کا اک خوابِ جوانی تم ہو صفحۂ دہر کی گم گشتہ کہانی تم ہو
جورِ صیاد کی اک زندہ نشانی تم ہو ساری دنیا کے لئے سوزِ نہانی تم ہو
تم وہی ہو جو کبھی صاحبِ لشکر تم تھے
مالکِ تخت تھے تم زینتِ افسر تم تھے[1]

خوابِ دلکش کی جہاں میں ہوسِ خام ہو تم عشرت و عیش کے آغاز کا انجام ہو تم
صبحِ امید سے جو دور رہو وہ شام ہو تم منزلِ جاہ کی اک کوششِ ناکام ہو تم

---

[1] ع :- تختِ فغفور بھی ان کا تھا، سرِ کَے بھی (علامہ اقبال "جوابِ شکوہ")

جس کی قسمت میں ہے افلاس وہ تقدیر ہو اب
عالمِ یاس کی اک بولتی تصویر ہو اب

بوئے گل کی طرح عالم میں پریشاں ہو تم
نرگسِ باغ صفت دیدۂ حیراں ہو تم
چمن دہر میں وہ بلبلِ نالاں ہو تم
جس کی پرسش نہیں دنیا میں وہ انسان ہو تم[1]

تم کو وہ دور زمانے نے مٹا رکھا ہے
رنج و اندوہ کا ہر لحظہ مزا چکھا ہے

جن کی کل لونڈی تھی دولت بہ ہیبت تھا انکی
جن کے کل بجتے تھے ڈنکے بہ ہی نوبت انکی
جو کہ تقدیر بناتے تھے یہ صورت انکی
آج ہے گردشِ قسمت سے بری گت انکی

ہائے تقدیر نے دنیا کا قرینہ الٹا
جام لبریز ہے مینا کا خزینہ الٹا

تاج زریں کی ضیا تھی جن کے سر پر
تخت طاؤس تھا قدموں سے مزین یکسر
جن کے خدام نے دنیا کو دیا زیور و زر
پھرتے ہیں کاسہ گدائی کا لیے وہ در در

سیکڑوں آکے جہاں راج و مہاراج بنے
آج وہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہوئے

گر ہے ہمت تو نہ یوں وقفِ فغاں ہو جاؤ
ایک دل ایک جگر ایک زباں ہو جاؤ

---

[1] طرزِ ادا کی ہم رنگی ملاحظہ ہو، اقبالؒ

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو (جوابِ شکوہ)

بحرِ مواج بنو اور رواں ہو جاؤ　مثلِ خورشید زمانے میں عیاں ہو جاؤ

قطرے مل جائیں جو آپس میں تو دریا ہوگا
قوم کے درد کا اس طرح مداوا ہوگا[1]

کب یہ ممکن ہے کہ وہ رہبرِ منزل ہو　جس کے پہلو میں نہاں حرص و ہوا کا دل ہو
سوچ تو بہرِ خدا دل میں ذرا قائل ہو　حق پرستی یہ نہیں نازکشِ باطل ہو

جان اور مال دو تم اپنی ہی عزت کے لئے
زندگی وقف کرو قوم کی خدمت کے لئے

قوم کے واسطے تم اپنا مٹا دو تن من　ہاتھ آ جائے گا پھر فضلِ خدا کا دامن

---

[1] علامہ اقبالؒ نے بھی ایسے موقع پر کچھ اس سے بھی زیادہ پُرشوکت آواز میں مضروب و سرکش زمانے کے ستائے ہوؤں کو للکار کر اس طرح تعلیمِ پیکارِ عمل اور دعوتِ انقلاب دی ہے!

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم　صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر　تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنالے آشیاں　اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذِ گل　یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو　لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو　خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

سعیٔ موجود ہے تیمور ہے حق کا مخزن   لہلہاتا ہے یہاں جلوۂ قدرت کا چمن
بر عالی ملے گر ہمتِ عالی رکھو
ہوس و حرص سے گر سینہ کو خالی رکھو

غزل

مری تقدیر کی گردش نہ جائے گی خدا کب تک
رہے گی یوں ہی ناکامِ اثر میری دعا کب تک
کیا معدوم کیوں اہلِ جہاں چشمِ مروت کو
رہے گی دور تم سے کافرو طرزِ وفا کب تک
الٰہی اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم دیدے
رہے یا رب یہ ہستی پائمالِ مدعا کب تک
مری آنکھوں میں بادل ہے سفیدی ہے سیاہی ہے
خدا جانے یوں ہی ترسا کریگی یہ گھٹا کب تک
نہ سونے دیں گے مدفن میں ترے تیمور افسانے
بیاں کرتی رہیگی شمع حالِ جاں گزا کب تک

جو ظلم و جور سے پرہیز رکھتا ہے زمانے میں
وہ محشر میں یقیناً سرخرو اور شادماں ہوگا
نہ ہو آلودۂ حرص و ہوس، ہرگز نہ بن طامع

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا

اعانت تو نے گر کی بے کسوں کی اور یتیموں کی
خدا کے فضل سے دونوں جہاں میں کامراں ہوگا

نہ گھبرا اے حجابؔ خستہ دل بس صبر بہتر ہے
تری بگڑی بنا دے گا خدا جب مہرباں ہوگا

رُباعی

عبرت کدۂ دہر کے والی ہم ہیں
افسوس کہ وقفِ پائمالی ہم ہیں
تیمورؔ کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے
اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

دیگر

تھے کبھی سلطنتِ ہند کے ہم بھی حقدار
رشکِ اسکندر و قیصر تھا ہمارا دربار
بدلی قسمت، نہ رہا عہدِ حکومت تیمورؔ
وہی ہم آج ہیں رنجور و اسیرِ افکار

حجاب

حمیدہ خانم نام اور حجابؔ تخلص ہے، لاہور کی شاعرہ ہیں، قدیم رنگ میں غزل لکھتی ہیں، کلام میں خیال آفرینی، و خیال بندی زیادہ ہے، ایک زمانہ تھا کہ جب یہ رنگ بھی بہت مقبول تھا، مگر اب اس کو عموماً ترک کیا جا رہا ہے۔

رازِ ہستی

رازِ ہستی میرے بھی کچھ ایسے لکھوائے گئے
پڑ گئے ہیں زخم، دل میں کاتبِ تقدیر کے

دشتِ اُلفت میں قدم کیونکر بڑھیں تدبیر کے
کچھ بتا اے رہنے والے پردۂ تقدیر کے

اہلِ دل سمجھے ہوئے تھے اپنا اپنا دل جسے
حشر میں دیکھا تو پیکاں تھے تمہارے تیر کے

میّتِ بیمارِ ہجراں دیکھنے سے فائدہ
نقش کچھ دھندلے سے ہیں بگڑی ہوئی تقدیر کے

دل کے نالے نارسا ہوں لیکن اتنا ہے حجاب
حوصلے بڑھنے نہ دوں گی میں بھی چرخِ پیر کے

حجاب

فخر النسا، نام اور حجاب تخلص ہے، شاہجہانپور کی رہنے والی ہیں اُردو کی کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ کلام میں رنگینی و لطافت ہے۔ طرزِ ادا پاکیزہ ہے۔ آپ نے اکثر مشاعروں میں بھی حصّہ لیا ہے۔ ذیل کی غزل محترمہ نے سیّد التفات رسول صاحب مرحوم تعلّقدار سندیلہ کے مشاعرہ میں خود پڑھی تھی۔

کہاں ممکن ہے پوشیدہ غمِ دل کا اثر ہونا

لبوں کا خشک ہو جانا بھی ہے آنکھوں کا تر ہونا
غضب دل کر جدا مجھ سے ترا اے فتنہ گر ہونا
ستم نالوں کا پُر تاثیر ہو کر بے اثر ہونا
جگر میں درد لب پر نالۂ وحشت اثر ہونا
عیاں کرتا ہے اک شاب پری کا دل میں گھر ہونا
غضب نالہ کشی اک صاحب عصمت کے کوچہ میں
ستم اے دل کسی پردہ نشیں کا پردہ در ہونا
وہ اُن کا چپکے چپکے مسکرانا خون رونے پر
وہ میرا دل ہی دل میں واصفِ رنگ اثر ہونا
نہیں علت سے خالی پیش دشمن او ستم پیشہ
یہ منھ میری طرف ہونا تری نظریں اُدھر ہونا
غضب ہے دل کا رہ رہ کر تڑپنا میرے پہلو میں
کئے دیتا ہے طائر بسمل تیر نظر ہونا
جو تنہا پاس منزل دل کو شایاں ہے محبت میں
تو آنکھوں کو ہے لازم دیدۂ حسرت نگر ہونا
جو تجھکو اپنے چشم شوق کی پتلی سمجھتا ہے
ستم ہے اس سے پوشیدہ ترا مثل نظر ہونا
ستم کی جور کی بیداد کی کافی شہادت ہے
جدائی میں میرا بیتاب بے خود بے خبر ہونا

وہ تڑپانا کسی بیدرد کا مجھ کو نڈر ہو کر
وہ میرا ڈرتے ڈرتے شاکیٔ دردِ جگر ہونا
جو اک سوتے ہوئے فتنے کو چونکا میں گے غفلت سے
ان آنکھوں میں مناسب ہے قیامت کا اثر ہونا
حجابؔ آکر سندیلہ میں جو شاعر جمع ہوتے ہیں
مزا دیتا ہے کیا کیا مجمعِ اہلِ ہنر ہونا

حزیںؔ

صابرہ سلطان نام اور حزیںؔ تخلص ہے، تاریخ پیدائش فروری ۱۹۱۹ء ہے آبائی وطن میرٹھ ہے۔ والد کا نام محمد اللہ تھا۔ جو ڈھائی سال کی عمر ہی میں آپ کو داغِ یتیمی دے گئے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد چند سال سنبھل میں اپنے نانا کے پاس گزارے۔ اس کے بعد سے اب تک علی گڑھ، میرٹھ، لاہور، دہلی، اجمیر وغیرہ رہ چکی ہیں۔ فی الحال کانپور میں مقیم ہیں۔

تحصیلِ علم کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ مگر قدیم ایشیائی تہذیب اسکول کی تعلیم کے خلاف تھی۔ خاندانی بزرگوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ گھر ہی پر بغیر کسی اُستاد کی مدد کے پڑھنا شروع کیا؛ اور اس طرح اتنی ترقی کی، آج آپ ملک کی ایک قابلِ قدر ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔

اُردو ادب کا بھی شروع ہی سے ذوق رہا۔ پچھلے چھ سات سال سے

مختلف رسائل میں مختلف ناموں (عموماً شکیبا کے نام) سے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کے خیالات اور نثر نگاری کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ خطوط نگاری آپ کا محبوب مشغلہ ہے اور اس میں آپ کو بڑا کمال حاصل ہے۔ ادبی حیثیت سے ان کا پایہ بلند ہوتا ہے۔ آپ کے خطوط بے تکلف، عبارت آرائی، سادہ نگاری اور پُرخلوص اندازِ تحریر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں آپ نے جامعہ اُردو آگرہ سے ادیب۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیبِ عالم کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اب ادیبِ فاضل کے امتحان میں شمولیت کا ارادہ ہے۔ طبیعت بہت حساس پائی ہے۔ مگر اس کے باوجود مزاج میں ضبط، تحمل اور بُردباری بہت ہے۔

شاعری کا ذوق فطری ہے مگر آپ طبیعت سے مجبور ہو کر شعر کہتی ہیں۔ دوسروں کے لئے نہیں کہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کلام کو منظرِ عام پر لانے سے ہمیشہ محترز رہتی ہیں۔ کسی مشاعرہ میں حصہ نہیں لیتیں، کسی رسالہ میں اپنا کلام شائع نہیں کراتیں۔ راقم الحروف کو بھی بہت کچھ اصرار کے بعد اپنے مختصر حالات اور اشعار ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

محترمہ حزیں کا شاعرانہ ذوق بہت بلند ہے۔ آپ کا کلام جذبات نگاری کی کامیاب اور دلکش مثال ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے اور درد و اثر

بھی، یاس و حسرت بھی ہے اور امید و آرزو بھی۔ آپ کے جذبات میں بڑی تازگی اور شدت ہے، طرزِ ادا بہت شستہ، صاف اور پُرکیف ہے۔ جذباتی اعتبار سے آپ کا کلام نہایت بلند اور پُرکیف ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک کامیاب اور خوشگو شاعرہ ہیں۔

محترمہ کا مختصر مرسلہ کلام درج ذیل ہے:-

"میری داستاں سُن لے"

تجھے قسم ہے مری بیقرار آہوں کی
تجھے قسم ہے مری اشکبار آنکھوں کی
تجھے قسم مری دیوانہ وار باتوں کی

امینِ قلبِ حزیں، میری داستاں سن لے

ہے ایک جوششِ باراں سا آج آنکھوں میں
ہے ایک خوابِ پریشاں سا آج آنکھوں میں
ہے ایک تہیۂ طوفاں سا آج آنکھوں میں

امینِ قلبِ حزیں، میری داستاں سُن لے

تجھے قسم ترے افسانہ ہائے رنگیں کی
تجھے قسم ترے لمحات ہائے زریں کی
تجھے قسم مری شب ہائے تار و غمگیں کی

امینِ قلبِ حزیں، میری داستاں سُن لے

ترے حضور میں کرلوں بیں شرحِ آیتِ غم

تو آج سن لے مری خونچکاں حکایتِ غم
خدا گواہ! نہیں ہے مجھے شکایتِ غم
امینِ قلبِ حزیں میری داستاں سن لے

یہ میرا نالہ، کہیں تیرا ہی ترانہ نہ ہو
مری حکایتِ غم تیرا ہی فسانہ نہ ہو
یہ حرفِ شوق کہیں رازِ محرمانہ نہ ہو
امینِ قلبِ حزیں میری داستاں سن لے

غزل

یہ ربط و ضبط کہاں تک نبھائے جاؤں میں
کہ دل کا خون ہو اور مسکرائے جاؤں میں

وہ اک نگاہ جو ہستی پہ چھائی جاتی ہے
تمہیں بتاؤ کہاں تک چھپائے جاؤں میں

ستارے شام ہی سے جھلملائے جاتے ہیں
کہو تو اپنی کہانی سنائے جاؤں میں!

جو کوئی سنتا رہے بیٹھ کر پسِ پردہ
تمام عمر اسی طرح گائے جاؤں میں

لبوں پہ دم ہے مگر ان کا حکم ہے یہ حزیں
کہ داستانِ محبت سنائے جاؤں میں

آج ان کو بلا رہی ہوں میں
اپنی دنیا بسا رہی ہوں میں

پھر تصور میں ہیں یہ راز و نیاز
کوئی روٹھا، منا رہی ہوں میں

ان کے قدموں پہ آج رکھ کے جبیں
قصۂ غم سنا رہی ہوں میں

اے حزیں انتظار دوست میں آج
دل کو ساکت سا پا رہی ہوں میں

شیرازۂ حیات ہے پھر منتشر سا کچھ
آنکھوں میں پھر رہا ہے خواب پریشاں سا آجکل

ہاں پھر کوئی خیال پہ چھایا ہوا سا ہے
برپا ہے میری زیست میں طوفاں سا آجکل

پھر آرزو یہ ہے کوئی پوچھے حدیث غم
آنکھوں میں ہے تہیۂ طوفاں سا آجکل

پھر امتیاز وصل و فراق اٹھ گیا کہ ہے
کچھ دن سے کوئی قلب میں مہماں سا آجکل

کیوں روزگار بر سر پیکار ہے حزیں
کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں سا آجکل

حمیدہ ۔ دہلوی ۔

حمیدہ سلطان احمد حمیدہ ۔ دہلی کی ادیبہ اور شاعرہ ہیں، نہایت باذوق اور ادب نواز خاتون ہیں، نثر و نظم دونوں کا رنگ پختہ اور سنجیدہ ہے آپ ادبی خدمات میں بڑی خوشی اور سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں ۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو جو پہلا آل انڈیا زنانہ مشاعرہ نشر ہوا تھا اس کی روح رواں آپ ہی تھیں ۔ اس کے بعد دہلی میں ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو

لیڈیز کلب میں جو زنانہ مشاعرہ ہوا تھا وہ بھی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔
آپ ایک خوش ذوق و خوش فکر شاعرہ ہیں۔ آپ کے اشعار صاف و لطیف ہیں، طرزِ ادا میں سادگی، ندرت و جدّت ہے۔
ذیل کی طرحی غزل محترمہ نے دہلی میں زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی جو ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو لیڈیز کلب میں ہوا تھا۔

محبّت بھی ہے جرأت آزما کیا
غمِ دل ان سے کہہ دوں برملا کیا

بقا کیا ہے، محبّت میں فنا کیا
ترے کشتوں سے اس کا پوچھنا کیا

اشاروں میں یہ کیوں عہدِ محبّت
نگاہوں سے یہ پیمانِ وفا کیا

تصوّر میں یہ مبہم سی محبّت
ہے یہ بھی کوئی اندازِ جفا کیا

تمھیں دیکھیں گے چشمِ روح سے ہم
ان آنکھوں سے تمھارا دیکھنا کیا

سب اس کی راہ تکتے ہیں چمن میں
شمیمِ لالہ و گل کیا، صبا کیا

جنونِ بندگی کا عکس ہیں سب
خودی کیا، بیخودی کیا، اور خدا کیا

شکستِ آرزو ہے اور مسلسل
ہماری زندگی کا پوچھنا کیا[1]

غمِ آغازِ اُلفت ہی مرن ہے
حمیدہ شوقِ مرگِ انتہا کیا

---

[1] مؤلف احقر ؎
ہر تمنّا کا خون ہوتا ہے
کیا یہی زندگی کی غایت ہے
"رنج"

حمیدہ :-

حمیدہ خاتون نام اور حمیدہ تخلص ہے، دورِ حاضر کی ایک خوش فکر شاعرہ ہیں نظمیں خوب لکھتی ہیں - آپ موجودہ دور کی ایک اچھی ادیبہ اور افسانہ نگار بھی ہیں -

خوشی کے چہچہوں سے دور یہ سنسان بستی ہے
یہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی برستی ہے
قیامت کی سیاہی ہے، قیامت کا اندھیرا ہے
زمیں کو ہر طرف وحشت بھری تاریکی نے گھیرا ہے
زمیں پر خشک پتوں کی اچانک سرسراہٹ سے
جھجک اٹھتے ہیں انسانی قدم اپنی ہی آہٹ سے

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے چھانے سے
لرز جاتا ہے دل ہر گام پر رستہ نہ پانے سے

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پہ مت جاؤ
حقیقت سے تمھیں آگاہ کرتی ہوں ادھر آؤ

یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
زمانہ گر نشاں ان کا مٹاتا ہے مٹانے دو

جو سچ پوچھو تو کتنی رشک کے قابل یہ حالت ہے
میسر ان کو کتنا چین ہے کتنی فراغت ہے

نہ دنیا کے بکھیڑے ہیں، مصیبت ہے، نہ بیماری
نہ آپس کی عداوت ہے، نہ چالاکی، نہ عیاری

میسر ہے یہاں عالم کی سب فکروں سے آزادی
خموشی اور سکوں کا گھر ہے یہ ویران آبادی

یہاں کی سرزمیں اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں غمناک روحوں کو دوامی عیش حاصل ہے

یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہمِ تسکیں مہیا ہے
یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے

شکستہ خاطروں کی آخری منزل ہے یہ بستی
تھکے ہارے ہوؤں کی جاوداں محفل ہے یہ بستی

حور - میرٹھی

گوہر اقبال نام، اور حور تخلص ہے۔ میرٹھ وطن ہے، جناب نذیر احمد صاحب میرٹھی کی دختر ہیں۔ آپ کا تعلق زبیری خاندان سے ہے۔

گوہر اقبال حور ایک بلند پایہ اور قابلِ قدر شاعرہ ہیں، آپ کا کلام مختلف رسائل میں چھپتا ہے اور کافی مقبول ہو چکا ہے، آپ نہایت قادر الکلام اور خوش گو خاتون ہیں۔ آپ کے کلام میں جوش، رنگینی، رومان پروری، جذبات کی ترجمانی، ندرت اور جدت موجود ہے، آپ کے دل میں قوم و ملت کا درد بھی ہے اور اس رنگ کی بھی عمدہ نظمیں آپ کے یہاں ملتی ہیں، آپ شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہوئی ہیں۔ اور آپ نے شاعری سے پیغام و اصلاح کا بھی کام لیا ہے۔

جہانِ عشق کا ہر ذرہ انتظار میں ہے　　　میں دیکھتی ہوں جسے تیرے انتظار میں ہے
ہم اس خیال میں اب سر جھکا کے بیٹھے ہیں　　　کششِ جبیں میں ہے یا آستانِ یار میں ہے

مستقبل

اے شاہدِ دورِ نہاں!
تو ہے محیطِ دو جہاں اے شاہدِ دورِ نہاں!
افکارِ ماضی سے اگر فرصت کبھی پاتی ہوں میں
پابستگیٔ حال سے رہ رہ کے گھبراتی ہوں میں
پھر تجھکو شب کی خلوتوں میں ڈھونڈھنے جاتی ہوں میں
اور دور ہوتا ہے کہیں نظروں سے تیرا آشیاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں

آہستہ آہستہ مری تخئیل میں آتا ہے تو
تسکین میں ڈوبے ہوئے نغمے سے برساتا ہے تو
اور میری نظروں میں بھی یوں منظر جاتا ہے تو
جیسے ہجومِ ابر سے تارا چمک کر ہو عیاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

ہونٹوں کی رنگینی میں صبحِ لالہ ساماں کے ہجوم
آنکھوں میں چھائے ہوئے خوابِ درخشاں کے ہجوم
شب رنگ زلفوں میں لئے ابرِ بہاراں کے ہجوم
اکثر میری تخئیل پر ہوتا ہے تو جنت نشاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

جب زندگی کو ہر طرف سے گھیر لے شامِ ملال

جب ظلمتوں میں حال کی پیدا نہ ہو رنگِ جمال
سلمائے صبحِ آرزو ہو جائے جب غم سے نڈھال
اس وقت تو آتا ہے امیدوں کا لیکر کارواں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

اکثر مرے کھوئے ہوئے نغمے سناتا ہے مجھے
بن کر مرا خوابِ سکوں تو راس آتا ہے مجھے
تو ہر قدم پر جلوہ ہائے نو دکھاتا ہے مجھے
حیران رکھتی ہیں مجھے تیری تنوّع خیزیاں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

رہ رہ کے آتا ہے نظر رہ رہ کے کھو جاتا ہے تو
پھر شام زارِ ذہن میں چھپ چھپ کے سو جاتا ہے تو
میں ڈھونڈھتی ہوں ہر طرف اور محو ہو جاتا ہے تو
تو کھیلتا ہے روح سے بن بن کے سحر بے نشاں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

ظلمت بداماں ہے کبھی اور جلوہ ساماں ہے کبھی
تو خوابِ شیریں ہے کبھی خوابِ پریشاں ہے کبھی
تو ہے کبھی پیشِ نظر، نظروں سے پنہاں ہے کبھی
ہر رنگ سے میرے تخیّل میں تو ہے جلوہ کناں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

قوم و وطن کی پستیاں کرتی ہیں جب دل کو خراب
تو کیف زا خوابوں کی دنیا سے اُٹھاتا ہے نقاب
پیشِ نظر لاتا ہے پھر دورِ وطن کو کامیاب
اور بخش دیتا ہے نگاہوں کو وقارِ جاوداں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

لپٹی ہوئی تیرے قدم سے ہے اُمیدِ ارتقا
ہے ذرّے ذرّے سے ترے خاکِ وطن کو آسرا
اور تیری آمد میں ہے اندیشۂ جنگ و فنا
تو ہے کبھی شامِ الم اور ہے کبھی صبحِ جناں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

تو کارزارِ دہر کا نقشہ دکھاتا ہے کبھی
جوشِ عمل کے پُراثر نغمے سناتا ہے کبھی
اور تو کبھی آتا ہے بنکر جسم میں روحِ رواں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

ہے مسکراہٹ میں تری روپوش خورشیدِ وطن
تیرے ہی جلووں میں نہاں ہے صبحِ تجدیدِ وطن
وابستہ آنچل سے ترے دامانِ امیدِ وطن
پردوں میں تیرے جلوہ گر اوجِ وطن کی کہکشاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

تو ارتقائے قوم کا اک مستقل پیغام ہے
امن و سکونِ دہر کی تمہیدِ خوش انجام ہے
اور انقلابِ دور میں بربادیٔ آلام ہے
آتا ہے سرافرازیوں کا بن کے عہدِ کامراں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

برسائے گا تیرِ الم، یا تو مسرت لائے گا
تو نور بن کر آئے گا، یا نار بن کر آئے گا
کس کو خبر ہے دہر پہ کس رنگ میں چھا جائے گا
روپوش ہے تو کس قدر، اے زندگی کے رازداں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

نوائے عمل

جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

سورج سر پر آن چڑھا ہے ۔۔۔ سارا زمانہ جاگ اٹھا ہے
ہر فرقہ حق مانگ رہا ہے ۔۔۔ تم سوتی ہو قہرِ خدا ہے

جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

قوم ہے مردہ جان تمھیں ہو ۔۔۔ جینے کا سامان تمھیں ہو
شان ہے تم سے شان تمھیں ہو ۔۔۔ شانِ تمھیں ہو آن تمھیں ہو

جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

عہدِ غلامی موت سے بدتر　　ساری بلائیں ہے تو سر پر
چھاؤ جہاں پر رحمت بن کر　　بہنو آزادی کا زیور
جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

فاقوں کی ماری بہنیں مائیں　　روٹی کے بدلے جو غم کھائیں
بھوکے بچے آنسو بہائیں　　کب تک دیکھو گی یہ دشائیں
جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

ہم سے لگی ہیں قوم کی آنکھیں　　ہم سے بندھی ہیں ساری امیدیں
مل کے جو ہم میدان میں نکلیں　　بھارت کو آزاد کرا دیں
جاگو۔ جاگو۔ بہنو جاگو

آرزوئے موہوم

میں سوچتی رہتی ہوں　　یہ میری تمنا ہے
اے کاش کبھی ایسا　　اک دورِ عمل آئے
اک پھول میں بن جاؤں

پھولوں کی لطافت میں　　شاخوں کی نزاکت میں
میں نزہتیں پھیلاؤں

پھر پھولوں کے خرمن پر　　اور سبزہ کے دامن پر
کچھ نگہتیں برساؤں

ایسا جو ہو تو شاید　　ممکن ہے کبھی شاید

راحت میں یہاں پاؤں

حاصل ہو سکوں دل کو　　اور کیفِ بقا مجھ کو
لیکن یہ نہیں ممکن　　دیکھو جو حقیقت میں

راحت نہیں دنیا میں
فانی ہی یہاں ہر شے

(۲)

میں سوچتی رہتی ہوں　　یہ میری تمنا ہے
اے کاش کبھی ایسا　　اک دورِ عمل آئے

اس بزمِ پریشاں سے
ظلمت گہِ ہستی سے　　اس گنجِ لطافت سے

اُڑ کر میں پہنچ جاؤں
مہتاب میں بن جاؤں　　ہر شام کو روشن ہوں

ہر صبح کو چھپ جاؤں
پھر بزمِ فلک پر سب　　تارے کریں جھلمل جب

ہنس کر میں نکل آؤں
اس دشتِ مصیبت پر　　گہوارۂ ظلمت پر

وہ نور میں برساؤں
کہ پھر مری کرنوں سے　　ہر ذرّہ چمک اُٹھے

ہر قطرہ کو چمکاؤں

اب جو ہو تو شاید ممکن ہے کبھی شاید
راحت ہیں یہاں پاؤں

حیا میرٹھی :-

خورشید اقبال نام اور حیا تخلص ہے آپ گوہر اقبال حور کی حقیقی بہن اور جناب نذیر احمد صاحب میرٹھی کی دختر ہیں۔

محترمہ خورشید اقبال حیا موجودہ دور کی ایک نہایت سربرآوردہ، اور بلند پایہ شاعرہ ہیں آپ کے یہاں جذباتی، رومانی، قومی و ملی ہر قسم کی نظمیں ملتی ہیں جو نہایت پاکیزہ و لطیف ہیں آپ کے یہاں یاس و حسرت کی تڑپتی ہوئی تصویریں بھی ہیں اور امید و آرزو کی جنت بھی، آپ کا اسلوبِ بیان نہایت پختہ اور شگفتہ ہے آپ کی نظموں میں بڑا کیف و اثر ہوتا ہے کلام میں جذبات کی سنجیدگی و وقار قائم ہے کیف و اثر بھی ہے اور کہیں کہیں فلسفیانہ جذبات کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔
آپ کا شمار موجودہ دور کی چوٹی کی شاعرات میں ہے۔

ایک امید تو بندھ جائے تسلی نہ سہی اور جو یوں بھی نہیں منظور تو یہ بھی نہ سہی
میں سمجھتی ہوں کہ موت آ نہیں سکتی شبِ غم دل میں باقی ابھی امید ہے ان کی نہ سہی

صبحِ امید

(۱)

کرنوں کا لے کے پرچم سورج افق سے نکلا
اور بے نقاب ہو کر رنگیں فضا میں نکھرا

پھر کوہسار پر چمکے　　پھر آبشار پر چمکے
پھر برگ و بار پر چمکے

شاخوں کی گتھیوں میں　　کلیوں کا رنگ چمکا
سرسبز پتیوں میں　　پھولوں کا رنگ چمکا

(۲)

پھر صبحِ عید آئی　　کیف و سرور لے کر
رنگینیوں میں اپنی　　نور و ظہور لے کر
غنچے چٹک رہے ہیں　　گلشن مہک رہا ہے
ذرے چمک رہے ہیں

صوتِ رباب بن کر　　نغمے ہوا میں گونجے
موجِ شراب بن کر　　پھر سبزہ زار جھومے

(۳)

لیکن حیا تمھارے　　دل پر اثر نہیں ہے
خاموش یوں پڑی ہو　　گویا خبر نہیں ہے
چاروں طرف خوشی ہے　　عشرت برس رہی ہے
در اصل عید ہی ہے

یہ عید کی سحر ہے　　تم کیوں غم آشنا ہو
اٹھو خوشی مناؤ　　ایسا بھی رنج کیا ہے

بیان قصۂ قلبِ نزار کیوں نہ کروں
تجھی پہ دردِ ترا آشکار کیوں نہ کروں

مجھے جب آپ ہے اپنے سے اعتبارِ وفا
تو ہی بتا کہ ترا اعتبار کیوں نہ کروں [1]

وہ آنکھ جس کو دکھایا تھا تونے روئے جمیل
ترے فراق میں اب اشکبار کیوں نہ کروں

وہ زندگی جو ترے سامنے ہو جان سپرد
تجھے نہ پا کے اُسے سوگوار کیوں نہ کروں

جو تو ہی مجھکو نہ بھیجے کوئی پیام سکوں
قبائے صبر کو پھر تار تار کیوں نہ کروں

طلسمِ اُمید

تو رنج نہ کر مغموم نہ ہو اُمیدیں مجھ سے کہتی ہیں
اس یاس کے ریگستاں سے پرے تسکین کی نہریں بہتی ہیں
ہر شے جب قطعاً فانی ہے اس دنیائے فانی میں
تغییر نہ ہوگا آخر کیوں۔ پھر تیری غم سامانی میں
آخر اک دن بدرِ عشرت۔ شب زار افق پر چمکے گا
یہ آج جہاں تاریکی ہے اک نور وہیں پھر برسے گا
عیش اور مسرت کی کرنیں پھر روح پہ تیری چھا جائینگی
تاریک پڑی ہے جو بستی اس کو وہ پھر چمکائیں گی
پھر خوشبوؤں کے گہوارے میں آسودہ سکونِ دل ہوگا
پابوس مسرت ہوگی تری سرخوشِ رنگِ محفل ہوگا

---

[1] غالب: حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم :: اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

کوئی آنے والی ساعت، عشرت لے کر آجائے گی
خوشبوؤں کی اک موجِ روشن، بہجت لے کر آجائے گی
یوں جاگیں گی پھر آرزوئیں، جیسے کہ شگوفوں کی دنیا
مسرور، شگفتہ پھر ہوگی، یہ تیری روحِ واماندا
اس ویراں دل کی دنیا پر، جنّت کی بہاریں چھائیں گی
شیریں خوابوں کی جنّت میں، نوریں کلیاں کھل جائینگی
ہر غم کے بعد اک راحت ہے، دنیا والے یوں کہتے ہیں
آغاز میں رونا ہے جن کے، انجام میں ہنستے دیکھے ہیں

خاتونِ وطن سے

چاہیئے ذوقِ حصولِ علم و حکمت چاہیئے
ساتھ ہی احساس دردِ قوم و ملّت چاہیئے
تلب کیے یہ ظلم و استبداد کی خود غرضیاں
ترے ہر اک فعل میں کیفِ محبّت چاہیئے
سرزمینِ ہند کو حاصل ہو جس سے روشنی
ذہن و دل میں وہ تجلّیٔ صداقت چاہیئے
ہو نہ ایسا عظمتِ ماضی پہ حرف آئے کہیں
تیرے ہر انداز میں شانِ متانت چاہیئے
باغباں! کہتے نہ پائے تجھ کو باغی تیتری
تجھ میں غیرت چاہیئے، جوشِ حمیّت چاہیئے
ذرّے ذرّے کو جگادے تیرا طوفانِ عمل
گرمیٔ احساس و ذوق بے نہایت چاہیئے
کردے جو نابود دنیا سے جمود و بیخودی
تیری رگ رگ میں وہ طوفانِ قیامت چاہیئے
جور و استبداد کی زنجیر کو جو توڑ دے
دست و بازو میں وہ قوت اور طاقت چاہیئے
تیری ہستی کو جو لے پہنچے فرازِ عرش پر
تیرے دل میں وہ یقینِ فتح و نصرت چاہیئے

ماہ و انجم کی ضیاء بھی جس سے ہو جائے خجل
یوں فروزاں شمع استقلال و ہمت چاہیئے

جس سے ہوں اصنامِ تہذیبِ خیالی سرنگوں
تیرے شیشے میں وہ قوت، وہ صلابت چاہیئے

تجھ کو کرنی چاہیئے مضبوط ملت کی اساس
ہر رگِ دل میں تری احساسِ ملت چاہیئے

تجھ پہ نازاں ہو صداقت تجھ پہ نازاں ہو وطن
تیری ہر اک بات میں ایسی شرافت چاہیئے

جہل اور افلاس کی مٹ جائیں جس سے ظلمتیں
کم سے کم اتنا فروغِ آدمیت چاہیئے

غور کر کے اپنے نصب العین کو تبدیل کر
مقصدِ آزادیٔ اقوام کی تکمیل کر

تمھاری یاد میں ہر نغمہ ہے فغاں اب بھی[1]
تمھاری یاد کی تازہ ہے داستاں اب بھی
غمِ فراق کی باقی ہیں تلخیاں اب بھی
یہ غم وہ ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا :: تمھاری یاد زمانہ بھلا نہیں سکتا

ابھی بدل نہ سکا تھا مزاجِ دنیا کا
کئے ہوئے ہے مقید رواجِ دنیا کا
تخیلات پہ اب بھی ہے راج دنیا کا
چلے گئے ہو ابھی سے ہمیں شکایت ہے :: الم کدے میں تمھاری ابھی ضرورت ہے

---

[1] یہ دو بند موصوفہ کی ایک نظم سے لئے گئے ہیں جو علامہ راشد الخیری کی وفات پر لکھی گئی تھی اور جس کا عنوان ہے۔ "مصور غم سے"۔

سکونِ شب اور بچپن کی یاد

سیاہی شب کی بڑھتی آرہی ہے
چراغِ شام کو دھندلا رہی ہے

مناظر پر خموشی چھا رہی ہے
سواری ظلمتوں کی آ رہی ہے

حجابوں میں ہے دشت و کوہ و دریا
ہر اک شے پر خموشی چھا رہی ہے

ہوا ساکت ہے سبزہ سو رہا ہے
حسیں کلیوں کو بھی نیند آ رہی ہے

شگوفے ڈالیوں پر جھک گئے ہیں
شگفتہ بیخودی سی چھا رہی ہے

شمیم و نکہتِ گل سو گئی ہیں
لچک شاخوں کی سوئی جا رہی ہے

ہری شاخیں نشہ میں نیند کے ہیں
ہر اک پتّے کو بھی نیند آ رہی ہے

چمن میں ہے سکوں اندوز بلبل
خموشی کی زباں سے گا رہی ہے

ہر اک وادی کا دامن بے صدا ہے
سکوں کا راگ ندّی گا رہی ہے

صنوبر کے یہ لمبے گہرے سائے
نظر بھی جن میں کھوئی جا رہی ہے

عجب حیرت سی طاری ہے دروں پہ
اُداسی مقبروں پر چھا رہی ہے

بساطِ سبز پر گر گر کے شبنم
پیامِ بے ثباتی لا رہی ہے

وہ ندّی جس پہ سائے چھا گئے ہیں
سکوں کے ساتھ بہتی جا رہی ہے

متانت سے رواں ہے اپنی دھن میں
کوئی پیغام لے کر جا رہی ہے

نہ جانے اس کی منزل کس جگہ ہے
خدا جانے کہاں سے آ رہی ہے

کہیں کوئی کنول یوں تیرتا ہے
کہ جیسے ننھی کشتی بہا رہی ہے

کنول خاموشیوں کے جل رہے ہیں
ستاروں کی چمک دھندلا رہی ہے

ہے ان کی انجمن بیہوش و جامد
سکوں کی نیند اُن کو آ رہی ہے

کسی نے کوئی جادو کر دیا ہے — تجلّی ان کی سوئی جا رہی ہے
کوئی بادل کا بھولا بھٹکا ٹکڑا — ہوا نے جس کو ساکن کر دیا ہے
نہیں شاید فرشتے کا یہ بازو — سرِ پرواز میں پھیلا ہُوا ہے
کوئی آنچل ہے یہ لیلائے شب کا — فضا میں پھیل کر جو رہ گیا ہے
گھنے پیڑوں کے پیچھے سے فلک پر — نکل کر ماہِ روشن آ رہا ہے
نہیں شاید فرشتہ ہے یہ کوئی — جو حیرت سے ٹھٹک کر رہ گیا ہے
اگرچہ اس کی کرنیں پڑ رہی ہیں — مگر پھر بھی کُہر سا چھا رہا ہے
ہر اک منظر پہ طاری ہے سکوں سا — سکوں اک خواب بن کر چھا گیا ہے
مگر اس وقت بھی میں ہوں پریشاں — کہ اک طوفان سا دل میں بپا ہے
وہ طوفاں جو محیطِ روح و دل ہے — تخیّل جس میں بھٹکا جا رہا ہے
نہ سوئے گی یہ میری تیرہ بختی — سکوں دنیا پہ چھایا ہے تو کیا ہے
مرے دکھ اور مری بے چینیوں کو — فضا کا یہ سکوں چونکا رہا ہے
مجھے پھر آ رہی ہے یادِ دوشیں — فسانہ پھر وہی یاد آ رہا ہے
وہ بچپن! آہ میرا عہدِ شیریں — کہانی، دل وہی دُہرا رہا ہے
تھیں جب اک کیف سے مخمور آنکھیں — وہ دورِ زندگی یاد آ رہا ہے[1]

---

[1] محترمہ کی اس نظم کے بعد علامہ اقبالؒ کی نظم "ایک شام" یاد آجاتی ہے، ملاحظہ ہو:-

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش

اے سالِ نَو

اے سالِ نَو اے سالِ نَو

اے وقت کے نورِ خراماں حاصلِ دَورِ نہاں
پھر صبح زارِ دہر میں، تو بن کے سورج ہے عیاں
مدہوشیوں کی گود میں ہے گل طرازو گل فشاں

اے سالِ نَو اے سالِ نَو

کچھ آرزوئیں حسرتیں رقصاں تری آمد میں ہیں
ہاں شوق کے آتشکدے پنہاں تری آمد میں ہیں
کچھ خواب اُمیدوں کے بھی لرزاں تری آمد میں ہیں

اے سالِ نَو اے سالِ نَو

یہ سچ ہے کہ آیا ہے تو کچھ خواب دکھلاتا ہوا
اس غمکدے پر دہر کے نشہ سا برساتا ہوا
کیفِ سکوں ساماں لئے، اور گیت سے گاتا ہوا

[پچھلے صفحہ سے] فطرت بیہوش ہوگئی ہے | آغوش میں شب کے سوگئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے، | نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے، | یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خموش ہیں کوہ و دشت و دریا | قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہوجا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا [بانگِ درا ص۱۳۶]

اے سالِ نو اے سالِ نو
کس کو خبر ہے ساتھ تو لایا ہے غم کے قافلے
یا تیرے پردوں میں ہیں روپوش خوشیوں کے پرے
یعنی آیا ہے نویدِ امن و آزادی سے لیے
اے سالِ نو اے سالِ نو
اے کاش راس آئے ہمیں رعنائیاں لانا ترا
آغوشِ عالم میں باندازِ دگر آنا ترا
بنکر طلسمِ رنگ و بو دنیا پہ چھا جانا ترا
اے سالِ نو اے سالِ نو
شب ہائے ظلمت میں ہماری تو نیا خورشید ہو
گلہائے زنگار رنگ سے پُر دامنِ اُمید ہو
یکسر مسرت جو ہو اس انجام کی تمہید ہو

بجا کہ رنج و مسرت پہ ہم نہیں قادر
یہ زندگی تو مگر صرف ایک خواب سی ہے
پھر اس کا رنج ہی کیوں جو ہو مقدر موہوم
کہ حیثیت تو یہاں کی فقط سراب سی ہے
اُلٹ ہی دیتی ہی آخر جسے ہوائے اجل
لطیف روح کے چہرے پہ وہ نقاب سی ہے
ازل سے لازم و ملزوم ہی حیات اور موت
کہ چار روز کی یہ زندگی سراب سی ہے

پھر چمن میں آج غنچے چاک داماں ہو گئے
پھر مرے جوشِ جنوں کے راز عریاں ہو گئے

سونیوالے جاگ اُٹھے محشر کے ساماں ہو گئے
آج شاید وہ سوئے گورِ غریباں ہو گئے

منتشر ہیں رخ پہ اور بکھری ہوئی ہیں دوش پر
آپ کے گیسو مرا حالِ پریشاں ہو گئے

اے حیا کہتے ہیں اس کو امتزاجِ حسن و عشق
ان کے جلوے میری آنکھوں میں نمایاں ہو گئے

حیا (لکھنؤ)

کنیز فاطمہ نام اور حیا تخلص ہے۔ آپ چودھری نعمت اللہ صاحب ایڈوکیٹ کی دختر ہیں۔ آپ کی شادی سندیلہ میں چودھری عبدالرحمٰن صاحب سے ہوئی ہے۔ آپ کے والد صاحب بہت زمانے سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ اس لئے عام طور پر ادبی دنیا میں محترمہ کو "لکھنوی" لکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن راقم السطور کے نام ایک خط میں محترمہ رقمطراز ہیں:۔

"لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ میں لکھنؤ کی ہوں۔ میرا وطن یعنی میرے والد صاحب قبلہ کا وطن ضلع بارہ بنکی قصبہ ستر کہ ہے۔"

محترمہ دورِ حاضر کی ایک نہایت ادب پرور اور ادب نواز خاتون ہیں۔ تمامتر زندگی ادبی مشاغل میں بسر ہوتی ہے۔ آپ لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ بھی نکالا کرتی تھیں، جس کا نام "حیا" تھا اور آپ خود ہی اس کی مدیرہ تھیں۔

افسوس ہے کہ باوجود سخت اصرار کے محترمہ نے اپنے حالاتِ زندگی ارسال نہیں فرمائے اس سلسلہ میں آپ رقمطراز ہیں:۔

" دیباچہ ... حالاتِ زندگی اور میری "کاوش" (شاعری) پر روشنی ڈالنی چاہتی ہے اور اس کے متعلق معلومات طلب کرتی ہے۔ حالاتِ زندگی نہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں نہ میں انھیں واضح طور پر قلمبند کر سکتی ہوں۔"...
اب سے پہلے ماہنامہ حیا لکھنؤ کے دورانِ ادارت میں ہندوستان کے وسیع طول و عرض سے خدا جانے کتنی بار میرے دور اُفتادہ قارئین کرام نے مجھ سے اپنے متعلق اور اپنی شعر گوئی کے متعلق سوانح نگاری کی فرمائش کی لیکن میرے لئے یہ تعمیلِ ارشاد ہر مرتبہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوئی ... مجھے اس کی ضرور ندامت رہی کہ اپنے بہت سے ادب دوست بھائیوں کی مکرر سہ کرر استدعاؤں کو میں رہین تشکر نہ کر سکی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دیانت کے ساتھ اس کا بھی اعتراف رہا کہ میں نے اپنی خاموش اور معنی خیز بے اعتنائی سے اپنے سراب آسا تشنگانِ ادب کو مایوس رکھا۔ بہر حال اس اظہارِ خیال سے میرا مطلب اپنی علمی بے بضاعتی کو ظاہر کرنا ہے .....؛

محترمہ دورِ حاضر کی ایک نہایت خوشگوار و قادر الکلام شاعرہ ہیں، آپ کا کلام جذباتی اعتبار سے نہایت بلند و پُر کیف ہے، آپ کے یہاں کہیں کہیں نشاطیہ رنگ بھی ملتا ہے مگر یہ آپ کا مستقل رنگ نہیں، آپ کے کلام پر حزنیہ و المیہ رنگ چھایا ہوا ہے اور اس رنگ کی نہایت دلدوز مثالیں آپ کے یہاں موجود ہیں زبان میں سادگی و پاکیزگی قائم ہے، جو خلوص اور شدتِ جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے، آپ کے کلام پر اختر شیرانی کا اس قدر

کنیز فاطمہ 'حیا'

اثر پڑا ہے، اور اسی رنگ میں آپ اس قدر بے تکلفی اور پختگی سے لکھتی ہیں کہ آپ کو بجا طور پر شاعرات کی دنیا کا اختر کہا جا سکتا ہے، معاملہ بندی آپ کے کلام کی خاص خصوصیت ہے۔ اس سلسلہ میں آپ جرأت اور مومن کے رنگ سے متاثر نظر آتی ہیں!

آپ کا ہر ہر شعر رومانی فضاؤں میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ کلام میں جذبات کا ایک تلاطم ہے ——— جذبات جو نہایت شدید طریقے پر محسوس کئے گئے ہیں اور نہایت صداقت کے ساتھ ادا ہو گئے ہیں۔ آپ کی شاعری وارداتِ قلب کی آئینہ دار ہے! شاعری اور اخلاقیات مختلف چیزیں ہیں اور ان کو مختلف نظریوں ہی سے دیکھنا چاہیئے۔ شاعری شدّتِ جذبات کے پُرخلوص، مرتّب و مسلسل، کیف آور اور وجد آگیں اظہار کے سوا اور کچھ نہیں اور اس کی عمدہ مثالیں محترمہ کے کلام میں موجود ہیں!

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ محترمہ کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے اپنی شاعری پر اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارا اصرار بیکار نہ گیا اور بالآخر محترمہ کو اگر حالاتِ زندگی پر نہیں تو اپنے کلام پر قلم اُٹھانا ہی پڑا۔ آپ لکھتی ہیں:-

"آپ کے اصرار نے مجھے آخر قلم اُٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ اگرچہ آجکل طبیعت بھی غیر حاضر ہے اور فرصت بھی نہیں۔ اس قسم کے بہت سے اور تقاضے اب بھی ہیں۔ خیر اب لوگوں کو شکایت کا موقعہ ہاتھ نہ آئیگا!"

آپ نے اپنے کلام پر جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ذیل میں شکریہ کے

ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

"شاعری کی ابتدا، گیارہ سال کی عمر سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جو ابیات میں نے کہے ان میں اوّلیت میری ایک نظم "گلاب" کو حاصل ہے بالکل بچپن ہی سے مجھے پھولوں سے بہت شغف تھا اور خاصکر گلاب کے پھول سے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے گلاب ہی پر قلم اُٹھایا۔ یہ نظم تہذیبِ نسواں لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا کلام آئینہ۔ عصمت۔ زیب النساء رومان اور دوسرے رسائل میں شائع ہونے لگا۔ میرے ابتدائی اشعار میں تصوّف کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن مجھے یہ بات ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے اشعار کی مد نہیں رہی۔ اور آورد کیلئے میری طبیعت نے مجھے پابند نہیں رکھا میں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ حکیمانہ اور مصلحانہ شاعری کو اپنا نقطۂ نظر قرار دوں بلکہ جیسا میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ جذبات میری شاعری کے معنوی پہلو کو اُجاگر کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں غزلیہ۔ نشاطیہ۔ حزنیہ اور المیہ جو کچھ کلام میرے قلم سے نکلا وہ سب تاثرات خارجی و داخلی کا پابند تھا۔

وقتی تاثرات نے مجھے جس قدر متاثر کیا بعض بعض اوقات بلا تکلّف وہی خیالات موزوں ہو کر زبانِ قلم سے ٹپک پڑے۔ چنانچہ میں نے اپنی والدہ صاحبہ مرحومہ کی یاد میں "ماں" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ اس کی صاف اور روشن مثال ہے۔

مجھے اس کے کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ چند قدر دانانِ ادب اگر میرے اکثر اشعار پر سر دھنتے ہیں تو بعض نقادانِ فن میرے اکثر اشعار پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن بقول شخصے ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست میں کبھی فنی نقطۂ نظر سے ایک شعر کو بھی پڑھنے کی روادار نہیں ہوں؛ اور حقیقت یہ ہے کہ میں شعر گوئی کو محض اپنی دلچسپی اور ہیجان فکری کے لئے آلۂ کار بناتی ہوں ـــــ بات یہ ہے کہ میں نہ تو خود شخصیت پرست ہوں اور نہ کسی شخصیت پسند کو اچھا سمجھتی ہوں۔ میں اس عقیدہ کی حامل ہوں کہ شاعری کی سرحد میں ہر طبقہ اور شخصیت کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ نہ یہ عورتوں کی میراث ہے نہ مردوں کی جاگیر؛ بلکہ عام انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے کہ اگر طبیعت میں موزونیت پیدا ہو جائے تو شعر مرتب کر سکتا ہے۔ میری نظمیں اکثر جذباتی رنگ کے ماتحت ہیں اور اس پر سنجیدہ اور زہدِ خشک کا دعوے کرنے والا ریاکار طبقہ اگر معترض ہو سکتا ہے تو یہ اس کی آپ تنگ نظری اور کم فہمی ہے نہ کہ شاعری کا قصور؛ مجھے کسی وقت بھی اس سے خوشی نہیں ہوئی کہ لوگ میرے اشعار کو پڑھکر دادو تحسین دیں۔ میں سمجھتی ہی نہیں بلکہ میرا عقیدہ ہے کہ شعر اگر شعر ہے تو وقت اور زمانہ خود اسے اپنی گود میں پروان چڑھائے گا ورنہ وہ زمانہ کے ساتھ بے نام و نشان فنا ہو کر رہے گا! اور بس؛

میرے اشعار خود میرے نقطۂ نظر سے دو اقسام زبان کے حامل ہو سکتے ہیں؛ اوّل تو وہ جو فارسی آمیز ترکیبوں سے کہے ہیں اور ان کو میں کوئی درجہ

نہیں دیتی ہوں، دوسرے وہ جو موسیقیت "سلاست" اور روزمرّہ کے طرزِ بیان میں ادا کر دئے گئے ہیں اور یہی وہ چند شعر ہیں جو محض تاثرات کے ترجمان ہیں ــــ میرے کلام میں بے خیالی اور ربودگی کے ساتھ جو کچھ قلم برداشتہ رطب و یابس جمع ہو گیا ہے وہ خواہ متانتِ فکری سے گر گیا ہو لیکن صحیح معنیٰ میں خلوص بیان اور صداقتِ شعری کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ رہا تاثیر کلام اس کا پیدا کرنا میرا کام نہیں۔ طبیعت کچھ آمادگی کے لئے حاضر نہیں ہوتی ہے ورنہ اپنے کلام کا جستہ جستہ اقتباس پیش کرتی ــــ بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست۔"

کنیز فاطمہ حیاؔ لکھنؤ"

ذیل میں جو محترمہ کا کلام پیش کیا گیا ہے اس میں خود محترمہ کا مرسلہ انتخاب یہ ہے، شوہر کا تحفہ'۔ ایسے میں'۔ پیغامِ عمل'۔ غزل، شرابِ ناب میں کب رنگ و بو نہیں باقی"۔ بقیہ کلام راقم الحروف کا مزید انتخاب ہے

"شوہر کا تحفہ"

غذائے حسن مرا پیکرِ جمال مرا ـــ چراغِ روح مرا مرکزِ خیال مرا

سرورِ قلب مرا کیف لازوال مرا ـــ ہر ایک حال میں تنہا شریک حال مرا

اسی کے دم سے ہے راحت دلِ حزیں کیلئے

اسی کے در کے ہیں سجدے مری جبیں کیلئے

وہ اپنی پاک محبت کا زندہ افسانہ ـــ وہ اپنی شمع حرم کا اسیر پروانہ

نشاطِ روح کا وہ حسن سحر کارانہ وہ اپنے جلوۂ پنہاں سے آپ بیگانہ
وہ گلستاں بکنار و بہار در آغوش
وہ جانِ میکدہ و لالہ زار در آغوش

وہ کہکشاں مرصّع کے تار لایا ہے متاعِ نورِ مہ زرنگار لایا ہے
وہ سلکِ گوہرِ تازہ بہار لایا ہے درِ خوشاب کا خوشرنگ ہار لایا ہے
بہشتِ حسن کی تنویر جس کا ہار ہوئی
بہارِ خلد کی تصویر جس کا ہار ہوئی

یہ ہارِ الفت باقی کی یادگار رہیں یہ ہارِ عقدِ ثریا کی سلک خوش آئیں
کسی کے رشکِ مسرت کا تحفۂ رنگیں کسی کے نقشِ محبت کا لازوال نگیں
شعاعِ مہرِ منور سے جس کا رشتہ ہے
مرے حسین مقدر سے جس کا رشتہ ہے

گلے کا ہار ہے یا شرحِ مدعا ہے یہ مرا انیسِ شبستانِ پُرضیا ہے یہ
سفینۂ دلِ مضطر کا ناخدا ہے یہ سکونِ قلب کا اک نسخۂ شفا ہے یہ
ادائے حسن پہ صد جلوۂ خجل قرباں
یہ آرزو ہے کروں اس پہ جان و دل قرباں

رفیقِ جاں ہے یہ معصوم الفتوں کیلئے حریمِ دل ہے مرا اسکی عظمتوں کیلئے
یہ نذرِ شوق ہے میری مسرتوں کیلئے یہ کارسازِ غمِ دل ہے راحتوں کیلئے
ہے جس کی دید سوادِ نظر کی اک تصویر
یہ تحفہ اس کی وفاؤں کی معنوی تفسیر

ضیائے سلک پہ صد جلوۂ تباں صدقے
مرا خیال تصدق مری زبان صدقے
حیا تمام محبت کی داستاں صدقے
یہ کائنات ہو قربان دوجہاں صدقے

رہے یہ دل کے قریں ان کا دل نشیں تحفہ
نویدِ عیشِ فراواں بنے حسیں تحفہ

"ایسے میں"

سحر کے جھٹپٹے میں جب پرندے چہچہاتے ہیں
مناظرِ صبح کے جس دم رسیلے راگ گاتے ہیں
بہاروں کے جلو میں دلربا نغمے لٹاتے ہیں
حسیں غنچے چمن میں صبحدم جب مسکراتے ہیں
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

شفق جب جھانکتی ہے دامنوں سے کوہساروں کے
فضا میں تھرتھراتے ہیں ترانے آبشاروں کے
ہوا میں تیرنے لگتے ہیں نقشے جوئباروں کے
بیاباں جب بدل لیتے ہیں چولے سبزہ زاروں کے
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

پری قوسِ قزح کی آسماں پر جب سنورتی ہے
ادائے دلبری سے رنگ کے سانچوں میں ڈھلتی ہے
صبا کے مشکبو جھونکوں سے نکہت ٹوٹ پڑتی ہے

بہار آ کر چمن کی جب گلوں سے مانگ بھرتی ہو
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

کنارِ آب کا نظارہ جب مدہوش ہوتا ہے
درخشاں ریت کا میدان جب زرپوش ہوتا ہے
کنول آبِ رواں کی زینتِ آغوش ہوتا ہے
حسیں لہروں کے دل میں جذبۂ پرجوش ہوتا ہے
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

خنک راتوں کی بھینی بھینی جب مہکار ہوتی ہے
ستاروں کی نظر جب واقفِ اسرار ہوتی ہے
کسی شاعر کی چشمِ روح جب بیدار ہوتی ہے
مرے پندار کے تاروں میں جب جھنکار ہوتی ہے
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

پیغامِ عمل[1]

اُٹھیں پھر فصلِ گل میں آرزوؤں کو جواں کر دیں
چلیں پھر بلبلوں کو آشنائے گلستاں کر دیں

---

[1] اس کے ساتھ علامہ اقبال کی نظم "سر عبد القادر کے نام" (بانگِ درا) پڑھیے جس کا پہلا شعر یہ ہے

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر ۔۔۔ بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

حوادث کے خس و خاشاک ہیں پیدا دھواں کر دیں
زمانے بھر پہ اپنی شعلہ سامانی عیاں کر دیں
چمن زادانِ خوش آواز کب تک چپ رہیں آخر
تقاضہ ہے یہ فطرت کا انھیں پھر نغمہ خواں کر دیں
بہت خوابِ گراں میں سو چکے اب وقت آیا ہے
کہ اپنی عقل و دانش کو ہم اپنا پاسباں کر دیں
ثبوتِ زندگی دینا ہے پھر تہذیب حاضر کو
ہماری کوششیں پھر اس زمیں کو آسماں کر دیں
اگر دنیا میں رہنا ہے تو یوں دنیا پہ چھا جائیں
کہ اپنے ہر عمل کو زندگی کا ترجماں کر دیں
ضرورت ہے کہ ہم بیدار ہو کر دردِ قومی سے
بدل دیں فطرتِ غم ختم یہ آہ و فغاں کر دیں
سرشکِ بے بسی ٹپکے ہیں جن بے لوث آنکھوں سے
ستاروں کی طرح ان موتیوں کو ضوفشاں کر دیں
سناویں غنچہ و گل کو حکایت پائمالی کی
نگاہِ نغمۂ فطرت کو اپنا رازداں کر دیں
ترقی کے منازل چومتے ہیں پائے ہمت کو
اُٹھائیں یوں قدم اک موج بیداری رواں کر دیں
وہ پابندی جو سکھلادے ہمیں بے لوث قربانی

نثار اس قید پہ ہم سیکڑوں آزادیاں کر دیں
شگوفے اب تو علمِ باعمل کے کھلنے والے ہیں
ہوائے ذوق سے بیدار روح گلستاں کر دیں
نہیں ہے اس سے بہتر افتخارِ خدمتِ قومی
مٹیں تو یوں کہ مٹنے کو حیاتِ جاوداں کر دیں
حبا مرکز رہا ہے لکھنؤ علم و تمدّن کا
نہ کیوں نورِ عمل سے بھی اسے ہم ضوفشاں کر دیں

غزل

شرابِ ناب میں کب رنگ و بو نہیں باقی
وہ ربط شیشہ و جام و سبو نہیں باقی
چمن وہی ہے گھٹائیں وہی بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی
نزاعِ شیخ و برہمن ہے ہر گھڑی لیکن
حرم کی دیر کی وہ جستجو نہیں باقی
ہے کائنات کے ہر ذرّہ میں کھٹر رہا
نگاہِ فکر کو خود جستجو نہیں باقی
ہے دل کشی وہی اب بھی ہے موسموں کی بہار
نظر میں کیفیتِ رنگ و بو نہیں باقی
شبابِ دہر کی اب بھی ہے وہ فراوانی
مگر خیال میں جوشِ نمو نہیں باقی
ہے دل میں درد بھی پہلو میں دل بھی ہے لیکن
کسی کے درد پہ رونے کی خو نہیں باقی
ہیں ساتھ آج بھی کچھ شورشیں مگر دل میں
سکت نہیں ہے جسارت کی خو نہیں باقی
حرم کی شمع فروزاں ہے آج بھی لیکن
تجسّسِ نظر شعلہ جو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیا اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

اقرارِ محبت

اُن کا اصرار ہے اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

کہتے ہیں نذرِ محبت دلِ بیمار کرو
جانِ محزوں کو رہینِ غم و آزار کرو

غم کا اقرار کرو عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

آپ جب غیروں میں بیٹھے ہوں تو پاس نہ آنے کو کہیں
پاس آ بیٹھیں تو کبھی ہم کو بُلانے کو کہیں

گر کبھی بات کہیں وہ بھی رُلانے کو کہیں
خود ستائیں ہمیں اوروں سے ستانے کو کہیں

پھر تقاضا ہے کہ اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

حکم یہ ہے کہ کسی غیر سے بولا نہ کریں
جس سے تکلیف انھیں پہنچے ہم ایسا نہ کریں

سب سے روپوش رہیں ان سے ہی پردہ نہ کریں
غیر کو خط نہ لکھیں غیر کا چرچا نہ کریں

ان کا اصرار ہے تم عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

جی میں حسرت ہے سنائیں انھیں افسانۂ غم
کبھی موقعہ ملے سب کچھ کہیں انکی ہی قسم

لیکن آتے نہیں سنتے نہیں رودادِ الم
کتنے مجبور ہیں بتلائیں یہ ہے کیسا ستم

اس پہ طرّہ ہے کہ اُلفت کا بھی اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رازِ الفت کا بہت دن سے چھپا رکھا تھا
درد کو اپنے کلیجے سے لگا رکھا تھا

جذبۂ عشق کو سینے میں دبا رکھا تھا
غم کا اظہار قیامت پہ اُٹھا رکھا تھا

بے حد اصرار ہے عشق کا اظہار کرو
ہم کو یوں جو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رات دن ہم کو رلاتے ہیں الٰہی توبہ — اپنی فرقت میں ستاتے ہیں الٰہی توبہ
خواب الفت کا دکھاتے ہیں الٰہی توبہ — ایسی باتیں وہ بناتے ہیں الٰہی توبہ

پھر بھی تکرار ہے الفت کا تم اقرار کرو
ہم کو یوں جو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رازِ الفت کا ہماری نہ کھلا تھا جب تک — دردِ دل کا بھی نہ اظہار ہوا تھا جب تک
ہم نے حالِ دلِ مضطر نہ کہا تھا جب تک — اس قدر سوزِ دروں بھی نہ بڑھا تھا جبتک

ان کا اصرار ہے عشق کا اظہار کرو
ہم کو یوں جو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

چین لوٹا غم و آلام سکھایا ہم کو — مضطرب دن کو کیا شب کو رلایا ہم کو
ہجر میں ایک گھڑی چین نہ آیا ہم کو — خواب میں بھی کبھی جلوہ نہ دکھایا ہم کو

پھر بھی کہتے ہیں کہ الفت کا تم اقرار کرو
ہم کو یوں جو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

ایسے بے رحم ہیں انصاف کا بھی پاس نہیں — مہر کی ذرہ برابر بھی تو بو باس نہیں
ایسی بے مہری پہ بھی دل کو مرے یاس نہیں — اب بھی آجائیں کہ جینے کی کوئی آس نہیں

اور خود آکے کہیں عشق کا اظہار کرو
ہم کو یوں جو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

سوزِ ناتمام

آہ دلِ پُر اضطراب ضبط سے کیوں نہ کام لے
بے دلی و پُردو غا ہے وہ اس کا سنبھل کے نام لے
مہر و وفا و عشق کا آہ نہ اب پیام لے
جوشِ جنوں سے باز رہ دامنِ صبر تھام لے
ختم ہے داستانِ غم رہ گیا سوزِ ناتمام
ہاں اسی سنگدل کو اب دے کوئی میرا یہ پیام

کر دیا میں نے دل سے محو سارا فسانہ عشق کا
ہائے چلا گیا بہت دور زمانہ عشق کا
اب نہیں مجھ کو یاد ہے کوئی ترانہ عشق کا
لے گیا وہ ستم طراز دل سے خزانہ عشق کا
عشق کی آہ بندگی ختم ہوئی ہے آج سے
جور و جفا کی زندگی ختم ہوئی ہے آج سے

گرمیٔ عشق اب نہیں دل کو جو میرے پھونک دے
اب مرا جذبۂ وفا غیر خوشی سے لوٹ لے
چھوڑ دیا ہے آج ساتھ میرا بنازِ ناز نے
ہو گئی ہوں میں دست کش رنج و الم سے یاس سے
ہے میری ان سے التجا مجھ سے نہ نامِ عشق لیں
آہ مزید تحفۂ رنج و الم مجھے نہ دیں

یاد میں اب کرونگی میں مفتی نہ اشک کے نثار
اب کہونگی ان سے میں آہ مرا ہے دل فگار
اب نہ لکھونگی عمر بھر ان کو میں دل کا حال زار
اب بتاؤنگی کبھی میں انھیں دل کا راز دار
اے دلِ فتنہ زا بس اب اپنا قدم سنبھل کے رکھ
محفلِ سوز و ساز سے دور بہت نکل کے رکھ

اب کرونگی ذکر میں عشق کی رسم و راہ کا
ہوگا بیاں نہ اب کبھی کوئی فسانہ چاہ کا
اب تو نہ ہوگا عمر بھر عہد کبھی نباہ کا
اب نہ سنیں گے حشر تک تذکرہ درد و آہ کا

ان کا اور ان کے پیار کا غم نہ مجھے ستائے گا
یاد جو آئے گی کبھی دل مرا بھول جائے گا
خوش ہوں کہ اب کبھی مجھے اپنا نہ وہ بنائینگے
میں انہیں بھول جاؤنگی وہ مجھے بھول جائینگے
ڈوبے ہوئے گداز میں گیت نہ اب سنائینگے
عشق کی داستانِ غم اب نہ لبوں پہ لائینگے
وہم سمجھ کے نقشِ عشق قلب سے میں مٹاؤں گی
اُن کی طرح نہ غیر سے آہ میں دل لگاؤں گی
حکمِ قضا ٹلے گا کیا جب نہ ٹلا ہے آج تک
جیسے نوشتہ بخت کا مٹ نہ سکا ہے آجتک
جا کے کماں سے آئے تیر یہ نہ ہوا ہے آجتک
اور نہ خزاں کے زور میں پھول کھلا ہے آجتک
بس مرے دل کا حال ہے بالکل اسی طرح جیا
ٹوٹ کے جیسے آئنہ پھر نہ کسی سے جڑ سکا

انتظار

دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے
پُرسشِ غم کرے تو کون آ کے نحیف و زار سے
جان بہ تنگ آ گئی اس دلِ بیقرار سے
اُٹھنے لگے ہیں شعلے پھر دیدۂ اشکبار سے
دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے
آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدّتِ انتظار سے
اب تو بہار آ گئی، اب تو خزاں بھی جا چکی
ہو گیا سالِ نو شروع تازہ بہار آ چکی
میرے نصیب کی بدی خوب مجھے ستا چکی
ہجر کا غم رُلا چکا غم کی جفا مٹا چکی
پرسشِ غم کرے تو کون آ کے نحیف و زار سے

آنکھوں میں آچلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

دہر کا ہے وہی شباب اور وہی بہار ہے
چرخ پہ گل فشاں شفق خاک پہ لالہ زار ہے
باغ کا رنگ ہے وہی گل پہ وہی نکھار ہے
مجھ میں ہوا نہ کوئی فرق دل ہو کہ جاں فگار ہے

جان بہ تنگ آگئی اس دلِ بیقرار سے
آنکھوں میں آچلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

وہ ہیں اگرچہ بے نیاز اور انھیں اس پہ ناز ہے
نقشِ قدم ہی گر ملے خم یہ سرِ نیاز ہے
بہہ گیا آنسوؤں میں دل پھر بھی نوا طراز ہے
آؤ کہ انتظار میں چشم امید باز ہے"

اُٹھنے لگے ہیں شعلے پھر دیدۂ اشکبار سے
آنکھوں میں آچلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

حسن و شباب کا طفیل دل کو ارم بناؤ پھر
صدقہ ناز و ناز کا شانِ کرم دکھاؤ پھر
کر کے نگاہِ التفات دل کی لگی مٹاؤ پھر
ہم ہوں خوشی سے ہمکنار ساتھ خوشی کو لاؤ پھر

دامنِ صبر چھٹ چلا دستِ دلِ فگار سے
آنکھوں میں آچلی ہے جاں شدتِ انتظار سے[۱]

---

۱ مینا زبیری مارہروی (علیگ)
ہر چشم بیدار روح آمد ز تشنگی انتظار امشب

بیا کہ جان نزار مینا شکست جام قرار امشب

ایک آرزو

حالِ غمِ محبت کہنے کی آرزو ہے ۔ شرحِ گدازِ الفت کہنے کی آرزو ہے
رودادِ رنج و حسرت کہنے کی آرزو ہے ۔ تفصیل شامِ غربت کہنے کی آرزو ہے
پھر داستانِ فرقت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے[1]

دل سے بُھلا کے مجھکو تم یاد کس لئے ہو؟ ۔ میرے حریمِ دل میں آباد کس لئے ہو؟
ناشاد کر کے مجھکو دل شاد کس لئے ہو؟ ۔ سچ سچ بتاؤ وقفِ بیداد کس لئے ہو
بیداد کی شکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

گر بھولنا تھا مجھ کو پھر پیار کیوں بڑھایا ۔ میرے سکونِ دل کو یوں کس لئے مٹایا
بیدرد تھے جب ایسے کیوں مجھسے دل لگایا ۔ دل سے لگا کے مجھکو پھر دل سے کیوں بُھلایا
یہ حالِ پُر شکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

گو اب تمھارے دل میں میری جگہ نہیں ہے ۔ غیروں سے تم کو الفت زیبا ذرا نہیں ہے
جو چاہتا ہو اس سے نفرت روا نہیں ہے ۔ کیونکر کہوں کہ مجھکو تم سے گلہ نہیں ہے
یہ دُکھ بھری حکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

---

[1] محترمہ صابرہ سلطان حزیںؔ

پھر آرزو یہ ہے کوئی پوچھے حدیثِ غم ۔ آنکھوں میں ہے تہیۂ طوفاں سا آجکل

اب کیا ہوئے وہ دن جب مجھ پر عنایتیں تھیں　　آنکھوں میں پیار تھا جب دل میں محبتیں تھیں
جب میری زندگی میں رقصاں حلاوتیں تھیں　　شاداب اور شگفتہ دل میں مسرتیں تھیں

یہ داستانِ حسرت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

اللہ کیا ہوا اب وہ چاہ کا زمانہ ؟　　وہ چاہ تھی کہ ان کا مقصد تھا آزمانا!
مقصود تھا ستانا مطلوب تھا رُلانا!　　مجھکو نہ تھی خبر یہ آفت ہے دل لگانا

حالِ مآلِ اُلفت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

اے کاش وہ ہی رہتے ایام زندگی کے　　افسانے بھول جاتے ناکام زندگی کے
مٹ جاتے خواب ہو کر آلام زندگی کے　　کیسے گزاروں یہ دن بدنام زندگی کے

اب تو سلامِ رخصت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

کس سے کہوں الٰہی یہ دکھ بھرا افسانہ[۱]　　روٹھے وہ کیا کہ گویا روٹھا سبھی زمانہ
الفت کی ہوں بھکارن قدموں میں ہے ٹھکانا　　میری جبیں ہو اے کاش اور اُن کا آستانہ

پھر ماجرائے حسرت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

آجاؤ غم غلط ہو، دنیا کو بھول جاؤں　　افسانہ ہائے فرقت رو رو کے پھر سناؤں
بھولے ہوئے دنوں کی پھر یاد میں دلاؤں　　حسرت ہے خود بھی روؤں اور تم کو بھی رلاؤں

[۱] بسمل ہے بسمل کوئی بھی پوچھنے والا نہیں رہا ؛ وہ کیا بگڑ گئے مری دنیا بگڑ گئی

گذری ہوئی حقیقت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

التجا

آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں
دل کے ویرانے کو معمور مسرت کر لیں
گردشِ چرخ کو پھر خوگر بہجت کر لیں
عمر ناشاد کو سرمایہ عشرت کر لیں
وقت باقی ہے ابھی آؤ کہ الفت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

میں پریشاں ہوں اور آئے نہ تمہیں رحم ذرا
اُف یہ انصاف کا خون آہ یہ الفت کا صلا
کہ ذرا سی بھی جو ہو بات تو ہو بیٹھو خفا
خیر روٹھے کو منانے میں بھی آئیگا مزا
آؤ پھر جمع ہوں اور دور کدورت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

آؤ دیکھو کہ سراپا غم پنہاں ہوں میں
شمع کی طرح سے اک شعلہ سوزاں ہوں میں
دل شکستہ ہوں ستم کش ہوں پریشاں ہوں میں
درد شاہد ہے کہ منت کش درماں ہوں میں
تم جو آجاؤ تو سب دور شکایت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

ایسے بیدرد کسی دکھ کا نہ احساس ہوا
بزمِ اغیار میں ہنس ہنس کے کیا کو مرا
آہ کس سے کروں محرومیٔ قسمت کا گلا
نہ سنو تم، تو سنے کون فسانہ دل کا
تازہ پھر رسم و رہِ حرف و حکایت کر لیں

آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

مجھ سے گر تم کو گلہ ہے تو سناؤ مجھ کو
گر خطا مجھ سے ہوئی ہو تو بتاؤ مجھ کو
ہو خفا مجھ سے تو پاس آ کے جتاؤ مجھکو
غمِ دوری سے مگر اب نہ رلاؤ مجھ کو

نالۂ درد کو آہنگِ مسرت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

حرفِ شکایت

یہ کیا کہ مرے عشق کا چرچا نہیں کرتے
پہلے کی طرح اب مجھے رسوا نہیں کرتے
مکتوب میں ان کے نہیں کچھ حرف و حکایت
بتہائے حسیں اب مرا شکوا نہیں کرتے
سو آرزوئیں دل میں تھیں بیتاب تمھارے
کیوں مجھ پہ فدا اب دلِ شیدا نہیں کرتے
کیوں میرے کسی درد کا درماں نہیں ممکن
کیوں آہ مرے غم کا مداوا نہیں کرتے
اللہ ری بے مہری و بیگانگیٔ عشق
اب بھول کے اظہارِ تمنا نہیں کرتے
یہ کیا ہوا اک دم سے جو بدلی نگۂ مہر
کیوں اب نظرِ شوق سے دیکھا نہیں کرتے
اک شکوۂ شیریں میں گزر جاتے تھے پہروں
اب کیا ہے جو اُلفت کا تقاضا نہیں کرتے
اے وائے دریغ آہ یہ محرومیٔ قسمت
روٹھوں جو میں اب مجھکو منایا نہیں کرتے
دے دے کے قسم اب نہیں لیتے کوئی وعدہ
خود وعدۂ فردا کو بھی ایفا نہیں کرتے
آنے کی خوشی اور نہ جانے کا کوئی غم
اب رسمِ محبت کا اعادہ نہیں کرتے
افسانۂ غم اپنا سناتے تھے شب و روز
اب قصۂ جاں کاہ سنایا نہیں کرتے
ہو جاؤں خفا گر تو مناتے تھے وہ پہروں
اب بہرِ تسلی کبھی شکوہ نہیں کرتے

یہ کیا مئے الفت میں نہیں جوش ذرا بھی
کیوں میری طرف چشمِ تماشا نہیں کرتے

اُف قصۂ الفت کو بس اک وہم سمجھکر
ٹھکرا دیا انسان تو ایسا نہیں کرتے

افسانۂ زرّین کو پامال بنایا
دل والے ان افسانوں کو بھولا نہیں کرتے

"یہ قصۂ پارینہ ہے اک خواب پریشاں"
یہ کہہ کے محبت کو مٹایا نہیں کرتے

یہ کیا کہ بھلانے پہ بھی تم دل میں سمائے
اس طرح جلے دل کو ستایا نہیں کرتے

کہتے ہیں تصوّر میں وہ ماضی کی کہانی
کس روز حیاؔ مجھکو رلایا نہیں کرتے

غزل

نگاہِ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرّہ ذرّہ محبت کا رازداں ہو جائے

زباں سے کیجئے رسوائے نالہ کیوں اسکو
وہ راز آنکھوں ہی آنکھوں میں جو بیاں ہو جائے

پھر اس کے رنج و غمِ دائمی کی حد ہے کوئی
جو اس جہاں میں گھڑی بھر کو شادماں ہو جائے

کسی سے کیا گلۂ جورِ آسماں کیجے
کہ جس زمیں پہ رہیں ہم وہ آسماں ہو جائے

بجا ہے محفلِ ہستی میں یاس سوائی
گداز شمع مرے دل کی داستاں ہو جائے

ادھر بھی اک نظر اے ابرِ نوبہارِ کرم
ہماری حسرتِ دیرینہ بھی جواں ہو جائے

حیاؔ ٹھکانا بھی کچھ ایسی دردمندی کا
کہ لب تک آ کے نہ اک حرفِ اُف فغاں ہو جائے

غزل

بڑھ گئی ہے کچھ زیادہ بیقراری ان دنوں
کر رہا ہے دل بہت فریاد و زاری ان دنوں

یاد پھر بیچین رکھتی ہے تمھاری ان دنوں
بڑھ گئی ہے وحشتِ دل پھر ہماری ان دنوں

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف — چاہیئے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں
پھر بہار آئی ہی جی اُمڈا ہے یادِ دوست میں — دل کرے زاری اور آنکھیں اشکباری ان دنوں
اک نگاہِ ناز نے یہ کر دیا ہے کیا سے کیا — دل کی رگ رگ میں بسی ہی بیقراری ان دنوں
آہ یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار — ہو گیا ہے خونِ دل آنکھوں سے جاری ان دنوں
کیا تقاضہ کیجیئے ان سے نگاہِ لطف کا — بے نیازی ہی وہاں یاں سوگواری ان دنوں

چھوڑ دو اس بے وفا دنیا کو تم بھی اے حیا
کر نہیں کر سکتا ہے کوئی غمگساری ان دنوں

مجھے بھول جا

مرے لب سے آتی ہے یہ صدا — مجھے بھول جا مجھے بھول جا
مری یاد دل میں ذرا نہ لا — یہی مصلحت کا ہے اقتضا
مجھے تجھ سے کوئی نہیں گلا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

مرے دور رہنے کا غم نہ کر — مرے چھوٹنے کا الم نہ کر
مجھے نامہ خوں سے رقم نہ کر — مرے دل پہ اُف یہ ستم نہ کر
مرا تذکرہ بھی نہ لب پہ لا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

میں رہینِ منتِ یاس ہوں — ہوئیں مدتیں کہ اُداس ہوں
غمِ آرزو کے میں پاس ہوں — میں الم کی لطف شناس ہوں

تجھے کیوں ہے ملنے کا آسرا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

ترا دل ہے رنج سے کیوں لہو — نہیں اب ہے مجھ میں رنگ و بُو
تجھے کیوں ہے دید کی آرزو — ترے دل کو کیوں ہے یہ جستجو
ہے نصیب سے تجھے کیوں گلا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

تجھے چاہتا ہے دلِ حزیں — کروں لاکھ منھ سے نہیں نہیں[1]
ہوں ترے خیال سے میں قریں — میں کہیں ہوں اور مرا دل کہیں
ہے دلِ حزیں کا یہ مدّعا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

مرے لب پہ بس ترا نام ہے — تری یاد سے مجھے کام ہے
مجھے چین صبح نہ شام ہے — مرا تجھ سے اب یہ پیام ہے
مرے عشق کا یہی دے صلہ
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

وہی دل میں شاہدِ ناز ہے — وہی سوز ہے وہی ساز ہے
وہی اپنے پہلو میں راز ہے — وہی عشق فتنہ طراز ہے

---

[1] فیض احمد فیض

آہ میں! اور تری چاہ نہیں! — اس تصنّع سے تنگ گیا ہوں میں

("نقشِ فریادی صـ۴۴")

مری اب ہے تجھ سے یہ التجا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

جو نہ ختم ہو میں وہ رات ہوں — جو نہ بن سکے میں وہ بات ہوں
کوئی ذات ہوں نہ صفات ہوں — میں اسیرِ دامِ حیات ہوں
میں ہوں ایک نالۂ نارسا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

نہ وہ اب ہے لطفِ چمن حیا — نہ رہا وہ ذوقِ سخن حیا
نہ وہ خوفِ چرخِ کہن رہا — ہے سکوت میں ہمہ تن حیا
میں شکستہ ساز کی ہوں صدا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

شکایت

تمھیں نے کی تھی محبت کی ابتدا کہ نہیں — تمھیں نے درسِ غمِ دل ہمیں دیا کہ نہیں
سکونِ روح کی محفل کو کر کے خود برہم — ہمارے دل کو شناسائے غم کیا کہ نہیں
ہمارا طفلِ دل، آگاہ تھا نہ حسرت سے — لبھا لبھا کے نگاہوں سے چھل دیا کہ نہیں
یہ بے نیازیاں اب کس لئے بتاؤ تو — فسانۂ غمِ الفت مرا سنا کہ نہیں
تمام لطفِ محبت کی یادگاروں کو — بس اک ذرا سی نہیں میں مٹا دیا کہ نہیں
نگاہِ گرم نے برسا کے بجلیاں پیہم — ہرا بھرا چمنِ دل جلا دیا کہ نہیں
تمھارا وعدۂ باطل تھا اک فریبِ وفا — ہمیشہ جھوٹا ہی ہر آسرا دیا کہ نہیں

وہ دل کی نذر وہ حسرت سے پوچھنا بھی یاد
قبولِ تحفۂ ناچیز کو کیا کہ نہیں
تمھارے غم کے عوض اپنا دل دیا ہم نے
وہی یہ دل ہے جو ٹھکرا دیا گیا کہ نہیں
نگاہ ملتے ہی روحوں کا ایک ہو جانا
وہ وقت آہ تمھیں محو ہو گیا کہ نہیں
کہا تھا "عہدِ محبت کبھی نہ بھولیں گے"
مگر یہ عہدِ محبت بھلا دیا کہ نہیں؟

نہ اُن سے کوئی شکایت نہ ہے زمانے سے
حیاؔ ہمیشہ رہو دور دل لگانے سے

تصوّرات

نہ چھیڑ اے ہم نشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے
تصوّر سے کسی کے مجھ کو ہم آغوش رہنے دے
میں سرشارِ محبت ہوں مجھے مدہوش رہنے دے
ازل سے خوگرِ غم ہوں، مجھے غم کوش رہنے دے
نہ چھیڑ اے ہم نشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

نہ چھیڑ افسانۂ غم، تو مجھے خاموش رہنے دے
دلِ محزوں میں پنہاں آفتِ پُر جوش رہنے دے
مسرّت ہے یہی میری مجھے غم کوش رہنے دے
تو مجھ محرومِ عشرت کو ستم بر دوش رہنے دے
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

مجھے کیا واسطہ دنیا جو سرتاپا مسرّت ہے

غرض کیا مجھ کو گر دنیا صدائے سازِ عشرت ہے
میں اس کی یاد میں بس محو ہو جاؤں یہ حسرت ہے
اسی میں آہ پنہاں میری راحت اور مسرت ہے
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

مری آہ و فغاں رہتی ہے تا کے بے اثر کب تک
مرے نالوں میں رہتا یہ دھواں کب تک شرر کب تک
کہ رہتا نخلِ امید آہ میرا بے ثمر کب تک
بھلاتا مجھ کو وہ غفلت شعار و بیخبر کب تک
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

سنا ہے دھیان ان کو بڑھ چلا ہے ان دنوں میرا
میں غرقِ بحرِ حیرت ہوں کہ آخر کیوں ہوا ایسا
بھلا کر مجھ کو دل سے کیوں انھیں میرا خیال آیا
کہوں میں کچھ تو پھر ہوگا مرا اغیار میں چرچا
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

لگاوٹ کی ہیں باتیں پھر بڑھے گا حوصلہ دل کا
کہ پھر وابستہ ہو جائیگا اُن سے آسرا دل کا
یہ سوچا ہے کہ ہم اب سے نہ مانیں گے کہا دل کا
شکایت ہو گلہ ہو کچھ نہ سننا تم حیا دل کا
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

نہ ہوتی حالِ دل کہنے کی گر ہمت تو اچھا تھا
نہ سُننے کاش وہ شرحِ غمِ اُلفت تو اچھا تھا

یہ پامالِ الم مصروفِ غم میرا دلِ محزوں
نہ ہوتا آشنائے شادی و بہجت تو اچھا تھا

مری بیتابئ دل بڑھ گئی ہے الاماں کتنی
نکلتی گر نہ شوقِ دید کی حسرت تو اچھا تھا

وہ راحت بیزباں ثابت ہوئیں کتنی حبابِ آسا
کبھی ہوتا نہ اتمامِ شبِ فرقت تو اچھا تھا

بڑھی پھر آرزوئے دل ہوا کیوں سامنا اُن کا
مرے دل ہی میں رہ جاتی جو یہ حسرت تو اچھا تھا

ہوا کیوں التفات اُن کا بڑھا کیوں حوصلہ میرا
نہاں پھولوں میں رہتی آہ گر نکہت تو اچھا تھا

سکوں سے ہے مجھے نفرت میں مایوس تمنا ہوں
مرے دل کو نہ ملتی گر کبھی راحت تو اچھا تھا

تمنا ہے فزوں تر ہو شورشیں جذبِ محبت کی
دلِ مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا

رہیں غم کی شرر انگیزیاں یارب قیامت تک
حیا غم سے نہ ملتی گر کبھی فرصت تو اچھا تھا

خ

خالدہ - محترمہ خالدہ بیگم جبلپور

محترمہ نے اپنے خود نوشتہ حالات جو ارسال کئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

"نام خالدہ بیگم، تخلص خالدہ، مقیم جبلپور۔ میرے والد محمود حسن صاحب بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار گن کیریج فیکٹری جبلپور میں سپروائزر ہیں میرے دادا خان بہادر لطیف حسن صاحب مرحوم عرصہ تک ضلع بریلی میں تحصیلدار رہے۔ تحصیل نواب گنج بریلی سے ۱۹۱۸ء میں پنشن

لیکر آنریری مجسٹریٹ اور منیجر کورٹ آف وارڈ کا کام کرتے رہے ۱۹۴۱ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔

"میری ابتدائی تعلیم مڈل کلاس تک اسکول میں ہوئی۔ فارسی کی تکمیل مکان پر ہوئی۔ دورانِ تعلیم میں شاعری کا شوق شروع ہوا عروض کی کتابیں مطالعہ سے گزریں۔ مگر یہ مقام (جبلپور) اُردو کے واسطے قطعی غیر موزوں ہے، جہاں پر نہ کسی سے مشورہ سخن کیا جا سکتا ہے اور نہ یو۔پی کا سا ماحول ہی ہے۔ یہاں کی دفتری زبان تک ہندی ہے اور ہر شخص ہندی پڑھنے پر مجبور ہے۔ میں خاموشی سے مشق سخن کرتی رہی۔ میرا کلام اور مضامین نثر اکثر رسالہ خاتونِ مشرق میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے زائد ایک ایسی لڑکی کے اور کیا حالات ہو سکتے ہیں جو ابھی تک انفرادیت کے دوَر سے گزر رہی ہو۔"

محترمہ کے کلام کا انتخاب جو موصوفہ نے اس کتاب کے لئے راقم الحروف کو ارسال فرمایا ہے، درج ذیل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محترمہ کا اندازِ بیان پختہ اور کلام سنجیدہ ہے جذبات میں متانت و وقار موجود ہے۔ زبان صاف و سادہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئی ہیں:-

مایوسِ آرزو ہے، مجبورِ التجا ہے　　دل ہے مگر وہ دل بھی اب دل نہیں رہا ہے
اللہ! تو ہی حافظ، آج اس کا سامنا ہے　　لاکھوں قیامتیں ہیں اک جانِ مبتلا ہے
دل نذر کر دیا تھا، اب جان بھی فدا ہو　　نہ حسن ابتدا تھی یہ حسنِ انتہا ہے

خالدہ بیگم "خالدہ"

یہ بیخودی کا عالم، دیوانگی کا نقشہ　　میں دل کو ڈھونڈتا ہوں دل مجھکو ڈھونڈتا ہے
تجھ کو مری محبّت کا واسطہ بتا دے　　آخر مجھے مٹا کر کیا بات چاہتا ہے
یہ غمِ محبّت، یہ ہجرِ جاناں
کیا خالدہ بتاؤں آفت کا سامنا ہے

پابندِ اختیار، اثرِ اُف زباں نہیں　　وہ سن کے کہہ رہے ہیں تری داستاں نہیں
یہ منظرِ حیات ذرا تو بھی دیکھ لے　　وہ بے نشانِ عشق ہو جس کا نشاں نہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد غلط غلط　　کیا بات کہہ رہا ہے کہ جس کا گماں نہیں[1]
بیٹھا ہوں کچھ سمجھ کے اٹھونگا نہ حشر تک　　تو ہی بتا دے کیا یہ ترا آستاں نہیں
خوش ہوں میں خالدہ مرا انجام ہو بخیر
عمرِ رواں سے آگے کوئی کارواں نہیں

قربانِ محبّت ہوں　　تصویرِ مسرت ہوں
پھولوں کی میں نکہت ہوں　　دنیا کی میں جنت ہوں
مشرق کی میں عورت ہوں
دریائے لطافت ہوں　　اک گوہرِ عصمت ہوں
اک رازِ حقیقت ہوں　　پروانے کی فطرت ہوں

---

[1] امیر مینائی ؎ وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

مشرق کی میں عورت ہوں

میں پیکرِ فطرت ہوں مانوسِ محبّت ہوں
سرمایۂ راحت ہوں میں حسنِ قیامت ہوں

مشرق کی میں عورت ہوں

شیریں کی صباحت ہوں لیلیٰ کی ملاحت ہوں
فرہاد کی غیرت ہوں مجنوں کی میں حسرت ہوں

مشرق کی میں عورت ہوں

شمشیرِ ہلاکت ہوں تفسیرِ قیامت ہوں
چنگیز کی خصلت ہوں محمود کی عادت ہوں

مشرق کی میں عورت ہوں

حضرتِ جگر کے ایک شعر کی تضمین

منھ میں زباں جو دی تھی تو دل کیوں دیا مجھے فطرت سے اپنی کس نے کیا آشنا مجھے
انجی نگاہِ ناز سے کہنا پڑا مجھے مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے

اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

ایضاً

نگاہوں سے اپنی وہ تڑپا رہا ہے تبسّم کے ساغر وہ چھلکا رہا ہے
یہ دل جوشِ طوفاں سے گھبرا رہا ہے وہ حرفِ غلط ہے مٹا جا رہا ہے

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

ہر اک رنگ سے آزمایا گیا ہوں — چڑھا کر نظر سے گرایا گیا ہوں
بھری بزم سے میں اُٹھایا گیا ہوں[1] — کہاں پھر کہاں سے میں لایا گیا ہوں

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

تڑپ خالدہ دل میں ہوتی ہی اکثر — مصیبت میں ہر آنکھ روتی ہے اکثر
سنو دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اکثر — یہ شمع ہے وہ جل کے بجھتی ہے اکثر

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

شوخیاں بن کے جو چھا جائے نظر پر ساقی — ہے کوئی موج بھی ایسی ترے پیمانوں کی
زندگی میری کہیں حرفِ مکرر تو نہیں — برق کیوں ڈھونڈھتی پھرتی ہی نشیمن میرا[2]
نمودِ حسن سے اظہارِ آرزو کیا ہے — سمجھ رہا ہوں یہ اندازِ گفتگو کیا ہے[3]
دیوانگی میں تو میری نیت بھی دیکھ لے — کس درجہ احترام ہے عہدِ شباب کا

---

[1] شاد عظیم آبادی
لحد میں کیوں نہ جاؤں منھ چھپائے — بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں
[2] غالب سے :- یا رب زمانہ مجھکو مٹاتا ہی کس لئے :: لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
[3] غالب سے :- تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے۔

خورشید　امراوتی (برار)

اس شاعرۂ نادرہ کا نام خورشید آرا بیگم اور تخلص خورشید ہے نہایت عالم و فاضل خاتون ہیں۔ فارسی کی منتہی ہیں۔ آپ کا وطن امراوتی (برار) ہے، بہت عرصہ پہلے آپ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کر چکی تھیں۔ اور ویمن کالج ناگپور میں پرشین پروفیسری کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

آپ کی طبیعت کا رجحان بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف تھا اور اب آپ ملک کی ایک مسلم الثبوت و قادر الکلام شاعرہ ہیں۔ آپ کا شمار گنتی کی ان چند خواتین میں ہے جن کی شاعرانہ قابلیت ہندوستانی خواتین کے لئے باعثِ فخر کہی جا سکتی ہے۔ ان کی بلند پایہ اور مؤثر نظمیں بڑی قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کے کلام و زبان میں فارسی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ آپ کے خیالات، نہایت بلیغ، سنجیدہ اور پُر وقار ہوتے ہیں، طرز ادا نہایت پختہ اور استادانہ ہے۔ کلام میں فلسفہ کا بھی امتزاج ہے اور ضرورتِ زمانہ کا بھی لحاظ۔ آپ نے نہایت کامیاب منظر کشی بھی کی ہے۔ جذبات نگاری پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

محترمہ خورشید آرا بیگم خورشید فارسی کی بھی ایک بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ مولانا رازق الخیری ایڈیٹر رسالہ عصمت آپ کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"...... بالعموم وہ فارسی میں لکھتی ہیں، انھوں نے تقریباً پانچ چھ ہزار اشعار اب تک فارسی میں کہے ہوں گے۔ پُر شکوہ الفاظ

ہیں مناظرِ قدرت کی مصوری، جذبات کی ترجمانی، درد و اثر، سوز و گداز، ان کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔ عورتوں کے حقوق اور فرائض پر ان کی بیداری اور ترقی کے سلسلہ میں خورشید آرا بیگم صاحبہ کی نظمیں سب سے زیادہ شائع ہوئی ہیں۔"

زندگی

زندگی جبروتِ فطرت کا پریشاں خواب ہے
زندگی مجبوریٔ انساں کی دردآگیں کراہ

زندگی ناکامیوں کی قسمتِ سیماب ہے
زندگی افسردہ ارمانوں کی غم پرور نگاہ

زندگی مایوسیوں کا روح فرسا اضطراب
زندگی پامالیوں کی آہ وحشت آفریں

زندگی ہے کاہشوں کا کشمکش زا انقلاب
زندگی ہے نقطۂ پرکارِ افکارِ حزیں

زندگی تسکینِ برہم کی دعائے ناقبول
زندگی ناکامِ بہجت کا قیامِ مستقل

زندگی اک سعیٔ نامشکورِ جذباتِ ملول
زندگی تقدیر واثروں کی امید مضمحل

زندگی قدرت کا انساں سے زبردست انتقام
زندگی جنگِ عناصر کا مصائب زا سماں

زندگی ہے شورشوں کی داستانِ ناتمام
زندگی پاداشِ جرم آدم جنت مکاں

وہ گراں بارِ امانت ہے حیاتِ آدمی
محترز جس سے ہوئے تھے کوہ و افلاک و زمیں

مل گئی نادان و ظالم کو سزائے الٰہی[1]
ہو گیا خورشید وہ رنج و مصائب کا امیں[2]

---

[1] آیۂ پاک کے الفاظ "ظلوماً جہولا" کا لفظی ترجمہ ہے

[2] محترمہ کی یہ نظم دیکھنے سے پہلے راقم السطور نے بھی اس جذبہ کو اس طرح ادا کیا تھا

زندگی ایک خوابِ وحشت ہے زندگی اک سرابِ الفت ہے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صرفِ فغاں ہوگئیں آج نوا ریزیاں
آنسوؤں میں کھو گئیں آہ کی بیتابیاں

جانتا ہوں میں آرزو کا مآل — آرزو پھر بھی دل کی عادت ہے
دل کی رگ رگ سے خوں ٹپکتا ہے — زندگی صد ہزار کلفت ہے
زندگی نالہ ہائے بے تاثیر — زندگی گریہ ہائے حسرت ہے
زندگی داستانِ رنج والم — زندگی قہر ہے، مصیبت ہے
زندگی بیکسی و محرومی — زندگی سوز و دردِ فرقت ہے
زندگی نامرادیٔ پیہم — زندگی کرب ہے اذیت ہے
ہر تمنا کا خون ہوتا ہے — کیا یہی زندگی کی غایت ہے؟

کس کو جرأت کہ لب ہلائے جمیلؔ
زندگی شاہکارِ فطرت ہے

اسی مضمون کو ردیف و قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ اس زمین میں ایک اور جگہ بھی ادا کیا تھا۔ اس وقت صرف ایک شعر یاد ہے ؎

زندگی، زندگی نہیں یارب! — زندگی، زندگی کا ماتم ہے

میرے یہ اشعار ایک اضطراری لمحہ کی وقتی تخلیق ہیں جو میرے نظریۂ حیات کی طرف ہدایت نہیں کرتے۔ یوں نہ صرف یہ کہ میں اس نظریہ کا قائل نہیں بلکہ اس کو انسانی زیست کے مفاد اور حیات کی تکمیل مقاصد کے لئے ضرر رساں اور غلط سمجھتا ہوں، حیات، بے پناہ امکانات کی جولانگاہ ہے اس کی تخدید انفعال دراصل ہماری کم کوشی و بے بصری کا نتیجہ ہے۔ "ج"

نقشِ سکون ہو گئیں درد کی گہرائیاں
یاس سے خوں ہو گئیں ضبط کی ناکامیاں
آج سویدائے دل بن گیا داغِ الم
ہر نفس گرم ہے دودِ چراغِ الم
دودِ چراغِ الم وجہ شراغِ الم

عورت

(۱)
ازل میں سلسلہ تخلیق کا سرعت سے جاری تھا
اور تکمیل مذاقِ زیست میں مصروف تھی فطرت
کمالِ آفرینش بیقرارِ کامگاری تھا
عطا کی جارہی تھی زندگی کو مضطرب قسمت

(۲)
مگر ناواقفِ رمزِ گداز و سوز تھا نغمہ
صباحت سے سحر اور رنگ و بو سے گل تہی داماں
خمار و کیف سے ناآشنا تھی فطرتِ صہبا
بہارِ شامِ سحر آئیں نہ تھی رنگینیاں ساماں

(۳)
جنوں سے عشق بیگانہ تھا فرقت بیقراری سے
تجلیاتِ حسنِ حشر پرور زیرِ پردہ تھیں
وفا و عزم تھے محروم ذوقِ استواری سے
ادا و عشوہ محوِ خواب، امیدیں فسردہ تھیں

(۴)

نہ تھی معصومیت آئینہ دارِ عفت و عصمت
نہ تھی دوشیزگی ملبوسِ تقدیس و حیا پرور
نہ مقرونِ لطافت تھا خیالِ راحت و عشرت
نہ جذباتِ شباب و شاعری وجدانیت پرور

(۵)

نہ دارائے اثر آہ و دعائے صبح گاہی تھی
نہ حسیاتِ انسانی امینِ رنگِ خودداری
نہ نورِ زندگی مرہونِ حسنِ بیگناہی تھی
تھا فقدانِ رفاقت، سر بہ زانو شوقِ غمخواری

(۶)

کیا محسوس فطرت نے جمودِ ذوقِ اشیار کو
ہوئی مجبورِ بیداری، جذباتِ فسردہ پر
شبابِ حسن و رعنائی وفا و عزم و تقویٰ کو
کیا یک جا تبسم کی لطافت باریاں لے کر

(۷)

کیا عفت کو شامل اور بنایا اک حسیں پیکر
جو یکسر شعر و نغمہ تھا سراپا سوزشِ الفت
مجسم جذبۂ خودداری و شرم و وفا پرور
پھر اس کا نام اسے خورشید فطرت نے رکھا عورت"[1]

---

[1] محترمہ کی اس نظم کو علامہ اقبالؒ کی اس نظم کے ساتھ پڑھئے۔

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے ستارے آسماں کے بیخبر تھے لذتِ رم سے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

ہے موسم برشگال عریاں، فلک ہے ملبوس، ابر دربر
فتادگی سے نسیم عنبر چکاں ہے مستِ خرام یکسر

[پچھلے صفحہ سے]

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینہ کی تمنا چشمِ خاتم سے

سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھکر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخہ کو بڑھکر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیٔ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریمؑ سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکّب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

مہوّس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے

ہوئی جنبش عیاں، ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے محرم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

[بانگِ درا صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶]

صبح غنچے تبسّم آگیں، سبک رو و نرم سیرِ طائر
تجلّیِ شام حسن پیرا، ہے آہ وقتِ وداعِ نیّر
ہوا ہے بیدار حسنِ فطرت فضا ہے رنگینیاں بداماں
رواں دواں نغمہ ریز نہریں، ہے جامِ گل میں شرابِ احمر
شفق سے رنگیں اُفق ہوئی ہے، جہاں پہ نشہ سا چھا رہا ہے
ضیائیں ہمدوشِ تیرگی ہیں، کہیں کہیں جلوہ زا ہیں اختر
ہیں مائلِ آشیاں عنادل، ہیں اہلِ عالم سکون خواہاں
کنارِ راحت میں سوئے زحمت، لیے سکوں شورشیں ہیں مضطر
جمالیات و تجلّی آگیں، فضا ہے لیکن کنارِ چشمہ
خموش بیٹھی ہے اک دوشیزہ جمال و رنگ و شباب پیکر
ہیں ساعدِ تابناک عریاں، شگوفہائے سمن بداماں
ہے موجِ نقرہ بدوش ہر دم حسین پیروں پہ سجدہ گستر
ہیں گیسوئے عنبریں پریشاں، نگاہ یکسو لگی ہوئی ہے
ہیں بے نیازِ نظارہ آنکھیں، ہیں خشک لب زرد رو ہے پیکر
سکوت کا بُت ہے یا الٰہی شبیہِ مایوسی و الم ہے
ہوئی ہے یا محویت مجسّم، یا بیخودی کا جمیل پیکر
نگاہیں ساکن، زبان ساکت، ہے دل میں جذبات کا تلاطم
مثالِ سیماب ہر رگِ جاں، جگر میں غم کے لگے ہیں نشتر
گدازشیں آرزو کی دل سے ہیں "کرعیاں رازِ سرّ مخفی

ہاں مقتضیٔ وقت ہے فہم و دانش، نہ رکھ نہاں جذبۂ مضطر
اے غنچۂ باغِ آفرینش، زباں خموشی نواز کب تک
تری تمنا ہی رہے گی نہاں کدہ دل میں راز کب تک[1]

درخشاں

محترمہ آر۔ کے۔ درخشاں بجنور کی مشہور شاعرہ ہیں، خاتونِ مشرق میں کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کی زبان صاف و سادہ اور اندازِ بیان پُرکیف اور پُراثر ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

گدا تیرے در کا بنا چاہتی ہوں ۔۔۔ محبت میں تیری فنا چاہتی ہوں
کہے اب وہ رودادِ غم آکے مجھ سے ۔۔۔ تصور میں لیکن سُنا چاہتی ہوں
ہوا کس طرح قلبِ تاریک روشن ۔۔۔ عیاں رازِ پنہاں کیا چاہتی ہوں
کہا آکے گلشن میں بلبل نے ہنس کر ۔۔۔ میں پھولوں سے دامن بھرا چاہتی ہوں
ہوئی محفلِ شوق تاریک میری ۔۔۔ تجھے دل میں جلوہ نما چاہتی ہوں
کہانی میرے غم کی بکھری ہوئی ہے ۔۔۔ غمِ عہد یکجا کیا چاہتی ہوں
نہ دیکھے تصور میں بھی کوئی مجھ کو ۔۔۔ لطافت میں ایسی چھپا چاہتی ہوں
گناہوں کا نظروں پہ اتنا اثر ہے ۔۔۔ میں بحرِ خجل میں بہا چاہتی ہوں

درخشاں مرے شعر ہیں دل کے ٹکڑے
میں کاوش کا اپنی صِلا چاہتی ہوں

---

[1] ساغر نظامی۔ ہاں تو لبِ خاموش کو نطق کی دے اجازتیں
ناز سے یوں ہو نغمہ گر گونج اٹھے فضائے ساز

دل آرا

دل آرا بانو نام اور دل آرا تخلص ہے۔ زبان سہل اور صاف لکھتی ہیں۔ محاورات بھی نہایت خوش سلیقگی سے استعمال کرتی ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

یاد ہیں وہ دن کہ جب آپس میں اک سنجوگ تھا
کوئی صدمہ تھا نہ غم تھا اور نہ کوئی روگ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھی گلزارِ اُردو پہ بہار
اور چلا کرتی تھی اترا کر نسیم مشکبار

یاد ہیں وہ دن کہ اُردو کی ترقی کیلئے
لکھنؤ اور شاہجہاں آباد دونوں ایک تھے

تھی انھیں دونوں کے دم سے جلوۂ اُردو کی بہار
اور انھیں دونوں سے تھا جادوئے اُردو کا نکھار

ان کے ہاتھوں ہی بنی سنوری تھی اُردو کی دلہن
انکی کوشش سے ہی تھی آباد اس کی انجمن

لکھنؤ دلّی سے ہی اُردو کی آرائش ہوئی
متحد کوشش سے ہی اُردو کی افزائش ہوئی

ایک دو دن سے نہیں صدیوں سے تھا یہ میل جول
پر خدا جانے کہ بولے کس نے تھے بڑھ بڑھ کے بول

جن سے چرخِ فتنہ پرور کو بہانہ مل گیا
تیرِ فرقت کیلئے عمدہ نشانہ بن گیا

ہو گئی دونوں میں رنجش پڑ گئی دونوں میں پھوٹ
چرخ نے دستِ خزاں سے کہہ دیا گلشن کو لوٹ

جاگ اُٹھے فتنے کرم پرور فرشتے سو گئے
لکھنؤ دلّی کے دل جو ایک تھے دو ہو گئے

لیلیٰ اُردو تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
ہاں تری رنگیں شعاعیں نذرِ زنداں ہو گئیں

دل فسردہ ہو گیا چہرہ فسردہ ہو گیا
ہائے وہ اک رشکِ جنت پھول مردہ ہو گیا

ہائے وہ صدیوں کا دلّی لکھنؤ میں اتحاد
ہائے وہ مدّت کا کیف رنگ بو میں اتحاد

کیا خبر تھی حادثوں کے ہاتھ سے لٹ جائیگا
ساتھ جو مدت سے تھا وہ یک بیک چھٹ جائیگا

لکھنؤ کو گھر سمجھکر شاعرانِ دہلوی
جاکے رہتے اور بستے تھے بصد جوشِ دلی

متحد آپس میں تھے اک نیک مقصد کیلئے
ہو نہ سکتے تھے جدا وہ ایک مقصد کیلئے

ہائے یہ کس کی فسوں سازی کا جادو چل گیا
کیا فلک تیری نگاہِ بد کا جادو چل گیا

ہے زباں بھی ایک رنگِ شاعری بھی ایک ہے
غور سے دیکھو تو طرزِ زندگی بھی ایک ہے

پھر بھی دونوں کے دلوں میں ہے جدائی ہائے ہائے
گلشنِ اردو پہ کیسی آفت آئی ہائے ہائے

کاش اب پھر درمیاں سے رنگِ باطل دور ہو
کاش پھر دونوں دلوں سے حدِّ فاصل دور ہو

کاش صنفِ نازنیں کا دل ذرا جرأت کرے
مرد جس کو کر نہ سکتے ہوں اُسے عورت کرے

حق تعالیٰ سے دلِ آرا کی ہے روز و شب دعا
دونوں مرکز ایک کر دے دونوں بچھڑوں کو ملا

پھر دلوں سے ابتدا رنگِ کدورت دور کر
اب جو ناخوش ہیں انھیں پھر شاد کر مسرور کر

رازؔ

امت الشکور نام اور رازؔ تخلص ہے۔ آپ کی صرف ایک طرحی غزل دستیاب ہوئی ہے جو آپ نے لکھنؤ کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ یہ مشاعرہ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۰ء کو محترمہ کنیز فاطمہ حیا کے مکان پر بیگم حبیب اللہ صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ آپ موجودہ دور کی ایک اچھی شاعرہ ہیں، زبان و بیان میں سلاست، صفائی اور شائستگی موجود ہے۔

سفینہ لا پتہ ہے ناخدا کیا
مرے اشکوں کا طوفاں ہے بپا کیا

بہار آتے ہی کھل جاتے ہیں غنچے
بدل جاتی ہے گلشن کی فضا کیا

وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے
کسی سے ہم کریں جا کر گلا کیا

نظر آتی ہے صورت رہزنوں کی
بنائیں ہم کسی کو رہنما کیا

چلے آتے ہیں میکش میکدے میں
فلک پر جھوم کر آئی گھٹا کیا

اجل کا رات دن رہتا ہے کھٹکا نکالے دل کا کوئی حوصلا کیا
نہ لی کروٹ بشر نے رازؔ مرکر گئی ہے کان میں کہہ کر قضا کیا

رازؔ

محترمہ سیدہ جمیل رازؔ مظفر نگر کی شاعرہ ہیں۔ آپ کا کلام اکثر خاتونِ مشرق میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے دل میں اسلامی و قومی درد ہے۔ آپ اقبال کی شاعری سے متاثر ہوئی ہیں۔ اگر آپ برابر لکھتی رہیں اور کلام و زبان میں تھوڑی اور پختگی پیدا ہو گئی تو آپ اُردو کی ایک بلند پایہ شاعرہ ہونگی۔

خدا سے التجا

اے خدا اُمتِ عاصی پہ کرم کر اپنا تیرے بندے ہیں گنہ گار رحم کر اپنا
قومِ مسلم تری گمراہ ہوئی جاتی ہے ناؤ اسلام کی بد راہ ہوئی جاتی ہے
آہ مسلم کی وہ پہلی سی طبیعت نہ رہی اب تری اور ترے محبوب کی الفت نہ رہی
حالتِ امتِ عاصی میں بتاؤں کیونکر داستاں درد بھری آہ سناؤں کیونکر
شاہ اسلام کے ارشاد کو ہم بھول گئے انتہا ہے کہ تری یاد کو ہم بھول گئے
ہم تو وہ تھے کہ دو عالم کو ہلا دیتے تھے نام پر تیرے رگِ جاں کو کٹا دیتے تھے[1]
نازِ اسلام کو تھا ان ہی مسلمانوں پر سر بسجدہ ہوئے تھے ان ہی ایمانوں پر[2]

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے ؛ زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے (شکوہ)

[2] علامہ اقبالؒ کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھواللہ احد کہتے تھے (شکوہ)

ان کا بھولا ہوا افسانہ سنا دے ان کو مئے توحید کا پھر جام پلا دے ان کو
آہ مقصود کی پھر شمع دکھا دے ان کو کون تھے سیّد کونین بتا دے اُن کو
خوابِ غفلت میں ہیں مدہوش جگا دے ان کو
نالۂ دردِ دلِ راز سنا دے ان کو

رفعت

سکندر جہاں نام اور رفعت تخلص ہے لکھنؤ مولد و مسکن ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک قابل اور تعلیمیافتہ خاتون ہیں۔ آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ لیکن جہاں اکثر دوسری خواتین انگریزی پڑھنے کے بعد مغربی تہذیب میں کھو جاتی ہیں اور اپنی تہذیب و معاشرت، اپنے تمدن و مذہب، ہر چیز سے کچھ بیگانہ اور متنفر سی نظر آتی ہیں، وہاں محترمہ سکندر جہاں رفعت بی۔ اے کرنے کے بعد بھی مشرقی تہذیب اور اسلامی تعلیمات و نظریات کی دلدادہ ہیں۔ آپ مغربیت کے اس تباہ کن طوفان سے اپنی دوسری بہنوں کو بھی بچانے کی خواہشمند ہیں اور اپنے ان اصلاحی خیالات کا اظہار اکثر اپنی شاعری کے ذریعہ فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کے ذیل کے اشعار پڑھکر حضرت اکبر الہ آبادی کی وہ رباعیات یاد آجاتی ہیں جو انھوں نے پردہ کے متعلق لکھی ہیں۔

پردہ

اے مشرقی خاتون سن پردہ ہے تیری آبرو

چھوڑا اگر تو نے اسے ——— بدنام ہو جائے گی تو
فطرت کا تو اک پھول ہے　　پردہ ہے اس گل رنگ و بو
دنیا ہی کی زینت نہیں ——— ہے دین کی بھی زیب تو
اسلام کی گر ہے طلب　　ایماں کی ہے گر جستجو
عصمت اگر مقصود ہے ——— پردے ہی میں پائیگی تو
پردہ ترقی میں تیری　　حائل نہیں اے نیک خو
ہر خدمتِ قوم و وطن ——— پردے میں کر سکتی ہے تو
اے مشرقی خاتون سُن
پردہ ہے تیری آبرو

روشن آرا

محترمہ روشن آرا دہلی کی ایک قابل اور ہونہار خاتون ہیں۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہے۔ نظمیں خوب لکھتی ہیں۔ زبان میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہے، رنگ صاف اور اسلوبِ بیان پُرکیف ہے۔

اُردو زبان

دلربائے ہند اے اُردو زباں　　نغمۂ شیریں ہوا رطب اللساں
یادگارِ سطوتِ اسلامیاں　　نورِ چشمِ مادرِ ہندوستاں
بادۂ مے خانۂ جنت نشاں　　بادۂ رنگین جانِ مے کشاں
حاصلِ ہمشیریں کلامی زباں　　مایۂ صد نازشِ اہلِ جہاں

تجھ سے ہے آباد اپنا بوستاں

تجھ میں دل آویزیٔ گلزار ہے
تجھ میں رنگ و کیفِ لالہ زار ہے
تیرا ہر گل آج عنبر بار ہے
اس لیے گلشن نرا تاتار ہے
تیرا ہر غنچہ دہانِ یار ہے
تیرا جو گل ہے گلِ بے خار ہے
تیرا دامن بحرِ گوہر بار ہے
تیرا سینہ معدنِ اسرار ہے

قبلۂ ہر شاعرِ نغمہ ہے

ہے سراپا کیف تیرا ہر سخن
باعثِ وارفتگیٔ انجمن
نازشِ نغمہ سرایانِ چمن
یعنی فخر نکتہ سنجانِ وطن
روح پرور، قاطعِ رنج و محن
شاہدِ اربابِ علم و اہلِ فن
تیرا ہر نکتہ عروسِ سیم تن
ماہ وش، حجلہ نشیں، غنچہ دہن

اور تو اس کا مناسب پیرہن!

ریحاں۔

حسن آرا نام اور ریحاں تخلص ہے۔ آپ عصمت کی شاعرہ ہیں کلام میں اسلامی رنگ نمایاں ہے۔ آپ کی زبان شائستہ اور پُر وقار ہے۔ کلام میں جوش و اثر موجود ہے۔ "نذرِ حسین علیہ السلام" کے عنوان سے آپ نے جو نظم لکھی ہے وہ خواتین کی شاعری کا ایک اچھا نمونہ کہی جا سکتی ہے یہ نظم نہایت بلند اور پُر شوکت ہے ہر شعر عقیدت و محبت سے لبریز اعلیٰ جذبات کا حامل ہے۔

نذرِ حسین علیہ السلام

تپش سوزِ محبت کی نہ دنیا سے کبھی تو نے
بجھالی آبِ تیغِ ظلم سے دل کی لگی تو نے

دلِ قاتل میں لرزہ پڑ گیا تھا جب سنائی تھی
نگاہِ واپسیں میں داستانِ آخری تو نے

سرِ لاشِ پسر تیرے تبسم ہائے پنہاں پر
زمانہ محوِ گریہ ہے ہنسی تھی وہ ہنسی تو نے

جزاک اللہ مختارِ دو عالم ہو کے بھی رن میں
دکھا دی اہلِ عالم کو بشر کی بے بسی تو نے

نہ کیوں شاہا ترا مرنا سبق آموزِ عالم ہو
فنا ہو کر سکھائی ہے جہاں کو زندگی تو نے

قیامت تک کہے گی سجدہ گاہِ کربلا مولا
سکھا دی ایک سجدہ سے جہاں کو بندگی تو نے

یقیناً غرق ہو جاتا سفینہ امتِ جد کا
مگر ہاں آبرو رکھ لی حسین ابنِ علی تو نے

یہ دنیا منحرف ہو جاتی ساری کلمہ گوئی سے
بنائے لا الٰہ از سرِ نو ڈال دی تو نے[1]

دلِ پُر درد میں اک درد پیدا ہو گیا ریحاں
عجب انداز سے یہ داستانِ غم لکھی تو نے

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح — سر داد نہ داد دست در دستِ یزید، حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسین رض

رئیسہ

رضیہ خاتون نام اور رئیسہ تخلص ہے آپ محترم رفیع حسن صاحب کی شریک حیات ہیں اور اس نسبت سے ادبی دنیا میں مسز رفیع حسن کے نام سے مشہور ہیں گولکنڈہ (دکن) کی رہنے والی ہیں۔ پرانے رنگ تغزل میں لکھتی ہیں۔ کلام میں جذبات نگاری کم اور خیال بندی زیادہ ہے۔

"کیف ترنم"

ہے تصور کار فرما عشق کی تاثیر پر — آشیاں باندھا ہے بلبل نے گل تصویر پر
گو مقید ہے قفس میں پر ہے شکوہ سے گریز — کیا گلہ صیاد کا قانع ہے خود تقدیر پر
کاکل شبگوں کا ظالم کیا ہو تیرے تذکرہ — رشک ہے دار و رسن کو زلف کی زنجیر پر
نالۂ شبگیر بلبل کا اثر غنچوں میں دیکھ — ہے وفور شوق اس کا وقف کر تاثیر پر
تھام لیتے ہیں جگر بیخود ہوئے جاتے ہیں وہ — کس غضب کا ہے اثر بیتاب ہیں تقریر پر

طبع موزوں ہے رئیسہ کچھ تری اشعار پر
وقف کر دے فکر کو اور شاد ہو تشہیر پر

زیب صاحبہ

آپ موجودہ دور کی ایک خوش گو و خوش فکر شاعرہ ہیں۔ اپنا نام اور تخلص ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ اردو غزلوں اور نظموں کے علاوہ آپ ہندی رنگ میں بھی لکھتی ہیں۔ اور خوب لکھتی ہیں۔ آپ کی اس قسم کی نظموں میں ہندی شاعری کا سا رس اور شیرینیت ہے۔ جذبات میں بڑا کیف اور لوچ ہے

طرزِ ادا نہایت سادہ اور پُر اثر ہے۔ آپ کی اس رنگ کی ایک نظم درج ذیل ہے :-

من میرا ہے پریم کی بستی
پریم کا نامن، میری ہستی
جان کے بدلے پیت ہے سستی
یہ سنسار ہے پریم کا گیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

پریت کرے اور من کو گنوائے
پیت میں جیون اپنا بتائے
من ہارے پر میت نہ جائے
من کی ہار ہے پریت کی جیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

جب آنکھوں میں میت سمائے
اور کوئی پھر نظر نہ آئے
من میں میت بسے من جائے
پریم نگر کی اُلٹی ریت

جس کے من میں بسے نہ میت

وہ کیا جانے پریت کی ریت

اُس نے پایا جس نے کھویا
پیت بِنا کوئی میت نہ ہویا
جوگی ہو، یا کوئی اتیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

زاہدہ - محترمہ ز۔خ۔ش مرحومہ (علیگڑھی)

محترمہ ز۔خ۔ش کے حالات جو انکی بھانجی محترمہ ناجیہ اکرم شیروانیہ نے اس تذکرہ کے لئے خود تحریر فرما کر ارسال کئے ہیں درج ذیل ہیں:-

"نام زاہدہ خاتون۔ نسل شیروانی پٹھان۔ اس شاعرۂ شعلہ نوا نے دسمبر ۱۸۹۴ء میں والد مرحوم آنریبل نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی خان بہادر کے۔سی۔آئی۔ای۔او۔بی۔ای۔ ایل۔ایل۔ڈی کی قدیم سکونت گاہ بھیکم پور ضلع علیگڑھ میں جنم لیا اور جدید فرودگاہ "ظفر منزل" میں پرورش پائی (جو بھیکم پور سے ۶ فرلانگ پر واقع ہے)

زاہدہ خاتون شروانیہ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ اُن کا کلام مختلف ناموں سے اکثر و بیشتر رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کرتا رہا۔ مثال کے طور پر چند نام درج ذیل ہیں:-

"سخن گو خاتون" "نادر خاتون" "ایک شریف بی بی" "ز۔خ۔ش"
وغیرہ۔ موصوفہ کو علمی دنیا زیادہ تر موخر الذکر نام سے جانتی ہے۔
ہماری شاعرہ جب تک حیات رہیں انھوں نے کبھی اپنے اصلی نام مقام اور شخصیت سے دنیا کو روشناس نہ ہونے دیا بلکہ تادم آخر گوشہ گمنامی ہی میں رہیں۔ باوجود اس کے کون ہے جو آج بھی ز۔خ۔ش کے شاہکاروں سے واقف نہیں۔
مرحومہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اپنا زانوئے ادب کسی اُستاد کے سامنے مدت العمر تہہ نہیں کیا۔ اور اپنی خداداد ذہانت کی بدولت دنیائے ادب میں استادِ سخن بنکر چمکیں چنانچہ وہ خود کہتی ہیں

بے فیض تلمذ ہوئی استادِ سخن ہیں
یہ فخر ہے اس احقر خود ساز سے مختص

مرحومہ نام و نمود کی شائق نہ تھیں چنانچہ اکثر اشخاص نے مرحومہ کے کلام کو ایک مرد کا کلام سمجھا اکبر الٰہ آبادی مرحوم کو بھی یہی شک پیدا ہوا۔ جس کو انھوں نے اپنے ایک خط کے ذریعہ ظاہر کیا۔ لیکن بعد میں محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے توسط سے یہ شک دور ہوا۔ موصوفہ نے ادبی دنیا کے اس حوصلہ شکن سلوک کو بہت محسوس کیا اور کچھ عرصہ تک اپنا کلام شائع نہ کرایا۔ لیکن قدر دانوں کے پیہم تقاضوں نے مرحومہ کو پھر اس راہ پر گامزن کر دیا۔
ز۔خ۔ش ابھی چار۔ پانچ سال ہی کی تھیں کہ مشیت ایزدی سے

شفقتِ مادری سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئیں ۔ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت
کی تمام ذمہ داری ان کے والدِ محترم کے کاندھوں پر آپڑی اور یہ انھیں
کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج زہرہ رُخ کے نام سے تمام ہندوستان
واقف ہے ۔ مرحومہ کی تعلیم قدیم مشرقی خاندانوں کی طرح گھر پر ہی ہوئی
اُن کی تربیت کے لئے ایک ایرانی معلّمہ مقرر تھیں جن کا نام خجستہ خانم
تھا اور جو ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ۔ فارسی شاعری
میں ان معلمہ صاحبہ کو پوری پوری دسترس حاصل تھی چنانچہ زہرہ رُخ
کے لئے فارسی زبان مادری زبان کے برابر حیثیت رکھتی تھی ۔ اُن کی
فارسی شاعری میں وہی یگانگت، تسلسل اور روانی پائی جاتی ہے جو
ان کی اُردو شاعری کا جزو ہے ۔

مرحومہ ایک درد مند اور حساس دل رکھتی تھیں ۔ جوان بھائی کی
موت، شفقتِ مادری سے محرومی وغیرہ یہ تو تھے خانگی سانحات
جنھوں نے مرحومہ کو حد سے زیادہ سنجیدہ اور خوگرِ غم و آلام بنا دیا
تھا ۔ اس کے علاوہ مرحومہ کے دل میں قومی، ملکی، مذہبی اور
طبقۂ نسواں کا درد بھی بدرجۂ اتم موجود تھا ۔ کیسے ممکن تھا کہ زہرہ رُخ
جیسی شاعرہ رفتارِ زمانہ کا اثر قبول نہ کرتیں ۔ چنانچہ اس بات کا
شاہد خود مرحومہ کا کلام ہے ۔

زہرہ نہایت روشن خیال، حریت پسند، سچّی مسلمان اور مشرقی
اخلاق و اطوار کا نمونہ تھیں ۔ باوجودیکہ انھوں نے اپنے عزیز دل اور

مخصوص دوستوں کے علاوہ کبھی اپنے گھر سے قدم باہر نہ نکالا لیکن اخباری مطالعہ اور کتب بینی سے وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا یورپ اور دیگر براعظموں سے بھی واقفیت حاصل کر چکی تھیں چنانچہ اُن کی نظمیں "ایلیا سے پیرس" اور "جوشِ محبت" اس بیان کی تصدیق ہیں۔

وہ سماجی بندشوں سے بھی آزاد نہ تھیں۔ انھیں صرف تحریری آزادی کسی حد تک تھی لیکن تقریری نہیں۔...... یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خاندان شروانی تعلیم نسواں کے لحاظ سے زمانہ سے بہت پیچھے تھا۔ زاہدہ خاتون مرحومہ اور ان کی ہمشیرہ نکہت شروانیہ خاندان کی پہلی خواتین تھیں جنھوں نے اتنی تعلیم حاصل کی کہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کر سکیں۔ مگر باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے خاندانی رواج کے مطابق وہ نہ کسی عام جلسہ میں شریک ہو سکیں۔ اور نہ کسی خاص علمی مباحثہ وغیرہ میں جانے کی نوبت آئی۔ اگر اس صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ ز۔خ۔ش کے کلام کا مطالعہ کریں تو یقین ہے کہ آپ کی نظر میں اُن کی اور اُن کے کلام کی وقعت دہ چند ہو جائے گی۔

مرحومہ نے اپنے والد کے مکان پر بعالمِ دوشیزگی ۲ فروری ۱۹۲۲ء کو رحلت فرمائی۔ اور ہندوستان کی اس نوعمر قومی شاعرہ کو اُن کے خاندانی قبرستان میں مدفون کیا گیا۔

راقمہ:- ناجیہ اکرم شیروانیہ"

محترمہ اسم بامسمیٰ خاتون تھیں۔ نہایت متشرع، عبادت گزار، خوش خلق، نیک سیرت، صاحب علم وفضل اور پردہ نشین تھیں۔ آپ نے عصر حاضر میں اپنی زندگی سے دنیا میں خاتونِ اسلام کا ایک صحیح نمونہ پیش کیا تھا جو ایمان کی دولت کے ساتھ ساتھ علم کی برکتوں سے بھی فیضیاب تھا۔ آپ کی اردو فارسی اور عربی کی استعداد بہت اچھی تھی؛ دینیات اور اسلامی تاریخ سے آپ کو شروع ہی سے شغف تھا۔

اس وقت تک آپ کے دو مجموعۂ کلام چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں "آئینۂ حرم" اور "فردوسِ تخیل" یہ دونوں کتابیں دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی مطبوعات ہیں۔ "آئینۂ حرم" ۳۹ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں آپ کا مشہور مسدس "آئینۂ حرم" اور چند دوسری نظمیں شامل ہیں؛ یہ کتاب ۱۹۲۱ء کی طبع شدہ ہے۔ "فردوسِ تخیل" محترمہ کی وفات کے بعد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کو محترمہ نے خود ہی مرتب کیا تھا اور خود ہی یہ نام تجویز کیا تھا۔ یہ ۳۸۲ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جو ۱۲۱ منظومات پر مشتمل ہے، اس میں آئینۂ حرم کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس کے مختلف حصوں کے عنوانات یہ ہیں۔ نذر۔ دور اوّل، دور ثانی دور ثالث۔ مجمع احباب، بزم طرب، بزم عزا۔ حسن تضمین، بکھرے ہوئے موتی (قطعات، رباعیات، مفردات)

مگر ان دونوں کتابوں میں آپ کے حالات تو کجا آپ کا پورا نام تک درج نہیں ہے۔ ان دونوں کتابوں پر آپ کا نام صرف ز۔خ۔ش لکھا ہے۔

اس کے علاوہ مرحومہ نے اپنی اخلاقی غزلیات کا ایک ردیف وار دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔

اُردو کے علاوہ آپ فارسی و عربی میں بھی شعر کہتی تھیں۔ خصوصاً فارسی کی آپ ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ آپ تخلص کبھی زاہدہ اور کبھی نزہت کرتی تھیں۔ فرماتی ہیں،

ل؎ عربی اشعار کا نمونہ

(برقتہ الحمرا سے غازی انور پاشا کی مراجعت پر)

حَمِدْنَا الْاِلٰہَ فَنَادِی الْجَلَالُ　　قَدِ احْتَاکَ مِنْ شَرِّ اَهْلِ الضَّلَالِ

تَلَلْتَ الْخَبِیْثِیْنَ یَوْمَ الْقِتَالِ　　فَاَحْسَنْتَ اَهْلًا وَّسَهْلًا تَعَالِ

کجا بودی؟ اے انور خوش خصال　　"کجا بودی؟ اے اختر نیک فال

کہ مہ رفتی و آفتاب آمدی"　　(فردوس تخیل ص ۳۷)

فارسی اشعار کا نمونہ

خواہراں! تا چند مہر خامشی بر لب نہیم　　تا کجا باز ار شکر شکر تقریر ما

ہاں بفرمائید۔ اکنوں چیست تدبیر فلاح　　عدل جو بہ یا نہ جوئید۔ فرقہ و تکبیر ما

ہمچنیں باشیم در قعر مذلت سرنگوں　　یا کنند جولاں بہ گردوں مرکب توقیر ما

تا رک آئین شرع پاک شد صنف رجال　　آنکہ ہست از حکم رب فرمانده ما میر ما

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما

چیست یاراں طریقت! بعد ازیں تدبیر ما"　　(آئینۂ حرم ص ۳۰)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پوچھتے ہیں جو مرا حال سخن کے نقّاد
صاف گو ہوں سخن آرائی سے مجھکو ہے عناد
نہ میں نزہت ہی ہوں آگاہ نہ میں زاہدہ ہوں
خود فراموش ہوں اتنا ہے فقط مجھکو یاد
فردوس تخیل ص ۳۸۲

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

کام غمخواراں برآمد، آہ پُر تاثیر ما
گشتہ گردید بہ حرماں عاقبت از تیر ما
حاجب باب اجابت بالیقیں خیز و زخواب
از دعائے صبح گاہ و نالۂ شبگیر ما
کرد باید۔ بہر حریت جہاد بے قتال
کر کند گوشش حریفاں نعرۂ تکبیر ما
مایۂ نازِ زنانست۔ امتثال امر رب
کرد احمد مدح دین خواہران ہیر ما
حکمران ما۔ ہلا۔ شاہ رسولاں است و بس
آرے آرے غیر او ہرگز نباشد میر ما
آنکہ بُد پنہاں بہ تعلیش الفت جنس لطیف
آنکہ بُد پیدا از قولش عزت و توقیر ما
طاعتش اسلام ما۔ عشق رخش ایمان ما
رہ نیش فردوس ما۔ خاک رہش اکسیر ما
ما و دست و دامن پیر خستان حجاز
نیست یاراں طریقت غیر ازیں تدبیر ما
(آئینۂ حرم ص ۳۱-۳۲)

"البلاغ المبین"

اے قوم! چند فارغ و بیکار بنیمت
غافل ز کید دشمن عیار بنیمت
خواہم ز شرم چہرہ بپوشم بخاک گور
ہرگہ شریک محفل اشرار بنیمت
تقلید ہیر غرب دریغا شعار تست
غافل ز اسوۂ شہ ابرار بنیمت
کج میروی۔ بمنزل مقصود کے رسی
باغی ز طوع قافلہ سالار بنیمت
(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور کبھی ز۔خ۔ بھی تخلص کرتی تھیں،

سُبْحَانَكَ بَاذَا الْمَجْد پڑھے غُفْرَانَكَ اَللّٰهُمَّ کہے
ہر ڈھب سے لب ز۔خ۔ پہ رہے اے بارِ خدا مذکور ترا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

گاہے بدستِ خامہ گہ تیغ بے نیام	خواہم لبانِ حیدرؓ کرار بہ نیمت
دربزم ہمچو دریا ڈرپاش یا ہمت	دررزم ہمچو ساحل۔ خودداربہ نیمت
گلشن جہان وتو گل توحید بوئے گل	اے گل! بلاکشِ خلشِ خار بہ نیمت
اے زینت! اے کہ مخزن رازاست سینۂ ات	خواہم زلب ہمیشہ گہر بار بہ نیمت

حُسنے نداشت شعرِ تو۔ الا دلم ربود
شاعرانہ۔ فسونگر وسحار بہ نیمت		(فردوس تخیل ص۲۵۵)

۵

"ذکرِ حبیب"

لبان عاجز۔ دہاں قاصر۔ زبان الکن۔ بیاں کوتہ
ز وصفِ رب۔ ز مدحِ شہ۔ زحمدِ ایں۔ زنعتِ او

حبیب میداں چو من گنگ وخموش و عاجز وحیراں
دوصد رومی۔ دوصد جامی۔ دوصد سعدی۔ دوصد خواجو

دماغ تو نگاہِ تو۔ زبانِ تو۔ سرشتِ تو		فردوس تخیل ص۲۶۳
معارف داں معارف بیں۔ معارف گو معارف جو

مسلم قوم اور خصوصاً مسلم خواتین کی زبوں حالی پر آپ کا دل بہت دکھا ہے اور ان ہی خواتین کی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور تمدنی اصلاح آپ کی شاعری کا ایک خاص موضوع بن گیا ہے، آپ تعلیم نسواں کی بھی زبردست

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

منورہ جاں - مطہر جسم - عنبر زلف - شکر لب
مسیحا دم - سلیماں جاہ - یوسف چہر - موسے خو
وفاکیش و وفادار و وفا جوئی و وفا پرور
نکو چہر و نکو زلف و نکو چشم و نکو ابرو
نگہ جاں بخش و جاں افزا و جاں آسا و جاں پرور
ادا دل بر - عطا دل دہ - حیا دلکش - وفا دل جو
رضا کوش و رضا کیش و خدا بین و خدا بندہ
نکو رائے و نکو روئے و مبارک جاں مبارک خو
زعشق تو - زرعب تو - زغیر تو - زجور تو
سرم جوشاں - لبم ساکت - دلم خالی - کفم مملو
قتیل حسرت و یاد و غم و ہجر ترا باشد
مرض درماں - اجل عیش - کفن خلعت - لحد مشکو
زسوز آہ و درد عشق و رنج ہجر و داغ غم
بدل شور و بسر جوش و بچشم اشک و بلب یا ہو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

علمبردار تھیں مگر آپ اس انتہا پسند طبقہ میں شامل نہیں تھیں جو مغربیت کے سیلاب میں بہہ کر اپنی منزل فراموش کر چکا ہے۔ جہاں آپ نے قدیم، جاہل، رجعت پسند اور وہم پرست طبقہ پر تنقید کی ہے وہاں انتہا پسند

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

قرار و۔ راحت و۔ آرام و۔ آسایش۔ نمی بینم
نہ بر بستر۔ نہ بر بالش، نہ ایں پہلو۔ نہ آں پہلو

نیابم مونس و یار و انیس و۔ دوست می بینم
گہے ایمن۔ گہے الیسر گہے ایں سو۔ گہے آں سو

نمی از ہم برو۔ رندو خراب و مست و زشتم گو
بہر ساعت۔ بہر ہنگام۔ در ہر خانہ۔ در ہر کو

مشوبے درو۔ رنج و حزن و غم ایدل! اکہ خوش نبود
تن بے جاں۔ رگ بے خوں ہم بے دُر گل بے بو

بہائے حسرت داراں و افکار و۔ الم مشکن
بہ فریاد و۔ بافغان و۔ بزاری و بہائے و ہو

طبیبا! چارہ ام جز مرگ و۔ درد و زخم و ہم نبود
مہر تخلبت مکن درماں۔ منہ مرہم مدہ دارو

شہا۔ مائیم کج رفتار و۔ خوار و زار و بد سیرت
توئی ہادی۔ توئی شافع۔ توئی راحم۔ توئی خوشخو

بقیہ اگلے صفحہ پر

طبقہ کی گمراہی اور اس سے اپنی بیزاری کا بھی اعلان کیا ہے، قومی اور ملّی رنگ آپ کی شاعری پر چھایا ہوا ہے مگر آپ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اغیار پر نکتہ چینی کرتے وقت "سفیدانِ فرنگی" کے خلاف کچھ لکھتے ہوئے آپ کا قلم جھجکتا تھا۔ معلوم نہیں کہ غور و فکر کے بعد محترمہ اس نتیجہ پر پہنچی تھیں یا اقتضائے وقت و مصلحتِ زمانہ کے اعتبار سے آپ نے یہ طریقِ عمل اختیار کیا تھا۔

آپ کے کلام کا رنگ ناصحانہ ہے، خواتین کی درستیٔ اخلاق کے متعلق آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اور خدا پرستی، اطاعتِ شوہر، تربیتِ اطفال، خانہ داری وغیرہ تمام نسوانی فرائض پر موثر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے مگر چونکہ پند و نصائح دراصل روحِ شاعری کے منافی ہیں جب تک کہ کہنے والا اتنے بلند پایہ کا شاعر نہ ہو کہ اپنی شعریت کی رنگینی میں ان ٹھوس اور خشک مسائل کو چھپالے، اس لئے گو اخلاقی اعتبار سے محترمہ کا کلام حد درجہ قابلِ قدر ہے، پھر بھی جہاں تک صرف "شاعری" کا تعلق ہے اس میں زیادہ کیف، سرور، رنگینی اور ربودگی نہیں پائی جاتی۔

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

خیال و فکرت و قلب و دماغِ من زمدحِ تو
پُر از حورو، پُر از نور و پُر از طور و پُر از لولو

محترمہ نہایت پُرگو شاعرہ تھیں۔ آپ نے ہر عنوان اور ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کے یہاں نظمیں، غزلیں، قصیدے، مسدس، قطعے بند، رباعیاں اور سہرے سب ملتے ہیں۔ آپ نے حمد، نعت و منقبت پر بھی قلم اُٹھایا ہے، عرفان و حقیقت کے مضامین بھی نظم کئے ہیں، تہنیت اور تعزیت پر بھی نظمیں لکھی ہیں، آپ نے تاریخیں بھی کہی ہیں اور تضمینیں بھی۔ نیچرل شاعری کی مثالیں بھی آپ کے یہاں موجود ہیں اور جذبات نگاری کی بھی، آپ نے معارف ملیہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور بصائر سیاسیہ پر بھی۔ آپ اپنی قومی، ملی اور اخلاقی نظموں میں اقبالؒ کے رنگ سے متاثر نظر آتی ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے مخصوص رنگ کی مثالیں بھی جستہ جستہ آپ کے یہاں موجود ہیں۔

مسدّس

اخلاقی، ملکی و ملّی شاعری (ناصحانہ رنگ)

میں نے مانا کہ خموشی ہی بیاں سے بہتر　　لبِ پیوستہ لبِ شہد فشاں سے بہتر
صبر شیون سے شکیبائی فغاں سے بہتر　　دل ہے اسرار کے کہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شے کے لئے حد ہے معین لوگو
ضابطِ درد ہو کب تک جگر زن لوگو

مہد سے تا بلحد ظلم اُٹھائے صدیوں　　تیر پر تیر دلِ خستہ نے کھائے صدیوں

چپکے چپکے گہرِ اشک لٹائے صدیوں | قصص حسرتِ دل دل کو سنائے صدیوں

ضعفِ غالب میں گر اس صبر و سکوں کا شمہ
سعی و تفتیش سے مل جائے تو میرا ذمہ

بھائیو! آہ رہے سینہ میں مدفوں کب تک | دل ہی دل میں گلۂ طالع واژوں کب تک
آستیں سے ہو نہاں دیدۂ پرخوں کب تک | غم کو پوشیدہ رکھے خاطرِ محزوں کب تک

حالِ دل کیوں نہ کہیں؟ منہ میں زباں رکھتے ہیں
ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم | خستۂ جور ہیں ہم کشتۂ بیداد ہیں ہم
تختۂ مشق سناں بازیٔ صیاد ہیں ہم | آدمی کا ہے کو ہیں پیکرِ فولاد ہیں ہم

ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر
اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

آتشِ ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر | پھونک ڈالا تپ دق بن کے غموں نے اکثر
بے اجل مرتے ہیں تہ خانے کے اندر گھٹ کر | ہائے جو تنگی میں مناقق کی لحد سے بدتر

ڈاکٹر کہتے ہیں "در کھولو ہوا آنے دو"
سنگدل کہتے ہیں "ہرگز نہیں مر جانے دو"

یاد ایام کہ تھا بخت فدائے مسلم | ڈھونڈھتے تھے فلک و ارض رضائے مسلم
دلِ ہرقل کو ہلاتی تھی ندائے مسلم | تاجِ ایران تھا زیرِ کفِ پائے مسلم

رتبۂ انتم الاعلون[1] تھا اس کے لائق

---

[1] لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین یعنی سست و غمگین نہ ہو۔ اگر تم مومن ہو تو (ضرور) علو مراتب حاصل کرو گے۔ (الآیہ)

قولِ اَکملتُ لکم دینکم اس پر صادق

ہم سے خالی نہ تھی یوں انجمنِ قال اقول
نہ گرایا تھا ہمیں صورتِ حرفِ معلول
عائشہ کے دہنِ پاک سے جھڑتی تھی جو پھول
آج تک ہیں وہ بہارِ چمنِ شرعِ رسول

عرصۂ جنگ میں بھی ہم نے کیے کارِ وقیع
صنفِ نازک سے نہ تھی خولہ جانباز و شجیع

کون مسلم؟ وہی فرمانبر شاہ انساں
ہاں وہی مصلحِ اخلاق تباہ انساں
ہاں وہی اوج دہ رایتِ جاہ انساں
ہاں وہی نور دہ بخت سیاہ انساں

ہاں وہی واقف عقلیت اسباب و علل
ہاں وہی واصف حریت افکار و عمل

مرد و زن مل کے اٹھا سکتے ہیں وہ اثقل بار
کانپ اٹھا جس سے دلِ ارض و سپہرِ دوّار
مرد و زن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار
جو خلیج متلاطم میں پڑی ہے بیکار

آؤ وحدت کی امانت کو اٹھائیں مل کر
آؤ۔ اسلام کی کشتی کو بچائیں مل کر

شوق نظارۂ تھیٹر و بازار نہیں
مقصدِ حریت و علم یہ زنہار نہیں
حکم برداری شوہر سے بھی انکار نہیں
بخدا پردہ دری کے بھی روادار نہیں

ہے حیا بادشہ علم کے سر کا افسر

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا آج میں نے تمھارے دین کو مکمل کیا اور تم کو اتمام نعمت سے مشرف فرمایا اور تمھارے لئے دین اسلام کو پسند فرمایا (قرآن کریم)

قول مشہور ہے "اَلعِلمُ حِجَابُ الاکبر"[1]

سدِّ راہِ ستمِ فتنہ گراں ہے پردہ
خازنِ معتمدِ گنجِ نہاں ہے پردہ
مظہرِ شانِ خداوندِ جہاں ہے پردہ
جذبۂ غیرتِ مسلم کا نشاں ہے پردہ

اثرِ عصر سے محفوظ ہے پردے کا وجود
دور ہوں اس سے جو ناقابلِ برداشت قیود

مرد کا رتبہ گھٹانا نہیں ہرگز منظور
زن کو بے شبہ رضاجوئی شوہر ہے ضرور
لیکن اس کو تو فراموش نہ فرمائیں حضور
بطنِ عورت سے ہوا نورِ محمدؐ کا ظہور

یہ تنفّر، یہ حقارت کی نگاہیں کب تک
عرش جنباں ہوں خواتین کی آہیں کب تک

کچھ سنانے کیلئے آئی ہوں اب دم سن لے
کوئی سنتا نہیں۔ تو ہی سخنِ غم سن لے
میرے آقا میرے پیغمبرِ اعظم اب سن لے
بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمّی[2] شہِ عالم یہ سن لے

نکتہ چیں ہے غمِ دل ان کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالبؔ)

تو جب اے آمنہؓ کے نورِ نظر آیا تھا
دہر انوار سے معمور نظر آیا تھا
منظرِ قوتِ جمہور نظر آیا تھا
قیصر دل زدہ مقہور نظر آیا تھا

---

[1] علم بہت بڑا حجاب ہے (امام غزالیؒ کا قول)

[2] میرے ماں باپ تجھ پر قربان۔

پہلے آموختہ کبر بھلایا تو نے
پھر سبق عزت نسواں کا پڑھایا تو نے

سنگدل بھول چکے ہیں سخنِ استوصُوا[1] نہ قواریر[2] سے ہیں رفق پہ مائل سرِ مُو
اِتقوا اللہ[3] سے اب ان کا نہیں جھنکتا ہے نہ یہ پروا کہ محب زنِ مظلوم تھا تو

آہ کیا جوشِ کرم ہے ترے اس فرماں میں
"وہی بہتر ہیں[4] جو بہتر ہیں حقِ نسواں میں"

طلب العلم فریضۃ[5] سے ہیں اگرچہ آگاہ نہ رکھنے ہیں ایسی احادیث دل میں اکراہ
لوٹ دیتے ہیں ورق پھیر کے جلدی سے نگاہ گر لکھا پاتے ہیں لا تمنعوا[6] اماء اللہ

یاد ایام کہ منکر ہوئے جیسا اس سے بلال
ان سے پھر بات نہ کی باپ نے تا روزِ وصال

---

[1] استوصوا بالنساء خیراً الخ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو (الحدیث)

[2] رفقاً بالقواریر شیشوں کو ٹھیس نہ لگاؤ (الحدیث)

[3] اتقوا اللہ فی النساء فانکم اخذ تموھن بامان اللہ الخ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ تم نے انھیں امان خداوندی میں لے رکھا ہے (الحدیث)

[4] خیارکم خیارکم لنساءکم (الحدیث)

[5] طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ ۔ طلب علم ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے (الحدیث)

[6] لا تمنعوا اماء اللہ عن مساجد اللہ ۔ اللہ کی کنیزوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔ (الحدیث)

پردۂ شرع پر گر غور ہو ٹھنڈے دل سے　　پرزۂ رسم کا شمہ بھی ملے مشکل سے
تھا شغف گرچہ تجھے حریت کامل سے　　مگر اغیار ہیں اس امر میں کچھ جاہل سے

کیا کہوں کس نے تری شرع کو بدنام کیا
ہائے افسوس تری قوم نے یہ کام کیا

یا نبی اپنے لب بستہ کو جنباں کر دے　　قُم بِاذنی سے تن عدل کو ذیجاں کر دے
مرد کو زن کے ستانے پہ پشیماں کر دے　　یعنی پھر باغچۂ قوم کو خنداں کر دے

پھیل جائے چمن دہر میں بوئے اسلام
غنچہ ساں سر بگریباں ہو عدوئے اسلام　　(آئینۂ حرم صہ ۲۱)

تصادم رواج و شرع

"صوبۂ پنجاب میں لڑکیوں کو محروم الارث کرنے کا جو شریعت سوز رواج قائم ہے اس کو ۱۹۱۵ء میں قانونی استحکام بخشنے کی تجویز زیر بحث تھی خاکسار نے بھی بذریعہ اخبار حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا (ن - خ - ش)

جو حق پرست تھا وہ ہی دنیا پرست آج　　مسلم شراب حرص ہوا سے ہی مست آج
روز جزا کی فکر نہ ماغوں سے دور ہے　　جسطرح دل سے عظمت یوم الست آج
اسلام کے وجود میں ہے اختلاف رائے　　ہستی میں ہے مباحثہ نیست ہست آج
خود کام چاہتے ہیں کہ پائے رواج فتح　　شرع محمدی کو ہو رن میں شکست آج

رائج ہو زن کو ترکہ نہ ملنے کی رسم بد
ہو فیصلہ شریعت حقہ کا مسترد　　آئینۂ حرم صہ ۲۲

معارفِ ملّیہ

کیا ہوئی اے مرے اسلام! وہ شوکت تیری
ہائے کس گوشہ میں روپوش ہے سطوت تیری

اے رسولِ عربی! اے شرف افزائے رسل
اب بھی قرباں ہے ترے نام پہ اُمّت تیری

جوش زن اب بھی دماغوں میں ہے سودا تیرا
جلوہ گر اب بھی دلوں میں ہے محبت تیری

حرزِ جاں اب بھی ہے قرآنِ مقدس اپنا
اب بھی محفوظ ہے سینوں میں امانت تیری

آج بھی مرجعِ آفاق ہے مولد تیرا
آج بھی مرکزِ زوّار ہے تربت تیری

تا کجا لب پہ رہے شورِ متٰی نصر اللہ
تا کجا جورکشِ دہر رہے ملّت تیری

اے مہِ فیض! یہ اندھیر مٹا سکتی ہے
طرفۃ العین میں اک چشمِ عنایت تیری

دقائق

خودی کہتی ہے شوقِ دیدِ جاناں میرے دم سے ہے
ندائے بیخودی ہے رونمائے حسنِ وحدت ہوں

کہا میں نے کہ جنّت پر رضائے دوست فائق ہے
رضائے دوست بولی "بے خبر ایں ہی تو جنّت ہوں"

شہادت گاہِ اُلفت میں کھڑی ہوں سر بکف کب سے
نکل اے خنجرِ قاتل کہ مشتاقِ زیارت ہوں

کیا مجنوں کو رہبر منتخب صحرائے وحشت کا
مقامِ شرم ہے اب تک مقیمِ کوئے حکمت ہوں

(فردوسِ تخیل صفحہ ۱۶۶)

لذّتِ عرفاں

رنگِ فطرت ہے وجہِ حیرانی
عقل ہے اور جائے نادانی

رازداں مدعا کو کہتے ہیں
حُسنِ الفت کا داغ پیشانی

حُسنِ "باقی" نے دل کو کھینچ لیا
رخصت اے حسنِ ہستیٔ فانی

دل ہے وقفِ رجائے رحم و کرم
جاں ہے نذرِ رضائے ربّانی

اب میں سمجھی کہ ہے فنائے خودی
انبساطِ بہشتِ لافانی

غم نہ کر ہے نقیبِ ابرِ بہار
خشکیِ موسمِ زمستانی

دلِ صد پارہ کے الم گن لوں
دیکھی جائے گی سبحہ گردانی

کر سکے طے نہ ملکِ عرفاں کو
رومی و مغربی و کرمانی

دوریِ بزمِ دوست کے غم میں
محوِ افغاں ہے اک افغانی

عرش کے کنگرے پہ طائرِ قدس
رات کرتا تھا یوں خوش الحانی

کہ ہے انساں طلسمِ شانِ خدا
قدر اپنی نہ اس نے پہچانی

بند کیں اس نے جب ذرا آنکھیں کھل گیا رازِ بزمِ امکانی
چارہ روح فلسفی ہے نہ شیخ ایک وہمی ہے ایک خفقانی
کثرتِ این و آں ہیں وحدتِ دوست گنجِ نایاب کی فراوانی
شیخ! ایخ بیاں کا ڈر نہ کرے لابیاں ہے یہ کیفِ وجدانی
متشکّی ہے اور شکایتِ ہجر
نزہت اور شکرِ لطفِ پنہانی (فردوسِ تخیل صلا)

سلکِ مرواریدؔ

اسیرِ بیکاری دل وجاں! اگر اُٹھ کے عزمِ دیارِ جاناں
تلاش کر وہ متاعِ درماں جو حصہ اربابِ زر کا ہے
"پسند کر گوشہ سلامت"۔ یہ تجھ کو عارف کی ہے نصیحت
"اُٹھ اور سلیماں کی ڈھونڈھ شوکت" یہ تجھ کو طائر کا مشورا ہے
کرامت و کشفِ خشک کب تک مراد فقر؟ اے رفیع مسلک
بن آبِ نہرِ بقا کا گاہک خضر اگر تیرا آشنا ہے
ہمیشہ خوابِ سکوں سے دوری۔ ہمیشہ پاسِ نفس ہیں ساعی
یہ اصفیا کی ہے زندگانی۔ یہ زندگانی کا مدعا ہے

ل اقبال:- ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّے
اللہ کرے معرکۂ شوق نہ ہو طے
(ضربِ کلیم)

محاکاتی شاعری

برسات اور کسان

آبِ دریا میں کنول ہے؟ یا چمکتا ہے چراغ
خاکِ صحرا میں ہیں لالے؟ یا دہکتے ہیں شرار

اس طرف چڑیوں کا گانا اس طرف موروں کا ناچ
نیچے عنبر بیز گل - اوپر ہوائے مشکبار

دیکھتے ہی دیکھتے ہستی کا یہ عالم ہوا
جیسے کر لے کوئی گرد آگیں جسم غسل اور سنگھار

یا الٰہی ہے گوہر و گل ہیں پری سبز فام
اور نشاطِ حسن سے ہنس ہنس کے گاتی ہے ملہار

فاتحانہ کبر و خاموشی سے ہے نگرانِ خاک
یا ہے بگلوں کی طرف نگراں باندازِ وقار

اُڑ رہے ہیں جو زمیں کو چھوڑ کر اس کی طرف
مثلِ فوجِ شہ صف اندر صف قطار اندر قطار

(فردوسِ تخیل صہ ۱۸۹-۱۹۰)

بی بی آمنہؓ کا بسترِ مرگ

مرا پیارا محمدؐ کہاں ہے؟ لاؤ ذرا
جمال مجھ کو مرے لال کا دکھاؤ ذرا

کنارِ شوق میں دل کے قریب بٹھاؤ ذرا
مرے لبوں سے وہ ننھے سے لب ملاؤ ذرا

میں اپنے پیارے کو جی بھر کے پیار تو کر لوں

دمِ وداع ذرا ہم کنار تو کر لوں

مرے ستارے! مرے چاند! میرے مہر مبیں ۔۔۔ مزار میں بھی نہ بھولے گی مادرِ غمگیں
تری ادائیں۔ ترا حسنِ اصبح و نمکیں ۔۔۔ یہ تیرے عارضِ گلگوں یہ تابناک جبیں

یہ چشمِ مست و سیہ۔ یہ نگاہِ دزدیدہ
یہ حلقہ بندیِ زلفِ دراز و پیچیدہ

ترا یہ جھوٹ سے چڑنا۔ دغا سے گھبرانا ۔۔۔ یہ ہم سنوں کو صداقت کا رمز بتلانا
دمِ غضب یہ ترا شانِ حلم دکھلانا ۔۔۔ ہنسی کے وقت فقط مسکرا کے رہ جانا

عجیب تیری ادائیں عجیب شانیں ہیں
عرب میں ورد زباں تیری داستانیں ہیں

چلی ہوں چھوڑ کے گدڑی میں گنجِ ہفت اقلیم ۔۔۔ چلی ہوں چھوڑ کے۔ اک لعل! ایک دُرِّ یتیم
نہیں کسی سے کچھ امید۔ ہے تو ہم ہی ہیم ۔۔۔ کرم۔ کرم مرے معبود! میرے ربِّ کریم

ترے کرم سے یہ بچہ اگر جواں ہوگا
یقیں ہے قوتِ اجسام ناتواں ہوگا

سنی اگرچہ بغور اس نے شرحِ رنج و ملال ۔۔۔ مگر ہوا متزلزل نہ پائے استقلال
یہ چھ برس کا سن! اور ضبطِ نفس میں یہ کمال ۔۔۔ بچائیو نظرِ بد سے ایزدِ متعال

سپانے جاتی ہے ماں اک گنجِ تربت کو
تجھی کو سونپ رہی ہے تیری امانت کو

فردوسِ تخیل ص ۲۱۱

جذباتی شاعری

پیام

دلِ فسردہ کو اب طاقتِ قرار نہیں　　نگاہِ شوق کو اب تابِ انتظار نہیں
نہیں نہیں۔ مجھے برداشت اب نہیں کچھ نہیں　　خدا کے واسطے کہنا نہ اب کی بار نہیں"
ہمیشہ وعدے کئے۔ اب کے مل ہی جا آکر　　حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں
دکھاتی اپنی محبت کو چیر کر سینہ　　مگر نمود مرا شیوہ و شعار نہیں

مری بہن! مری محبوبہ! حب عجب شے ہے
جہاں میں خاک نہیں کچھ۔ جو دوستدار نہیں

(فردوس تخیل صفحہ ۲۸۲-۲۸۳)

آ دیکھ مجھے

لذتِ دید کا جسکا ہے تو آ دیکھ مجھے　　صاحبِ دیدۂ بینا ہے تو آ دیکھ مجھے
میری صورت ہے تماشا گہ یاس و امید　　گر تجھے شوقِ تماشا ہے تو آ دیکھ مجھے
سب مری بات یہ کہتے ہیں کہ مختل ہے دماغ　　تجھ کو دیوانوں کا سودا ہے تو آ دیکھ مجھے
مجھ سے بھی بر سر پیکار ہے قسمت میری　　دیکھنا جنگ کا نقشہ ہے تو آ دیکھ مجھے
رابعہ اب ہے مرضِ غم سے برا حال مرا　　گر مزاج آجکل اچھا ہے تو آ دیکھ مجھے
لوگ پوچھیں گے مری صورتِ بیمار تجھ سے　　منہ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے

بدنما ہے مری کیفیت ناگفتہ بہ
اس میں گر شبہ بجا ہے تو آ دیکھ مجھے

(فردوس تخیل صفحہ ۲۸۶ و ۲۸۷)

اللہ الصمد[1]

ہاں یہی غمزدہ اک روز تھی بیگانۂ غم دور تھا سرحدِ تخئیل سے ویرانۂ غم
اس خرابے میں نہ تھی محرمِ میخانۂ غم لب تک آیا تھا نہ حرفِ لبِ پیمانۂ غم
ذکرِ غم قصّے کی مانند سنا کرتی تھی
لفظِ افسوس کو جوں رسم ادا کرتی تھی

کیا بتاؤں میں بہن مرگ کہ وہ کیسا تھا کوئی اس سا نظر آئے تو کہوں ایسا تھا
بس مرے جی ہی کو معلوم ہے وہ جیسا تھا جیسے اس دہر میں جی سکتے نہیں ویسا تھا
ہیں تو میں اس کے لئے روتے ہیں بیگانہ و غیر
اس مسلماں کا ہیں ماتم کدہ میخانہ و دیر

دین کا پابند بھی تھا طبع کا آزاد بھی تھا فخرِ احباب بھی تھا۔ نازشِ اجداد بھی تھا
ہمدم و ہم نفس نزہتِ ناشاد بھی تھا بھائی بھی دوست بھی شاگرد بھی استاد بھی تھا
رشتہ دل سے ہو یوں رشتہ خوں محکم تر
ایسی الفت کی جہاں میں ہیں مثالیں کمتر

اتفاقاً جو کبھی ہجر ملا کرتے تھے پہلے گھنٹوں غمِ فرقت کا گلا کرتے تھے
دیکھنے والے تعجب سے سنا کرتے تھے ہو کے پھر متفق اللفظ کہا کرتے تھے
ایسی اُلفت کہیں دیکھی نہ سنی مشفق من
ہم نے ان آنکھوں سے کیا دیکھے نہیں بھائی بہن

موت پر زور نہ جینے کی توانائی ہے تابِ شیون ہے نہ یارائے شکیبائی ہے
باعثِ وحشتِ دل گوشۂ تنہائی ہے شرکتِ بزم میں دیوانے کی رسوائی ہے

[1] یہ ایک طویل نظم کے کچھ بند جو محترمہ نے اپنے بھائی جناب احمد اللہ خاں صاحب حیرانؔ کی وفات پر لکھی تھی۔ مرحوم کا ... انتقال اپریل ۱۹۱۷ء میں ہوا۔

موت آتی ہی نہیں چکتی کسی عنواں میری
ہائے اللہ کس آفت میں پھنسی جاں میری

طبع میں مادۂ نغز بیانی نہ رہا | زور آمد نہ رہا۔ شور روانی نہ رہا
الغرض خاک بھی جز سوز نہانی نہ رہا | جب مرا عارف اسرار معانی نہ رہا

جوش اسی کا تھا جو میرے سر پُر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا

(فردوس تخیل ص ۱۴۳ و ۱۴۴)

سنتے ہیں آج روٹھے ملتے ہیں آج چھوٹے
ہیں شکوہ سنج دونوں۔ خونابہ بار دونوں

(فردوس تخیل ص ۲۹۲)

تاریخ گوئی

شادی

اے قلب حزیں! تڑپ پہ کم کم | اے آہ جگر خراش! تھم تھم
شادی ہے بہن سعیدہ کی آج | گھر گھر ہے نشاط و عیش کا راج
کیوں ہو نہ مجھے دلی مسرت | ہے مجھ کو دلہن سے ایک نسبت
دونوں کا ہے نصیب بین اک ہی | وارفتۂ غم وہ بھی۔ میں بھی
ہے خواہش نزہت طبیدہ | مسعود ہو شادیٔ سعیدہ
زوجین رہیں اسیر الفت | ہو غم نہ سوائے رنج ملت

اعدا کہیں رو کے مسنا الفرح
شادی ہو سعید۔ باعث فرح

(فردوس تخیل ص ۳۱۱)

کوکبِ مشرق

وفاتِ حضرتِ شبلی کی زائدہ تاریخ
کہو غروب ہوا، آہ - کوکبِ مشرق"
۱۹ ھ ۱۴

(فردوسِ تخیل صفحہ ۳۵۲)

حُسنِ تضمین

تضمین بر اشعارِ غالب

دردِ الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری - ہائے ہائے
کیوں لگایا پھر وفا کا زخم کاری ہائے ہائے
تجھ سا بے فکر - اور کسی کی غمگساری ہائے ہائے
درد سے میرے ہو تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم! تیری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے

کچھ ہنسی تھا؟ شرکتِ رنج و الم کا حوصلہ
آہ یہ - اک خوگرِ نازو نعم کا حوصلہ
کیوں کیا بے قوتِ دل اس ستم کا حوصلہ
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

تھا مرا غم خوار بن کر پھولنا پھلنا محال
کٹ گیا آخر نہ تیرا نخلِ عمر؟ اے نونہال
آہ ناداں! کیوں نہ سوچا میری الفت کا مآل

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری۔ ہائے ہائے

جیتے جی ہم تم رہے گر یک دل و یک جا۔ تو کیا
تا دمِ آخر۔ بھرا گر دم محبت کا تو کیا
عمر بھر پیماں رہا منتِ کشِ ایفا تو کیا
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری۔ ہائے ہائے

چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو تو نے راہِ خلد لی
تیرے زخمِ ناوکِ فرقت سے ہیں جیتی بچی
ہو چکی بس اعتمادِ دل کی شیشہ گری کری
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسم یاری۔ ہائے ہائے

وا دریغا تھا دل بیمارِ غم کو آسرا
"اب تیغ ناز سے اک دن مجھے ہوگی شفا"
حسرت اے شوقِ جراحت! رخصت اے ذوقِ فنا
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

غم بھرے کرتی ہے دخلِ اشک بارہ برشگال
مثل قسمت تار ہیں لیل و نہار برشگال

کب کھلے گا ہائے - ابر سایہ دارِ برشگال
کیسے کاٹوں ہائے ہیں شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری - ہائے ہائے

ایک دن وہ بھی تھا جب دم بھر کی فرقت تھی محال
آہ اک دن یہ بھی ہے جب رونما ہے انفصال
یہ الم کب تک سہوں؟ کب تک ہو جینا وبال
گوش نا مہجورِ پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری - ہائے ہائے

(فردوس تخیل صفحہ ۳۶۵)

رباعیات

جاں بلب ضعف سے ہوں لب کو ہلاؤں کیونکر
دسترس اس پہ نہیں خامہ اٹھاؤں کیونکر
حال پوچھو نہ مرا خود ہی بتاؤ مجھ کو
ایسی حالت میں تمھیں حال بتاؤں کیونکر

(فردوس تخیل صفحہ ۳۷۴)

مسلماں تو اکھاں تک ہے زباں حیواں کی قربانی
دو جہاں آفریں پر آ، کر دیں جاں کی قربانی
مو فر تھی خلیلؑ رب کی قربانی لخت دل
مگر ہے اور شے شبیرؑ کا ایماں کی قربانی

(فردوس تخیل صفحہ ۳۷۵)

اکبر کار زناگ

درگاہ میں کل جلسۂ سالانہ تھا میلاد کا　　ایک سرجی یوں برلب گویا ہوئے وقتِ دعا
کہلایا خادم قوم کا لیڈر بھی اب کہلاؤں میں　　سی آئی ڈی کا رکن ہوں سی آئی ڈی ہو جاؤں نہیں

~~~~~

نہیں ملتے مجھے الفاظ کافی　　جو ہوں سرحن سے خواہانِ معافی
دوا پینے سے پہلے اتفاقاً　　زباں پر آگیا اللہ شافی

فردوسِ تخیل ص۳۷۶

~~~~~

چھپ گیا انجام کار روئے مہرِ تابدار　　صبر ہا اے قلبِ فگار آچکا بس خطِ یار
کل یہ ہی حیشمانِ زار بہی خط کا انتظار　　پھر نہ ہو یوں انتشار کاش اے پروردگار

فردوس تخیل ص۳۷۹

~~~~~

زاہدہ

محترمہ، چودھری خلیق الزماں صاحب ام۔ال۔اے، کی شریکِ حیات اور عصرِ جدید کی ایک بلند پایہ اور قابلِ قدر شاعرہ ہیں، آپ کی شاعری کی عمر تقریباً ۱۴-۱۵ سال ہے، آپ کی غزلیں بہت دلدوز، پُرکیف اور وارداتِ قلب کی آئینہ دار ہیں، غزلوں کے ساتھ ساتھ آپ نے نظمیں بھی لکھی ہیں، عشقیہ شاعری کے علاوہ آپ کے یہاں قومی، ملکی اور سیاسی شاعری کے قابلِ قدر اور بلند پایہ نمونے بھی موجود ہیں پھر بھی تغزل آپ کا موضوعِ خاص ہے اور اس کی عمدہ مثالیں آپ کے کلام میں ملتی ہیں۔ محترمہ موجودہ دور کی ایک پختہ گو، خوش فکر اور کامیاب
~~~~~

شاعرہ ہیں۔

آپ کے خودنوشتہ سوانح حیات اور مرسلہ انتخاب کلام شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"۲۱ جولائی ۱۹۱۵ء کو شدید طوفانِ باد و باراں میں پیدا ہوئی۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں بعض جگہ گھٹنوں گھٹنوں تک پانی بہہ رہا تھا، مکانات گر رہے تھے۔ لوگ بے گھر سے ہو رہے تھے ادھر یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے خونی بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔ غرضیکہ اک تلاطم تھا، شور تھا، ہنگامہ تھا۔ میری آئندہ زندگی کا سلسل ذہنی طوفان شاید اسی خارجی طوفان کا آئینہ گہرا اور ہمہ گیر تو ہو۔ ہوش سنبھالا تو یہ طوفان کبھی کا ختم ہو چکا تھا لیکن اپنے ہمہ گیر اثرات چھوڑ گیا تھا جنھوں نے میرے ذہن پر کبھی کبھی خوشگوار اور کبھی ناخوشگوار اثر ڈالا۔ ذہن کی اس بےچینی سے فرار کی راہ شاعری میں نظر آئی۔ گھر میں پہلے ہی سے شعر و سخن کا چرچا تھا۔ والد، چچا، ماموں سب اچھے غزل گو تھے چنانچہ شاید تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی پھر رسائل، اخبارات اور سخن سنج حلقوں نے قدر دانی کی تو ایک زمانہ تک غزلگوئی اور محض غزلگوئی زندگی کا مشغلہ رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اگر اس قسم کا کوئی دلچسپ اور حسبِ حال مشغلہ نہ ہوتا تو نہ جانے میرے ذہن و روح حقیقت و مجاز کی کن کن وادیوں میں سنگلاخ چٹانوں سے سر پھوڑتے رہتے۔

زاہدہ خلیق الزماں

میری غزلیں میری زندگی کی آئینہ دار ہیں (یہاں میں یہ عرض کردوں کہ میں فن برائے فن کی مطلق قائل نہیں) میرا غور و فکر، زندگی کے متعلق میں جو کچھ سمجھ سکی وہ سب ان میں موجود ہے، میرے دل کی کسک، میرے ذہن کی رنگینیاں، میرے ذوق کی ہمہ گیری سب آپ کو ان غزلوں میں ملے گی:

اب کہ رت بالکل ہی بدل چکی ہے اور زندگی کی گہرائیوں، پیچیدگیوں اور ہمہ گیریوں نے ہمارے سامنے بالکل نئے اور اچھوتے تقاضے پیش کردیے ہیں۔ میں نے بھی حیات کی للکار پر لبیک کہی ہے۔ چنانچہ میری اس طرف کی غزلوں میں حسن و عشق کے علاوہ بھی وہ کچھ ہے جس کی گنجائش غزل کو ختم نہیں بلکہ زندۂ جاوید کر رہی ہیں۔ میں آزاد شاعری اور ان نئے تجربات کی جو آج اردو ادب میں ہوئے ہیں، قطعاً مخالف نہیں لیکن اسی کے ساتھ غزل کی خوبصورتی، اس کے رس اور اس کی ہمہ گیری کی بھی منکر نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نے غزل کو جو نیا مزاج دیا۔ وہ اسے لافانی بنا دینے کا تنہا ضامن ہے۔ غزل کے نہ مٹنے اور سدا بہار رہنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پروفیسر فراق گورکھپوری، خلیق ابراہیم، اور معین احسن جذبی ایسے کٹر ترقی پسند شاعر بھی نئے رنگ کے بہترین غزلگو ہیں اور ان میں سے پہلے دو حضرات کا جدید تنقید میں جو درجہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میں شاید بہت لکھ گئی، ہاں اتنا اور بتلا دوں کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء کو چودھری خلیق الزماں صاحب ایم۔اے سے شادی ہوگئی۔ اب چار بچوں کی ماں ہوں، گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں، کبھی کبھی مسلم لیگ کے قومی کاموں میں حصہ لیتی ہوں اور وقت اگر خوش قسمتی سے کبھی مل جاتا ہے تو شعر و سخن سے دل بہلاتی ہوں۔ نمونۂ کلام یہ ہے"

"زاہدہ خلیق الزماں"

کچھ نہ ہوگی زینتِ شام و سحر میرے بغیر ۔۔۔ یہ جہاں بن جائے گا ویران گھر میرے بغیر

بادۂ جور و ستم کی کیا ہوئیں سرمستیاں ۔۔۔ کیوں پریشاں ہے، وہ دزدیدہ نظر میرے بغیر

عام سجدوں سے کبھی مسجود ہو سکتا نہیں ۔۔۔ بن چکا کعبہ تمہارا سنگِ در میرے بغیر

سب تیری سرمستیاں بے کیف ہیں ابرِ بہار ۔۔۔ ہیچ ہے برسات کا موسم مگر میرے بغیر

گل ہنسے کلیاں کھلیں سبزے نے لیں انگڑائیاں ۔۔۔ ہو رہے ہیں آپ لیکن چشمِ تر میرے بغیر

اہلِ دل ہیں اور تکلیفِ خمارِ ہوش ہے ۔۔۔ بادۂ جوشِ جنوں ہے بے اثر میرے بغیر

عشق بے مایہ سے زینت ہے جہانِ حسن کی ۔۔۔ اُٹھ نہیں سکتی تری نیچی نظر میرے بغیر

حُسن بے حس، عشقِ مضطر اور جہاں پُر انقلاب ۔۔۔ آہ کب کرتی ہے تکلیفِ اثر میرے بغیر

عشق کی دنیا میں ہے، اے دل تجھے سب اختیار ۔۔۔ کام چل جائے محبت میں اگر میرے بغیر

آ ادھر آ میں بھی شامِ غم میں تیرا ساتھ دوں ۔۔۔ لطف کیا رونے کا اے شمعِ سحر میرے بغیر[1]

---

[1] محترمہ نے "شمعِ سحر" کو دعوت گریہ دی ہے اور سعدیؒ صاحب نے "بلبل مسکیں" کو فرماتے ہیں،

بنال بلبل مسکیں اگر سرِ یاری ست ۔۔۔ کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاری ست

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں مجھکو فصلِ گل نزدیک ہے
اُڑتے پھرتے ہیں ہوا میں بال و پر میرے بغیر

حُسن کے گل کیا ہوئے خوبی کے جلوے کیا ہوئے
کس لیئے خالی ہے دامانِ نظر میرے بغیر

ترجمانِ دل ہے اک اک شعر اپنا زاہدہ
کون پا سکتا ہے یہ گلہائے تر میرے بغیر

— ۵ —

ہوں کشتۂ نیرنگیٔ دنیا کئی دن سے
بیرنگ ہے تصویرِ تمنا کئی دن سے

پھر دل کے بنانے کا ہی سودا کئی دن سے
کرتی ہوں بہم منتشر اجزا کئی دن سے

فرقت میں عجب حال ہے اپنا کئی دن سے
ہے ذوقِ سکوں درپئے ایذا کئی دن سے

خود حاملِ نظارہ ہے نظارے کی حسرت
اور حسن ہے خود حسن کا پردا کئی دن سے

دن رات ہے نشترزنِ دل یاد کسیکی
ہیں صبر و سکوں درپئے ایذا کئی دن سے

بڑھتی ہوئی وحشت میں تڑپنے نہیں بنتا
کم ہوگئی کیا وسعتِ صحرا کئی دن سے

جلووں نے تری قیمتِ دل اور بڑھادی
سجدہ کیلئے آتا ہے کعبہ کئی دن سے

لو تم تو الگ ہوگئے دکھلا کے تجلّی
گردش میں ہے خونِ رگِ سودا کئی دن سے

اے حُسن پراگندہ نہ کر دل کا صحیفہ
ہیں منتشر اوراقِ تمنا کئی دن سے

---

۵ مؤلف احقر

اک آگ سی ہے دل میں فروزاں کئی دن سے
ہستی ہے مری شعلہ بداماں کئی دن سے

اب موت کا اس دل میں ہے ارماں کئی دن سے
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اُف عالمِ الفت کے دلآویز مناظر — وحشت ہے عناں گیرِ تمنا کئی دن سے
قابو میں دل آنکھوں پہ بھروسا نہیں ورنہ — ہے جلوہ نما حسنِ خود آرا کئی دن سے

اے زاہدہ کیا کہہ دیا اس مست نظر نے
دل بھی نظر آتا نہیں اپنا کئی دن سے

زرّیں

زہرہ خاتون نام اور زرّیں تخلّص ہے، آپ کا خاندان بریلی کا ہے، لیکن اب آپ لشکر گوالیار میں مقیم ہیں۔ محترمہ زرّیں، زینت بیگم صاحبہ عبرت اور سیّد محمد عبد الحی صاحب کی دختر اور بلقیس فاطمہ بیکس کی ہمشیر خوردہ ہیں!

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

راتیں مری بےخواب، مرے دن ہیں پریشاں
کچھ اشک کئی دن سے ہیں ان آنکھوں میں لرزاں
کچھ زیست سے اپنی ہوں کئی دن سے پشیماں
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی

اک بوجھ ہے دل پر کہ اٹھایا نہیں جاتا
اک خواب ہے آنکھوں میں بھلایا نہیں جاتا
اک نغمہ ہے ہونٹوں پہ کہ گایا نہیں جاتا
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی "ج"

آپ کے نانا خان بہادر محمد خوب داد خانصاحب مرحوم بریلی کے ایک مشہور و معروف رئیس تھے اور چیف کمسریٹ آفس کلکتہ میں ہیڈ اسسٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھے [1]

محترمہ زریں کے متعلق جناب خواجہ محفوظ حسین صاحب (لشکر گیا بہار) رقمطراز ہیں :-

"زہرہ خاتون زریں ایک ترقی پسند خاتون ہیں نظم و نثر کا شوق ماحول نا پید اکر رہا ہے۔ عزم و ارادہ میں استقامت ہے۔ طبیعت جوشیلی پائی ہے۔ دل میں ملت کا درد اور احساس ہے۔ شہرت اور ناموری سے گھبراتی ہیں۔"

شاعری میں آپ اپنی بڑی بہن محترمہ بلقیس فاطمہ بیکس کی شاگرد ہیں۔ کلام میں ابھی پختگی اور رنگ نہیں ہے۔ لیکن اگر کہتی رہیں تو اچھا کہنے لگیں گی۔ محترمہ کا مرسلہ کلام درج ذیل ہے۔

ابر سے نکلا ہے کچھ کچھ آفتاب زندگی
رنگ پر آجائے گا اپنا شباب زندگی

ذرہ ذرہ میری ہستی کا درخشاں ہو گیا
ضو فشانی کر رہا ہے ماہتاب زندگی

ہو چکا بیدار اب قسمت کا میری شاہ باز
رنگ لائے گا ضرور اب انقلاب زندگی

دشمنوں کے ہاتھ آئیگی نہ میری خاک پا
ہو گیا اقبال میرا ہم رکاب زندگی

---

[1] مرحوم کے حالات زینت بیگم صاحبہ عبرت نے اپنے تذکرہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ "م"

دور رہتی ہوں ہمیشہ الجھنوں سے دہر کی　　کیوں نہ ہوگا پاک پھر میرِ حسابِ زندگی

ذرّہ ذرّہ ہو گیا زرّیں جمالِ حُسن سے
ہو گیا ہے پھر ضیا بار آفتابِ زندگی

آسماں پر ہے کیوں مسرّت آج　　پیارے تارے بھی جھلملاتے ہیں
دہر میں ماہ ہیں خوشی رقصاں　　سب غنچے ہل ہل کے مسکراتے ہیں
تا ثریا ہے آج دَورِ خوشی　　جامِ عشرت لنڈھائے جاتے ہیں
جب عنادل خوشی سے گاتے ہیں　　تب صنوبر بھی جھوم جاتے ہیں
آئی بادِ صبا بھی اِٹھلاتی　　اور پرندے بھی چہچہاتے ہیں
ہوئی بلبل چمن میں نغمہ سرا　　مور جنگل میں گیت گاتے ہیں
بزمِ عشرت فضا میں سب خوش ہیں　　اور پھولے نہیں سماتے ہیں
کوئی لکھ کر نوید لایا ہے　　کچھ خوشی کے ترانے گاتے ہیں
وجد میں ہے فضائے صحنِ چمن　　پھول ہنس ہنس کے رنگ لاتے ہیں
بن کے سلطان انجمن آرا　　بزمِ علم و عمل میں آتے ہیں
یعنی سلطان کی ہے بسم اللہ　　لوگ دولھا انھیں بناتے ہیں
لائی زرّیں دعاؤں کا تحفہ　　جس کے الفاظ جگمگاتے ہیں

ہو کے مقبول بارگاہِ خدا!
دیکھیے رنگ کیا دکھاتے ہیں

شب کو شبنم جو آئی شادی میں
خوان ہائے گہر بکھیر گئی

ڈالے سبزے کے موتیوں کے ہار
بختِ خوابیدہ اس کے پھیر گئی

آئی مالن تلاشِ گل کے لئے
بھر کے دامن کو وہ دلیر گئی

نہ زخمِ دل بھی ابھی مندمل ہوئے تھے خدا
کہ ایک چوٹ پڑی اور شیشۂ دل پر

زہرا

زہرا: محترمہ ام زہرا ہاشمی مرحومہ بدایونی کا تخلص ہے۔ آپ عصمت کی مخصوص و مقبول شاعرات سے ہیں۔ جنابِ جام نوائی صاحب بدایونی کی شریکِ حیات تھیں۔ شادی کے بعد شوہر کے مذاقِ شاعری پر نظر کرتے ہوئے خود ذوقِ شاعری پیدا کیا اور پھر اس میں اس قدر ترقی کی کہ ملک کی ایک مشہور اور قابلِ قدر شاعرہ بن گئیں۔

آپ نہایت نیک طینت، پاک باطن، وفا شعار اور خدا ترس خاتون تھیں تعلقات زن و شوئی نہایت خوش گوار تھے، اور دونوں کو ایک دوسرے سے از حد محبت تھی۔ ایک دفعہ جناب جام نوائی صاحب سخت علیل ہوئے اور حالت بہت خطرناک ہوگئی۔ اس وقت وفا شعار بیوی نے "بیمار شوہر کے سرہانے" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں وفا کے جوش میں درگاہ ایزدی میں دعا کی گئی تھی کہ الٰہ العالمین تو میرے شوہر کو اچھا کردے اور ان کے بدلے مجھے موت دے، یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ صرف یہ نظم ہی

مقبول نہیں ہوئی بلکہ یہ دعا بھی بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو گئی، جام نوائی صاحب اچھے ہو گئے اور ام زہرا ہاشمی رفتہ رفتہ بیمار ہونے لگیں۔

شوہر کی تیمارداری میں انہماک کے باعث محترمہ کو خفیف سا بخار ہونے لگا تھا جو بڑھ کر ورم امعاء و جگر میں تبدیل ہو گیا، اور بالآخر موت کا باعث بن گیا۔

جب محترمہ ام زہرا ہاشمی کی حالت زیادہ خطرناک ہوئی تو جام نوائی صاحب نے ایک نہایت پُردرد نظم "رحم کی بھیک" کے عنوان سے لکھی جس میں خدا سے بیوی کی زندگی کی بھیک مانگی گئی تھی جو مرحوم کی وفات کے بعد عصمت بابتہ نومبر ۱۹۴۲ء میں چھپی تھی [1]

---

[1] اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں

الٰہی ام زہرا ہاشمی پر رحم فرما دے
ترے صدقے کرم دور از قیاس وہم فرما دے

نہ بن جائے سکونِ مستقل ماضی کی بیتابی
نہ ہو تمہید خوابِ مرگ وہ راتوں کی بیخوابی

اسے تو چھین لے مجھ سے نہ ایسا ہو کہیں یارب
نہیں یارب نہیں یارب نہیں یارب نہیں یارب

میں واقف ہوں وفا کے جوش نے مجھ پہ جفا کی تھی
مرے بدلے میں خود قربان ہونے کی دعا کی تھی

دعا سے میری اب اس کو عطا کر زندگی یارب
مرے جذبِ محبت کو نہ ہو شرمندگی یارب

مری فریاد اگر رنگِ قبولیت نہ پائے گی
تو کیا کیا نازشِ عشق و وفا کو شرم آئے گی

بھنور سے جن کی کشتی کو ابھی تو نے نکالا ہے
وہی معصوم جن سے میری دنیا میں اجالا ہے

وہ پھر مایوسیوں میں آج تجھ سے لو لگائے ہیں
وہ تجھ سے بھیک لینے کو بھکاری بن کے آئے ہیں

لیکن محترمہ کی حالت خراب ہوتی گئی محترم جناب جام نوائی صاحب لکھتے ہیں:۔

"مرحومہ نے انتقال سے چھ روز پیشتر ۲۷ ستمبر ۱۹۴۲ء کو بڑی لڑکی کے عقد و رخصت سے فراغت حاصل کی تھی۔ اور مجھے مجبور کر کے عالمِ بیماری میں چارپائی پر پڑے پڑے خاص اہتمام و انتظام کے ساتھ بحسن و خوبی یہ فرض انجام دیا تھا۔ آخر وقت تک حواس درست رہے۔ مرنے سے دس منٹ قبل پلنگ، بستر، کپڑے ہر چیز تبدیل کرائی۔ تیمم کیا۔ سب کو تلقینِ صبر و شکر کی۔ یٰسین شریف پڑھوانے میں عجلت کی۔ اور صرف تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ کہہ کر جانِ عزیز جانِ آفریں کے سپرد کر دی"

محترمہ کا انتقال ۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک کو ہوا۔ مرحومہ نے چار بچے چھوڑے ہیں۔

محترمہ اردو کی ایک قابلِ قدر شاعرہ تھیں۔ آپ کے کلام میں بڑا درد و اثر اور سوز و گداز ہے، طرزِ ادا نہایت دل کش و سنجیدہ ہے آپ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔

میرے بعد[1]

بعد میرے تم رہو گے نوحہ گر میرے لئے
جانگسل ہے یہ تخیل کس قدر میرے لئے

---

[1] یہ وہ دردناک نظم ہے جو مرحومہ ام زہرا ہاشمی مغفورہ نے اپنے آخر زمانہ علالت میں لکھ کر اس تکئے کے غلاف میں پوشیدہ کر دی تھی جو انھوں نے بزمانۂ علالت اپنے شوہر جناب جام نوائی بدایونی کے لئے اپنے ہاتھ سے کاڑھا تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

گھر میں آکر حسبِ عادت جب نہ پاؤ گے مجھے — خاک اُڑاؤ گے نہ کیا کیا دربدر میرے لئے
شدّتِ غم میں بہا ہیں گے سرخ آنسو آنکھ سے — خون روئے گی تمھاری چشمِ تر میرے لئے
دیکھ کر روتے تمھیں میری لرز جاتی ہے روح — ہے تمھارے دل پہ صدمہ کس قدر میرے لئے
کیا کرو گے بعد میں جب آج میرے جیتے جی — ہو پریشاں اور غمگیں اس قدر میرے لئے
کون سمجھائے گا تم کو موت ہے ہر ایک کو — بن نہ سکتے تھے قوانینِ دگر میرے لئے
وقت پر آئی کسی کی بھی ٹلی ہے دہر میں — تھا نہ یہ دستورِ فطرت خاص کر میرے لئے
میں سمجھتی ہوں مرا غم اور تم اور تابِ ضبط — صبر کرنا جس طرح بھی ہو مگر میرے لئے
میں ہوئی قربان تم پر۔ فرض تھا میرا یہی — تم کو واجب ہے جیو تم عمر بھر میرے لئے
تم کو میری آرزو، میری محبّت کی قسم — تم۔ خدانخواستہ جانا نہ مر میرے لئے
تم اگر روؤ گے میری یاد میں بچوں کی طرح — ہوئیگا صدمہ بڑا یہ روح پر میرے لئے
میرے غم میں نالہ و فریاد و شیون کے عوض — مانگنا حق سے دعا با چشمِ تر میرے لئے
سونپتے رہنا مجھے قرآن پڑھ پڑھ کر ثواب — بھیجنا ہدیہ یہ ہر شام و سحر میرے لئے
میرے بچوں سے محبّت کرتے رہنا عمر بھر — جانتے رہنا انھیں نورِ نظر میرے لئے
زندگی بھر میں نے چاہا ہے تمھارا جان کر — چاہنا تم ان کو میرا جان کر میرے لئے
میں مری جاتی ہوں اس غم میں کہ یہ بچے مرے — بعد میں میرے کہیں پھوڑیں نہ سر میرے لئے

[بقیہ حاشیہ] مرحومہ کے چالیسویں کے بعد یہ نظم برآمد ہوئی۔ مرحومہ بزمانۂ علالت آستانۂ پاک حضرت سلطان العارفینؒ پر شہر کے باہر گیارہ روز قیام کی غرض سے تشریف لی گئی تھیں غالباً وہیں کی فرصت اور تنہائی میں یہ نظم لکھی گئی تھی۔

بہر اپنوں سے نہ تم پیمانِ الفت توڑنا
اُن کو اپنا ہی سمجھنا عمر بھر میرے لئے

بعد میرے اتنا پہنچا دینا تم مجھ کو ثواب
بن سکے جس کے سبب جنت ہیں گھر میرے لئے

ہاں مگر ان میرے بچوں کا بہت رکھنا خیال
رحم کرنا ان کے غمگیں حال پر میرے لئے

مجھ کو اپنی بُو کی حالت پر بہت افسوس ہے
اب یہ ہونگی اور غم شام و سحر میرے لئے

آہ یہ میری ضعیف اماں تمھاری والدہ
روئیں گی اب زندگی بھر کس قدر میرے لئے

بے طرح تڑپیں گے چاروں بھائی بہنو بھاوجیں
جب نہ پائیں گے مجھے پیشِ نظر میرے لئے

بے خبر پردیس میں توڑے گی کیا غم کا پہاڑ
میرے منجھلے بھائی پیارے بھائی پر میرے لئے

دل پھٹا جاتا ہے میرا آہ میری بچیاں
کس قدر روئیں گی ہر ہر بات پر میرے لئے

ہائے بچلے بھائی کا کیا حال ہوگا میرے بعد
آہ پھڑکیں گے بھتیجے کس قدر میرے لئے

اُف وہ میری آنکھ کا تارا مرا اچھے میاں
عمر بھر رکھے گا اپنی آنکھ تر میرے لئے

روئے گا بیتاب ہو ہو کر دہاڑیں مار کر
رکھ کے اپنا ہاتھ اپنے قلب پر میرے لئے

آہ! دل ہے کتنا ننھا سا مرے مہتاب کا
آہ یہ تڑپا کرے گا کس قدر میرے لئے

رات کو بدلے گا جب کروٹ پکارے گا مجھے
دن میں دوڑائے گا ہر جانب نظر میرے لئے

کس سے اب افسوس کوئی بات پوچھے گی حبیب
اس پہ ہوگا کس قدر غم کا اثر میرے لئے

آہ پردیسی جمیلہ جو ہے اک مدت سے دور
دفعتاً رہ جائے گی دل تھام کر میرے لئے

گھر میں ہر سو آبادی براتی سی ہوگی جلوہ گر
آدمی کیا روئیں گے دیوار و در میرے لئے

میں نے اب تک دل کسی کا بھی دکھایا ہی نہ تھا
اب دکھیں گے قدر دانِ قلب و جگر میرے لئے

آہ یہ بیکار ہستی تو اس قابل نہ تھی
سب کے دل میں اک محبت تھی مگر میرے لئے

دیکھ لوں میں اپنی خورشید و ثریا کا بیاہ
زندگی دے اے خدائے بحر و بر میرے لئے

اور اگر ایسا نہ ہو تو تم کو میری ہی قسم
قرض کر دینا ادا یہ جلد تر میرے لئے

چاہنا اپنے جگر پاروں کو میرا جان کر
اب یہ میرے ہیں تمہارے تھے مگر میرے لئے

سب بتا دی ہیں تمہیں باتیں لکھوں اب اور کیا
ظاہراً اتنا ہے سر پہ سفر میرے لئے

جو خطا مجھ سے ہوئی ہو بخش دو للہ تم
جس طرح کرتے رہے ہو عمر بھر میرے لئے

میں تمہاری داسی تمہاری ہوں اور اس کے بعد بھی
تم ہی ہو گے خلدِ فردوسِ نظر میرے لئے

گر دعاؤں سے تمہاری مل گیا جنت میں گھر
شغل ہو جائیگا اک شام و سحر میرے لئے

نام دونگی اس کو گلکدۂ وفائے جاوداں"
موجب صد آرزو ہوگا وہ گھر میرے لئے

میرے پاس آئینگے بن بنکر گہر وہ اشکِ غم
جو بہائے گی تمہاری چشمِ تر میرے لئے

میں بنا جاؤنگی ان موتیوں کی جھالریں
اور سجے گا جھالروں سے خوب گھر میرے لئے

دل بہل جائیگا کچھ تھوڑا بہت اس شغل میں
یہ کڑی منزل بنے گی سہل تر میرے لئے

ہوگا اس گل خانے میں اس داغ سے روشن چراغ
کل جو ابھرے گا تمہارے قلب پر میرے لئے

ہوگی شمع گھر میں اس دردِ محبت کی چمک
جو تمہارے دل میں ہوگا عمر بھر میرے لئے

منتخب کر کے میں جنت سے کنیزیں لاؤنگی
کام ہوگا یہ بہت دلچسپ تر میرے لئے

زر بہ ہونگے بہرِ استقبال ان سب کے پر
صف بہ صف شانہ بشانہ سر بہ سر میرے لئے

بعد عمرِ خضر جب آکر ملو گے مجھ سے تم
اور جب جنت میں ہوگی یہ خبر میرے لئے

"تم کو گلکدۂ وفائے جاوداں میں لاؤنگی"
ساتھ میں حوروں کے نغمات مسرت گاؤنگی

محسن اعظم کی یاد میں

کہاں ڈھونڈیں تجھے اے فخرِ قوم اے راشد الخیری
تری رات سے اب تک اک تپک ہے دل کے چھالے میں
تری تحریر تھی آئینہ رودادِ مظلوماں
نمایاں دردِ قومی تھا ترے ہر ہر مقالے میں
تری سعیٔ عمل نے کی وہ شمع رہبری روشن
نظر آتا ہے سیدھا راستہ جس کے اجالے میں
پڑھایا یہ سبق ان بیکسوں کو تیری شفقت نے
گذر جاتی تھی جن کی زندگی فریاد و نالے میں
کہ دنیا کو کریں روشن مکاں کی قید میں رہ کر
ضیا بخشِ جہاں ہے ماہ جیسے رہ کے ہالے میں
حمایت نے تری کی برمحل ایسی مسیحائی
سنبھالے جس طرح بیمار کو کوئی سنبھالے میں
دلائے وہ حقوقِ زندگانی غم نصیبوں کو
پڑے تھے ایک مدت سے جو اب تک ٹالے بالے میں
بلندی پر بٹھایا ان کو لاکر قعرِ پستی سے
کئے پیدا معانی "ہر زوالے راکمالے" میں
ابھی اس میں بھی کچھ سطحی نگاہوں کے لئے لیکن
جو تیرے دل میں تھا دیکھا کہاں ہے داغ لالے میں

حیات جاوداں ہے تیری تصنیفات کو حاصل
کتابت زندگی کی روح ہے تیرے رسالے میں
یہ کہہ کہہ کر زمانہ تاقیامت تجھ کو روئے گا
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں"

سالِ نَو کا ترانہ

مبارک، مبارک، کہ بدلا زمانہ مسرّت کا پھر ہاتھ آیا خزانہ
چمن پر کھنچا ابر کا شامیانہ کلی کی چٹک کا بجا شادیانہ
اُٹھو گائیں پھر سالِ نَو کا ترانہ

کہاں اب ہیں باقی فضائیں وہ گدلی ترشح سے خاکِ چمن نے مدد لی
جوانانِ گلشن نے پوشاک بدلی نیا ہے ہر اک پھول بوٹے کا بانا
اُٹھو اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

پھر آئی رُخِ لالہ و گُل پہ لالی ہوئی دور سبزے کی پھر پائمالی
عروسِ چمن نے نئی دھج نکالی کیا پھر سے زلفوں میں سنبل نے شانا
اُٹھو اگائیں پھر سالِ نَو کا ترانہ

نیا جام ہر ایک گل لے کے آیا نیا رنگ اطرافِ گلشن پہ چھایا
نیا چشمِ نرگس نے انداز پایا نیا بلبلِ خوشنوا کا ہے گانا
اُٹھو اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

کہاں وہ تماشائے دورِ کہن ہے کلی نو شگفتہ نئی اک دلہن ہے

سجی پھر نئے طور پر انجمن ہے　　غرض ہر طرف ہے نیا کارخانا
اُٹھو! اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

رخِ شاہدِ غنچہ، شبنم نے دھویا　　نئی نزہتوں کے لئے بیج بویا
نئے عطر میں گل کا دامن ڈبویا　　نئی نکہتوں سے ہے گلشن بسانا
اُٹھو! اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

یہاں اب تو کچھ رنگ ہی اور ہوگا　　نرالا ہر اک بات کا طور ہوگا
نیا سال آیا، نیا دور ہوگا　　لُٹے گا مضامینِ نو کا خزانا
اُٹھو! اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

نئی شمع ہوگی، نئی نور باری　　نیا علم ہوگا، نئی دستکاری
نیا چشمۂ فیض پھر ہوگا جاری　　ہیں "عصمت" کو پھر کچھ نئے گل کھلانا
اُٹھو! اگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

زہرہ - حیدرآبادی

محترمہ زہرہ بیگم زہرہ - ڈاکٹر عبدالرب صاحب حیدرآبادی کی دختر ہیں، آپ ادبی حلقوں میں "بنت عبدالرب" کے نام سے معروف ہیں اور اس نام سے آپ کے مضامین اور کلام زنانہ رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں - آپ نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی - خانگی تعلیم اور مطالعہ کے باعث آپ نے یہ شوق پیدا کیا ہے، آپ نے حفیظ جالندھری کے "شاہنامہ اسلام" کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں - کلام میں ابھی ترقی کی گنجائش و

ضرورت ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

مشرکوں نے جو کیں گستاخیاں آنحضرتؐ سے
آپ نے ترکِ وطن کا کیا قصد اُکتا کر
وقت دوپہر کا، شدت کی تپش گرم ہوا
آپ اُس دھوپ میں تنہا گئے صدیقؓ کے گھر
اور فرمایا کہ اے یارِ وفادار سنو
تم بھی اب چھوڑنے کے واسطے تیار ہو گھر
اس قدر ان کو ہوئی اپنی معیّت کی خوشی
آنکھوں میں آ گئے صدیقؓ کے آنسو بھر کر
اور ادب سے یہ کیا عرض کہ ماں باپ فدا
خدمتِ پاک میں دو اونٹنیاں ہیں حاضر

زہرہ

محترمہ کے۔ رابعہ۔ خاتون المتخلص بہ زہرہؔ بلیا کی رہنے والی ہیں، آپ خاتونِ مشرق کی مخصوص شاعرہ ہیں۔ زندگی کے دلدوز واقعات آپ کی نظموں کے مرغوب عنوانات ہیں۔ نظموں میں احسانؔ دانش کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگر آپ اس قسم کی نظمیں لکھتی رہیں اور اس رنگ میں کچھ اور پختگی پیدا کر لی تو شاعرات کی دنیا میں آپ کا کلام ایک نہایت خوشگوار اضافہ ہوگا، اب بھی آپ کا کلام نہایت امید افزا اور قابلِ ستائش ہے۔

تصویرِ حیات کے دو رُخ[1]

(ہمشیرہ کی قبل از وقت موت سے متاثر ہو کر)

موت کا پیغام ہے حسنِ شبابِ زندگی
کس قدر عبرت بداماں ہے ربابِ زندگی

[1] موصوفہ کی یہ نظم خاتونِ مشرق دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ذیل کے نوٹ کے

خاک جب ہو جائے گا ورق کتابِ زندگی
کس لئے ناداں! ہے پھر مستِ شرابِ زندگی

دے رہا ہے موت کا پیغام سازِ زندگی
آ! کہ ذرّے ذرّے میں دکھلاؤں رازِ زندگی

زندگی جو انتسابِ زیست کی تفسیر تھی
زندگی جو شوخیٔ قسمت کی اک تحریر تھی

زندگی جو آئینہ دارِ محبت تھی کبھی
درحقیقت آئینہ دارِ حقیقت تھی کبھی

زندگی جو کھیلتی تھی حسن کے آغوش میں
خواب کے عالم میں یعنی عالمِ بے ہوش میں

زندگی مخصوصیت جس کی فنا کی دید تھی
اک مجازی دلکشی تھی اور طلسمِ عید تھی

زندگی جس کے تکلّم میں نہاں صد آبشار
زندگی جس کا تبسم باغِ رضواں کی بہار

{پچھلے صفحے سے} ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"شام کی تاریکی فضائے عالمِ ناسوت پر غالب آ رہی تھی۔ اُفقِ آسمان پر گلابی بدلیوں کی انجمن جگمگا اٹھی تھی۔ قدرت کے نظارے کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنے بام پر گئی۔ سامنے چند جا بجا ٹوٹی ہوئی قبریں نظر پڑیں جو عالمِ اسباب کی نیرنگیوں کو دیکھ کر ہنس رہی تھی' نظارۂ شام نے انھیں اور جاذبِ نگاہ بنا دیا تھا۔ یہاں واں کیسے وہ لال زیرِ خاک پڑے تھے جن کی پرورش کسی زمانہ میں خونِ جگر سے ہوئی تھی۔ ہُو کا عالم تھا، بیکسی ٹپکتی تھی، حسرت برستی تھی' ہمدم تھا نہ ہمراز' خونِ دل سے بہنے لگا جب مجھے دھیان آیا کہ اس ماتم سرا میں میری مشفق ہمشیرہ بھی مدفون ہے۔ میں اپنے تاثرات کو بصورتِ نظم پیش کرتی ہوں۔ یقیناً یہ ان بہنوں کے لئے باعثِ تسلی ہوگا اور وہ اسی سے کافی تسکین اندوز ہوں گی جو ٹوٹی ہوئی قبروں کی عبرت سامانیوں کو دیکھ چکی ہیں۔"

"زہرہ"

زندگی جلوت میں جو خاموش رہتی تھی کبھی　　زندگی خلوت میں جو تانیں اُڑاتی تھی کبھی
زندگی جو کھیلتی تھی ہر نئے انداز سے　　لوریوں کے راگ سے اُلفت کی ہر آواز سے
"زندگی" وہ چین سے آرام کرتی ہے وہاں　　ہُو کا عالم اور بھیانک رات آتی ہے جہاں

دیکھتی تھی دہر کی ظلمت میں تنویرِ حیات
ہائے مگر نظروں میں ہے تیرہ آج تصویرِ حیات

پیکرِ عصمت

(شادی کے بعد رخصت کے وقت غربت کے عالم میں ایک بوڑھے باپ کی
اپنی بیٹی کو نصیحت)

رات کا پچھلا پہر ہے جھک چلا ہے ماہتاب
جھلملاتے ہیں ستارے خلق ہے مصروفِ خواب
ہو گیا کافور اب گردوں کے چہرہ کا نکھار
ہانپتی روندی ہوئی سڑکوں کا سویا ہے وقار
سنسناتی باغ میں موجِ نسیم آنے کو ہے
بلبلِ درماندہ کو موجِ شمیم آنے کو ہے
ہے روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی نزدیک و دور
گا رہے ہیں نور کے سایہ میں خوش الحان طیور
ہو گئی ہے چاندنی شاخوں سے چھن کر پاش پاش
اور ہے پھولوں پہ شبنم کا غضب کا ارتعاش

شہر کے شور و شغب سے اور آزادی سے دُور
ایک میداں کے کنارے اور آبادی سے دُور
ہے پڑا ایک جھونپڑا موسم کا منہ دیکھے ہوئے
تلخیٔ دوراں کی پیہم جھڑکیاں کھائے ہوئے
عیش کے پیہم تخیّل کا کبھی پالا ہوا
مفلسی کے سرد ہاتھوں کا کبھی مارا ہوا
جھلملاتا اک دِیا کونے میں ہے جلتا ہوا
قصّۂ رنج و الم کو ہائے دُھراتا ہوا
ایک بیٹی، باپ و ماں ہیں غرقِ سیلابِ محن
ہو گئی ہے درہم و برہم خوشی کی انجمن
صبح دم بیٹی کی رخصت کا تخیّل بار بار
بے نوائی سے وہ اپنی اور بھی ہیں بے قرار
ایک چادر بھی نہیں بیٹی کو دینے کے لئے
دولتِ معصوم عصمت کو چھپانے کے لئے
جھک گئی ہے ہائے غربت پر تمنّا کی جبیں
ہو کے حسرت مل رہی ہے سسکیاں خلوت نشیں
اک طرف سامان کچھ ٹوٹے ہوئے پھوٹے ہوئے
اور غربت کی مدد سے موت کے لیٹے ہوئے
اک طرف کونے میں جالے مکڑیوں کے جا بجا

اور بوڑھا باپ بھی ہے ایک طرف لیٹا ہوا
اک طرف اک بوریہ پر حسن کی تصویر ہے
راحتِ جانِ پدر ہے، غم کی اک تفسیر ہے
چاند چہرے سے عیاں ہے چال سے مستی عیاں
ہیں مگر رنج و الم کے داغ سینے میں نہاں
آنکھ شرمیلی، نظر نیچی قدا جیں پر حجاب
لے رہا ہے کروٹیں سویا ہوا دل میں شباب[1]
غم کے ہاتھوں عیش کی بازی ابھی ہاری نہیں
پھر بھی کوئی چیز دنیا کی اسے پیاری نہیں
ماں ہے اس کے سامنے مدہوش سی لیٹی ہوئی
اشکِ غم سے پیکرِ غربت کا منھ دھوتی ہوئی
ایک بیٹی کے بچھڑنے سے ہے ویراں ہر نظر
دل دھڑکتا، تھرتھراتے ہاتھ، پگھلا سا جگر
فرطِ غم سے ضبطِ غم کا باپ کو یارا نہ تھا
ایک بیٹی کے سوا کوئی اسے پیارا نہ تھا
دل میں پیدا آخری دیدار کا ارماں ہوا
ہانپتا کرتا ہوا، بیٹی سے آکر یوں کہا

[1] جوش ملیح آبادی ؎ لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جیسے طوفانی سمندر میں ضیائے ماہتاب

اے مری نورِ نظر، تو اس قدر روتی ہے کیوں
طائرِ روحِ حزیں کو اور تڑپاتی ہے کیوں
جانتا ہوں دل تشبیں الفت سے تو مجبور ہے
دل کی راحت کے تڑپنے سے بہت رنجور ہے
مانتا ہوں اے سکونِ قلب کہ ارماں ہے تو
دردِ دل کا ایک ہنستی کھیلتی درماں ہے تو
ہے مجھے تسلیم بیٹی تو مرا آرام ہے
دستِ قدرت کا مقدر بے بہا انعام ہے
فطرتِ مجبور نے لوٹا تیرے آرام کو
زندگی آرام ہے پہچان لے آرام کو
کیا کروں قدرت سے میں لاچار ہوں مجبور ہوں
اس ضعیفی میں بھلا میں تجھ سے کب رنجور ہوں
فطرتِ مجبور پر قابو مرا چلتا نہیں
ہائے بیٹی آج اس دل کا کنول کھلتا نہیں
گوشِ دل سے چند باتیں سن مری بیٹی ہے تو
جانتا ہوں میرے چھٹنے سے بہت روتی ہے تو
بارگاہِ آفرینش میں تجھے عزت ملی
عظمت و عفت کی تجھ کو بے بہا دولت ملی
تیری ہی فطرت سے قائم ہے سرورِ زندگی

تو جو چاہے تو بڑھا سکتی ہے نورِ زندگی
نبض چلتی ہے محبت کی تری آواز سے
ہے بہت مانوس انساں تیری لے کے ساز سے
راحتِ جانِ پدر! پروردۂ رحمت ہے تو
پیکرِ اُلفت ہے تو سرمایۂ راحت ہے تو
عالمِ امکاں میں سچ ہے باعثِ عزت ہے تو
مختصر سی بات ہے کہ پیکرِ عصمت ہے تو
اپنے شوہر کی اطاعت سے نہ گھبرانا کبھی
دیکھنا پیہم مصیبت سے نہ دب جانا کبھی
ساتھ رکھنا شرم و استقلال کو ایمان کو
عمر بھر راہِ وفا میں، ساس کے فرمان کو
فکر کیا کچھ بھی نہیں تجھ کو چھپانے کے لئے
چادرِ عصمت ہے گر عزت بچانے کے لئے
زیورِ صبر و رضا خود باعثِ تزئین ہے
انکساری، بردباری باعثِ تمکین ہے
دیکھنا دھبہ نہ آنے پائے تیرے نام پر
دیکھنا ہنسنے نہ پائے کوئی تیرے کام پر
جس گھڑی مرنا مرا رہ رہ تجھے تڑپائے گا
رشتۂ الفت مرا جب یاد تجھ کو آئے گا

میری باتوں کو نظر کے سامنے رکھ کر ذرا
غور کرنا کس قدر تونے مرا کہنا کیا
گر ہے واقف تو مری ہر بات کے انجام سے
پھر سمجھنا میں بھی زیرِ خاک ہوں آرام سے
چھوڑ دے اے میری بیٹی میرا دامن چھوڑ دے
چار دن کی دل نشیں الفت کا رشتہ توڑ دے
میری باتوں پر عمل کرنا تو اے بیٹی مدام
اُن سے حل ہو جائیں گے اُلجھے ہوئے سب تیرے کام
جھلملا کر پھر نظر آئے گا غربت کا چراغ
اور پائے گا جلا پھر تیرا نسوانی دماغ
پھر تجھے مل جائے گا بیٹی سکونِ زندگی
دوڑ جائے گا تیری نبضوں میں خونِ زندگی
پھر وہ دن آئے کہ جس سے رنج تیرا دور ہو
تیری خدمت سے مرا دل شاد ہو مسرور ہو

زیب عثمانیہ ۔ لدھیانوی

اُردو کی اس محترم اور گرامی قدر شاعرہ کا نام تاجور اور تخلص زیب ہے، عثمانیہ نسبت خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں، آپ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لدھیانہ کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں

آپ کے عم محترم خان غلام محمد خاں صاحب یکتا پنشنر پولیس لاولد تھے بچپن ہی میں زیب کی فراست اور ہوش مندی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ چنانچہ آپ کے عم بزرگوار نے آپ کو عالم شیرخوارگی ہی سے اپنا متبنّٰی کر لیا اور اُن ہی کی آغوشِ محبت میں زیب کی تربیت ہوئی۔ اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق آپ کی تعلیم بھی گھر پر ہوئی، اور جلد ہی آپ نے اُردو اور فارسی کی تعلیم مکمل طور پر گھر پر حاصل کر لی۔ جب بچپن کی حدود سے گزر کر آپ نے جوانی میں قدم رکھا تو آپ کے چچا نے آپ کی شادی ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء میں آپ کے پھوپھی زاد بھائی سلطان بہاء الدین صاحب سے کر دی جو آج کل محکمہ انہار میں ہیڈ ڈرافس مین کی خدمات انجام دے رہے ہیں شادی کے تقریباً ۹ سال بعد ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو آپ کے فرزند تولّد ہوا جس کا نام سلطان صلاح الدین رکھا گیا۔

آپ کے عم محترم ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ چنانچہ شروع ہی سے محترمہ کے ذاتی جوہر کو تربیت اور ترقی کے لئے ایک ہم آہنگ اور خوشگوار ماحول مل گیا تھا۔ ابتدا میں آپ خاموشی کے ساتھ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ اور رفتہ رفتہ مشقِ سخن نے خیالات میں بلندی اور کلام میں پختگی پیدا کر دی، یہ وہ وقت تھا کہ دنیائے شعر و ادب پر اقبالؒ کی ہستی چھا چکی تھی۔ اس "دانائے راز" کے رازدارانہ نغمے فضائے دہر میں گونج رہے تھے۔ اس کی قومی

اور ملّی نظمیں ہر مسلمان کے دل میں اپنا گھر کر چکی تھیں۔ اس کے پیامِ بیداری، تلقینِ عمل اور نعرۂ خودی کو سن سن کر قومیں اپنے صدیوں کے سکوت پرور خواب سے آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہو رہی تھیں۔ اس کی ژرف نگاہی نے لوگوں کو زندگی کے گہرے حقائق کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اس کا کلام ہر دل میں گھر کر چکا تھا۔ زیب عثمانیہ فطرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے حساس قلب نے نہ صرف اپنے ماحول کے اس اثر کو قبول کیا بلکہ اپنے اندر جذب کر لیا۔ چنانچہ وہ پہلا نغمہ جس کے ذریعہ سے آپ ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ ایک شاعرہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں، شروع سے آخر تک اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نظم کا عنوان "مقصدِ حیات" ہے جو محترمہ نے دسمبر ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ لاہور میں پڑھی تھی اور جس پر انجمنِ اُردو پنجاب کی طرف سے آپ کو ایک طلائی تمغہ انعام میں ملا تھا وہ نظم یہ ہے:

مقصدِ حیات

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ
شاہدِ دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا[1] سمجھ
امن کی آرزو نہ کر امن کا مدعا ہے موت
ہر نفسِ حیات کو درد میں مبتلا سمجھ

---

[1] علامہ اقبالؒ:- از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفےٰ ست :: مرد را روزِ بلا روزِ صفا ست
(جاوید نامہ)

شاہراہِ حیات میں رہبر و راہ زن نہ بن

اپنے سفر کا مدّعا ان سے کہیں سوا سمجھ

منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند

مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ[1]

جوہرِ درد ہے اگر گوہرِ اشک میں ترے

دامنِ کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ

تیرے صفاتِ قلب کا دہر میں امتحان ہے[2]

خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ

زیبِ حریمِ قلب کی خاک میں جب جمود ہے

فتنہ کوئی اٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ

یہ نغمہ کس قدر پُروقار اور پاکیزہ ہے اور شاعرات کی عام روش سے کس قدر مختلف! اس نظم پر انجمنِ اردوئے پنجاب کا طلائی عطیہ دنیائے ادب کی طرف سے آپ کے شاعرانہ کمال کا پہلا اعتراف تھا۔ اس کے

---

[1] علامہ اقبالؒ

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

(بالِ جبریل)

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

(بانگِ درا)

[2] علامہ اقبالؒ　اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(بانگِ درا)

بعد انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کی گولڈن جُبلی کے موقع پر آپ کے نعتیہ کلام پر آپ کو سنہری تمغہ عطا کیا گیا اس کے بعد سے آپ کے کلام کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی اور موقر ادبی جرائد و رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہونے لگا۔ اور آج آپ کا شمار ادبا و شعراء کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "متاعِ حرم" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو کر ملک کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔

آپ کا ذہنی و شاعرانہ پسِ منظر اسلامی ہے، آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ، پردہ نشیں، سادہ مزاج کم گو اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ دورِ حاضرہ کے دقیق ملکی، ملّی اور سیاسی مسائل سے آپ کو گہری دلچسپی ہے اور آپ کا اکثر وقت غور و خوض اور فکر و تدبّر میں کٹتا ہے۔

یوں تو آج کل ہر شاعر و سخن گو علامہ اقبالؒ کے رنگ میں کہنا دلیلِ عظمت سمجھنے لگا ہے لیکن متبعین اقبالؒ کے سلسلہ میں پنجاب کے جن لوگوں کے نام لئے جاتے ہیں ان میں امینِ حزیں، خان صابر خلیلی اور میر ولی وارثی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لیکن ابھی ان ناموں میں ایک بہت ضروری اضافہ باقی ہے اور وہ اضافہ محترمہ زیب عثمانیہ کا نام ہے، میرا خیال ہے کہ امینِ حزیں کے علاوہ کسی نے آج تک اقبالؒ کے فلسفہ و پیغام اور اس کی روح شاعری کو اتنی صحیح حد تک پیش نہیں کیا جتنا کہ محترمہ زیب نے محترمہ نے ان عنوانات میں سے اکثر پر قلم اٹھایا ہے جو علامہ مرحوم کے مرغوب و مخصوص موضوعات

رہے ہیں اور اس اتباع میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے جو اس دور کے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے' یہ صحیح ہے کہ محترمہ کے یہاں وہ فلک پیما تخیل' وہ آفاقیت' وہ ہمہ گیری و تبحر' وہ فلسفیانہ ژرف نگاہی' وہ عمق' وہ کمالِ شاعری' وہ زندگی کو اپنے گوشے میں سمیٹ لینے والی وسعتیں نہیں ہیں جو اقبالؒ کے یہاں موجود ہیں مگر یوں بھی کسی کے یہاں ان کی "تلاش و جستجو عبث و بے سود ہے اقبالؒ ہزاروں برس میں ایک ہوا ہے اور ہزاروں برس تک ایک رہے گا' زمانہ برسوں نہیں صدیوں میں بھی صحیح معنوں میں اقبالؒ کا حریف مشکل سے پیدا کر سکے گا۔ مگر موجودہ دور میں جن لوگوں نے اقبالؒ کا اتباع کیا ہے ان کی دو کامیاب مثالیں ہیں حریں اور زیب ہیں یہ امر کس قدر باعث مسرت ہے کہ خواتین کے اس ہجوم میں جہاں ہر جگہ "طاؤس و رباب" ہی جنت نگاہ اور "فردوس گوش" ہے' ایک شاعرہ علامہ مرحوم کی پُر وقار آواز میں ان کو زندگی اور زندگی کے حقائق کی طرف للکارتی نظر آتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے فارسی کے مشہور مصرعہ میں کس قدر صحیح تصرف کیا تھا۔

"زنے از پردہ" بروں آید و کارے بکند'

انتخاب کلام ـــ اقبال کا رنگ :-

اقوام کی جاگیریں بے دردی سفاکی	ہمدردی و دلداری انسان کی جاگیریں
اقوام نے دیکھا ہے جو خوابِ حصولِ زر	بربادی و ناکامی اس خواب کی تعبیریں

اس دین کے معنی ہیں اب خارِ خذف سے کم
پھر وہ مہ و انجم تھیں جس دین کی تفسیریں
شمشیر کو دنیا میں ہے نصرتِ حق سے کام
مغلوب جو حق ہے پھر بیکار ہیں شمشیریں
توحید پرستوں کی اک ضرب یدِ اللّٰہی
اوہام پرستوں کی صد آہنی تدبیریں

احساس غمِ انساں لے زیب ہے دیں جس کا
نازاں نہ ہوں کیوں ان پر خود قوم کی تقدیریں

(متاعِ حرم ص۹۹)

وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام
جس کے فوارہیں محروم آرام
تو سادہ رہروؔ ہیں سادہ رہرو
فتنوں سے بھرا ہے منزل کا ہر گام
گر تیرا نالہ محتاجِ نے ہے
دل ہی میں اپنے اس کو ابھی تھام[2]
اپنی خودی کو پوج اے برہمن
کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام[3]
اس کو زمانہ رکھتا ہے قائم
جس قوم کو ہے احساسِ انجام

---

[1] مولانا حالی ؎

جو دیں کہ بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں اب آکے غریب الغربا ہے

[2] علامہ اقبالؒ ؎ نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

(بانگ درا)

[3] علامہ اقبالؒ ؎

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

(ارمغان حجاز ص۲۵۱)

ہے عہدِ عسرت، عہدِ بغاوت اور عیش و عشرت، عسرت کا پیغام
جس میں عمل کی طاقت نہیں زیبؔ
وقت سے خالی ہیں اس کے احکام

(متاعِ حرم صـ۹۴)

فلسفۂ جنگاہ

قوموں کی تقدیر وہ مردِ جنگاہ ایمان جس کا الحکم لِللہ
دنیا ہے خود اک جنگِ عناصر باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ
ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملت شمشیر جس کی الملک لِللہ
گر مردِ کیبت ہو واقفِ راز اک سحرِ طاقت ہے شوکت شاہ
درسِ سیاست دے کون اے زیبؔ
شیخ و برہمن ہیں مردِ درگاہ

تو صاحبِ تدبیر نہیں صاحبِ تدبیر تدبیر پہ موقوف ہے ہر قوم کی تقدیر
مغرب کی نظر کیف امارت ہے پُر از خواب مشرق کی نگاہوں میں عیاں قوتِ تعبیر
سائنس ہیں جہاں شام و سحر نفس خرد ہو انسانیت اس ملک میں ہے بیکس و دلگیر
بولا کہ خودی اور خدائی میں تفاوت! یزداں سے جو پوچھی گئی اوہام کی تفسیر[۲]

---

[۱] علامہ اقبالؒ ع مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات (بالِ جبریل صـ۱۴۵)
[۲] علامہ اقبالؒ ؎ خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ (بالِ جبریل صـ۶۹)

اے زیبؔ پلٹ آئی ہیں اس راہ سے قومیں
ناکام رہی غرب کی یہ کوششِ تزویر

(متاعِ حرم ص۶۵)

غنچے کی جیبِ رنگیں نقدِ خودی سے خالی
ضعفِ خودی کی شاہد سبزہ کی پائمالی[1]
تاریخ امتوں کی اس بات پر ہے شاہد
ہر کم مذاقِ ملت ہے جلد مٹنے والی
قوموں کی ماندگی کا باعث رہی ہے اکثر
تیری تنک مزاجی، میری تنک خیالی
کیا چیز تھی بھلا وہ ہر دورِ معصیت میں
جس نے جہاں میں قوموں کی آبرو بچالی
ٹوٹے ہوئے دلوں سے اظہارِ دردمندی
دنیا کی نعمتوں میں احساس لااُبالی
اے زیبؔ مشرقی ہوں قومیں کہ مغربی ہوں
ہے جن کا عزم عالی، ان کے نصیب عالی

(متاعِ حرم ص۹۳)

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ ہے اشکِ سحرگاہی تقویمِ خودی مشکل
یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو (ضربِ کلیم ص۱۲۶)

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری[1]

مری کوتاہ افکاری سے بدلے وقت مرے نغمے
تری کوتاہ کاری سے تری منزل میں دشواری

ابھی تہذیب وہ محروم ہے ایماں کی دولت سے
کسی تہذیب میں گر فقر کے معنی ہیں ناداری

نہ پاس عہد تجھکو ہے نہ پاس عہد مجھکو ہے
ترا شیوہ گلہ داری مرا شیوہ گلہ داری

زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں
بچائے گی تجھے کیا کفر کی آہنی دیواری

مجھے اے زینب ہر روز خون کے آنسو رلاتی ہے
مری ملت کی کم کوشی، مری ملت کی ناداری

(متاع حرم ص۹۳)

عورت

اے کہ تو بھی کاروانِ دہر کی ہمدوش ہے — اے کہ جس کو خلد کہتے ہیں تری آغوش ہے
گو نہیں حاصل تجھے تابِ توانِ مردانہ وار — تیری نازک انگلیوں میں ہے عنانِ روزگار

---

[1] علامہ اقبال رح
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں (ضرب کلیم ص۵۷)

جاگے گی نہ ہرگز کبھی اس قوم کی تقدیر
جس قوم کی عورت ہی نہیں صاحبِ تدبیر
عورت میں ہو مفقود اگر جراتِ اخلاق
قوموں کی ہے یہ خامیٔ اخلاق کی تعبیر

محروم ہے وہ قبضۂ شمشیر سے اے زیب
جس قوم کی عورت میں نہ تھے جوہرِ شمشیر

(متاعِ حرم صـ۴۲)

خاتونِ مسلم

پھر مٹاتا ہے غلط جادۂ منزل تجھ کو
پھر بناتا ہے یہ بگڑی ہوئی محفل تجھ کو
تج دیئے تو نے ہوسناکی کے گرلات و منات
عین ممکن ہے کہ ہو شاطرِ تقدیر کو مات
نہ تری قوم میں ثروت ہے نہ عزت باقی
ننگِ گلشن ہے کسی نخل کی کم اوراقی
بادباں چاک ہوئے ڈوب چلی ہے کشتی
تو ہے کشتی میں نہ آب چلی ہے کشتی

(متاعِ حرم صـ۲۴)

سرمایہ و محنت

یہ کس کی خودی ضربتِ پا سے ہوئی بیدار
سرمایہ و افلاس میں ہیں جنگ کے آثار
مرعوبِ گل بختہ! تجھے کیا نہیں معلوم
خارہ خس و خاشاک بھی ہیں شاملِ دیوار

(متاعِ حرم صـ۸۰)

ہلال اور مزدور

افق پر ہلکے ہلکے جھلملانا
فلک پر چپکے چپکے مسکرانا

تیرے پیکر میں آب گل بھی ہونگے　　تیرے پہلو میں لاکھوں دل بھی ہونگے
وہاں سنجیدگی بھی ہشیاری بھی ہوگی　　سبکساری بھی خودداری بھی ہوگی
وہاں مجبور بھی ہوگا زمانہ　　وہاں مغرور بھی ہوگا زمانہ
مگر مزدور سے نفرت نہ ہوگی　　غریبی باعث ذلت نہ ہوگی

(متاع حرم ص۴۶)

مزدور خدا کے حضور میں

جب یہ بندہ اپنے رب کے پاس جاکر روئے گا
ساکنانِ عرشِ اعظم کو رُلاکر روئے گا
جب یہ اہل خانہ کے فاقے جتاکر روئے گا
جب یہ اپنی داستانِ غم سناکر روئے گا
اہل ثروت کی ستم رانی بتاکر روئے گا
نوعِ انساں کی زبوں حالی سناکر روئے گا
جب یہ اپنی نیم عریانی دکھاکر روئے گا
جب اسے مادر کلیجے سے لگاکر روئے گا
چیخ اٹھے گا آسماں کا ذرہ ذرہ انقلاب
انقلاب اے ساکنانِ بزمِ دنیا انقلاب

(متاع حرم ص۵۶)

سیاسیات

دیں سیاست سے جدا ہے نہ سیاست دیں سے　　یہ ترے فہم کم اندیش کی ہے ناداری

(متاع حرم ص۹)

قوم وہ جو اپنے وعدوں پر نہ مستحکم رہی
رہ نہیں سکتی کبھی اس کی ستّبا برقرار لہ
(متاعِ حرم ص۶۹)

بدلا ہے اس نے غرب میں جمہوریت کا رنگ
اک آخری خدنگ کلیسا کہیں جسے
(متاعِ حرم ص۷۷)

وہ دَور اپنی ستّبا میں سدا بدنام رہتا ہے
غریبوں کا ہو جس میں ہر قدم اقدام تعزیری
ریاکاری پہ مبنی ہے سراسر عہدِ طاقت میں
ق
اگر قوموں میں ہو موجود راہ و رسم تحریری
کہ عنصر ہائے ہستی ہیں غلام اقوام غاصب کے
ہو گیا اس سے زیادہ پیرکِ گردوں کی بے پیری
(متاعِ حرم ص۷۹)

جمہوریت خام و ملوکیت بدنام
دولت کی یہ ایجاد ہے دولت کی وہ ایجاد
(متاعِ حرم ص۸۵)

بلند نظری

مرا ہمسفر نہیں تو کہ جدا ہے تیری محفل
مجھے اہتمام طوفاں تجھے انتظار ساحل ؎۲
(متاعِ حرم ص۸۵)

لہ علامہ اقبال ؒ ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری (بانگ درا)

؎۲ اس "اہتمام طوفاں" کی درس فرمائی علامہ اقبال کی زبان سے ملاحظہ ہو
(بقیہ اگلے صفحہ پر)

میرا مذاق فکر و غم و سوز و درد و داغ | تیرا مذاق اک نئی آمد بہار کی

(متاعِ حرم ص۷۶)

حُبِّ قوم و وطن کا نظریہ

دلوں میں ڈال سکے قوم و وطن کا ذوق غلط

ہے مگر جذبِ مروّت کی درس فرمائی[1]

(متاعِ حرم ص۱۸)

سماج کے رسم و رواج پر تنقید

پروانہ

آہ اے پروانہ! تجھ کو کیا خبر کیا ہے سماج

کس طرح ہم پر مسلّط ہیں غلط رسم و رواج

آدمی ذکرِ محبت لب پہ لا سکتا نہیں

جان دے سکتا ہے دردِ دل بتا سکتا نہیں

وارثانِ دیر و کعبہ، وہ بزعمِ خود حکیم

جن کو تھا شایانِ شاں ادراک احساسِ عمیم

(پچھلے صفحہ سے)

مبارا بزم بر ساحل کہ آنجا | نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز | حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(پیامِ مشرق)

[1] علامہ اقبال رح نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ

خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات (بانگ درا)

احترامِ فطرتِ انساں سے ہے ان کو مفر
الحذر! خود وضع کردہ طرزِ دیں سے الحذر!
جب کبھی اقوام کے اخلاق کو پہنچا گزند
اس کا باعث تھے دلِ انساں پہ بیجا قید و بند
(متاعِ حرم ص۳۵)

ایک گشتۂ رسوم کیلئے

رسم و رواجِ دہر ہوں عقل و خرد پہ حکمراں
ہے یہ اہانتِ بشر ہم کو جتا گیا ہے تو
برہم و خشمگیں نہ ہو کیوں تیری موت پر سماج
اس کے مذاقِ جہل سے پردہ اٹھا گیا ہے تو
فرد کا انتخابِ زوج تابعِ رسم و رہ ہو جب
ہے وہ زمانہ بے وقار ہم کو جتا گیا ہے تو
(متاعِ حرم ص۴۱)

وطن کا مستقبل

بے ضرورت صنفِ نازک جس کی بے پردہ پھرے
یا غلط ہو جس کی رسمِ پردہ داری وہ وطن

سلہ علامہ اقبال رح

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را (ارمغانِ حجاز)

رہگذاروں میں ہوں محوِ عشق جس کے نوجواں
جو ہو ذوق و جذب خودداری سے عاری وہ وطن
معتمد ہوں جس کے اربابِ غرض و سطحِ ارض
مشتبہ ہو جس میں ذوقِ جاں نثاری وہ وطن

(متاعِ حرم ص۲۴)

فلسفۂ ایماں

ایمانِ محکم قوموں کا معیار　　ایمانِ ناقص ملکوں کا ادبار[1]
ایماں نبوت کا درسِ اوّل　　ایماں خدا کے آئیں کا شہ کار
ایماں ہمارا سازِ تمدن　　ایماں ہمارا سامانِ پیکار[2]
مومن کے تابع ساری خدائی[3]　　مومن خدا کا احکام بردار
ایمان محکم ہوتا ہے اس دم　　جب ضربِ غم سے ہو روح بیدار
ذکرِ خدا سے تازہ ہو احساس　　فکرِ خودی پر مائل ہوں افکار

(متاعِ حرم ص۱۷)

---

[1] علامہ اقبالؒ　ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی　(بانگِ درا)

[2] علامہ اقبالؒ　ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں　(بانگِ درا)

[3] علامہ اقبالؒ۔ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے مسلماں　(ضربِ کلیم)

متفرقات

تری ضربِ پا سے جب تک نہ رواں ہو کوئی چشمہ
نہیں در خورِ زمانہ ترا ذوقِ تشنہ کامی
(متاعِ حرم ص۶۷)

تجھے سمجھا دیا کس سوختہ سامانِ حکمت نے
کہ کوئی شعلہ تیری خاک کا حاصل نہیں ہوتا
(متاعِ حرم ص۶۷)

بھولیں نہ مجھ کو تیری وفائیں
مجھ سے زمانہ بھر نے جفا کی[1]
(متاعِ حرم ص۹۲)

اگر ہے سخت کوشی پر بنائے آشیاں میری
محافظ میرے طوفاں و بجلی پاسباں میری
ترا شیوہ تن آسانی مرا شیوہ تن آسانی
وہی مجبوریاں تیری وہی مجبوریاں میری
نزاکت برگِ گل کی سنگ آہن سے بدلتا ہے
نہیں ہو جیتا تنِ گلشن ہیں فضا میری
(متاعِ حرم ص۴۲)

جو گردشِ ایام سے گھبرائے نہ اے زینب
سمجھی ہے وہی قوم زمانہ کا اشارہ[2]
(متاعِ حرم ص۹۹)

اے بحر کچھ سمجھ کر قطرے کی کر اہانت
ہے رازدار تیری دنیائے بیکراں کا
(متاعِ حرم ص۸۹)

---

[1] عندلیب شادانی:- رات اک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے
دل بھر آیا جو تیری مہر و وفا یاد آئی

[2] علامہ اقبال رح:- زندگی از دہر و دہر از زندگی است :: لا تسبوا الدہر فرمانِ نبی است

رہِ حیات میں مڑ مڑ کے نقشِ پا کو نہ دیکھ　　مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر

(متاعِ حرم صـ۱۰۳)

حرم و دیر ہوئے ترکِ عمل سے رسوا　　دیکھئے اہلِ عقیدت اسے کیا کہتے ہیں

متاعِ حرم صـ۱۰۷

قطرے قطرے کو پھریں تیرے سبو کش لاچار
ہے یہ کس لئے غیرت کا مقام اے ساقی[۱]
مکرمت سے تری ہو جائیں نہ میکش بیدل
سنگدل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی

(متاعِ حرم صـ۱۱۰)

ترے صحرا و بیاباں تو ہیں آباد تمام　　مرا حسرت کدۂ قلب ہی آباد نہیں

(متاعِ حرم صـ۱۱۵)

اٹھا ہے محفلِ ہستی سے اعتماد و وفا　　کہو کسی سے کہ رسمِ جفا پہ ناز کرے
خدا بھی ہو تو کبھی کوششِ نیاز نہ کر　　اگر وہ تجھ سے کوئی احتیاط راز کرے

(متاعِ حرم صـ۱۱۷)

گھبرا کے سر و مہری دنیا سے رات دن　　رویا کئے ہیں زیبؔ کسی مہرباں کو ہم

(متاعِ حرم صـ۱۲۰)

---

[۱] علامہ اقبالؒ :- ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے :: بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم :: بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے　(بالِ جبریل)
ذمری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ :: ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
(بالِ جبریل)

گردشِ چشمِ دوست ہی گردشِ روزگار ہے

تو ہی سمجھ کے شکوۂ گردشِ روزگار کر

حجلۂ عجز سے نکل پردۂ بندگی اُٹھا

وقت کا اقتضا ہے زیبؔ خود کو اب آشکار کر

(متاعِ حرم ص۱۲۴)

اہلِ وفا کی قدر کر حاصلِ داستاں ہیں یہ

حسن بھی ایک داستاں عشق بھی ایک داستاں

(متاعِ حرم ص۱۲۵)

رحمت سے تیری ہم جو ہیں ہم کسی کو کیا

ٹھکرا دیے ہیں ہم نے دو عالم کسی کو کیا

ہوتی ہے کوئی کہنے کی بات اور کوئی نہیں

کہیے کسی سے کیوں سببِ غم کسی کو کیا

ہے پاسِ دوستی انھیں کیوں ہم انا لیں

محفل میں ان کا ہے کوئی محرم کسی کو کیا

(متاعِ حرم ص۱۲۹)

خرد کے مصرفِ اعلیٰ سے کتنے بے خبر نکلے

کہ بازارِ جہاں سے اہلِ مغرب خوار تر نکلے[1]

فلک کی طرفہ کاری ہے کہ آج اے زیبؔ دنیا میں

جو تھے صیاد وہ خود طائرِ بے بال و پر نکلے[2]　　(متاعِ حرم ص۱۳۰)

---

[1] علامہ اقبالؒ:- غبارِ رہگذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو؛ جبینیں خاک پر رکھتے تھے اکسیر گر نکلے

[2] علامہ اقبالؒ:- عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے

ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے　(بانگِ درا)

بہرِ ثبات کوششِ نام و مقام سے گزر — اصل دوام ہے یہی حدِ دوام سے گزر
زاہدِ کم نہاد نے رسم سمجھ لیا تو کیا — قصدِ قیام اور ہے رسمِ قیام سے گزر[1]
ہے ترا ذوق احتیاجِ اہلِ کرم کا پردہ دار — ایک ادائے رمز سے سرِ در و بام سے گزر
نشۂ مے سے کب ملا دردِ حیات کو سکوں — فطرتِ سہل گیر کی کوششِ خام سے گزر

(متاعِ حرم ص۱۳۳)

ذوقِ فنا میں ہے نہاں رازِ حیات با شرف — ہے وہ زمانہ باوقار جس کے عوام سر بکف[2]
ذوقِ طلب کو کر بلند دامِ عمل فلک پہ ڈال — مہر و مہ و نجوم ہیں بحرِ حیات کے صدف

متاعِ حرم ص۱۳۴

اے کہ مرا مقامِ عجز تیری نظر میں ہیچ تر — کس کو خبر کہ یہ بھی اک منزلِ کبر و ناز ہو

متاعِ حرم ص۱۳۶

بتلاتے ہیں جیسے قشقہ و محراب — بہت معروف ہیں شکلیں ریا کی

(متاعِ حرم ص۱۳۸)

مکتبِ ہستی میں اس درسِ قناعت سے حذر
جس سے قوموں کے عزائم میں ہو پیدا اختصار

---

[1] علامہ اقبالؒ:- ترا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر (بالِ جبریل)

[2] اس زمین میں علامہ اقبال کی وہ غزل ملاحظہ ہو جس کا مطلع یہ ہے ؎
میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف ÷ آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف (بالِ جبریل)

صیغمانِ حق سے کوئی جا کے پوچھے آج زیب
پیشِ باطل کتنا بے موقعہ ہے ان کا انکسار

(متاعِ حرم ص ۱۳۹)

ذیل کے شعر متاعِ حرم میں شامل نہیں ہیں۔

خواتین میں ذوقِ علم کی کمیابی

جہل کیا ہے؟ سعیٔ حاصل پر قناعت کا خیال
علم کیا ہے؟ زندگانی ہیں کمال اندر کمال

صد شبابِ خام ہوں اس پختہ پیری پر نثار
جس کا اندیشہ بیاں کرتے ہیں جوشِ نامدار[1]

علم کی توسیع سے خائف ہے ہر قومِ غلام
کیونکہ ہے محدود بزمِ دہر میں اس کا قیام

پروانہ

بزمِ ہستی میں حیات آفریں ہے یہ عمل
وہ سحر کی آگ میں جل کر جلا جاتا ہے تو

کس قدر وقفِ عبادت ہے ذرا سی زندگی
موت ہنگامِ طوافِ شمع میں پاتا ہے تو

شعلۂ شمع فروزاں سے نہیں اتنی تپش
گرمیٔ شوقِ شہادت ہے کہ گھبراتا ہے تو

کرمکِ بے مایہ را شمعِ فروزاں زندگیست
زیب مارا ایں دلِ بیتابِ سوزاں زندگیست

---

[1] خواتین کے تحصیلِ علم کے ضمن میں جوش ملیح آبادی کا ایک شعر ہے ؎
وقت سے پہلے بلا لیتے ہیں پیری کو علوم :: عمر سے آگے نکل جاتے ہیں چہرے بالعموم

زینت

زینت بیگم نام اور زینت تخلص ہے۔ ڈھاکہ کی شاعرہ ہیں طرزِ ادا رواں دواں اور صاف ہے۔ گو کلام میں ابھی پختگی نہیں۔ لیکن اگر برابر لکھتی رہیں تو خوب لکھنے لگیں گی۔

طلوعِ سحر

اُفق پر سپیدی سی چھانے لگی ۔ مؤذن کی آواز آنے لگی
ستارے بھی سب ماند اب پڑ گئے ۔ ضیائے قمر جھلملانے لگی
گجر دم کلیسا کی گھڑیال بھی ۔ گجر پانچ کے اب بجانے لگی
سڑک پر کی بتی جلی رات بھر ۔ پھٹی پو تو وہ ٹمٹمانے لگی
طلوعِ سحر کی نسیمِ سحر ۔ جگت میں بدھائی بجانے لگی
عروسِ سحر ہو کے آراستہ ۔ بہار اپنی ہم کو دکھانے لگی
نسیمِ سحر جو چلی جھوم کر ۔ کلی شاخ پر مسکرانے لگی
چمن کا چمن بن گیا لالہ زار ۔ سمن باغ میں کھلکھلانے لگی
صبا اپنی مستانہ رفتار سے ۔ چمن در چمن گل کھلانے لگی
فضائے چمن بن کے باغِ ارم ۔ شگفتہ دلوں کو لبھانے لگی
سحر خیز نازک مزاجوں کے دل ۔ نسیمِ سحر گدگدانے لگی
مکانوں میں دھندلی سی ایک روشنی ۔ دریچوں سے چھن چھن کے آنے لگی
گلوں کی پرستار بلبل غریب ۔ محبت کا نغمہ سنانے لگی
وفورِ ترنم میں سرشار ہو ۔ درختوں پہ شاما بھی گانے لگی

برہمن بھجن پاٹ کرنے لگا صدا اس کی بھگتوں کو بھانے لگی
پُجارن بھی پھولوں کی ڈالی لئے لپکتا نہ مندر کو جانے لگی
سجاکر عقیدت سے پھولوں کی بھینٹ وہ دیوی کو اپنی چڑھانے لگی
دبستاں کی لڑکی بھی کر کے وضو معلّم کو قرآں سنانے لگی
سُریلی صداؤں سے زینت بھی اب
عزیزوں کو اپنے جگانے لگی

(س)

ساجدہ شاہجہانپوری

ساجدہ بیگم نام ہے اور ساجدہ تخلّص۔ آپ منشی فاضل ہیں بیگم دانش شاہجہانپوری کی صاحبزادی ہیں اور "بنتِ دانش" کے نام سے مشہور ہیں۔ عصمت کی مخصوص شاعرات سے ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ کلام میں سنجیدگی متانت اور درد و اثر موجود ہے۔

روحِ علامہ راشد الخیری سے

نہ دستِ عقل میں دامانِ عفت و ناموس
زنانِ قوم کی حالت ہے قابلِ افسوس
وہ بڑھ رہی ہیں معاصی کی سمت روزانہ
ہیں اس قدر مددِ کردگار سے مایوس
نماز و روزہ تمسخر، نہ کوۃ و حج میں مذاق

اصولِ مذہبِ اسلام طرزِ دقیانوس

ہراس شوہرو فرماں پذیریٔ شوہر
نگاہِ شوق میں ہے کارِ ماکیانِ خروس

فضا میں نازو کرشمے ہیں دیدنی تو یہ
رہا قفس سے ہوا آج طائرِ محبوس

ضیائے علم بدن سے نہ بڑھ کیں آگے
وہ کیا سنیں گی صدائے ضمیرِ نامحسوس

گو نامِ علم و ترقّی پہ جان دیتے ہیں
سمجھ رہی ہوں مگر میں ترقیٔ معکوس

یہ وقت ہے کہ کوئی دردِ قوم کا مارا
عروجِ زن کو کرے راہِ عقل سے مانوس

ہے یاد آپ کی ایسے میں راشد الخیری
مثالِ خضر یہ ناآشنائے راہِ نفوس

نظیر آپ کا اب تک ہے کیا یس پردہ
زنانِ قوم بجاتی ہیں کفر کا ناقوس

علامہ راشد الخیری مرحوم (شاعرہ)

اے زنِ مسلم نہ ہونا مادیت کا شکار
روح کا دامن نہ چھوٹے تجھ سے تاحدِ مزار

میری تصنیفات نے بخشی ہے تجھکو اک نظر
ہو سکے تو طبقۂ نسواں کی انجمن نور کر

گر بہ رفتی نہ ثابت ہو مری تفسیرِ غم
اس لئے درکار ہے مجھ کو ترانۂ قلم

میں نے اپنے وقت میں سر نیز اونچا کر دیا
قوم کو شرمندۂ حرکات بیجا کر دیا

میں نے اس انداز سے پھونکی رگِ ملت میں لی
تیرے حق کے سامنے سر کو جھکاتے ہی بنی

یہ میرا سوزِ دروں ہو کاش میرا نقش پا
مثل میرے اشکباری میں تجھے آئے مزا

"اے تسلی بخش جاں وائے سکوں افزائے دل
گو ہوائے مادیت چل رہی ہے متصل

گو ہوئی مفقود یکسر روح میں ڈوبی نظر
طبقۂ نسواں کے دامن میں ہے علم بے اثر

پھر بھی ہم میں جلوہ گر ہیں چند اہلِ قلم
جن پہ ظاہر نقشِ ہیئت کی دھمک کا زیر و بم

ڈاکٹر اختر۔ جمیلہ۔ نذرِ سجاد۔ آمنا
رابعہ پنہاں۔ صفیہ۔ نجمہ و حورہ و حیا

آپ کا پودا بڑھا اور بڑھ کے بار آور ہوا
شاہدِ بے مثل ہیں اوراق "عصمت" برملا

سر جو اونچا ہو چکا نیچا نہ ہو سکتا نہیں
نقش ہائے محسنِ اعظم کو کھو سکتا نہیں

آپ کی تحریر ہے جبتک فروغِ چشمِ دل
کر نہیں سکتی ہمیں بادِ مخالف مضمحل"

قطعات

(۱)

زندگی ٹیں کبھی بھی رائگاں جاتی نہیں
آہ کا ہوتا اثر ہے قلب پر وہ ہو بہو

جس طرح آذر صفت اک بُت تراش ہوشیار
کاٹ کر پتھر بناتا ہے بتانِ خوبرُو

(۲)

ایک طوفانی ہوا ہے نغمۂ راہ فنا
گوشِ دل میں اس طرح تیزی سے بھرتو ہیں شرر
آم کے باغوں میں آندھی کے اثر سے جس طرح
اپنا دامن گاؤں کے لڑکے کریں دم بھر میں پُر

(۳)

رات میں مہتاب انجم دن میں خورشیدِ منیر
دیکھتے حسرت سے ہیں رنگِ دلِ حسرت اثر
دل یہ کہتا ہے ذرا صبر و تحمل ساجدہ
وہ تیرے پیغام کی خاطر ہیں سرگرمِ سفر

(۴)

حسنِ اصلی معتبر اہلِ نظر کی رائے میں
پھول سے چہرہ یہ پوڈر صنعتِ قدرت سے جنگ
دیدنی ہے خواہرِ من اسحرِ زینت کا اثر
روح بھی اُف ہوگئی ہے خوگرِ قیدِ فرنگ

(۵)

جس سکونِ درد سے دنیائے دل ہے ہم کنار
ڈھونڈھنا اس کا عبث ہے، دامنِ تدبیر میں
خامۂ قدرت چلا اور ایک سوہی چل گیا
یہ مشیّت نے لکھی دولت مری تقدیر میں

ساجدہ

ساجدہ خاتون نام اور ساجدہ تخلص ہے۔ آپ سمن پور ضلع غازیپور کی شاعرہ ہیں آپ کا کلام اکثر خاتونِ مشرق میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ اردو کی ایک خوشگو شاعرہ ہیں۔ کلام میں جوش و اثر اور جذبات کی شدت موجود ہے۔ آپ کو طبقۂ نسواں کی مظلومی کا احساس ہے۔ سماج کے غلط رسم و رواج اور مذہب کے نام نہاد علمبرداروں پر آپ کی نظریں اکثر ناقدانہ پڑتی ہیں۔

مرغِ مذبوح کی آتش فشانی

ایک مرغِ نیم جاں نے مولوی جی سے کہا
سچ بتا اے پارسا اے سنگدل بہرِ خدا
کائناتِ رحم پر کیوں گر پڑی برقِ جلال
کس لئے اک بے زباں کو کر رہا ہے تو حلال
کیوں تری تحریکِ الفت کا علم خم ہو گیا
کیوں نظامِ مہر و شفقت آج برہم ہو گیا
کیوں تری رگ رگ میں بیدردی کا دوڑا ہے لہو
تیرے وعظ و پند کی کیوں لٹ رہی ہے آبرو
انجمن میں تیری گرماگرم تقریروں کا رنگ
ذرہ ذرہ پر چڑھا دیتا ہے تاثیروں کا رنگ
تو زمانہ کو دیا کرتا ہے درسِ عاشقی
نام تیرا مولوی ہے کام تیرا رہبری

کیا محبت کرنیوالوں کا یہی انداز ہے
کس قدر مکر و دغا سے پُر تری آواز ہے

اک طرف دیتا ہے تو انساں کو نیکی کا سبق
اک طرف سر جھوٹ کا خود الٹتا ہے ورق

اک طرف کہتا ہے تو ایذا رسانی ہے بُری
اک طرف پھیری رگِ گردن پہ پھیری ہے چُھری

کیا تجھے معلوم ہے ہم زندگی رکھتے نہیں
کیا تمناؤں کے گہوارے ہیں ہم پلتے نہیں

کیا ہمارے سینۂ معصوم میں حسرت نہیں
کیا ہماری مختصر سی جان کی قیمت نہیں

ناتواں ہیں بے زباں ہیں اس لئے خاموش ہیں
درحقیقت آدمی سے بڑھ کے ہم پُر جوش ہیں

آدمی تو ہو گئے ہیں باغیٔ دینِ خدا
ہے مگر اب تک ہماری عنس میں ارزانیٔ فا

صبح کی کچی سپیدی میں اذاں دیتا ہے کون
میٹھی میٹھی نیند کے میٹھے مزے لیتا ہے کون

اشرف المخلوق ہیں اب آدمی بس نام کے
مے نہ ہو جس جام میں وہ جام ہیں کس کام کے

بانسری ہیں سُر نہ ہو تو بانسری بیکار ہے
دھار جس میں کچھ نہیں وہ کب بھلا تلوار ہے

ہوش میں آ اے ستم ایجاد بانیٔ جفا
منقلب تیری ہی کو ہے بزمِ عالم کی فضا

برقِ آفت لقمۂ تر پر ترے گرنے کو ہے
پھر ہوائے دہر کا رخ سر بسر پھرنے کو ہے

ظلم کا دریا صدا اک حال میں بہتا نہیں
ایک مرکز پر زمانہ کا قدم رہتا نہیں

ہے بظاہر نسا جیدہ اک مرغ کی یہ داستاں
اس میں پوشیدہ ہے لیکن عبرتوں کا اک جہاں

ے موصوفہ کی یہ نظم ان کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"شاعر یا شاعرہ کا مذہب اس کا جذبۂ بے اختیار ہوتا ہے اس کی آزادی کسی دوسرے مذہب کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ نظم بھی جذباتی حیثیت سے لکھی گئی ہے اور اسی حیثیت سے پڑھی جائے۔ ہاں غلطیوں پر نگاہ عفو کی ضرورت ہے۔"

ساره حیدرآبادی

سارہ بیگم نام اور سارہ تخلص ہے۔[1] آپ احمد مدنی صاحب کی بڑی دختر ہیں جو مدرسہ دار العلوم حیدرآباد کے ایک قابل مدرس تھے آپ ۱۹۰۳ء ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ گھر پر والدین اور نانا سے ابتدائی تعلیم کے علاوہ فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد محبوبیہ گرلز اسکول میں شریک ہوئیں۔ افسانہ نگاری وغیرہ میں مختلف انعام حاصل کیے ۱۹۱۶ء ۱۳۲۵ھ میں محبوبیہ گرلز اسکول میں فارسی اور عربی کی معلمہ کی جگہ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۳۲ء ۱۳۴۲ھ میں بوجہ خرابی صحت وظیفہ حاصل کر لیا۔

"ماتم سروش" اور "اساس القواعد" آپ کی دو مستقل تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا۔ رسالہ افادہ میں آپ کے اکثر مضمون شایع ہوئے۔ انسداد گداگری پر آپ نے ایک رسالہ (پمفلٹ) لکھا جو پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا سخن سنجی اور سخن فہمی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ طرز بیان سادہ و دلکش ہے۔ کلام میں کیف واثر ہے۔

واں نزاکت تھی یاں تک آنہ سکے　　یاں نقاہت تھی یہ کہ جا نہ سکے
جوش گریہ نے کر دیا خاموش　　قصۂ غم انھیں سُنا نہ سکے
میرے دل میں سما گئے کیونکر　　دونوں عالم میں جب سما نہ سکے
کی دمِ نزع اس نے پرسش حال　　لب پہ جنبش ہوئی بتا نہ سکے[1]

---

[1] مومن ؎ کیا مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا　　وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

یوں سما جاؤ میری نظروں میں پھر کوئی دوسرا سما نہ سکے

سائرہ

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے زمانہ حال کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام میں درد و اثر اور سوز و گداز بہت ہے عشقیہ رنگ میں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ آپ کے یہاں نہایت شدید اور حسرت آمیز جذبات کی ترجمانی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

"تحیّرِ منفعل"

ستم ہے شرطِ آئینِ محبت میں نہ سمجھی تھی
ارے ان حُسن والوں کی شریعت میں نہ سمجھی تھی
مجھے کھوئے گی اک دن شامِ فرقت میں نہ سمجھی تھی
مجھے دنیا سے کھودے گی محبت میں نہ سمجھی تھی
تمھاری سادگی تصویرِ خاموشِ مسرت تھی
جوانی آئے گی بن کر قیامت میں نہ سمجھی تھی
پشیماں ہو رہی ہوں شکوۂ جور و جفا کر کے
کوئی ہوگا پشیماں شکایت میں نہ سمجھی تھی
اسے جلنے نہ دیتی جذب کر کے دل میں رکھ لیتی
بہارِ باغ کا رنگِ طبیعت میں نہ سمجھی تھی
تیری گلیوں میں مٹ کر موت کے دن کاٹ دیتی ہیں

تیری گلیوں سے اُٹھے گی قیامت میں نہ سمجھی تھی
سمجھ رکھا تھا میں نے اختیاری ولولہ دل کا
تمھارے ہاتھ میں ہے میری قسمت میں نہ سمجھی تھی
شبِ خلوت ستاروں نے بہت لوٹے ترے جلوے
ترے حسنِ شب آراء کی حقیقت میں نہ سمجھی تھی
محبّت تھی نشاطِ زندگانی وہ بھی کیا دن تھے
کہ آفت تم نہ سمجھے تھے مصیبت میں نہ سمجھی تھی
نظر ملتے ہی کچھ محجوب ہے وہ بیوفا مجھ سے
نگاہوں سے بھی ہوتی ہے شکایت میں نہ سمجھی تھی
کسی کو خواب میں بے چین کر ڈالا خیالوں سے
خیالوں میں بھی ہوتی ہے یہ قوت میں نہ سمجھی تھی
گنہ کیوں سر پہ لیتی سائرہ حُسن تماشہ کا
مجھے یوں مست کر دے گی محبت میں نہ سمجھی تھی

سردار، حیدرآبادی

منظور فاطمہ بیگم نام اور سردار تخلص ہے، مولوی مشتاق حسین مرحوم المخاطب نواب وقار الملک کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی سید محبوب علی صاحب ناظم لاسلکی حیدرآباد کی رفیق حیات ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ اُردو

فارسی اور عربی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اردو میں طبع آزمائی کرتی ہیں حضرتِ جلیل سے آپ کو تلمذ حاصل ہے۔ رسالہ آئینۂ ادب میں آپ کا کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ کوئی دیوان یا کلیات شائع نہیں ہوا مگر کلام کا کافی ذخیرہ ہے۔ تصوّف کا آپ کو خاص مذاق ہے، زبان میں صفائی اور پاکیزگی ہے۔ اسلوبِ بیان سادہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

ہو آس جس کو رحمتِ پروردگار کی
کیا فکر اس کو پرسشِ روزِ شمار کی

آنکھوں کو ہے جو کوچۂ احمد کی آرزو
ہر اشک میں چمک ہے دُرِ آبدار کی

سب سے پہلے ہے ہنر درکار زر کے واسطے
چاہیئے انساں کرے کوشش ہنر کے واسطے

اللہ اللہ حضرتِ صدّیق کی داد و دہش
ایک کپڑا بھی نہ رکھا اپنے گھر کے واسطے

سن لیا سردارِ اسلام کی جس نے ایک بار
ہو گیا قائل خدا کا عمر بھر کے واسطے

سروپ رانی

محترمہ سروپ رانی دورِ حاضر کی شاعرہ ہیں۔ آپ اندرجیت شرما کی طرح ہندی آمیز اُردو میں لکھتی ہیں اور ہندی شاعری کی روایات کی متبع ہیں، کلام میں بڑا رس، حلاوت، اور شیرینی ہے، اسلوبِ بیان دلکش اور پاکیزہ ہے، جذباتی اعتبار سے آپ کا کلام بلند اور پُرکیف ہے، نمونہ یہ ہے:-

نِسدن تیرے نام کی مالا
ہے جیون کا جاپ

پاپی ہوں میں پاپی بالم پریم ہے میرا پاپ
تو بھی پاپی ہو جا

ریت کی اُلٹی ریت ہے پیارے ہارنے میں ہے جیت
ہارنے جیون ہارنے تن من چاہے گر تو میت
بالکل نردھن ہو جا

پاگل مجھ کو کہے ہے دنیا کیا جانیں یہ لوگ
یارب ان کو بھی ہو جائے پریم کا میٹھا روگ
پریتم روگی ہو جا

تجھ سے بس اک عرض ہے ساجن ہو جا میرا ہو جا
یا تو مجھ کو اپنا کر لے یا خود مجھ میں کھو جا
بس تو میرا ہو جا!

سعیدہ (شوکت دولہن)

سعیدہ خاتون نام ہے تخلص کبھی سعیدہ کرتی ہیں اور کبھی شوکت دولہن للت پور وطن ہے۔ والد کا نام حکیم مولوی سجاد حسین ہے۔ شادی کے زمانہ تک اپنے والد کے ہمراہ میں پوری ہیں رہیں۔ شادی محمد عمر صاحب شوکت تھانوی سے ہوئی جو اردو کے ایک مشہور مزاح نگار اور اچھے شاعر ہیں۔ اسی رعایت سے شوکت دولہن تخلص کرتی ہیں۔ شادی کے بعد سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ اصلاح سخن اپنے شوہر جناب شوکت

تھانوی سے لیتی ہیں جو شاعری میں مولوی عبدالباری آسی کے شاگرد ہیں۔ غزل گو شاعرہ ہیں۔ اور قدیم و جدید دونوں رنگوں میں لکھتی ہیں آپ کے یہاں وہ شاعری بھی ہے جو صرف شاعرانہ روایات و تصورات اور اجماع الفاظ پر مشتمل ہے اور وہ شاعری بھی ہے جس میں نظر کی وسعت، جذبات کا پھیلاؤ، اور استقصا بھی ہے۔ آپ کی ایک خاص خصوصیت ندرتِ بیان اور اکثر لطیف تشبیہات کا استعمال ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

مرے نالوں سے شانِ ضبطِ غم مجروح ہوتی ہے
نہیں تو میں پلٹ دیتی نظامِ دہر دم بھر میں
شبِ فرقت کی بیتابی سے میں واقف نہیں لیکن
کسی نے جیسے کانٹے رکھ دئے ہیں آج بستر میں
تخیّل ہے کہ وحشت ہے سمجھ ہی میں نہیں آتا
خدا کیوں کر نظر آتا ہے ہر خاموش منظر میں
نہیں معلوم اس کے بعد کتنے انقلاب آئے
جنوں کے ساتھ ایک صحرا بھی آیا تھا مرے گھر میں

دل بہلنے کا ہمارے خوب ساماں ہو گیا
لیجئے بیٹھے بٹھائے گھر بیاباں ہو گیا
اللہ اللہ آج وہ آئے ہیں فاتحہ پر جبیں
ہم غریبوں کی بھی تربت پر چراغاں ہو گیا

دم نہ نکلا انتظارِ یار میں
نیند کیسی دیدۂ بیدار میں
نبض ناحق دیکھتے ہو بار بار
جان بھی باقی ہے جسمِ زار میں
کھنچ گئی مقتل میں مجھکو دیکھکر
آگئی نخوت تری تلوار میں
اے سعیدہ گریۂ شبنم پہ پھول
تا سحر ہنستے رہے گلزار میں

سکینہ

سکینہ محمود نام اور سکینہ تخلص ہے۔ دَورِ حاضر کی ایک خوش مذاق شاعرہ ہیں، کلام میں سوز و گداز ہے۔ طرزِ ادا صاف اور پاکیزہ ہے، نمونۂ کلام یہ ہے :-

ہر قدم پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
کہہ نہیں سکتی کہاں مجھ کو لئے جاتا ہے دل
بے کسی ہائے محبت کی سنا کر داستاں
دل کو تڑپاتی ہوں میں اور مجھ کو تڑپاتا ہے دل
ایک وہ دن تھے کہ کھو جاتے تھے ذوقِ عشق میں
اب محبت کے تصور سے بھی گھبراتا ہے دل

سلمیٰ

غالباً یہ ہی نام اور یہی تخلص ہے۔ لاہور کی شاعرہ ہیں، تخیل

بہت بلند اور نظر وسیع پائی ہے۔ آپ کے قطعات بہت خوب ہوتے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

قطعات

زندگانی کا سلسلہ ہے دراز | یوں ہی آسان کٹ نہیں سکتی
ہیں اسی راہ کے نشیب و فراز | جس کو کہتے ہیں لوگ شادی و غم

کہیں رکتی نہیں بشر کی نگاہ | فکر انساں کی ہر بلندی دیکھ
ہے اسی کارواں کی گردِ راہ | آسماں پر یہ کہکشاں کا نشاں

سلمیٰ حیدرآبادی

جمال النساء بیگم نام اور سلمیٰ تخلص ہے۔ آپ مولانا سید نادرالدین مرحوم استاذ فلسفہ و کلام مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی شادی حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت امجد سے ہوئی تھی۔ عالم شباب میں ۱۹۴۰ء میں انتقال فرمایا۔ اور درگاہ شاہ خاموش حیدرآباد میں دفن ہوئیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ نسواں نامپلی میں پائی تھی اور پھر اپنے والد سے فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ آپ ایک اچھی انشاپرداز اور نثر نگار بھی تھیں شعر گوئی کا شوق تھا۔ توحید۔ نعت اور تصوف آپ کے خاص موضوع تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

نہ ہو کوئی ہمراہ، یہی ہمرہی ہے　　رہوں بے خبر میں، یہی آگہی ہے
کبھی ہے قیام اور کبھی وقت سجدہ　　کبھی سرکشی ہے کبھی عاجزی ہے
کبھی ٹیس دل میں کبھی لب پہ آہیں　　مری جان کو اک نہ اک دل لگی ہے
نہ میری سنیں گے، نہ بولیں گے مجھ سے　　عجب بے کسی ہے عجب خامشی ہے
نہ معلوم جب تجھ کو دیکھوں تو کیا ہو　　ترے نام ہی سے مجھے بے خودی ہے

ہے سلمیٰ زدل جاں سے امجد کی لونڈی
اور امجد غلام غلام نبی ہے

وہ یوسف گم گشتہ کس جا پہ نہاں ہوگا　　کس پہلو میں پوشیدہ، وہ راحت جاں ہوگا
یہ عالم کثرت کب توحید نشاں ہوگا　　اس جسم کی مسجد میں کب شور اذاں ہوگا
میرا اعربی آقا، اللہ کہاں ہوگا
دیکھوں اسے گلشن میں ڈھونڈوں اسے صحرا میں　　ہے عالم بالا میں یا عرش معلیٰ میں
دل میں ہے مقام اس کا یا دیدۂ بینا میں　　وہ کعبہ میں رہتا ہے یا گلشن طیبہ میں
میرا اعربی آقا، اللہ کہاں ہوگا

سیدہ۔ خیرآبادی۔

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے۔ آپ خان بہادر مضطر خیرآبادی کی صاحبزادی اور حبیب اللہ خاں صاحب کی شریک زندگی ہیں چونکہ آپ کے والد صاحب خود شاعر تھے اس لئے ابتدا ہی سے آپ کے ایک

شاعرانہ ماحول مل گیا تھا۔ رفتہ رفتہ آپ کا شوق ترقی کرتا رہا۔ اور اب آپ اردو کی ایک مشہور اور ممتاز شاعرہ ہیں، آپ کا کلام زیادہ تر عصمت میں شائع ہوتا ہے۔

آپ قوم کی زبوں حالی اور خستگی سے بہت متاثر ہوئی ہیں، اسی لئے آپ کے کلام میں اصلاحی، قومی اور ملّی رنگ جھلکتا ہے، آپ عورتوں اور مردوں کی بے حسی اور خاموشی کو توڑ کر ان میں ایک عزم اور جذبۂ عمل پیدا کر دینا چاہتی ہیں۔ آپ کے خیالات پر اقبال کا بہت اثر پڑا ہے گو طرزِ ادا میں یہ اثر اس قدر نمایاں نظر نہیں آتا۔

آپ ایک تعلیم یافتہ، پردہ نشین اور مذہبی خاتون ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:—

مالکِ کون و مکاں آ سایشِ تقدیر دے
التجائے عجز کو سرمایۂ توقیر دے

زندگی کو کثرتِ جد و جہد درکار ہے
اس لئے فکرِ عمل کو صورتِ تدبیر دے

ایک عالم کو ہلا دیں طاقتِ گفتار سے
وہ کمالِ نطق دے وہ شوکتِ تقریر دے

شاہ راہِ زیست میں اسلاف کے پیرو رہیں
پھر وہی جذبِ عمل شایانِ صد تشہیر دے

تا کجا یہ صورتِ تخریبِ ملت تا کجا
فکرِ مسلم کو کمالِ حسرتِ تعمیر دے

پھر امیدوں کو شعاعِ کامرانی کر عطا
قسمتِ تاریک کو ہنگامۂ تنویر دے

---

[1] علامہ اقبال ؒ :

بھٹکے ہوئے راہی کو پھر سوئے حرم لے چل
اس دشت کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے (بانگِ درا)

پھر حدیثِ دل ہے کہ جوشِ عقیدت آمیز کا
پھر زبانِ مدعا کو نعرۂ تکبیر دے
پھر تمنا کو شریکِ ہمتِ مردانہ کر
پھر تہوّر کو کمالِ جرأتِ شمشیر دے
التجائے سیّدہ سُن لے برائے مصطفےٰ
قومِ مسلم کو بہارِ عالمِ تقدیر دے

مخدراتِ گروہِ مسلم ہماری حالت ہی کیا رہی ہے
یہ غفلتِ بے پناہ توبہ کہ قومِ مسلم پہ چھا رہی ہے
معاشرت کے طریق بھولے، تمدنِ خوش سلیقہ بھولے
تمیزِ قوم و فریق بھولے اسی کی تہذیب بھا رہی ہے
وہ طرزِ اخلاقِ احمدی بھی، وہ رسمِ آدابِ ہاشمی بھی
وہ شان ہی ہم سے مٹ گئی ہے ہماری حالت بتا رہی ہے
وہ جنگِ موتہ وہ جنگِ خیبر، وہ حربِ خالدؓ، وہ ضربِ حیدرؓ
وہ تیغ مسلم کی شانِ جوہر کہ شانِ مسلم بتا رہی ہے
مگر وہ حالت کہاں ہے باقی، وہ جاہ و صولت کہاں ہے باقی
وہ تیغ ہمت کہاں ہے باقی کہ تاب و طاقت ہی کیا رہی ہے
وہ عزم باقی نہ رزم باقی، نہ شوکت و شانِ بزم باقی
ہماری ہر بات مٹ چکی ہے کہ ہم کو قسمت مٹا رہی ہے
خراب حالت ہوئی یہاں تک تغافلِ بے محل کہاں تک
کہ شاہ راہِ عمل پہ دنیا قدم برابر اٹھا رہی ہے

خدایا یہ دن بھی گذار دیگا، وہ سبتہ پھر قرار دیگا
ہماری حالت سنوار دیگا، کہ کس کی بگڑی سدا رہی ہے

ش

شبنم

طاہرہ خاتون نام اور شبنم تخلص ہے۔ دورِ حاضرہ کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ اکثر رسالوں میں کلام چھپتا رہتا ہے۔ انداز دل کش اور کلام صاف اور پاکیزہ ہے۔

تاثیر تجھے جذبۂ دل کی ہے دکھانی　　اقرارِ محبت کریں وہ اپنی زبانی
دلچسپ ہیں کس درجہ یہ قدرت کے مناظر　　وہ صبح کی نیرنگیاں وہ شام سہانی
کیا جانیے خیال آگیا کس بات کا ہم کو　　یہ کیسے جو کہتے نہیں اشکوں کی روانی[1]
جذبات کا ہنگامہ ہے برپا مرے دل میں　　کیوں آج تلاطم میں ہے یہ بحر معانی
گھبرائے گا ہمدم مرے افسانۂ غم سے　　دل جس سے بہلتا ہے نہیں یہ وہ کہانی

پھرتی ہیں مری آنکھوں میں ہر وقت وہ آنکھیں
شبنم مجھے مشکل ہوئی جاں اپنی بچانی

---

[1] دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے :: بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

ہر عیش و طرب کی محفل میں دل ہے کہ امنڈنے لگتا ہے
کیا جانیے کیوں از خود آنکھیں ہو جاتی ہیں پُر نم کیا کہیے
{ عبد الحمید صاحب حمید لکھنوی }

جو عقل سے بالا ہے وہ کمال تیرا | جس پر نظر نہ ٹھہرے وہ ہے جمال تیرا
قیدِ حیات میں تو کرتا ہے فکرِ راحت | دیوانے ہنس پڑیں گے سن کر خیال تیرا[1]
ظلمتِ دوئی کی میری نظروں سے دور ہو گر | پھر کچھ نظر نہ آئے ہاں بس جمال تیرا
گر بادۂ فنا کی تلچھٹ بھی مجھ کو مل جائے | اے خضر میں نہ چکھوں آبِ زلال تیرا

شبنم تو یہ بشارت اب قوم کو سنا دے
ہو گا یہ بدر بڑھ کر اک دن ہلال تیرا

شکیل

شکیلہ خاتون نام اور شکیل تخلص ہے۔ دورِ حاضر کی ایک غزل گو شاعرہ ہیں۔ رنگ صاف ہے، نمونہ یہ ہے یہ وہ غزل ہے جو محترمہ نے لکھنؤ کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی :۔

دلِ ناداں تجھے آخر ہوا کیا | کسی کی یاد میں گم ہو گیا کیا
بُرا کوئی کہے لیکن نہ مانو | بھلا سمجھو بُرے کا ماننا کیا
مجھے مقصود ہے تیری پرستش | مرے جینے کا ورنہ مدعا کیا
حیاتِ جاوداں ہے بعد مُردن | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

---

[1] غالب ؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شمس

صفیہ بانو نام اور شمس تخلّص ہے، قریشی نسبت خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں آپ دَورِ حاضر کی ایک خوش فکر نظم گو شاعرہ ہیں۔ آپ کی نظمیں تفریح طبع کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ لوگوں کو زندگی کے حقائق کی طرف دعوتِ فکر دیتی ہیں، اکثر کلام زنانہ رسالوں میں چھپتا رہتا ہے نمونہ یہ ہے:-

دنیا کی کہانی زہرہ کی زبانی

جمی تھی شب کی محفل رقص میں سب ہی ستارے تھے
لبوں پر تھا تبسم شوخ آنکھوں میں اشارے تھے
اُدھر وہ بدرِ کامل یعنی دولھا بزمِ انجم کا
خوشی سے مسکراتا تھا جو بھرتے سب طرارے تھے
یکایک اک طرف سے ایک نورانی غبارہ اُٹھا
نظر اس سمت جو اُٹھی پڑا چہرہ وہیں پھیکا
لگے دیکھے سُروں میں سب کے سب سرگوشیاں کرنے
نہ جانے کیا خبر لائی سُنو شہزادئی زہرا
یہ شہزادی نہیں ہے زاہدہ معلوم ہوتی ہے
یا پھر کوئی حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے
کسی کی رائے تھی کافرادا معلوم ہوتی ہے
قمر کہتا تھا دیکھو غم زدہ معلوم ہوتی ہے
سُنیں زہرہ نے یہ سرگوشیاں تو ہمکلامی کی

قسم کھاتی ہوں اے تارو ہیں تم سب کی جوانی کی
ہماری زندگی ہے چار دن کی بھولنا کیسا
ابھی اُبھرے ابھی ڈوبے بسر یوں زندگانی کی
سُنی ہیں نے کہانی اک بہت دلدوز ہے پیارو
مرے دل سے نکلتی آہِ آتش سوز ہے پیارو
ذرا اپنی نظر ڈالو زمیں کے بسنے والوں پر
کہ ہر انساں کے دل میں خطرۂ امروز ہے پیارو
تڑپتی بجلیوں نے سیکڑوں خرمن جلا ڈالے
کہیں تقدیر نے بچولے پھلے گلشن لٹا ڈالے
فلک کے گھاٹ اُترتے آہ وہ گبرو جواں دیکھے
فلک کو چیر جاتے آہ ہیں ہواؤں کے نالے
کہیں خونی درندے جنگ میں مصروف ہیں باہم
کہیں آنکھیں ہیں پُرنم اور کہیں ہے زندگی پُرغم
نہیں یہ زخم ہے ایسا جو ہو منت کشِ مرہم
ابھی لوٹا ابھی ٹوٹا ہے سازِ زندگی مدھم
اُٹھائے ننھے ننھے ہاتھ ہیں فریاد کرتے ہیں
وہ لاوارث یتیم اپنے خدا کو یاد کرتے ہیں
دلِ گیتی لرزتا ہے یہ منظر دیکھ کر جس دم
زبانِ حال سے یہ شکوۂ بیداد کرتے ہیں

وہ دیکھو اُٹھ رہے ہیں ہر طرف سے ظلم کے بادل
ہزاروں دل ہیں زخمی اور کروڑوں جسم ہیں گھائل
کہاں رونے کی طاقت اب ہیں آنسو خشک آنکھوں سے
نہیں ہوتا مگر چرخِ ستمگر رحم پر مائل
وہ دنیا جو کبھی نعم البدل تھی باغِ جنت کی
جہاں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں جہاں راحت ہی راحت تھی
وہاں انساں نے اب خون کی ندیاں بہا ڈالیں
گنوادی ہائے اپنے ہاتھ سے تفویض قدرت کی
ربابِ زندگی سے غم کی لہریں پھوٹتی دیکھیں!
شہابِ زندگی سے خوں کی بوندیں چھوٹتی دیکھیں
کہیں نوخیز کلیاں مست گلچیں نے مسل ڈالیں
کہیں نازک دلوں کی اُف امیدیں ٹوٹتی دیکھیں

شمیم[1]

محترمہ انوار فاطمہ (لکھنوی) پروفیسر کراستھ ویٹ گرلس کالج الہ آباد

---

[1] محترمہ کے مستند حالات اور ان کے علمی و ادبی ذوق کا مفصل بیان "تذکرۂ شمیم" میں محفوظ ہے، یہ کتاب جو اُردو ادب میں جذبات آمیز، سادہ نگاری کا ایک شاہکار ہے، آپ کی وفات کے بعد محترم سعید رضوی صاحب لکھنوی نے مرتب کی ہے۔ جو صاحب محترمہ کے حالات اور ان کی علمی کاوشوں کا مطالعہ

محترمہ انوار فاطمہ تبسم لکھنؤ کے ایک شریف اور قدیم خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ آپ کے نانا سید بخشش نبی صاحب ایک بڑے تاجر تھے۔ آپ کے دادا خدا بخش صاحب اپنی دریا دلی، وضع داری اور غربا پروری کے لئے مشہور تھے۔ آپ کے والد عبدالرشید عرف اللہ بخش صاحب عربی و فارسی کے عالم تھے اور عرصہ تک محکمہ پولیس میں انسپکٹری کی خدمات انجام دیتے رہے۔

ابھی آپ بچی ہی تھیں کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا، آبائی جائداد سے پرورش ہوئی، اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور تھوڑی ہی مدت میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ نو۔ دس سال کی عمر ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہو گیا تھا چنانچہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے مختلف اقسام کے کھانوں کی تراکیب پر چالیس بیالیس صفحہ کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو اب تک بصورت مسودہ موجود ہے۔

آپ کی شاعری کی ابتدا زندگی کی چودھویں یا پندرھویں منزل سے ہوتی ہے۔ پہلی غزل جو آپ نے لکھی اس کے کچھ اشعار یہ ہیں اس عمر میں جب نوجوان قلب و نظر نشاطِ زندگی کے طالب اور عشرت امروز

(پچھلے صفحہ سے) تفصیل سے کرنا چاہیں ان کو یہ کتاب دیکھنا چاہیئے دنیا کو اس کتاب سے سبق لینا چاہیئے کہ منھ بولے بہن بھائیوں میں بھی اتنی محبت و مودت ممکن ہے۔

کے قائل ہوتے ہیں، محترمہ کے دماغ پر بے ثباتیٔ دنیا کا یہ اثر تعجب خیز ہے

ہنس رہے ہیں گل کہ رنگِ گلستاں کچھ بھی نہیں
شمع گریاں ہے کہ یہ بزمِ جہاں کچھ بھی نہیں
ہیں کہاں فرہاد و شیریں، لیلیٰ و مجنوں کہاں
رہ گیا ان کا فسانہ اور نشاں کچھ بھی نہیں
صاف دیتی ہے اذانِ پنج وقتہ یہ خبر!
ہے فقط اللہ ہی اللہ اور یہاں کچھ بھی نہیں
دیکھ کر دنیائے فانی دل یہ کہتا ہے شمیمؔ
عارضِ رنگِ گلِ باغِ جہاں کچھ بھی نہیں

اسی زمانہ کے کچھ اور اشعار یہ ہیں:-

نہیں معلوم کیا حالت گزرتی جو تم سنتے مرے دل کی کہانی

اب حالِ دلِ عاشق کیا پوچھتے ہو سن کر خود آپ بھرے گھر کو جب کر چکے ویرانہ

محروم نہ رہ جائے شمیمؔ ابرِ کرم سے کہنا نہ پڑے فیض ترا عام نہیں ہے[1]

---

[1] محترمہ زیب عثمانیہ ۔ مگر مست ہے تری ہو جائیں نہ میکش بد دل
سنگ دل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی

۱۹۲۳ء میں آپ کی شادی بشارت اللہ صاحب سے ہوگئی محترمہ کو کتب بینی کا عشق تھا اور یہ شوق شادی کے بعد بھی برابر ترقی کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد بشارت اللہ صاحب کورٹ آف وارڈس کی ملازمت کے سلسلہ میں میرٹھ گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوگئی جو ایک صاحبِ باطن اور صاحب نسبت بزرگ تھے اور اس وقت ۷۵ یا ۸۰ سال کی عمر تھی محترمہ نے ان سے عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ محترمہ نے مولانا سے علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی اکتسابِ فیض کیا۔ اور غالباً انھیں کے فیض کا یہ نتیجہ ہے کہ محترمہ کے اس زمانہ کے کلام میں تصوف، پاکیزگیِ قلب اور عشقِ حقیقی کے مضامین غالب نظر آتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد محترمہ نے سیرت پاک اور حیاتِ نبویؐ کے متعلق مستند اور معتبر واقعات مرتب کرکے شائع کئے اس کتاب کا نام "انوار اسرار احمدیہ" ہے۔ اس کتاب کے متعلق مولانا صفی کے چند شعر یہ ہیں:۔

اک زنِ صالحہ کی یہ تحریر — قابلِ قدر و بیش قیمت ہے
نثرِ رنگین و نظم دلکش سے — مترشح خلوص نیت ہے
نہیں گنجینۂ ادب یہ کلام — بلکہ گنجینۂ سعادت ہے

اسی دوران میں محترمہ کی اکیلی بہن اور پھر ان کے شفیق استاد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب محترمہ کا تنہا مشغلہ کتب بینی رہ گیا۔ آپ نے اپنے شوہر کے ایما اور کوشش سے لاہور اور الٰہ آباد کے فارسی و عربی

کے امتحانات میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانہ میں آپ کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اشرف سلطانہ رکھا گیا۔

کچھ عرصہ بعد بشارت اللہ صاحب کا الہ آباد تبادلہ ہو گیا۔ یہاں کراستھ ویٹ گرلس کالج میں اُردو فارسی کے ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ یہ جگہ محترمہ شمیم کو پیش کی گئی جو شوہر کے ایما سے آپ نے قبول کر لی اور زندگی کے آخری ایام تک اس خدمت کو بطور احسن انجام دیتی رہیں

۲۳ راگست ۱۹۴۰ء مطابق ۱۸ رجب ۱۳۵۸ھ یوم جمعہ بعارضہ فالج آپ نے انتقال فرمایا اور کراستھ ویٹ گرلس کالج کے قریب کیٹ گنج میں دفن ہوئیں۔

محترمہ ایک نہایت روشن دماغ، بالغ نظر اور صاحب علم و فضل خاتون تھیں لیکن نام و شہرت سے بالکل بے نیاز تھیں۔ آپ نے اپنی حیات میں نہ اپنا کلام شایع کرایا نہ زنانہ مشاعروں میں حصہ لیا، جب جذبات میں ہیجان ہوتا تو تنہائی میں بیٹھ کر کہتیں اور اپنے ہی تک محدود رکھتیں۔ ظاہری زیب زینت کی بھی بالکل پرواہ نہ تھی، مگر اپنی عزت کا بڑا پاس تھا۔ فطرتاً نہایت غیور اور خوددار تھیں طبیعت میں بڑی فیاضی اور سیر چشمی تھی، غریبوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ آپ کا سلوک نہایت ہمدردانہ تھا۔ آپ نہایت دیندار، پردہ نشین اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔

شاعری کے علاوہ محترمہ ایک قابلِ قدر نثر نگار بھی تھیں۔ آپ نے

افسانے اور تذکرے، علمی اور ادبی مقالے، تنقیدیں اور تبصرے، اصلاحی اور اخلاقی مضامین، سب پر قلم اٹھایا ہے، انفرادی مقالوں اور افسانوں کے علاوہ ایک مستقل ناول آپ کی یادگار ہے جو وفات سے سات۔ آٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا۔

شاعری میں محترمہ کو کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا۔ مگر آپ کا کلام کہنہ مشقی اور خیالات کی پختگی کا پتہ دیتا ہے۔ یوں محترمہ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور قصیدہ پر بھی قلم اٹھایا ہے مگر آپ ایک مخصوص غزل گو شاعرہ تھیں۔ آپ کے کلام میں فطری جذبات کی عکاسی، حسن و عشق کے رموز کی تشریح اور محبت کی پاکیزگی موجود ہے۔ آپ کے احساسات میں نزاکت اور مذاق میں بلندی موجود ہے، جذبات نگاری اور سادگی، درد و اثر، اور سوز و گداز، بلند نظری اور عالی ظرفی آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ آپ نے منظر کشی بھی کی ہے اور ملی اور وطنی رنگ کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ زبان میں بڑی سلاست و روانی ہے بعض بعض جگہ تو زبان میں داغ کی سی بے تکلفی و سادگی نظر آتی ہے،

اپنی نااہلی کا احساس رہا تھا نہ کریم

مجھ کو جرأت یہ ہوئی تھی کہ تری حمد کروں [1]

---

[1] حمد کے سلسلے میں مولانا رومؒ نے جس ندرت اور بلاغت سے کام لیا ہے وہ آج بھی اپنی آپ ہی مثال ہے، مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا است   کیں دلیل ہستی و ہستی خطا است

جذبات نگاری

یہ کہہ کے ٹال رہی ہوں اجل کو مدت سے
ٹھہر کہ وعدۂ دیدار اب وفا ہوگا
مٹا و شوق سے امید و آرزو لیکن
ہمارے دل کو تمھارا ہی آسرا ہوگا
میری تباہیاں مشہور ہیں زمانے میں
یقیں ہے آپ نے بھی کچھ نہ کچھ سنا ہوگا
تمھاری نظروں میں میں صاف صاف پڑھ لونگی
مرے نصیب میں جو کچھ بھی اب لکھا ہوگا
جو لغزشوں کا کرے احتساب اے واعظ
نہیں خدا وہ ہمارا، ترا خدا ہوگا
شمیمؔ آپ سدھاریں گی یوں زمانے سے
کہ ساتھ حسرت وارماں کا قافلہ ہوگا

مری وفا، مرا مسلک، مرے اصولِ حیات
بنیں گے مشعلِ راہِ عمل جہاں کے لئے

اب تو قرار آچکا اس دل بیقرار کو
آ، اجل او جلد آ ختم کر انتظار کو
خیر سے بجھ کے رہ گیا میرا چراغ زندگی
آج قرار آگیا چرخ ستم شعار کو

یہ چیخ اٹھیں ظلم ڈھاکر ہنسنے والے تو سہی[1]
ضبط کی امداد تھوڑی نالۂ دل چاہیئے
مشکلیں غم کی خوشی سے کاٹ دے انساں ہے وہ
کچھ نہیں پہلو میں اک ہنستا ہوا دل چاہیئے
سیر ہے بزمِ حسینانِ جہاں سے دل شمیم
اس کا جلوہ جس جگہ ہو بس وہ محفل چاہیئے

زبان کی صفائی و سادگی

کچھ درد و داغ ہے کہ دکھائے کوئی کتھیں
ضد کر رہے ہو آج تو تم خواہ مخواہ کی
کرنے کو آپ شوق سے وعدہ کریں مگر
جھٹلا رہی ہے دیکھئے شوخی نگاہ کی

---

[1] صاحب تذکرۃ الخواتین مولوی عبدالباری آسی نے یہ غزل "بی بیگم شمیم" کے تذکرہ میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ لکھنؤ کی کوئی پردہ نشیں خاتون ہیں۔ اور کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ بی بیگم شمیم لکھنؤ کی کوئی شاعرہ خاتون نہیں ہیں۔ یہ غزل انوار فاطمہ شمیم ہی کی ہے اور" تذکرۂ شمیم میں موجود ہے۔ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ لکھنؤ میں رہنے کے باوجود مصنف خود لکھنؤ کی ایک ایسی سربرآوردہ خاتون کے متعلق اس قسم کی غلطی کرے۔

کیوں بگڑ جاؤ اگر کہہ دے کوئی وعدہ خلاف
اس سے پہلے کیا کبھی جھوٹی قسم کھائی نہ تھی
کیا نیا دل ہو گیا پامال کوئی، خیر ہے
چال تھی مستانہ لیکن ایسی اٹھلائی نہ تھی

وعدہ کبھی کسی سے تم نے وفا کیا ہے
بس ٹالتے ہو یوں ہی ہاں ہاں نہیں نہیں پر
افشاں سے شوق شاید کچھ بڑھ گیا ہے ان کو
یوں ورنہ ٹوٹتے ہیں تارے کہیں زمیں پر

دفعتاً اٹھی نگاہِ فتنہ پرور خود بخود
خود بخود پیدا ہوا آشوبِ محشر خود بخود
آپ کی محشر خرامی سے قیامت آگئی
ورنہ کیوں اٹھنے لگا تھا شورِ محشر خود بخود

سوز و گداز

آتشِ غم بجھا رہی ہوں میں
اشک پیہم بہا رہی ہوں میں
کوئی دیکھے مرا جنونِ طلب
ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں
شاید اب عشق ہو گیا کامل
غم میں لذت سے پا رہی ہوں میں
دیکھیے کس ستم کا ہو آغاز
پھر انھیں یاد آ رہی ہوں میں

خدارا رحم کر او دردِ پیہم — نکل جائے نہ نام ان کا زباں سے
معاذ اللہ طوافِ کعبہ اور ہم — ہمیں فرصت کہاں کوئے بتاں سے
شبِ تار رباب اور ان کا تصور — وہ[1] لمحے عیش کے لاؤں کہاں سے
ترے اک جلوۂ رنگیں کی خاطر — بہت الجھی ہوں مرگِ ناگہاں سے

مرے دل میں ہر دم ہے نامِ محبت — مجھی سے ہے قائم نظامِ محبت
کہا آنکھوں آنکھوں میں حالِ پریشاں — دیا چپکے چپکے پیامِ محبت

جب کہ تدبیر کی قوت بھی فنا ہو جائے — پھر دعا میری حقیقت میں دعا ہو جائے
میں نے اب راہِ محبت میں بڑھائے ہیں قدم — رہبرِ عقل سے کہہ دو کہ جدا ہو جائے

شفق اور شام کی نیرنگیاں دل کو دکھاتی ہیں
جنوں بڑھتا ہے اور اشکوں سے پلکیں تھرتھراتی ہیں
فضا کی خامشی میں طائرِ شب رنگ کی تانیں
مرے جذباتِ خوابیدہ کو رہ رہ کر جگاتی ہیں
خنک راتوں میں وہ مہتاب کی ننھی حسیں کرنیں
مسکن شیشۂ دریا پہ جس دم مسکراتی ہیں

---

[1] مومن: ع تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

جگر میں ہوک سی اٹھتی ہے دل بیتاب ہوتا ہے
تمنائیں اسی میں جذب ہو کر کھوئی جاتی ہیں
زمانہ اُف محبت کا اور اس کی پُرسکوں راہیں
مری تخئیل کی دنیا کو آ آ کر بساتی ہیں
محبت کی صبوحی پیتے تھے اور شاد رہتے تھے
کبھی دو دل تھے اس دنیا میں جو آباد رہتے تھے

رہے گی دردِ جگر کی خلش نہاں کب تک
کروں گی ضبط یوں ہی نالہ و فغاں کب تک
فراق و ہجر ہے اُلفت کا امتحاں لیکن
زمانہ ہوگیا آخر یہ امتحاں کب تک
اُداس چہرہ، زباں بند، آنکھ میں آنسو
مجھے رولائے گا رخصت کا وہ سماں کب تک
تیری ہی آس پہ جیتی ہے اب شمیم حزیں
کرے گی رحم تو اے مرگ ناگہاں کب تک[1]

مناظرِ عیش اب کہاں ہیں ستم فلک کے اٹھا رہی ہوں
ہے حسنِ رنگیں نظر میں میری میں پاس سے مسکرا رہی ہوں

---

[1] فانی :- تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد :: مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

کبھی جو تھا وجہ کیفِ محفل زمانہ سن کر جسے تھا بسمل
شکستہ تارِ ربابِ دل پر وہی ترانہ میں گا رہی ہوں
کہیں ہے حسرت کہیں ہے حرماں کہیں تمنا کہیں ہیں ارماں
میں اپنے ویرانۂ دل کی بستی نئی طرح پھر بسا رہی ہوں
اُداس چہرہ نظر فسردہ، لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسم
ارے تم اس کو ہنسی نہ سمجھو میں اپنے غم کو چھپا رہی ہوں
نرالے آئیں ہیں اِس جہاں کے، جہاں محبت ہے کارفرما
کہاں کا ناموس، ننگ کیسا، خودی کو اپنی مٹا رہی ہوں
نہ بھول جاؤں کہیں وہ ماضی جو ساری رنگینیوں سے پُر تھی
غم و الم کا میں اک مرقعِ اکیلی بیٹھی بنا رہی ہوں
لذیذ کس درجہ تھی حکایت شمیمؔ ان سے جو کل کہی تھی
اسی فسانے کو طول دے کر میں آج دل کو سنا رہی ہوں

ستم[1] ہر روز تازہ ہے نئی ہر روز آفت ہے
کبھی جوشِ تمنا ہے کبھی جوشِ ندامت ہے
فقط اک سانس کا لینا اذیت ہی اذیت ہے
محبت درحقیقت ایک طوفانِ مصیبت ہے

---

[1] یہ محترمہ کی آخری غزل ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے ایک ہفتہ پہلے یعنی ۱۶ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کی رات کو لکھی تھی۔

ملوں یوں خاک میں گم ہر نشاں میرا زمیں پر ہو
نہ سبزہ ہو، نہ مرقد ہو، نہ پھولوں ہی کی چادر ہو
مجاورِ بے نشانی، بے کسی مرقد پہ آ کر ہو
کمر بستہ مری بربادیوں پر بادِ صرصر ہو
فلک تربت کی مٹی تک ہواؤں سے اڑا دینا
شمیم نا ہو رکا تو نشاں بھی اب مٹا دینا

عشق حقیقی کی تڑپ

وہ عطا کر عشق اے پروردگار
بیقراری جس میں ہو لیل و نہار
ہر گھڑی لب پر تری ہی یاد ہو
یاد سے تیری مرا دل شاد ہو
سازِ ہستی گر مرا چھیڑے کوئی
تو صدا نکلے ترے ہی نام کی
پاسِ ذلت خوف رسوائی نہ ہو
ہجر میں تیرے شکیبائی نہ ہو
درد اٹھے گو جگر میں بار بار
پر نہوں اس درد سے میں بے قرار
استخواں جب جل کے ہیں خاک ہوں
بارشِ رحمت سے تیری پاک ہوں

منظر نگاری

ادھر آئی گھنگھور کالی گھٹا
ادھر رعد نے دی کڑک کر صدا
کہیں پڑ رہی ہلکی ہلکی پھوار
کسی جا پہ قوس قزح کی بہار
سب جو وہ سرخاب و مرغابیاں
دکھاتی ہیں قدرت کی نیرنگیاں

کہیں سیوطی ہے کہیں نیلوفر کہیں ہے کنول سطح آب پر
کھلے ہیں کہیں پھول نیلوفری کہیں رنگ دکھلاتی ہے کیتکی
کہیں لالہ ہے زینتِ صحنِ باغ جسے دیکھو لالہ رخوں کو ہے داغ
کہیں عشق پیچاں کسی جا گلاب چمن پر غرض ہے عجب آب و تاب
تری کلکِ قدرت کی گل کاریاں ہر اک پھول پتی ہیں یہ بھی عیاں
شمیمِ جگر خستہ خاموش بس
ہے اللہ بس اور باقی ہوس

ملی، وطنی اور سیاسی رنگ

ہے تقاضائے جگر شکوہ بیداد کروں قیدِ غم سے دلِ پُر درد کو آزاد کروں
تا کجا ضبط سے خونِ دلِ ناشاد کروں درد کہتا ہے کہ دل کھول کے فریاد کروں
دل کی فریاد ہے بنیادِ جہاں ہلتی ہے
ہاں سنبھل جاؤ کہ اب میری زباں کھلتی ہے

له طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کی ہمرنگی ملاحظہ ہو۔ علامہ اقبال رح
کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو (شکوہ)

اپنے ہاتھوں سے اُجاڑا گیا گلشن اپنا — آپ بلبل نے جلایا ہے نشیمن اپنا
جھوٹ ہے سب کہ زمانہ ہوا دشمن اپنا — ہم نے تاراج کیا آپ ہی مسکن اپنا

اب نہ وہ جام ہے اپنا نہ وہ میخانہ ہے
غیر کی بزم ہے، اور غیر کا میخانہ ہے

اب نہ پہلی سی حمیت ہے نہ ہم میں غیرت — نہ وہ احساسِ اخوت ہے نہ جوشِ الفت
نہ وہ خودداریاں باقی ہیں نہ اب عزت — ہر طرف دَور میں ہے جامِ شرابِ غفلت

سب تو دنیا میں بلندی پہ چڑھے جاتے ہیں
اک فقط ہم ہیں کہ پستی میں گرے جاتے ہیں

تم نے اسلاف کی عادات کو چھوڑا یکسر — تم میں باقی نہیں اب میل و محبت کا اثر
مسجدوں میں کہیں جھگڑا تو کہیں مندر پر — مسجدیں بن گئیں دنگل تو اکھاڑے مندر

اپنے ہاتھوں سے کنوئیں کھودتے ہو اپنے لئے
جال کے پھندوں کو خود کستے ہو پھنسنے کے لئے [1]

اب بھی گر ہوش میں آؤ تو نہیں کچھ بگڑا — چھوڑ دو اب بھی یہ آپس کی لڑائی جھگڑا
مل کے اک ساتھ کرو زور سرا پا چھوٹا بڑا — آن کی آن میں ہو پار تمھارا بیڑا

---

[1] علامہ اقبالؒ

خودکشی شیوہ تمھارا وہ غیور و خوددار — تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی (جوابِ شکوہ)

خوفِ گلچیں ہو نہ اندیشۂ صیاد رہے
چمن آباد ہو بلبل اگر آزاد رہے

شمیم جالندھری

محترمہ ش۔ ا۔ شمیم جالندھر کی شاعرہ ہیں۔ حمد و نعت و منقبت آپ کے خاص موضوع ہیں۔ کلام سے حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کا رنگ جھلکتا ہے، کلام میں صفائی، روانی، اور متانت موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

"میلاد النبی صلعم"

آج وہ دن ہے، کہ برسا آسماں سے ابرِ نور
آج کس دن جوش پر تھی رحمتِ ربِّ غفور

آج یثرب میں کیا شاہِ دو عالم نے ظہور
ہو گیا روشن خدا کے نور سے نزدیک و دور

قل ھو اللہ احد سے گونج اٹھا بت کدہ [1]
بجھ گیا ایران کا جلتا ہوا آتش کدہ [2]

شعبدے گم ہو گئے شیطان بھی گھبرا گیا
جھک گئی باطل کی گردن کفر بھی شرما گیا

ہل گئے ایوانِ شاہی زلزلہ سا آ گیا
ہیبتِ بعثت تھی گویا اک جہاں تھرا گیا

نعرۂ اللہ اکبر کی صدا آنے لگی
برقِ وحدت کفر کے خرمن کو جھلسانے لگی

---

[1] علامہ اقبال رحمۃ: کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے ۔۔ منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے (شکوہ)

[2] " " کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایران کو ۔۔ کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزدان کو (بانگ درا)

شمیم ملیح آبادی

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی شاعرات حاضرہ کی صف اول میں ایک نہایت وقیع اور نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کے خود نوشتہ حالات جو آپ نے اس تذکرہ کے لئے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:-

"میرا وطن ملیح آباد ضلع لکھنؤ ہے میرے مورث اعلیٰ نواب فقیر محمد خاں صاحب گویا تھے جو افواج اودھ کے رسالدار تھے اور تہوّر جنگ حسام الدولہ کے خطابات پائے میرے نانا صاحب نواب بشیر احمد خاں صاحب بشیر (تعلقہ دار ملیح آباد) تھے۔ آپ بھی صاحب دیوان تھے اور غیر معمولی شہرت کے مالک تھے۔

میرے حقیقی ماموں صاحب جناب شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ حقیقت تعجب خیز ہوگی کہ آپ نے میرے ایک شعر کو بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھا افسوس اس میں ان کی مصروفیت ہمیشہ حائل رہی۔

میری تاریخ ولادت ۲۷ مارچ ۱۹۲۰ء ہے۔ مجھے دس سال کی عمر سے شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ میں نے چند سال مسلم گرلز اسکول میں تعلیم پائی پھر گھر پہ شوقِ علم پورا کرتی رہی۔

میرا عموماً قیام لکھنؤ میں رہا اور یہیں کی علمی صحبتوں اور ادبی مجلسوں نے میرے ذوقِ شعری کو پیدا کیا۔"

صفیہ شمیم ملیح آبادی

۱۴ فروری ۱۹۴۲ء۔ لکھنؤ"

محترمہ شمیم ملیح آبادی ایک تعلیم یافتہ، بالغ نظر، عالی حوصلہ اور ادب دوست خاتون ہیں اور عصرِ حاضر میں اُردو کی ایک نہایت زبردست اور نامور شاعرہ ہیں، آپ کی شاعری کی ابتداء سنہ ۱۹۳۰ء سے ہوتی ہے، شاعری کا ذوق فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، پھر آپ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جس میں جوش جیسا زبردست شاعر موجود تھا، جس کے پختہ آرٹ اور جوان نغموں نے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، یہ صحیح ہے کہ محترمہ کی شاعرانہ تربیت جوش کی کسی شعوری کوشش کی منّت کش نہیں۔ جیسا کہ محترمہ نے خود اپنے حالات میں تحریر فرمایا ہے پھر بھی غیر شعوری طور پر جوش نے صرف اپنے ماحول سے جس قدر محترمہ شمیم ملیح آبادی کو متاثر کیا ہے اس کا ثبوت محترمہ کے کلام سے بخوبی ملتا ہے۔

یوں تو اس دور کی اکثر شاعرات جوش کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں مگر ان کے یہاں آرٹ کی وہ پختگی اور جذبات کی وہ لطافت موجود نہیں جو محترمہ شمیم ملیح آبادی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ آپ نے جس پختہ اور دلکش آرٹ کا نمونہ پیش کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

محترمہ کے کلام کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت محاکات کا حسن ہے اس سلسلہ میں جوش کی طرح محترمہ بھی نہایت نادر و لطیف، نہایت نازک و شاعرانہ تشبیہات کا استعمال کرتی ہیں، خصوصاً مناظرِ فطرت کی تصویر کشی میں جذباتِ انسانی کا امتزاج محترمہ کا کمال ہے جس سے منظر اور بھی

زیادہ دلکش اور ذی حیات بنجاتا ہے، یوں بھی صحیح معنوں میں محاکات کوئی آسان چیز نہیں مگر اس میں جذبات کی آمیزش نہایت دشوار آرٹ ہے اور محترمہ اس میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔

ادب اور خصوصاً شاعری کی بنیاد جذبات پر قائم ہے، جذبات جس قدر حقیقی، جس قدر گہرے اور شدید ہوتے ہیں اور جس قدر سچائی سے ساتھ ذاتی و شخصی طور پر محسوس کئے جاتے ہیں اُسی قدر اس ادب یا شاعری کا درجہ بلند ہوتا ہے، محترمہ شمیم ملیح آبادی کے کلام میں شدید اور تڑپتے ہوئے جذبات کا ایک ہجوم ہے، محسوسات و وارداتِ قلبی کی ایک دنیا ہے جس نے ان کے اشعار کو نہایت بلند اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

محترمہ کے نغمے کیف اور رومان کی فضاؤں میں پلے ہیں، اور کیف و رومان کی فضاؤں کے حامل ہیں، ان میں محبّت کا کیف اور جذبات کی نرمی ہے ان کا سوز و گداز اور درد و اثر نہایت دلدوز ہے۔

ساتھ ہی ساتھ محترمہ نے حقایق اور زندگی کے گہرے مسئلوں کی طرف بھی توجّہ کی ہے۔ انھوں نے انسان کی بلندی پر بھی غور کیا ہے اور اس بلندی کے حصول کے لئے اس کو دعوتِ پیکار و عمل بھی دی ہے، ان کا دل اپنے ملک کی زبوں حالی پر بھی دکھا ہے اور ان کی آنکھ اپنے ہموطنوں کی خستہ حالی اور فاقہ مستی پر بھی روئی ہے۔

سطور ذیل میں محترمہ شمیم ملیح آبادی کا مرسلہ انتخاب کلام درج کیا جاتا ہے:۔

منتخب اشعار

عالی ظرفی و بلند حوصلگی[1]

گلستاں کا ہر پھول دل بن کے مہکے — اگر ایک اشکِ تمنا گرا دوں
اگر چھیڑ دوں ساز خلوت میں تیری — چراغوں کو طاقِ حرم سے گرا دوں
اجل بھی میرے غم پہ آنسو بہائے — اگر نالۂ زندگانی سنا دوں

یہ کیا خیال کوئی نہیں ناخدا تو کیا — کشتی سپردِ شورشِ طوفاں تو کیجئے
گر ہے نئے نظام کی تخلیق کا خیال — آبادیوں کو نذرِ بیاباں تو کیجئے
گر جلوۂ جمال کی دل کو ہے آرزو — اشکوں سے چشم شوق چراغاں تو کیجئے
ہوتا ہے دردِ عشق سے گر لذت آشنا — دل کو خرابِ تلخیٔ ہجراں تو کیجئے

اک لمحۂ نشاط کی گر ہے ہوس شمیم
دل کو ہلاکِ حسرت و ارماں تو کیجئے

نہ ہے موت ہی شاید غمِ ہستی سے رہائی — ہستی تو ہے اک صورتِ زنداں مر کے گئے

گر ہے سکوں کی آرزو سوئے سکوں کبھی نہ دیکھ
خاروں سے لے خلش کا لطف پھولوں کی تازگی نہ دیکھ

---

[1] عنوانات میرے ہیں۔ جمیل

ٹوٹے دلوں کی سن صدا نغمۂ عیش روک کر
سوئے گدا نظر اٹھا شانِ سکندری نہ دیکھ
صرف اجل ہی زیست کا کرتی ہے قائم اعتبار
شکلِ اجل نظر میں رکھ جانبِ زندگی نہ دیکھ
دل ہی میں اس کو پائے گا پہلے وسیع کر نظر
دیر و حرم کی سمت تو بھول کے بھی کبھی نہ دیکھ
اوجِ خودی بڑھائے جا سجدوں میں سر جھکائے جا
لذتِ بندگی اٹھا پستیٔ بندگی نہ دیکھ

کھولوں زباں جو ساری خدائی لرز اٹھے
وہ راز اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہوں میں

وہ ہم کہ شکوۂ جورِ بتاں نہیں رکھتے
وفا تو کیا ہے جفا کا گماں نہیں رکھتے
یہ وضعداریٔ اہلِ وفا کوئی دیکھے
گلے تو رکھتے ہیں لیکن زباں نہیں رکھتے
ترے خیال کی وسعت ارے معاذ اللہ
کہ دل میں آرزوئے دو جہاں نہیں رکھتے
نہ لطفِ برق سے واقف نہ زورِ طوفاں سے
جو بدنصیب کوئی آشیاں نہیں رکھتے
سنا نہ عہدِ طرب کی کہانیاں ہمدم
کہ دل میں طاقتِ آہ و فغاں نہیں رکھتے

جذبات نگاری

مری زندگی کے طرب ناک نغمے ترے غم میں آنسو ہوئے جا رہے ہیں
نہ پوچھ آہ دنیا تری انجمن سے تمنائیں کیا کیا لئے جا رہے ہیں

کر دیا بادِ خزاں نے خاک سارا گلستاں لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لئے

یہ کیسی بے کسی ہے یہ کیسی نامرادی کیا ختم ہو گئے ہیں لمحے مری خوشی کے

چھلک نہ جائے سبوئے حیات اپنا کہیں دمِ وداع ان آنکھوں کو اشکبار نہ کر

چھٹ جائے زندگی کا نہ داماں ترے بغیر ہستی کا ہو نہ ترا آنا کہیں خموش

اے ہمنشیں نہ چھیڑ حکایاتِ رنگ و بو مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو

نفرت سی ہو چلی ہے خموشی سے ان دنوں پھر دل کو شوقِ عرضِ شکایت ہے آج کل

ناممکنات

جیسے پتھر کو کوئی ہیرا بنا سکتا نہیں جیسے کانٹا صورتِ گل مسکرا سکتا نہیں
جیسے ناممکن ہے انگاروں کا بن جانا گلاب جیسے کوئی زہر کو امرت بنا سکتا نہیں

جیسے دن کو دے نہیں سکتے ستارے روشنی
جیسے کوئی وسعتِ گردوں کو پا سکتا نہیں

جیسے چل سکتا نہیں بس زندگی کا موت پر
جیسے انساں عقدۂ ارواح پا سکتا نہیں

جس طرح بہکا نہیں سکتا نسیم کوئی
جس طرح دن، شب کی سی ظلمت دکھا سکتا نہیں

چھیننا جس طرح ناممکن ہے گرمی آگ سے
جیسے کوئی آگ پانی میں لگا سکتا نہیں

جیسے پتھریلی چٹانوں پر نہیں ملتے گہر
جیسے کوئی چاند کی تابش چرا سکتا نہیں

جیسے کوئی قید کر سکتا نہیں مہتاب کو
جیسے کوئی آسماں کا سر جھکا سکتا نہیں

جس طرح ہے تم کو میرا یاد فرمانا محال
دل مرا یوں ہی کبھی تم کو بھلا سکتا نہیں

انسانی عظمت کا احساس

میرے لئے

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لئے
نغمہ سرا ہیں مرغ خوش الحاں مرے لئے

روشن ہے میرے واسطے قندیلِ مہر و ماہ
تارے ہیں اوجِ چرخ پہ رقصاں مرے لئے

کھلتے ہیں میرے واسطے گل ہائے نو بہ نو
شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے

چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے
آتا ہے روز ابرِ بہاراں مرے لئے

کرتی ہے نذر اوس کے موتی خموش رات
گلشن کا عطر بیز ہے داماں مرے لئے

رخسارِ گل پہ میرے لئے مضطرب ہے رنگ
روئے گہر میں آب ہے غلطاں مرے لئے

کھلتی ہے میرے واسطے شفاف چاندنی
انوار بار ہے مہِ تاباں مرے لئے

ہر شاخِ گل ہے جام بکف میرے واسطے
لبریز ہے گلوں سے بیاباں مرے لئے

ساری ہے ایک روحِ بقا کائنات میں جاری ہیں لاکھ چشمۂ حیواں مرے لئے
ہوتا ہے دن کا چہرہ مری خاطر آشکار رہتی ہے شب کی زلفِ پریشاں مرے لئے
میرے لئے وجود میں آیا ہے کل جہاں
پیدا ہے میرے واسطے پنہاں مرے لئے

نسوانی فطرت کی عظمت کا احساس

"عورت سے"

حلقۂ ظلمات میں شمعیں جلا سکتی ہے تو زندگی کی تیرہ شب کو دن بنا سکتی ہے تو
اللہ اللہ تیرے حسن و رنگ کی تابانیاں حاملانِ عرش کو حیراں بنا سکتی ہے تو
یاس کی شکلیں، الم کی صورتیں، غم کا وجود ایک ہلکی مسکراہٹ سے مٹا سکتی ہے تو
گر و ہیں اربابِ دولت کی شہنشاہوں کے سر بارگاہِ حسن میں اپنی جھکا سکتی ہے تو
مسکراہٹ سے ستاروں کے اڑا سکتی ہے ہوش قدسیوں کے عزم کی تعمیر ڈھا سکتی ہے تو
اک اشارے سے بدل سکتی ہے عالم کا نظام اک صدا سے ساری دنیا کو جگا سکتی ہے تو
آج بھی قسمت پلٹ سکتی ہے تو اقوام کی آج بھی ہر فرد کو ارجن بنا سکتی ہے تو
قلعۂ ظلم و ستم کی تو اڑا سکتی ہے خاک قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھا سکتی ہے تو
آہنی تیرے ارادے عزم طوفانی ترے راہِ ہمت میں بھلا کب ہچکچا سکتی ہے تو
اپنے دلبندوں کو بے کھٹکے چڑھا کر بھینٹ کی طورِ قربانی کے دنیا کو دکھا سکتی ہے تو
ہیں تمام اربابِ ہمت تیری گودوں کے پلے کب قدم میدانِ ہمت سے ہٹا سکتی ہے تو
دستِ نازک سے الٹ سکتی ہے دنیا ظلم کی دھجیاں سرمایہ داری کی اڑا سکتی ہے تو

خالدہ و حیدر سے ناتح پھر جنم لینے لگیں
یہ کرشمہ اب بھی دُنیا کو دکھا سکتی ہے تو
جو زمیں کیا، آسمانوں سے نہ ہرگز اٹھ سکے
بوجھ وہ کمزور شانوں پر اٹھا سکتی ہے تو

آج بھی بیدار کر سکتی ہے تو اقوام کو !
آج بھی ہر ملک کی قسمت جگا سکتی ہے تو !

محاکات

برسات کی چاندنی رات

یہ برشگال کی برسی ہوئی سنہری رات
یہ بوئے عود سے مہکی ہوئی سنہری رات
یہ چاندنی یہ فضائیں یہ وادیوں کی بہار
گماں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار
یہ زرنگار فضائیں یہ جوشِ نکہت و نور
زمیں ہے وجد میں طاری ہے آسماں پہ سرور
یہ چاندنی یہ چٹکتے ہوئے سبک غنچے
یہ بوئے عود سے مہکے ہوئے خنک جھونکے
یہ آبشار کے نغمے یہ تیتیوں کے ستار
چھڑک رہا ہے ہر اک شے میں زندگی کا شرار
جبینِ ناز ہے روشن عروسِ فطرت کی
ہوائیں چلتی ہیں گلشن میں باغِ جنت کی

یہ جوشِ حسن، فروغِ بہار، کیا کہنا
یہ چاندنی یہ لبِ جوئے بار کیا کہنا

نکھر رہا ہے ہر اک رنگ زندگانی کا
سحرِ حیات پہ ہے تاج شادمانی کا
یہ بزم سازِ طرب، یہ بہار کیا کہنا
یہ گنگناتے ہوئے آبشار کیا کہنا
یہ مسکراتی ہوئی رات یہ خمارِ طرب
یہ چاندنی یہ فضائیے یہ بہارِ طرب

نہیں ہے تو جوشِ نشاطِ بہار کچھ بھی نہیں
دلِ حزیں میں بجز اضطرار کچھ بھی نہیں

رباعیات

خالی ہے تمناؤں سے سینہ اپنا
بے آب سا ہے دل کا نگینہ اپنا
خاموش ہیں موجیں تو ہوائیں ساکت
طوفان کا طالب ہے سفینہ اپنا

شب کو کوئی فریاد کیا کرتا ہے
دن عیش کے برباد کیا کرتا ہے
اُس دورِ نشاط عہدِ عشرت میں صبا
ہم کو بھی کوئی یاد کیا کرتا ہے

دل وحشت کے دھارے میں بہا جاتا ہے
ماضی کا ہر اک نقش مٹا جاتا ہے
رنگینیٔ فطرت سے ہر اک لمحۂ زیست
فردوس کا اک خواب ہوا جاتا ہے

محترمہ کا مزید انتخاب کلام جو راقم الحروف کا کیا ہوا ہے درج ذیل ہے:۔

محاکات

رومان آفریں رات

بھینی بھینی ہوائیں نم سی فضا
کس قدر سین ہے نشاط افزا
یہ مچلتی ہیں چاندنی کرنیں
دودھ کی بہہ رہی ہیں یا نہریں
سبزہ زاروں کی دور تک ہے بہار
ہے گلوں پر جوانیوں کا نکھار

موجیں چھلکی ہوئی ہیں پانی کی — کان پگھلی ہوئی ہے چاندی کی
مہکی مہکی فضا، لطیف سماں — چرخ پر ہنس رہا ہے ماہِ رواں
نکھرے نکھرے مناظرِ قدرت — نم فضائیں ہواؤں میں فرحت
نرم کلیاں لطیف تر گھانسیں — لے رہی ہیں عجب طرح سانسیں
ہنس رہے ہیں گلاب کے غنچے — متبسّم ہیں چرخ پر تارے
بزمِ قدرت پہ کیف طاری تھے — چاند کا فیضِ عام جاری ہے
سارا عالم رہینِ عشرت ہے — نور ہے مستیاں ہیں نکہت ہے
جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں — چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں
بے خبر فکر سے ہے روحِ حزیں — سانس ہر ایک ہے نشاط آگیں
ہے ضیا تا بسیطِ ارض و سما — پھوٹ نکلا ہے نور کا دریا

یہ فضائیں گلوں کی یہ بو باس
اب بھی لیکن شمیمؔ دل ہے اداس

ایک حسرت

پُرکیف ہو جب دنیائے چمن اور ہر سو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں ہوں وجد میں جب گلپوش شجر
جب محوِ تزئیں ہو عالم، گل صحرا کو مہکاتے ہوں
جب کھیت ہواؤں کی رو سے میدانوں میں لہراتے ہوں
روشن ہو زمیں کا جب سینہ، جب حسن فلک کا سونا ہو

لیلائے شب کے دامن میں اک آدھ ستارا ہوتا ہو
جب نہروں اور تالابوں پر ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم ہو موتی، ہر ذرّۂ خاکی لعل و گہر
آراستہ ہو سلمائے جہاں جب نور کے دلکش زیور سے
پُرنور ہو جب تاریک فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت ہٹا کے پردوں کو تو کاش چمن میں در آئے
ہستی کا مری ذرّہ ذرّہ تصویرِ مسرّت بن جائے[۱]

ملکۂ صبح!

آ رہی ہے صبح کی ملکہ وہ بل کھاتی ہوئی
صبح کا خاموش نغمہ زیرِ لب گاتی ہوئی
نور کے زرّیں سمندر میں ڈبوتی کائنات
آ رہی ہے صبح رخ سے زلف سرکاتی ہوئی

---

[۱] جوشؔ ملیح آبادی

غلطاں ہے سبو میں عکس انجم ساقی　　دریا میں ہے چاند سے تلاطم ساقی
اس وقت نظر ملا کے دم بھر کے لئے　　میں تیرے نثار ایک تبسم ساقی

جھاڑیوں سے جھانکتی شاخوں سے اٹھلاتی ہوئی
آ رہی ہے تاج پہنے صبح بل کھاتی ہوئی
ہر شجر کی چوٹیوں کو جگمگاتی۔ جھومتی
آ رہی ہے صبح سیمیں نور پھیلاتی ہوئی
نہر کی خوابیدہ موجوں کو جگاتی۔ چھیڑتی
آ رہی ہے صبح، دل کلیوں کے چٹکاتی ہوئی
نہر سے آنکھیں لڑاتی تھرتھراتی، کودتی
آ رہی ہے ہر قدم پہ ناز فرماتی ہوئی
اہلِ عالم کو پیامِ زندگی دیتی ہوئی
ناامیدوں کو خوشی کے خواب دکھلاتی ہوئی
محفلِ گلشن کو دیتی صبح بیداری کا حکم
قطرۂ شبنم کو ضو سے اپنی جھلکاتی ہوئی
کھیتیوں پر برق کی سی لہر دوڑاتی ہوئی
ولولے دل میں اٹھاتی زیرِ لب گاتی ہوئی
خامشی کا تار ٹوٹا چھڑ گئے نغمے نئے
محفلِ صحرا میں آئی صبح بل کھاتی ہوئی
لہر موسیقی اٹھاتی گلشنِ خاموش میں
آ رہی ہے صبح راگِ زندگی گاتی ہوئی
جھاڑیوں سے مسکراتی آ گئی صبحِ بہار

پھر شمیم مبتلا کی روح چونکاتی ہوئی

آرزوئے دل

جہاں اخلاص کے چشمے رواں ہوں
محبت کے جہاں گلشن جواں ہوں
جہاں عیش و طرب شام و سحر ہو
جہاں کا ذرہ ذرہ نغمہ گر ہو
جہاں غم کی نہ دیوی کا گذر ہو
نئے ارض و سما شمس و قمر ہو
جہاں ہر سمت ہو گل ریز جنگل
جہاں جھومیں گلستانوں پہ بادل
جہاں آتے لرزتی ہو خزاں بھی
نہ ہو افکار کا جس جا نشاں بھی
جہاں سایہ فگن ہو ابرِ رحمت
جہاں مسدود ہو تخلیقِ نفرت
جہاں ہو سادگی میں اک نزاکت
جہاں آنکھوں میں ہو روحِ مروت
جہاں ذرات کے منہ میں زباں ہو
جہاں مہر و وفا ہی کا جہاں ہو
جہاں عشرت کی دیوی جلوہ گر ہو
غمِ فردا سے ہر دل بیخبر ہو
جہاں زر کا نہ ہو کوئی پجاری
جہاں دریا محبت کے ہوں جاری
برستے ہوں جہاں راحت کے موتی
جہاں افسردہ خاطر ہو نہ کوئی
اب ایسی سرزمیں کی آرزو ہے
اب اس رنگیں فضا کی جستجو ہے

جذبات نگاری

بارگاہ جمال میں

اے خندہ بہار بیاباں کو چھوڑ دے
اے حسن ایک کشتہ حرماں کو چھوڑ دے

اے غنچۂ بہار خزاں کی ہوس نہ کر
اے ماہتاب رات کے داماں کو چھوڑ دے

اے خلد آرزوئے جہنم ہے کس لئے
اے سبزہ زار خارِ مغیلاں کو چھوڑ دے

دل سے بھلا دے یاد کسی نامراد کی
گر ہو سکے تو عشق کے ارماں کو چھوڑ دے

ہدیۂ برق و شرارہ

قرار دے نہ اگر، بیقرار ہی کر دے
خوشی محال سہی اشکبار ہی کر دے

مرے چمن کے نصیبوں میں گر بہار نہیں
تو اس کو ہدیۂ برق و شرار ہی کر دے[1]

وفا نہ ہو نہ ہو، وعدہ تو کر لے آنے کا
مجھے رہینِ غمِ انتظار ہی کر دے[2]

دل گرفتہ کو اے مالکِ جمال و بہار
شگفتہ گل نہیں کرتا تو خار ہی کر دے

اگر ہے میرے لئے لطفِ زندگی مفقود
تو پھر فنا سے مجھے ہمکنار ہی کر دے

دریچے میرے لئے بند ہیں خوشی کے اگر
دلِ شکستہ کو غم کا شکار ہی کر دے

نہیں جاتی[3]

بگولے لاکھ اٹھیں شعلہ سامانی نہیں جاتی
سحر تک شمع محفل کی درخشانی نہیں جاتی

---

[1] علامہ اقبالؒ ۔ نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو ۔ اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر (بالِ جبریل)

[2] " " ۔ نہ آتے نہیں اس میں تکرار کیا تھی ۔ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی (بانگِ درا)

[3] محترمہ کی یہ غزل قابلِ تحسین ہے خصوصاً پانچواں شعر تو تعریف سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جسے شیخ و برہمن نے عجب سانچے میں ڈھالا ہے
وہ شے محسوس تو ہوتی ہے پہچانی نہیں جاتی
قمر بے نور ہو جائے تبسم چھوڑ دیں غنچے
بدل جائے زمانہ خوئے انسانی نہیں جاتی
بہاریں آئی بھی اور ہو گئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی[1]

[پچھلے صفحہ سے] بالاتر ہے۔ اس زمین میں مولانا اصغر گونڈوی نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت عمدہ غزل کہی ہے۔ یہ غزل اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی تھی ملاحظہ ہو:-

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

نمودِ جلوۂ بیرنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پتہ ملتا نہیں اب آتش وادی ایمن کا
مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

مگر اک مشتِ پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے،
ابھی تک شاخِ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اُڑا دیتا ہوں اب بھی تار تار ہست و بود اصغر
لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی (سرودِ زندگی)

---

[1] فیض احمد فیض ے کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
(نقش فریادی ص۱۱)

کسی کا نام سُن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

مری فکرِ رسا گرمِ سفر ہے ایسے عالم میں
جہاں کی وسعتوں تک عقل انسانی نہیں جاتی

مری باغی تمنائیں الٹ دیں گی زمانے کو
ہے جب تک زندگانی شعلہ سامانی نہیں جاتی

شمیمؔ حالات نے گو کر دیا باغی زمانے سے
مگر باتوں سے تیری بوئے انسانی نہیں جاتی

کیوں

آئیں مرے خیال میں وہ بار بار کیوں　　خوابوں میں آ کے روز کریں بیقرار کیوں

* وہ حسرتِ بہارِ وہ طوفانِ زندگی　　آتا ہے پھر رُلانے کو ابرِ بہار کیوں

* آلام و غم کے تند حوادث کے واسطے　　آتا لطیف دل مرے پروردگار کیوں[1]

ترکِ وفا کے ساتھ ہو ترکِ خیال بھی　　آتے ہو اب خیال میں بھی بار بار کیوں

وہ دن گذر گئے وہ زمانہ نہیں رہا　　پھر اُن کی یاد لے دلِ امیدوار کیوں

---

[1] غالبؔ ۔ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا :: دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے
میرؔ ۔ کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں :: ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں
* اس غزل کے یہ اشعار محترمہ نے اپنے انتخاب میں ارسال فرمائے ہیں "ج"

جب زندگی کا موت سے رشتہ ہے منسلک
پھر ہمنشیں ہے خطرۂ لیل و نہار کیوں

مطرب یہ زیر لحن ہے یا کرب ساز ہے
رگ رگ میں بجلیاں ہیں مری بیقرار کیوں

٭ جب ربط و ضبط حسن و محبت نہیں رہا
ہے بار دوش ہستی ناپائدار کیوں

مدت ہوئی وہ نقشۂ دل ہی بدل گیا
اب چھیڑتے ہو ساز محبت کے تار کیوں

وہ شورش نشاط نہ سامان زندگی
اب کی چمن میں آئی عروس بہار کیوں

باب کرم میں جب ترے لفظ ستم نہ تھا
بنیاد زیست ڈال دی پروردگار کیوں

٭ رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ مگر شمیم
اس کا گلہ ہے آئی چمن میں بہار کیوں

نہ پوچھیے

کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں نہ پوچھیے
دیکھا ہے جو وہ خواب پریشاں نہ پوچھیے
کیونکر ہوا ہے درد بھی درماں نہ پوچھیے
مشکل ہوئی ہے کس طرح آساں نہ پوچھیے
اہل خرد! تلطّف یزداں کے باوجود
بیچارگی حضرت انساں نہ پوچھیے
دیوانگی میں جیب گریباں ہے چاک چاک
بیگانگی حسن گریزاں نہ پوچھیے
دل میں کہاں ہے طاقت نظارۂ جمال

اب دل سے لطفِ صبحِ بہاراں نہ پوچھئے

فرصت نہیں ہے نالۂ شبگیر سے یہاں

اب لذتِ سرودِ ہزاراں نہ پوچھئے

وقتِ سفر تسلیٔ پیہم کے باوجود

کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے [1]

پرتو سے جس کے ماند ہیں انوارِ ماہتاب

تاریک زندگی کا وہ عنواں نہ پوچھئے

سایہ میں نکہتوں کے شبِ ماہتاب میں

وہ آب و تابِ جلوۂ خوباں نہ پوچھئے

چہرہ عرق عرق، وہ ادائیں تھکی تھکی

نظارۂ جمالِ پشیماں نہ پوچھئے [2]

---

[1] جگر مرادآبادی

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں　　مگر دل ہے کہ پھر گھبرا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں　　محبت کا زمانہ آ رہا ہے

[2] - "ان تھکی تھکی اداؤں" کی طرح جوش ملیح آبادی نے ایک جگہ "تھکی سی دلبری" اس طرح نظم کیا ہے

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری :: ایک بجھا سا تبسم اک تھکی سی دلبری

جگر مرادآبادی نے اس جمالِ پشیماں کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے

چشم پرنم، زلف آشفتہ، نگاہیں بے قرار :: اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

وقت طلوعِ جلوۂ اسرار کی قسم
کیا دیکھتی ہے چشم پریشاں نہ پوچھئے
فرصت سی ہو گئی ہے غمِ روزگار سے
کیا کیا ہیں دل میں حسرت وارماں نہ پوچھئے
الہام کا نزول جب ہوتا ہے ذہن پر
اس دم مقامِ روحِ غزل خواں نہ پوچھئے
مستقبلِ شمیم ہے جس سے ضیا فگن
وہ دل فریب خوابِ پریشاں نہ پوچھئے

کامراں، کامگار ہیں ہم لوگ　　ناشناسِ قرار ہیں ہم لوگ
اک بجھا سا چراغِ حسرت ہیں　　اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ
ہم سے زندہ ہے گلستانِ ادب　　گو خرابِ بہار ہیں ہم لوگ
فکر میں بھی شگفتہ دل ہیں ہم　　غم میں بھی نغمہ بار ہیں ہم لوگ
ہیں جہاں کیلئے پیامِ سکوں　　خود مگر بے قرار ہیں ہم لوگ

شاعرہ کی موت

زیست میری جب فنا کی گود میں سو جائے گی
جب متاعِ زندگی اے ہمنشیں کھو جائے گی
موت کے ہاتھوں اُجڑ جائے گا جب باغِ حیات

روحِ غم دنیا کے اندیشوں سے پائے گی نجات
منھ پہ جب احساس کے پڑ جائے گی کالی نقاب
آرزوؤں کا مری جب ٹوٹ جائے گا رباب
سانس کا جب ٹوٹ جائے گا یہ رنگیں سلسلہ
قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

انجمن پھولوں کی ہو گی نوحہ خواں میرے بغیر
ہو گی دیوی صبح کی حسرت فشاں میرے بغیر
ہر خس و خاشاک میں جب تازگی آ جائے گی
عارضِ قدرت پہ مایوسی اک چھا جائے گی
یاس آگیں راگنی تالاب کی ہو جائے گی
ہنسنے والی ہر کلی مایوس سی ہو جائے گی
چشمِ باراں خون کے آنسو شب کو جب ٹپکائے گی
روح میری آسمانوں پہ بہت گھبرائے گی
نور سا روئے شفق کا دیکھنا اڑ جائے گا
میرے بن کوئل کا دل گھبرائے گا اکتائے گا
صبح کو چڑیاں جگانے کو بہت چلائیں گی
دیکھ کر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی
پھول فرقت میں مری ہو جائیں گے خستہ خراب

کھائے گی ہر شاخ میرے نام پر یوں پیچ و تاب
چاک دامانی کرے گی میرے بن جو نسیم
خاک اڑائے گی مری فرقت میں پھولوں کی شمیم

جستجو میں میری آوارہ پھرے گا ماہتاب
میرے بن تارے فلک پر ہوں گے غرقِ اضطراب

روئیں گی شبنم کی لڑیاں میرے غم میں زار زار
ذکر سے میرے نگارِ شب کو ہوگا اضطرار

قبر پر میری عجب دھومیں مچیں گی صبح و شام
گائیں گے بیدار کرنے کو طیورِ خوش کلام
میری فرقت میں دِوانی تتلیاں ہو جائیں گی
منتشر فرشِ زمیں پر پتیاں ہو جائیں گی

سسکیاں لیں گی مری تربت پہ زندہ حسرتیں
روئیں گی فرقت میں میری گلشنوں کی رونقیں

جب بھری برکھا میں سب مل کر ترانے گائیں گی
شوخیاں میری بہت سکھیوں کو یاد آ جائیں گی
میری الفت خیز باتوں کو بہت ترسیں گے کان
پر نہ پائے گا کوئی میری محبت کا نشان
باغ سے آئے گی جب غمگیں پپیہے کی پکار

یاد آجائے گی سکھیوں کو مری بے اختیار

جب کہانی ہو گی جاڑوں کی سنہری رات میں
یاد کریں گی مری سکھیاں مجھے ہر بات میں
جشنِ رنگیں ہوں گے جب وہ ہوں مچیں گی بے پناہ
یاد میں میری نکل جائیگی سب کے منھ سے "آہ"

موسمِ باراں میں ہر سو حُسن جب چھا جائے گا
ساتھ اشکوں کے مرا سب کو خیال آجائے گا

نوحہ خواں بزمِ صحافت ہو گی میرے ہجر میں
ہو گا اک طوفاں بپا ہندوستاں کے بحر میں
سبزۂ علم و ادب کچھ زرد سا ہو جائے گا
شاعری کا کچھ دنوں جیسے مزا کھو جائے گا
پُرالم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر
مشرقی بہنیں میری فرقت میں ہوں گی نوحہ گر
ذکر میرا جب کبھی بزمِ سخن میں آئے گا
ایک نشتر سا دلوں میں دفعتاً چُبھ جائے گا
شاعری کی بزم ہو جائے گی غمگیں بے قرار
لکھنوی بہنیں مری فرقت میں ہونگیں سوگوار
آئیں گے جب آسماں پر بادلوں کے قافلے

یادِ اہلِ ذوق کو آئیں گے میرے زمزمے
ہو گی فطرت غرقِ گریہ نوحہ خواں میرے لئے
کچھ دنوں تک روئے گا ہندوستاں میرے لئے
ایک دن پھر من چلی دنیا کو صبر آ جائے گا
قصرِ امیدوں کا اک تازہ بنایا جائے گا

ملک و قوم کی زبوں حالی کا احساس

رودادِ الم

نہ پوچھو ستم کیش ہندی کی حالت — حقیقت ہے یہ کچھ کہانی نہیں ہے
تبسّم کی قلّت تو ہے اس کرہ میں — مگر آنسوؤں کی گرانی نہیں ہے
نہ نالوں میں ڈھونڈو فراغت کی تانیں — یہاں نام کو شادمانی نہیں ہے
غریبوں کی محفل میں اک دن سنو تو — کوئی نے بجز نوحہ خوانی نہیں ہے
سسکتا جنازہ ہے کرب و بلا کا — غریبوں کی مفلس جوانی نہیں ہے
کوئی رات آئی نہ ایسی کہ جس میں — غریبوں کی خونی کہانی نہیں ہے
نہ پوچھو ستم کیش زندہ ہیں کیونکر — ہے سکرات یہ زندگانی نہیں ہے
ہوں جب تک میں زندہ بغاوت ہے زندہ — مرا جذبۂ صدق فانی نہیں ہے

دخترِ ہند

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار — خاک پہ بیٹھی ہوئی ہے دل فگار

چیتھڑوں سے جسمِ لاغر ہے ڈھکا — کائناتِ دل میں ہے محشر بپا
آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار — گیسوئے خمدار ہیں گرد و غبار
قلب ہیں الجھن پریشاں و حزیں — ایک کرتا زیبِ تن ہم آستیں
ایک کہنہ اوڑھنی اوڑھے ہوئے — جس کے سے آنچل جابجا ادھڑے ہوئے
اندرونی دکھ کی سچی داستاں — کہہ رہی ہے اس کی چشمِ خونفشاں
بیکسی ہے چارگی کا سر فراز — دستِ نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات - یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ اے ہندوستانِ خستہ حال — بھوک سے بیتاب ہوں لعلیں نیز لال
آہ اے جنت نشاں ہندوستاں — تو کہاں اور یہ تری حالت کہاں

کاش پلٹا کھائیں روز و ماہ و سال
تو ہو اور تیرا وہی جاہ و جلال

پیغامِ عمل

پیدا کر

شبِ تاریک سے انوارِ سحر پیدا کر — ذرے سے ذرے میں نئے شمس و قمر پیدا کر
زورِ شمشیر سے دنیا کی بدل دے تقدیر — قلبِ شبیر کا حیدر کا جگر پیدا کر
سرد ہے کب سے رگِ قومِ میں خونِ چنگیز — قلب میں پھر تپشِ برق و شرر پیدا کر
کب سے چھایا ہے فضاؤں پہ فلاکت کا غبار — ہند کی خاک سے پھر لعل و گہر پیدا کر

ذرّے ذرّے کو بنا آئینۂ حسنِ نگار
رنگِ زاروں میں بہارِ گل تر پیدا کر
قطرہ قطرہ میں اٹھا شورشِ طوفانِ حیات
موج ظلمات سے پھر آبِ خضر پیدا کر

شہناز

شہناز زیدی نام اور شہناز تخلص ہے۔ عصمت کی شاعرہ ہیں۔ اکثر اخلاقی مضامین نظم کرتی ہیں۔ کلام صاف اور طرزِ ادا دل آویز ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

دنیا کے مسافر سے

نہ چل بن کے ناداں ہیں پُر خار راہیں
کسی جا مسرت، کسی جا پہ آہیں
کہیں پر سُنے گا تو نغمگیں صدائیں
کہیں ایسے نوحے، جو دنیا ہلائیں

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

ہر اک حال میں بھائی ثابت قدم ہو
کسی دکھ سے تیرا ارادہ نہ کم ہو
کسی غم میں یہ چشم بینا نہ نم ہو
کسی کی خوشی نہ کسی کا الم ہو

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

نہ کر کچھ بھروسہ یہ دنیا ہے فانی
کسی کا نشانہ، کسی کی کہانی
پڑھا کچھ صفحہ پر سنا کچھ زبانی
جھپکتے ہی آنکھیں ختم زندگانی

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

نہ کر غم کسی کا، نہ ہو بے قراری
یہ دنیا ہماری ہوئی نہ تمھاری
نہ کر کوئی نوحہ۔ نہ نالہ نہ زاری
جو بیٹھا ہے اب کل چلے گی سواری

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

یہ دو چار دن کی جو ہے زندگانی　　مسرت میں ہو یا صعوبت اٹھانی
لڑکپن بڑھاپا کیا ہو نوجوانی　　خوشی سے بسر کر یہ دنیا ہے فانی

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

لڑکپن کی بھولی فضاؤں میں کھو جا　　جوانی کی الھڑ اداؤں میں کھو جا
بڑھاپے کی بیکس دعاؤں میں کھو جا　　تو کھو جا جہاں کی صداؤں میں کھو جا

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

شیریں

شیریں خانم نام اور شیریں تخلص ہے آپ کیپٹن عزیز کی شریکِ زندگی ہیں اکثر کلام رومان میں چھپتا تھا۔

آپ کا کلام بلند پایہ اور پُر کیف ہوتا ہے، بہت جذباتی رنگ میں لکھتی ہیں، کلام میں سوز و گداز اور حسرت و یاس کے دلائل موجود ہیں، زبان بہت شستہ اور صاف لکھتی ہیں۔ طرزِ ادا پاکیزہ اور دلکش ہے" کلام کا نمونہ یہ ہے:-

نوائے شیریں

میں ڈھونڈھتی ہوں تجھ کو فضائے بہار میں　　آ جلد آ کہ دل ہے ترے انتظار میں
برسوں کے شکوے چشم زدن میں بھلا دئے　　کتنا اثر تھا اس نگہِ شرمسار میں
عہدِ شباب ماتمِ امید الاماں　　فصلِ خزاں کا رنگ ہے فصلِ بہار میں

دن بھی طویل، رات بھی تاریک ہے فراق
کب تک نہ فرق آئے گا لیل و نہار میں

اے بیخودی خدا کے لئے ڈھونڈھنا مجھے
کھوئی گئی ہوں سایۂ ابرِ بہار میں

صیاد کر دے یا تو قفس سے ہمیں رہا
یا آشیاں کو آگ لگا دے بہار میں

تم اختیار میں جو نہیں ہو تو زور کیا
رونا یہ ہے کہ دل بھی نہیں اختیار میں

ہر گل کو بے خودی میں گلے سے لگالیا
شیریں کو کیا ہوا یہ ہجومِ بہار میں [۱]

ص

صغرا۔ حیدرآبادی۔

صغرا بیگم نام اور صغرا تخلص ہے، آپ مرزا محمد علی خاں مرحوم سابق صوبہ دار کی چھوٹی صاحبزادی ہیں آپ کے دادا مرزا موسیٰ خاں مرحوم سرکار آصفیہ کے پہلے ناظمِ تعلیمات تھے، اور چچا مرزا مہدی خاں کوکب اچھے شاعر اور حیدرآباد کے سب سے پہلے طالب علم تھے جنہوں نے یورپ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔

محترمہ صغرا بیگم کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ نے محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی۔ شادی کے بعد بنگال میں

---

[۱] محترمہ نجمہ تصدق ؎
جو منی بھرتی ہے ہر پھول کا عارض نجمہ
اس کو عکسِ رخِ گلفام دکھایا کیوں تھا

شانتی نکیتن کی سراپا شعر اور موسیقی کی رنگین فضاؤں میں کچھ عرصہ تک رہنا ہوا۔

خاندانی علمی ماحول کے علاوہ فطری رجحان کے باعث آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہے، آپ کی شادی ڈاکٹر امیر خاں المتخلص بہ ہاشم سے ہوئی ہے۔

آپ کے کلام میں سادگی و صفائی ہے۔ زبان سلیس لکھتی ہیں۔ آپ نے مناظرِ فطرت کی نقاشی اور جذبات نگاری دونوں پر قلم اٹھایا ہے طرزِ ادا دلکش اور پُر کیف ہے۔

خموشی سی عالم پہ جب چھا رہی تھی　　یں ہستی سے سوئے عدم جا رہی تھی
اُجالا جو گھٹتا تھا روئے زمیں پر　　گھڑی عمر کی بھی گھٹی جا رہی تھی
عجب کچھ وحشت انگیز تھا وہ سماں کہ　　میں صحرا نوردی سے گھبرا رہی تھی
اکیلی تھی میں اور ہمراہ ڈر تھا　　مجھے اپنی تنہائی دہلا رہی تھی
اور اس اپنی مجبوری و بیکسی پر　　زمین و زماں کو میں لرزا رہی تھی
جو میں ماہ نے اپنا جلوہ دکھایا　　میں چاندی کی لہروں میں تیر رہی تھی
وہ جگنو کی جگ مگ وہ تابش قمر کی　　جو حوروں کے جلوہ کو شرما رہی تھی
سہانا تھا دشت اور اُجلا سماں تھا　　جہاں بادِ صرصر بھی منڈلا رہی تھی
اور اس وقت میں مجھ کو رحمت خدا کی　　خوش آئند لوری سے بہلا رہی تھی
"نہیں ہے یہ ممکن تجھے بھول جاؤں"　　مجھے دھیمی دھیمی صدا آ رہی تھی
مجھے تھا گماں یہ کہ نا آشنا ہوں　　صدا سے بوئے آشنا آ رہی تھی
نہیں تھا یہ معلوم مجھ کو کہ کوئی　　مری بگڑی قسمت کو چمکا رہی تھی

غرض شانہ لطف سے شانِ رحمت
مری اُلجھی زلفوں کو سُلجھا رہی تھی

صفیہ۔ حیدرآبادی

صفیہ بیگم نام اور صفیہ تخلص ہے۔ آپ محمد صدیق حسین صاحب مہاجر کی دختر ہیں۔ صدیق حسین مرحوم نظام کالج حیدرآباد دکن میں پروفیسر تھے اور فارسی زبان میں شعر کہا کرتے تھے۔

محترمہ صفیہ صدیق کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ زنانہ اسکول نامپلی میں تعلیم پائی اور پھر کلیۂ اناث میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کی۔ اُردو کی خدمت گذاری کا شوق ہے۔ نظم، نثر اور ترجمہ کے ذریعہ سے آپ اس شوق کی تکمیل کرتی ہیں۔ اخبار پیام اور رسالہ شہاب وغیرہ میں آپ کی نظمیں اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور اپنے ان خیالات کی ترجمانی اکثر اپنے کلام میں بھی کرتی ہیں۔ کلام سے ابھی نومشقی ظاہر ہوتی ہے۔ گو صفائی موجود ہے نمونہ یہ ہے:۔

مشرقی دنیا کی عورت تجھ میں ہے عفت بھری
عورتوں پر ساری دنیا کی تو سبقت لے گئی
حسن کی دیوی ہے تو، شرم و حیا تجھ پر نثار
تیرے ہر انداز میں پنہاں ہے حسنِ قدرتی

سارے گوہر سے ہے بہتر عصمت و عفت تری
ہو گئے عاجز پرکھنے سے بھی سارے جوہری
تیری خودداری سے عاجز ہو گئی ہے عاجزی
پھر وفاداری میں بھی تیرا نہیں ثانی کوئی
شکر ہے اللہ کا تو سب پہ بازی لے گئی
تو بھی اے صفیہ اسی زمرے میں شامل ہو گئی

ظ

ظریفہ

نام معلوم نہیں ظریفہ تخلّص ہے لیکن نہایت دلدوز اور حسرت آمیز اشعار لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام جذبات اور واردات قلب کا گنجینہ ہے اس میں درد و اثر اور سوز و گداز سب کچھ موجود ہے۔ آپ کے یہاں معاملہ بندی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جرأت اور مومن کے رنگ سے کافی متاثر ہوتی ہیں۔ آپ کے کلام کی خاص خصوصیت جذبات کی فراوانی ہے، جس نے آپ کے اشعار کو صرف دلکش ہی نہیں بہت پر اثر بھی بنا دیا ہے، رنگ پختہ اور اسلوب بیان پاکیزہ ہے نمونۂ کلام یہ ہے:۔

"نذرِ عشق"

بہتر یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے　　کرتے بھی تو رسوا سرِ بازار نہ کرتے

ہیں آپ دکھاتی مجھے ہو رنگ کے جلوے
تم حسرتِ دیدار کا اظہار نہ کرتے

جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر
اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے

دل ہی میں چھپا رکھتے اگر رازِ محبت
اس درد کا علاج آپ ہی دشوار نہ کرتے

دیوانگیٔ عشق ہے سرمایۂ راحت
تم پھول ہیں پیدا خلشِ خار نہ کرتے

منظور نہیں مجھ کو تنگ ظرفیٔ منصورؔ[1]
دنیا پہ عیاں حالِ دلِ زار نہ کرتے

اتنا بھی نہ تھا مادّہ ضبط جو تم میں
بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے

عابدہ

عابدۃ النساء بیگم نام اور عابدہؔ تخلص ہے۔ حیدرآباد کی شاعرہ ہیں آپ مولوی سیّد عارف الدین صاحب ناظم تعمیرات حیدرآباد دکن کی دختر اور سیّد علی صاحب ایچ۔سی۔ایس کی شریکِ حیات ہیں۔

آپ نے محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی ہے شعر گوئی سے کافی ذوق ہے۔ اس اسکول کی میگزین میں آپ کا کلام اکثر شایع ہوا کرتا تھا کلام میں صفائی موجود ہے۔ اگر آپ کہتی رہیں تو پختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

---

[1] غالب :- قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنگ ظرفیٔ منصور نہیں

اُلفت

الفت ہے اے خدا کیا ہم کو ذرا دکھا دے
الفت ہے نام کس کا؟ الفت ہمیں سکھا دے

قومیں بہت ہیں دشمن اک دوسرے کی سن لو
میل و ملاپ کا تو ان کو سبق پڑھا دے

ملّت نہیں ہے کوئی جو پھوٹ سے ہو خالی
اس پھوٹ کا جہاں سے نام و نشاں مٹا دے

دنیا میں فرقہ بندی بڑھتی ہی جا رہی ہے
آپس کے بیر کو سب دل سے خدا بھلا دے

آپس کی پھوٹ سے ہم برباد ہو رہے ہیں
اپنے کرم سے ہم کو شیر و شکر بنا دے

یہ عابدہ کی زاری کر لے قبول یا رب
الفت کے راستے پر ہم سب کو پھر لگا دے

عاصیہ

ملاحظہ ہو۔ راآجہ

عبرت

محترمہ زینت بیگم صاحبہ عبرت نے اپنے حالات جو خود لکھ کر ارسال فرمائے ہیں، درجِ ذیل ہیں:۔

"میرا شجرۂ نسب حضرت امیر قیس عبدالرشید رضؓ سے ددھیالی اور حضرت خالد بن ولیدؓ سے ننھیال شروع ہوتا ہے، میرے ددھیالی بزرگوں میں ہفت ہزاری پنج ہزاری اور سہ ہزاری زمانہ سلف میں گزرے ہیں میرے والد ماجد ڈاکٹر خوب داد خان بہادر کلکتہ میں سب اسسٹنٹ

چیف کمسریٹ کے عہدہ پر مامور تھے۔ بریلی میں محلہ گگی بھاٹان میں ہماری کوٹھی مبارک باغ کے نام سے مشہور تھی۔ میرے والد مرحوم نے اس کوٹھی میں ایک باغ لگایا تھا جس میں انواع و اقسام کے درخت پھولوں اور پھلوں کے موجود تھے۔ دوست احباب میں اشتہار عام تھا کہ اگر کوئی شخص یہ بتا دے کہ فلاں پھل اور پھول کا درخت اس باغ میں نہیں ہے اس کو پانچ روپیہ انعام ملتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بجلی کا رواج بہت کم تھا۔ مرحوم نے بیٹریوں کے ذریعے تمام کوٹھی اور باغ میں بجلیاں لگوائیں۔ واجد علی شاہ والیٔ لکھنؤ کا سامان آرائش جب کلکتہ کے مٹیا برج میں نیلام ہوا تو وہاں سے بہت بیش قیمت اور منتخب سامان لاکر کوٹھی کو بقعۂ نور بنایا۔ چار قوال نوکر تھے صبح و شام کھانا کھاتے وقت ان کی قوالی ہوا کرتی تھی اور رات کو سوتے وقت قصہ خوانی کے لئے جالب صاحب مرحوم ملازم تھے جو زبانی اور کتابوں سے داستان سنایا کرتے تھے۔ ہم تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ دنیا کے افکار و آلام سے قطعی نا آشنا۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔ والد صاحب مرحوم اردو و انگریزی کے شاعر تھے۔ اُن کا اردو کا دیوان "دیوان خوب سفینۂ مرغوب" کے نام سے مشہور ہے اور انگریزی کا دیوان پوئٹیکل جمس (Poetical Jems) کے نام سے مشہور ہے جس کی تعریف گورنروں اور وائسرائے و دیگر معززین انگریزوں نے کی ہے اور وہ سب اصلی ریکارڈ میرے پاس

محفوظ ہے۔

چونکہ میرے گھر میں ہر وقت علم و ادب کا چرچا تھا اس لئے اس کی ضو پاشیوں سے میں بھی محروم نہ رہی۔۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں پردہ کا رواج بہت سخت تھا اس لئے بلا امداد کسی استاد فن کے اپنی استعداد کے مطابق اپنے کلام کو جلا دیتی رہی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میرے خاندان کے لئے اس درجہ منحوس آیا کہ میرے والد ماجد کا انتقال اچانک مرض فالج میں دہلی میں ہوگیا۔ میرے منجھلے بھائی صاحب نے ریلوے کے ٹھیکہ جات لینا شروع کئے کام کا تجربہ نہ تھا۔ ملازموں نے خوب لوٹا۔ ہر کام میں نقصان ہوا ۲-۳ لاکھ کے ٹھیکے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ تباہ ہوگئے۔ میری شادی ۱۹۰۵ء میں سید محمد عبد الحی صاحب سے ہوئی یہ خاندان ہندوستان کا ایک مستند اور مشہور و معروف خاندان ہے۔ پیر زادے ہیں۔ صاحب نساب شجرہ ہیں۔ میرے خسر سید مولوی عبد الغنی صاحب وکیل ضلع سیتاپور میں وکالت کرتے۔ کثیر آمدنی تھی۔ گاؤں، مکانات و باغات تھے۔ میری دو بہنیں اور دو بھائی انتقال کرچکے، اب میں اور میرے ایک بھائی حیات ہیں۔ صرف تین بہنوں اور ایک بھائی کی اولاد بھی بفضلہ موجود ہے۔ چونکہ ٹوٹی پھوٹی شاعری کا شوق تھا۔ اس لئے میری لڑکیوں کو بھی شوق ہوا ماشاء اللہ ملقب فاطمہ بیگم نے تو ہندوستان میں بوجہ شاعری و قومی خدمات کافی نام پیدا کیا۔ اور پنجاب و حیدرآباد دکن کے شائقانِ ادب اس کو ادیب بلبلہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے

قائم کردہ پانچ اسلامی اسکول لڑکیوں کے لئے گوالیار اسٹیٹ میں چل رہے ہیں چونکہ اس کی شادی ہو گئی اب اس کی جگہ جنرل سکریٹری کا کام اس کی چھوٹی بہن انیس فاطمہ عرف زہرہ خاتون کرتی ہیں۔ انھوں نے بلقیس فاطمہ کے اسکول سے مڈل بھی پاس کیا ہے۔

میری پانچ اولادیں ہیں تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔

میرے شوہر محمد عبدالحی صاحب جو گورنمنٹ میں منیجر کورٹ آف وارڈس رہے اور گوالیار میں سپرنٹنڈنٹ مجسٹریٹ درجہ اوّل بھی رہے انھوں نے بریلی سے ۱۹۰۸ء تک میٹرک کلاس تک تعلیم پائی اور اس وقت انگریزی کھیلوں میں کافی نام پایا۔ یہ بریلی کی کل ٹیموں کے جنرل کیپٹن بھی رہے حضرت مولوی احمد رضا خاں صاحبؒ کے سچے عقیدت مند تھے۔ میرے خاوند کی عمر ۶۶ سال ہے اور میری ۵۶ سال ہے۔

محترمہ "عبرتؔ" کا زیادہ تر کلام پرانے روایتی شاعرانہ رنگ میں ہے لیکن زمانہ میں لکھنؤ میں اور تھوڑا بہت دہلی میں بھی یہ رنگ مقبول تھا لیکن چونکہ سچے اور صحیح جذبات کی ترجمانی اس میں زیادہ نہیں تھی اس لئے یہ رنگ زیادہ عرصہ تک مقبول نہیں رہ سکا اور اب اس کو ترک کیا جا رہا ہے۔

محترمہ نے چونکہ انھیں فضاؤں میں آنکھ کھولی اور اسی ماحول میں پرورش پائی۔ اس لئے ان کے یہاں اس رنگ کا ہونا کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے یہاں ترجمانی جذبات کا

بالکل فقدان ہے۔ ان کے یہاں اس رنگ کے بھی کچھ اچھے شعر ملتے ہیں۔
جیسا کہ اشعارِ ذیل کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

ذیل میں مخزنہ کے مرسلہ کلام کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

لطف آتا ہے نفس ہر ظلم نو ایجاد میں
چین آتا ہے مجھے دردِ دلِ ناشاد میں

دل کو دیکھوں یا جگر کو یا غم و اندوہ کو
سازِ ہستی جل رہا ہے اب کسی کی یاد میں

جانِ مضطر، دل مکدر، قلبِ مضطر، چشم نم
ہائے کیا کیا بن گئی ہم پر کسی کی یاد میں

نہ ہوتا دل تو کوئی کیوں کسی پر مبتلا ہوتا
حسیں ہوتے تو کیا تھا دلربا ہوتے تو کیا ہوتا

نہ دل ہوتا تو کیوں فرہاد اپنی جان سے جاتا
جہاں میں سیکڑوں شیریں ادا ہوتے تو کیا ہوتا

تصور میں کبھی آکر تسلی دے ہی جاتے ہیں
نہ اتنے بھی مرے درد آشنا ہوتے تو کیا ہوتے

ہمارے دم سے ہی تو نے ستمگر نام پایا ہے
نہ ہوتے ہم اور انداز جفا ہوتے تو کیا ہوتا

کسی کی اک نگاہِ مست سے بیہوش ہو بیٹھے
اسیر گیسوئے زلفِ رسا ہوتے تو کیا ہوتا

مقدر میں ازل کے روز سے ہم غم لکھا لائے
نہ کرتے وہ وفا کیونکر وفا کرتے تو کیا ہوتا

(نوٹ۔ اگلے صفحہ پر)

ستمگر ہیں تو جب بھی اک عالم ہے تمنائی
اگر رسم وفاداری ادا کرتے تو کیا ہوتا[2]
مجھے قسمت سے شکوہ ہے شکایت ان سے کیا عشرتؔ
ستمگر ہیں تو کیا ہے باوفا ہوتے تو کیا ہوتا

وہ نہ آئے وعدہ کر کے دلِ بیقرار سوجا
ہیں دروغ ان کی قسمیں نہ کر اعتبار سوجا
مری آنکھیں منتظر تھیں مرا قلب مضطرب تھا
کہا نامہ بر نے آ کر نہ کر انتظار سوجا
مجھے دفن کر چکا جب تو یہ بولا شاد ہے اب
تجھے اب تو چین آیا مرے بیقرار سوجا
تجھے یاس رو چکی اب تجھے شوق کھو چکا اب
ترا نوحہ ہو چکا اب مرے غمگسار سوجا

حالِ دل بر سرِ رحم ان کو میں پاؤں تو کہوں
ہیں وہ بیجرم خفا مجھ سے مناؤں تو کہوں
زاہدو پوچھو نہ اس عشق بلا خیز کے ڈھنگ
نقشۂ کفر ذرا دل سے مٹاؤں تو کہوں
کیا کہوں جو دلِ صد پاش سے آتی ہے صدا
گر پڑا سنگِ جفا پر میں اٹھاؤں تو کہوں
دردِ ہجراں کا یقیں آپ کو کب آئے گا
داغ ہائے دلِ مجروح دکھاؤں تو کہوں

[پچھلے صفحہ سے] [1] مؤلف حقیرہ
شکستِ دل ازل ہی سے مری قسمت میں لکھا تھا
قصور اس میں تمھارا اے امینِ بیکساں کیا تھا

[2] آغا حشر کاشمیری :-
جب اتنی بے وفائی پر دل اس کو پیار کرتا ہے
خداوندا اگر وہ باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

عذرا

سیدہ عذرا جمال نام اور تخلص عذرا ہے۔ آپ موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ روشن خیال اور عالی دماغ خاتون ہیں۔ آپ نے کنیرڈ ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اب آپ دہلی میں مقیم ہیں آپ کا عرف سنجیلہ خاتون ہے۔

آپ موجودہ دور کی ایک نہایت خوش گو اور قادر الکلام شاعرہ ہیں آپ کی شاعری صرف گل و بلبل کے افسانوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں قوم اور وطن، تہذیب اور سماج، رسم اور رواج اور زندگی کے حقائق پر تبصرہ ہے۔ آپ علامہ اقبالؒ کے رنگ سے بہت متاثر ہوئی ہیں اور اس رنگ میں بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام پختہ پر وقار اور بلند ہے نمونہ یہ ہے:-

پیامِ عذرا

اُٹھ کہ پھر تیرا وطن گردشِ ایّام میں ہے — تلخی زہر ترے بادۂ گلفام میں ہے

ہو نہ مایوس غلامی کے اگر دام میں ہے — زندگانی کا مزا کوشش ناکام میں ہے

خوابِ غفلت میں جو سوئے ہیں جگا دے ان کو — جل کے اقبال کا یہ شعر سنا دے ان کو

"اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر پیدا کریں"

(عذرا کا پیام خواتینِ مشرق کے نام)

مجھ سے اک دخترِ تہذیب نوی نے یہ کہا

نقشؔ بیکار ہے اب مشرق میں عورت کا وجود

زنِ مغرب رہِ ایجاد پہ ہنگامہ خرام
اور یہاں زیست کی ہر سانس پہ طاری ہے جمود

عرصۂ دہر میں وہ گرمِ تقاضائے حیات
اور نظارہ کناں ہم صفتِ چشمِ حسود

بغض تقدیر پہ قابل ہے زنِ مغرب کا
اور ہم اپنی ہی تخئیل کہن سے محدود

سن کے میں نے کہا "افرنگ کے اے دستِ نگر
تیری آزادیٔ افکار نہیں فالِ سعود[۱]

تو کبھی نقشؔ گرِ راہِ ترقی تھی مگر
ذوقِ تقلید نے تو نعمتِ احساس ربود"

۱؎ مغرب زدہ عورت پر حضرت علامہ اقبالؒ نے رموزِ بیخودی میں اس طرح اظہارِ خیال فرمایا ہے

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ظاہرش زن، باطنِ او نازن است

بندہائے آن بجا بگسیختہ تا ز چشمش عشوہ ہا دل کردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزاد بیش از حیا ناآشنا آزاد کیش

علمِ او بارِ امومت بر نتافت بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

این گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ [رموز ص ۱۷۵]

اب بھی صد جلوہ بداماں ہے فضائے عالم
کور ذوقی سے تری بند ہے گو چشمِ شہود
بتِ افرنگ سے ہو تو نہ اگر رشتہ بپا
اب بھی ہے زندہ و پائندہ نژادِ داؤد
جنس برباد ہوئی تیری حیا کی دولت
تیری عصمت کے محافظ تھے رسوم اور قیود
تو کسی روز بھی خود قوم کی زندہ تقدیر
اور اب ہے ترا تقدیر سے شکوہ بے سود
دوزخِ غرب کو فردوس سمجھنے والی
عصمتِ حسن کے جوہر سے ہے عورت کی نمود
سرزمیں ہند کی ہے منتظر اس عورت کی
مایۂ ناز ہو ملت کے لئے جس کا وجود
حسن کی روحِ رواں عشقِ جواں کی دولت
اللہ کہ خطرہ میں ہے اب امن و اماں کی دولت"

عصمت

خورشید عصمت نام اور عصمت تخلص ہے۔ موجودہ دور کی ایک نہایت خوش فکر اور کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ پختہ رنگ میں کہتی ہیں۔ زبان پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات اور طرزِ ادا دونوں اعتبار سے آپ کا

کلام بلند اور قابلِ قدر ہے، نمونہ کلام یہ ہے،

صبر کو آزما کے دیکھ لیا　　تیر یہ بھی چلا کے دیکھ لیا
بے وفا ہے وہ بے وفا ہیں نے　　آزما آزما کے دیکھ لیا
خود ہی محفل میں ہو گئے رسوا　　تم نے ہم کو اٹھا کے دیکھ لیا[1]

نہیں کوئی انیس غم عصمت
ہم نے خوب آزما کے دیکھ لیا[2]

عصمت

عصمت جہاں بیگم نام اور عصمت تخلص ہے آپ کا تعلق مظفر نگر کے ادب پرور اور ادب خیز خطہ سے ہے، کلام کا رنگ صاف و ستھرا ہے جذبات کی ترجمانی اور دلچسپ واقعات نگاری آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسالہ تحشر خیال میں شایع ہوتا تھا۔ نمونہ یہ ہے۔

مجھے ماں باپ کے گھر میں وہ اطمینان حاصل تھا
کہ دنیا بھر کی امیدوں کا گہوارہ مرا دل تھا
ہوئی حالت مگر بالکل وہی سسرال میں آکر

---

[1] مومن:۔ تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری ؛ تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

[2] مومن نے اس مضمون کو بڑی لطافت اور بڑی حسرت سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو

تو فلک مرگ علم سب سے غافل　　اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

پھنسے جیسے کوئی آزاد طائر جال میں آ کر
محلے بھر کی ساری عورتیں مجھ کو بناتی ہیں
میں اُن کا منھ چڑاتی ہوں وہ میرا منھ چڑاتی ہیں
سہے جاتے نہیں اب مجھ سے طعنے ساس نندوں کے
قیامت ہے رہوں کس طرح دن بھر پاس نندوں کے
وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

تری فرقت کی ماری تجھ کو اکثر یاد کرتی ہے
مجھے لے چل کہ میری آتما فریاد کرتی ہے
نہ آنسو آئیں گے رخ پر نہ گھبرائے گا دل میرا
کہ تیرے ساتھ رہنے سے بہل جائے گا دل میرا
یہ مانا ہیں بہت دلچسپ صبح و شام کے جلوے!
رہے تم آنکھ سے اوجھل تو پھر کس کام کے جلوے
تمھارے ساتھ رہ کر اپنا غم سب بھول جاؤں گی
تمھیں گاتا جو دیکھوں گی تو خود بھی ساتھ گاؤں گی
وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

عظمت

عظمت اقبال نام اور عظمتؔ تخلص ہے دَورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام نہایت پرکیف اور بلند پایہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اساتذہ کے

کلام سے متاثر ہوئی ہیں، نمونہ کلام یہ ہے :-

چمن اپنا نہ گل اپنا نہ کوئی باغباں اپنا
طبیعت بجھ گئی اُجڑا خوشی کا گلستاں اپنا[1]

مری صبح مسرت بن گئی شام الم کیسی
ہے محو خوں‌فشانی یہ شباب نغمہ خواں اپنا

مقدر کی لکیریں مٹ نہیں سکتیں اگر یارو
نکل جائے تو پھر سینے ہی سے قلب طپاں اپنا

سنایا حال محرومی نہیں ہر لمحۂ رنگیں نے
جہاں الٹا نقاب ماضیٔ دو خیاں اپنا

حکایات جنوں پھر لب پہ آتی ہیں مگر عظمتؔ
فسانہ ہے لبوں پر اور نہیں افسانہ خواں اپنا[2]

---

[1] مومن :- ؎ نہیں اپنا نہ دل اپنا، نہ تم میرے، نہ جاں میری
اثر کس کس کو ہو، ہووے بھی گر فریاد بیکس میں

فانی ؎ یہ کس قیامت کی بے کسی ہے نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطر بیقرار میری نہ دیدۂ اشکبار میرا

[2] اس زمین میں نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ شاہزادۂ دولت آصفیہ دکن نے بھی ایک نہایت پُرکیف اور مرصع غزل لکھی ہے چونکہ عام نظروں سے یہ غزل نہیں گذری ہوگی اس لئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو :-

اور ہے زمانہ میں کون راز داں اپنا
یا نگاہِ ناز ان کی یا غم نہاں اپنا

جستجو محبت میں بے اثر نہیں رہتی
ان کو ڈھونڈھنے نکلے مل گیا نشاں اپنا

میرا حال سن سن کر مسکرا رہے ہیں وہ
یوں بڑھا رہے ہیں وہ لطف داستاں اپنا

کچھ اثر نہیں کرتا جذبۂ نہاں ان پر
رہ نہ جائے غم بن کر جذبۂ نہاں اپنا

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

عفت - مظفر نگری -

محترمہ آمنہ خاتون عفت، رابعہ خاتون پنہاں، بلقیس جمال اور میمونہ خاتون غزالہ کی بڑی بہن اور موجودہ دور کی ایک ممتاز اور مشہور شاعرہ ہیں۔ حالات جو آپ نے اپنی زیر نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:-

آمنہ خاتون عفت دختر اول شیخ مولانا مولوی عبید اللہ صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی-پی-آئی-آفس الہ آباد ۲۲ نومبر ۱۹۰۳ء کو بمقام سہارنپور تولد ہوئیں۔ ۶ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل

[پچھلے صفحے سے]

آپ دل میں نہ کرنے بھی اس سے بےخبر کیوں ہیں
دل ہی راز ہے اپنا، دل ہی راز داں اپنا

پھر گئی ہے کچھ کہہ کر وہ نگاہ جاں پرور
اب سکوں نہ بن جائے اضطرابِ جاں اپنا

یوں بھی جا نہیں سکتا دل سے رنجِ تنہائی
عالمِ تصور میں ان پہ ہے گماں اپنا

رائیگاں نہ ہو جائیں نقش میرے سجدوں کے
وہ بدل بھی سکتے ہیں سنگِ آستاں اپنا

ابتدائے خاموشی آپ کی کہانی تھی
انتہائے خاموشی بن گئی بیاں اپنا

ان کی مہربانی سے مٹ رہی ہیں امیدیں
لٹ رہا ہے منزل پر آج کارواں اپنا

بزمِ ناز میں ان کی ہے کچھ اور ہی عالم
اب کسے یقیں ہوگا دل بھی تھا یہاں اپنا

ضبطِ غم ضروری تھا غم شنیع کیوں ہوتا
لے لیا محبت نے خود ہی امتحاں اپنا

کی۔ (جو کہ بریلی کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے) جنوری ۱۹۲۰ء
میں خاندانی عزیز مسٹر ناظر حسن صاحب وکیل و میونسپل کمشنر مظفر نگر
سے شادی ہوئی۔ یہ شادی والد صاحب نے اپنے حسب منشاء کی
اوائل عمر سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ چند کتابیں تصنیف کیں اور
کچھ زیر تصنیف ہیں۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ "گوہر عفت"
شایع ہو چکا ہے، دوسرا تیار ہو رہا ہے، شاعری کا بھی ذوق ہے۔ قومی
خدمات میں زندگی گزر رہی ہے، بارہ سال سے میونسپل بورڈ اور
ڈسٹرکٹ بورڈ میں بحیثیت سرکاری ممبر شامل ہیں اور دیگر اداروں
میں تقریباً ۱۵ سال سے حصہ لے رہی ہیں۔

ایک زنانہ اسلامی درسگاہ کی بنیاد ڈالی جو ترقی پذیر ہے۔ اور
اس وقت (بحیثیت انگلش مڈل اسکول) دختران مظفر نگر کی تعلیمی خدمات
انجام دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک صنعتی و حرفتی زنانہ اسٹور
قائم کیا ہے جو انتہائی مقبول ہوا۔

کچھ عرصہ سے دنیائے فانی سے لگاؤ کم ہو گیا ہے اور طبیعت فقر
کی طرف راغب ہے۔ مشرقی تہذیب اور مذہب کی پابند ہیں، شرعی پردہ
کرتی ہیں، چنانچہ کمیٹیوں وغیرہ میں زیر نقاب کام کرتی ہیں۔ دستکاری اور امور
خانہ داری سے دلچسپی ہے طبیعت بہ ہمدردی زندہ دلی ہے، اخلاق بہت وسیع ہے،
آپ کا رنگ پختہ اور کلام سنجیدہ و بلند پایہ ہے اسکا اسلوب
بیان پاکیزہ اور صاف ہے ذیل میں خود محترمہ کا وہ انتخاب

درج کیا جاتا ہے، جو آپ نے اس تذکرہ کے لیے راقم الحروف کو ارسال فرمایا ہے:-

جلوہ ترا جہاں ہے ہر گل میں تو نہاں ہے
ذرہ صحیفہ خواں ہے موجوں میں اک اذاں ہے

وقتِ نمازِ اِنبسات
کیفِ نیازِ اِنبسات

ہر ذرہ جاگ اٹھا ہے نغمہ زناں صبا ہے
ہر برگ اک ثنا ہے سجدہ کناں فضا ہے

وقتِ نمازِ اِنبسات
کیفِ نیازِ اِنبسات

نشاطِ حال بھی ہے کشتۂ اندیشۂ فردا
حصولِ مدعا میری نظر کا منتہا کیوں ہو
درخشاں صبح دم اشکِ تمنا ہو گہرِ عفت
تو پھر منت کشِ الفاظ رنگِ التجا کیوں ہو

(طرحی غزل کے چند اشعار۔ طرح: میرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو)
میرے زخموں میں اب تک لذتِ نیشِ سلاسل ہے
کہاں تارِ رفو ہر دم میسر نوکِ سوزن کو

مظالم چھپ نہیں سکتے تمھاری پردہ پوشی سے
چھپاؤ گے کہاں تک رنگِ چشمِ شوخ و پرفن کو
کیا رنگین اک پرتو سے رنگِ گلشنِ ہستی
تبسم سے کیا پھر خاک کیوں گلزارِ ایمن کو
نہ اذنِ ہم نشینی ہے، نہ اذنِ دید ہے عفت
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

اشعار ذیل محترمہ کے مرسلہ انتخاب کے علاوہ آپ کے کلام کا مزید انتخاب ہیں:-

لہ صلہ پائے گی آہِ نارسا کیا	ہلے گا پردۂ عرشِ عُلا کیا
میں ہر ذرّہ میں تجھ کو پا رہا ہوں	مجھے دیر و حرم سے واسطا کیا
جو غنچہ ہے جُدا جو گل انوکھا	یہ ہے نیرنگیوں کی انتہا کیا
جھلک ان کی کہیں دیکھی تھی دل نے	اسی دن سے نہ جانے ہوگیا کیا
جبل اور دشت اک جلوے نے پھونکے	کرے چشمِ طلب پھر حوصلا کیا
مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی	شکایت ہائے دستِ ناخدا کیا

ہر اک آنسو ہے رشحِ عشقِ عفت
دُرو گوہر سے اس کو واسطا کیا

لہ یہ ایک طرحی غزل ہے جو محترمہ نے لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں سنہ ۱۹۴۰ء میں پڑھی تھی۔

ہیں ان جلوؤں کے قرباں کیا یہ لطفِ بیکراں ہوگا
کہ اک پرتو سے سینہ مثلِ ایمن ضو فشاں ہوگا
اگر یہ پائے ہمت جانبِ منزل رواں ہوگا
تو ہر خارِ بیاباں رشکِ گلہائے جناں ہوگا
شبِ تاریک اور بحرِ الم کی غم فزا موجیں
ٹٹولوں کس طرح یارب مرا ساحل کہاں ہوگا
قدم پہلا سنبھل کے تم نے گر عفتؔ بڑھایا ہے
تو پھر نزدیکِ منزل جلد تر یہ کارواں ہوگا

مری آنکھیں مسکراؤ محمدؐ خراب آئینہ کو جِلاؤ محمدؐ
جہاں طائرِ عقل بھی نارسا ہے رسائی وہاں تک کراؤ محمدؐ
مری روح و جاں نذرِ چشمِ کرم ہیں خدارا نظر اک اٹھاؤ محمدؐ
گناہوں سے مردہ ہوئی روحِ عفتؔ
شفاعت سے اپنی جِلاؤ محمدؐ

عفتؔ۔ بنارسی

عفتؔ تخلص ہے۔ رضا کاظمی صاحب ساکن بنارس کی شریکِ حیات

۵؎ خواجہ حافظ

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل ؛ کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

ہیں، اور اس نسبت سے اکثر رضا دولہن کے نام سے معروف ہیں۔
غزل گو شاعرہ ہیں اور اکثر خوب لکھتی ہیں۔ روایتی شاعری کے علاوہ
جس کا مستقبل امید افزا نہیں، آپ کے یہاں جذبات و وارداتِ قلب
کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ طرزِ ادا پختہ اور کامیاب ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

بہار آتے ہی بن آئی جنونِ فتنہ ساماں کی
وہ دیکھو بیلیاں پھرنے لگیں بیچارہ ہجراں کی

الٰہی خیر ہو گلزارِ وحشت کی مرے پیچھے
وہی رنگینیاں پھرتی ہیں نظروں میں بیاباں کی

نگاہِ شوق بزمِ ناز و جلوہ ہائے رنگیں ہیں
معاذ اللہ کتنی سرخیاں ہیں بزمِ امکاں کی

تغافل لاکھ برتو تم مگر یاد آ ہی جاتی ہے
نوازش ہائے پیہم کی عنایت چشمِ گریاں کی

قتیلِ حسن کو حاجت نہیں دفن و کفن کی کچھ
لحد بن جائے گی خود خاک اڑ اڑ کر بیاباں کی

خدا رکھے سلامت جوشِ مستی کو مری عفت!
اسی سے زندگی کا کچھ پتہ ملتا ہے انساں کی

غ

غزالہ۔ بریلوی

حسن آرا بیگم نام، میمونہ خطاب اور غزالہ تخلّص ہے۔ محترمہ میمونہ غزالہ آمنہ خاتون عفت، رابعہ خاتون پنہاں اور بلقیس جمال کی چھوٹی بہن ہیں۔ یہ چاروں بہنیں اردو کی گرامی قدر شاعرات ہیں۔ اور بہت خوب کہتی ہیں۔

آپ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے اپنی زیر نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

"میمونہ غزالہ بریلوی دختر چہارم شیخ مولنا مولوی عبد الماجد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی۔پی۔آئی۔آفس الہ آباد۔ بمقام سہارنپور نومبر ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں۔ اور اوائل عمر میں الہ آباد اپنے والد کی جائے ملازمت پر مقیم رہیں۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنی ہمشیرہ محترمہ رابعہ پنہاں سے حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں شاعری اور مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ان کے دلکش افسانے غزلیات اور نظمیں مختلف رسائل میں شایع ہوتے رہے۔ اصلاح سخن محترمہ رابعہ پنہاں بریلوی اور محترمہ بلقیس جمال بریلوی سے حاصل کی۔

جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ کی شادی آپ کے والد کے قریبی عزیز جناب مولوی احسان الحق صاحب آڈیٹر (Auditor) دہلی سے ہوئی۔ آپ کی شادی آپ کی والدہ نے اپنی حسب منشاء کی۔ اب

کچھ عرصہ سے آپ کی صحت کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے علمی۔ ادبی۔ مشاغل کم ہو گئے ہیں۔ آج کل آپ کا قیام دہلی میں ہے۔ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ بہ عنوان "غزال" شایع ہو کر بہت مقبول ہوا ہے (ماشاءاللہ) آپ کے ۵ بچے ہیں۔ جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

آپ بچپن سے مشرقی تہذیب کی پرستار ہیں۔ اور صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ شرعی پردے کو پسند فرماتی ہیں۔ آپ رقیق القلب اور خوش مزاج ہیں۔"

محترمہ میمونہ غزالہ موجودہ دَور کی ایک نہایت خوش گوار اور ممتاز شاعرہ ہیں۔ آپ نظمیں اور غزلیں دونوں خوب لکھتی ہیں۔ جذباتی اور وجدانی اعتبار سے آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ آپ نے محاکات کی بھی بہت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ کا کلام بہت پر کیف اور پر تاثیر ہے طرزِ ادا بہت دلکش اور صاف ہے، خود محترمہ کے منتخبہ اشعار جو آپ نے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

اے ظلمتِ شامِ عشق، وجہ پریشانی نہ پوچھ
اے پرتوِ سوزِ دروں تمہیدِ حیرانی نہ پوچھ

میں اک حجابِ دردہوں کیا پوچھنا مژگاں کم
ہوں خوگرِ مشقِ الم اشکوں کی ارزانی نہ پوچھ

عارض ہیں برقِ خندہ زن۔ اک اِس طرف اک اُس طرف
آنکھیں ہیں دو رنگیں چمن اک اِس طرف اک اُس طرف
پلکوں کی جنبش اک طرف۔ آنکھوں کی لغزش اک طرف
دو ساحری ہیں خندہ زن اک اِس طرف اک اُس طرف
آنکھوں کے ڈورے اک طرف بسمل غزالہ اک طرف
دو تیر ترکش کا مراں اک اس طرف اک اس طرف

اک اشارہ سے جہانِ عشق روشن ہو گیا
ذرّہ ذرّہ غیرتِ صحرائے ایمن ہو گیا
کس کی پرتو کی جھلک سے بجلیاں لٹنے لگیں
آئینہ خانہ نویدِ برق ایمن ہو گیا

اضطرابِ مے خدایا کیا کروں ہاتھ میں پھولوں کے رنگیں جام ہے
جستجوئے ذوقِ منزل مرحبا اب میری پرواز نزدِ بام ہے
لوٹ لے میرا متاعِ زندگی اے نگاہِ ناز یہ انعام ہے

ذیل کا کلام آپ کے کلام کا مزید انتخاب ہے جو آپ کے مختصر مجموعہ "غزال" سے پیش کیا جا رہا ہے:۔

بانسری بجائے جا
او حسین کافرہ مست و ناز مطربہ

شوخ لب مغنیہ		اونشیلی ساحرہ

رازِ غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اُڑائے جا
بانسری بجائے جا

میرے دل کی ابتری		اور تیری بے خودی
میرا حالِ زندگی		تیری زلفِ عنبری

رازِ غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اُڑائے جا
بانسری بجائے جا

تابشِ جمال تو		نازشِ خیال تو
رخصتِ کمال تو		ہے دلِ غزال تو

رازِ غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اڑائے جا
بانسری بجائے جا

غزال صـ٦ تا ٩

بار بار نہ پوچھ

شوقِ دیدار ایک اُلجھن ہے — اُلجھنیں دل کی بار بار نہ پوچھ
کس لیے چشم نم ٹپکتی ہے — بے قراریٔ انتظار نہ پوچھ
ایک آنسو ہے ترجماں دل کا — حالتِ چشم اشکبار نہ پوچھ

دھڑکنیں بڑھ گئیں غزالؔ اب تو
دل کی حالت کا اضطرار نہ پوچھ (غزال ص۱۷)

وہ نگاہیں شرمگیں آکر مجھے سمجھا گئیں
خواب میں آکر اُمیدیں صورتیں دکھلا گئیں
اُف ہلا چتہ ہوا ہے اور دل دھڑکا غزالؔ
چونکتے ہی چونکتے لب پر دعائیں آگئیں
[غزال ص۱۹]

غمناک سا افسانہ

لیلیٰ کی کہانی تو برسوں کی پرانی ہے — اب اور سنا مجنوں تازہ کوئی افسانہ
کوثر بھری آنکھوں سے مست دیکھ ادھر ساقی — اُٹھتے ہی نظر تیری بیہوش ہے دیوانہ

یہ تو ہے غزالہ ہی مجنوں کہو یا وحشی
ہاں دل ہے مگر اس کا غمناک سا افسانہ
[غزال ص۲۶]

محترمہ کی ذیل کی نظم آپ کے مجموعہ "غزال" میں شامل نہیں ہے :-

"ندی کنارے"

دہقاں کی پیاری لڑکی ندی پہ جلوہ زا ہے
ساری کا سبز آنچل سر سے ڈھلک رہا ہے
چتون کی سادگی میں اک برق شعلہ زا ہے
جس پر نظر پڑی وہ شعلہ بنا ہوا ہے
ہونٹوں پہ ہے تبسم، نظریں جھکی ہوئی ہیں
معصوم حسن بے خود انگڑائی لے رہا ہے
ہاتھوں میں چوڑیوں کی رنگیں لہریاں ہیں
اک نیم بازہ غنچہ کانوں میں ہنس رہا ہے
معصوم سادگی میں لاکھوں تجلیاں ہیں
ماتھے کا سرخ ٹیکا شعلہ بنا ہوا ہے
مژگاں میں مست پتلی رقصاں ہے یا صنم گر
کالی گھٹا میں کوئی انگڑائی لے رہا ہے
گیسو سے نرم جھونکے کچھ چھیڑ کر رہے ہیں
ان پیاری انکھڑیوں میں ساغر چھلک رہا ہے
بجلی تڑپ رہی ہے ہر ہر نظر میں قاتل
ہر اک ادا میں ظالم شعلہ بھڑک رہا ہے
معصومیت کی پتلی دیوی نزاکتوں کی
تیری ادا سے سادہ جنت نہیں تو کیا ہے

غمخوار

آپ دہلی کی ایک ہندو خاتون ہیں۔ منور ما کنول نام اور غمخوار تخلص ہے۔ اُردو سے بہت ذوق ہے۔ نظم اور نثر دونوں کے ذریعے اس کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ کلام کا رنگ نہایت پاکیزہ ہے زبان بہت شائستہ اور مہذب استعمال کرتی ہیں۔ منظر نگاری بھی خوب کرتی ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

"خزاں" (کشمیر میں)

ہر طرف پیلے پڑے ہیں لالہ زار	شعلۂ جوالہ ہے ہر اک چنار
یہ خزاں ہے یا کہ تکفینِ بہار؟

پتّوں کے آنچل پھنسے کانٹوں میں ہیں	اور چمن کا پیرہن ہے تار تار
کس قدر ظالم ہیں یہ لیل و نہار؟

بوڑھے بوڑھے پیڑ دولہا کی طرح	پہنے بیٹھے ہیں قبائے زرنگار
ہائے پیری میں جوانی کی بہار؟

سرفروشی کا یہ عالم باغ میں	ایک جھونکا لاکھ پتّے گل ہزار
کر رہے ہیں اپنا اپنا سر نثار

برگ لرزاں ہیں درختوں پر کہ گل	موت کی آغوش میں ہیں بے قرار
اوڑھ کر پیلا کفن ہے سبزہ زار

مرنہ پھولوں سے چمن دامن بھرے	جیسے ماں کی گود میں بیٹا مرے
کیوں نہ بجلی ہو فلک پر بے قرار

آسماں پر ہیں صدائیں بے قرار　　اور زمیں پر خامشی ہے اشکبار
مر رہا ہے ایک اک زیرِ مزار

میٹھے میٹھے گیت گائے آبشار　　یا سنائے قصہ ہائے دل فگار
ہم بھی روئیں وہ بھی روئے زار زار

ایسے روئیں رونے میں کھو جائیں ہم　　رُواں رُواں ہو ہمارا اشکبار
ہائے دل کو کس طرح آئے قرار

ایک جھولا آنسوؤں کا ڈال کر　　سسکیاں لے لے کے جھولیں بار بار
نالہ آئے گیت بھی لب پہ یوں
برقرار اے بیقراری برقرار

ق

قمر

آپ سید حسین صاحب ساکن دیوی شریف کی صاحبزادی ہیں اور قمر تخلص کرتی ہیں۔ طرزِ ادا صاف اور زبان شستہ ہے۔ کلام میں روایتی و تخیلی پہلو غالب ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ساون

اٹھی انگڑائیاں لیتی جو گھٹا ساون کی　　چلی بل کھاتی ہوئی بادِ صبا ساون کی
تیرے بیمارِ محبت کو سلانے کے لئے　　رات بھر لوریاں دیتی ہے ہوا ساون کی
جھولا پھولوں کو جھلاتی ہے گلستاں میں بہار　　جوش مستی سے مگر تن کے ہوا ساون کی

ہو گئے زخم مرے دل کے ہرے آپ سے آپ
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی کچھ ایسی ہوا ساون کی

دامنِ دل میں لئے تازہ گل جذبۂ عشق
ناز کرتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

میں تھا وہ تفتہ جگر قبر پہ میری اب تک
چادرِ برق چڑھاتی ہے گھٹا ساون کی

آنکھ لو بھائی ہے انعام سنا کر یہ غزل!
مجھ سے کہتی ہے قمرؔ اٹھ کے گھٹا ساون کی

قمر

جمیلہ خاتون نام اور قمرؔ تخلص ہے۔ موجودہ دور کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ کلام بلند اور ترکیب ہے۔ طرزِ ادا سنجیدہ اور صاف ہے آپ کے یہاں بھی تخیلی رنگ غالب ہے، نمونہ کلام یہ ہے:-

خدا رکھے وہ جذبہ ہے جنونِ عشق ساماں میں
جو ہم چاہیں گلستاں کھنچ کے آجائے بیاباں میں

یہ سایہ بھی اٹھا یارب مری امید کے سر سے
اثر دیکھا نہیں برسوں سے اپنی آہِ سوزاں میں

شہیدانِ وفا ایسا نہ ہو بیدار ہو جائیں
ذرا اے بادِ صرصر بچ کے چل گورِ غریباں میں

کمالِ شوق میں پوشیدہ رازِ کامیابی ہے
جو میں چاہوں بہارِ بے خزاں کر دوں بیاباں میں

مری وحشت کی تفسیر یا کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

ہزاروں باندھ رکھے ہیں گریباں میں نئے داماں میں

بلا سے جان جائے یا رہے اب اے قمر اپنی
کمی باقی نہ رہ جائے کوئی غافل کے ارماں میں

قمر

صفیہ بیگم نام اور قمر تخلص ہے۔ حیدرآبادی خاتون ہیں۔ آپ زیادہ تر نظمیں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ رسالہ عصمت میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

عورت

تکمیلِ ہوں انساں کی تصویرِ وفا ہوں　　طاعت کے طریقوں میں ملک سے بھی سوا ہوں
آلام و مصائب کی میں ہی عقدہ کشا ہوں　　اور منزلِ الفت کی میں ہی راہ نما ہوں
انسان کی صورت میں　　آوازہِ خدا ہوں

تہذیب تمدن میں سدا ہاتھ بٹایا　　انسان کو احساس فرائض کا سکھایا
خود صبر و قناعت پہ عمل کر کے دکھایا　　اور خوگرِ ہمدردی و ایثار بنایا
واقف ہے ہر اک اہلِ بصیرت کہ میں کیا ہوں

قمر

قمر سلطان بیگم نام اور قمر تخلص ہے۔ دہلوی خاتون ہیں علم و ادب کی بڑی دلدادہ اور قدر شناس ہیں۔ اُردو سے شغف ہے اور

کسی نہ کسی طرح اس کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ شعر گوئی کا شوق ہے نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتی ہیں۔ کلام پُر کیف اور طرزِ انداز دلکش ہے ذیل میں محترمہ کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے جو آپ نے اُردو زبان پر لکھی ہے۔ یہ امر خصوصًا قابلِ لحاظ ہے کہ اس خشک اور بے رنگ موضوع کو بھی محترمہ نے اپنے خاص انداز کی بناء پر کس قدر دلکش بنا دیا ہے۔

اُردو مری زباں ہے

ہاں باغِ پُر خزاں ہے ہاں دل میں غم نہاں ہے
ہاں ہر طرف زیاں ہے اُمّید ابھی جواں ہے

اُردو مری زباں ہے

بدلے گا پھر زمانہ کہہ دیں گے پھر فسانہ
گونجے گا پھر ترانہ اُردو ابھی جواں ہے

اُردو مری زباں ہے

آئے گی پھر مسرّت جائے گی پھر مصیبت
چھائے گی پھر محبت ہر ذرّہ شادماں ہے

اُردو مری زباں ہے

اب ہے ہراس تو کیا ہے دل کو یاس تو کیا
میں ہوں اُداس تو کیا موسم تو کامراں ہے

اُردو مری زباں ہے

ہمّت سے کام لوں گی اُردو کا نام لوں گی

گردنوں کو تھام لوں گی جرأت ابھی جواں ہے
اردو مری زباں ہے
بدلیں گی پھر ہوائیں پلٹیں گی پھر فضائیں
برسیں گی پھر گھٹائیں اللہ مہرباں ہے
اردو مری زباں ہے
دل شاد ہے اثر کا روشن ہے منہ سحر کا
جائے گا غم قمر کا میرا بیاں بیاں ہے
اردو مری زباں ہے

قمر

نواب قمر جہاں بیگم نام اور قمر تخلص ہے۔ اودھ کے تعلقدار اور ایک بڑے خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ تعلیم یافتہ اور بالغ نظر خاتون ہیں۔ آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ اور مذہب پرست خاتون ہیں۔ آپ مغربیت اور مغربیت سکھانے والی موجودہ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں اور اس کے معائب کے خلاف آپ نے نظم و نثر دونوں میں آواز بلند کی ہے۔ آپ خواتینِ مشرق اور خصوصاً دخترانِ اسلام کو مغربی معاشرت کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہتی ہیں۔ آپ نے سماج کے غلط رسم و رواج پر بھی تنقید کی ہے۔ آپ مسلمان مرد و عورتوں کو اسلام کا بھولا ہوا سبق پھر یاد دلانے کی خواہش مند ہیں۔ اور یہ

نہایت اصلاحی اور تبلیغی مقصد آپ کے کلام میں نمایاں ہے'

تہذیبِ جدید کا نوحہ

نئے فیشن کے دلدادہ غضب کیسا یہ ڈھاتے ہیں
سرِ بازار وہ ناموس کو اپنے پھراتے ہیں
وہ نسوانی شرافت اور عزت کو ہٹاتے ہیں
کہ اپنے دوستوں کے ساتھ میں اُن کو نچاتے ہیں
جو عورت مومنہ دیندار اُن کے پالے پڑتی ہے
تو کرنی نوں سے بیٹے توں کے آنسو رلاتے ہیں
نہ پرواہ خانہ داری کی نہ ہے کچھ فکر بچوں کی
یہ جوڑے ہے پارٹی میں اور کلب میں روز جاتے ہیں
کہاں کی ہے یہ آزادی اسے کہتے ہیں بربادی
وہ دشمن ہیں ہمارے یہ طریقے جو سکھاتے ہیں
جہالت میں کبھی دختر کو زندہ دفن کرتے تھے
مگر اب روشنی میں علم کی اس کو جلاتے ہیں
نہیں ہے اب بھی وقعت کوئی عورت کی زمانے میں
بہائم کی طرح اس کو اشاروں پر نچاتے ہیں
پسند آتی ہے یہ تقلید ان کو غیر قوموں کی
سب احکامِ الٰہی اپنے دل سے یہ بھلاتے ہیں
وہ عاشق ہو گئے اس درجہ دیوی پرستی کی

کہ عورت اور غیرت بھینٹ دیوی پر چڑھاتے ہیں
یہی تعلیمِ نسواں فرض کی ہے کیا پیمبر نے
کہ اسکولوں میں اس کو علمِ موسیقی سکھاتے ہیں
سمجھتے ہیں یہ جاہل اپنے ماں باپ اور دادا کو
خدا کی شان ہے غنچے گلوں پر مسکراتے ہیں
یہ اپنی بیوں کو دیتے ہیں دھمکی طلاقوں کی
خُلع کا دھیان بھولے سے نہیں پر دل میں لاتے ہیں
اطاعت فرض ہے شوہر کی جب وہ ہو مطیعِ حق
خدا سے منحرف ہو کر خدائی کیوں جتاتے ہیں
ستیا ناس کر دیا کیوں اپنے مذہب کو
کھڑے ہوں اپنے بل بوتے پہ کیوں ایماں گنواتے ہیں
پڑھو آیاتِ قرآنی سنو تعلیم اسلامی
خدا کی اور پیمبر کی یہ خوشنودی سکھاتے ہیں
سنو اسلام بھی آیا ہے عورت کی حمایت میں
مقولہ بانیٔ اسلام کا تم کو سناتے ہیں
تمھاری ماؤں کے قدموں کے نیچے باغ جنت ہے
سلوک اچھا کرو تم اپنی زوجہ سے بتاتے ہیں
بہت تاکید زوجہ کے لئے عدل و کرم کی ہے
جو حق اُن پر تمھارا ہے وہی ان کا بتاتے ہیں

اور ان کا نان و نفقہ بھی دینا تم پہ واجب ہے
کمائی ہیں تمھاری ہیں شریک اس کو بتاتے ہیں
مگر انصاف کے بدلے یہ بے انصافیاں کیسی
انھیں کا مال کھاتے ہیں انھیں پر ظلم ڈھاتے ہیں
لغت میں لفظ عورت ہی کے معنے ہیں چھپانے کے
حفاظت کے لئے سب قیمتی موتی چھپاتے ہیں
ذرا سوچو اگر اسلام میں پردہ نہیں جائز
تو محرم اور نامحرم کی شرطیں کیوں لگاتے ہیں
نہیں خارج ہوا پردہ کبھی دنیا کے کاموں میں
خواتینِ سلف کے کارنامے یاد آتے ہیں
حیا ایمان کا جز ہے یہی زیور ہے عورت کا
جو عاقل ہیں کہیں وہ اپنی دولت کو گنواتے ہیں
قمرؔ ہم نے ادا اپنا کیا اک فرض تبلیغی
خدا رکھے انھیں جو ہم کو دیوانہ بناتے ہیں

قیصر

محترمہ قیصر جہاں مسولی عصمتؔ کی مشہور شاعرہ ہیں نظمیں بہت عمدہ لکھتی ہیں آپ کا کلام پختہ اور بلند ہے۔ طرزِ ادا صاف پاکیزہ و دلکش ہے زبان بہت مہذب اور شائستہ لکھتی ہیں:۔

مسرّت

نغمہ یہ وہ ہے جو تاروں سے کبھی نکلا نہیں
پردۂ سازِ جہاں سے جو کبھی مچلا نہیں
نور اس کا چاند اور تاروں میں بھی ملتا نہیں
پرتو اس کا قلبِ انساں پر کبھی پڑتا نہیں
جامِ دل لبریز ہو جس سے یہ وہ صہبا نہیں
چھو سکیں جس کو ہمارے لب یہ وہ مینا نہیں
آسماں کی وسعتوں میں بھی خوشی ملتی نہیں
یہ کلی وہ ہے کہ گلزاروں میں بھی کھلتی نہیں

اس کی نکہت باغِ عالم کی بہاروں میں نہیں
جلوہ اس کا بزمِ ہستی کے نظاروں میں نہیں
یہ جہاں کے پُر فضا گلشن کی دیاروں میں نہیں
دشت میں، صحنِ چمن میں، کوہساروں میں نہیں
یہ شمیمِ روح پرور خلد زاروں میں نہیں
کیف اس کا گل بداماں سبزہ زاروں میں نہیں
صدفِ دل محرم ہے جس سے وہی گوہر ہے یہ
چوٹ سے نظروں کی جو ٹوٹے وہی ساغر ہے یہ

میں نے اس گوہر کو ڈھونڈا زندگی کے بحر میں
تھا یہ ذوقِ جستجو جذبات کی ہر لہر میں
روشنئ دیدہ پرور اس کی بزمِ دہر میں
میں نے ڈھونڈی شمعِ فطرت میں شعاعِ مہر میں
بستیوں میں اس کو ویرانوں میں سونے شہر میں
جا بجا عالم میں جھانکا گوشہ ہائے دہر میں
میں نے ڈھونڈا سازِ فطرت کے ترنّم میں اُسے
صبحِ رنگ و بو میں غنچوں کے تبسّم میں اُسے

خارزارِ غم کو طے کر لیں تو یہ جنّت ملے
بے نیازِ عیش ہو جائیں تو یہ عشرت ملے
ترک کر دیں لذّتیں ساری تو یہ لذّت ملے
نظرِ استغنا جو حاصل ہو تو یہ نعمت ملے
فکرِ دنیا سے دلِ انساں کو گر فرصت ملے
اس تہی دستی ہی پایہ کو یہ دولت ملے

نور اس کا خانۂ تاریکِ غم سے دور ہو
قلبِ مستغنی میں یہ بن کر سکوں مستور ہو

ک

کافر

فرخ جمال نام اور کافر تخلص ہے، جہان آباد دہلی ہبیت مسکن ہے آپ نے مسلم گرلس اسکول علیگڑھ میں تعلیم پائی ہے۔

آپ موجودہ دور کی ایک خوش گو اور قابل قدر شاعرہ ہیں۔ آپ کی شاعری میں صرف خیال آفرینی اور لفظی صناعی ہی نہیں، جذبات کی ترجمانی بھی موجود ہے آپ کے اشعار بہت پُر کیف اور بلند پایہ ہوتے ہیں، زبان پر بھی آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے آپ اساتذہ کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں "نقاب الٹا" اور "آفتاب الٹا" بہت پامال طرح ہے جس میں خصوصاً مصحفی اور سید انشا کی یہ غزلیں آج تک مشہور ہیں :-

مصحفی ؎ جو پھر اکے اس نے رخ کو نقضا نقاب الٹا
ادھر آسمان الٹا، ادھر آفتاب الٹا

سید انشاء ؎ مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا

اسی زمین میں محترمہ نے بھی ایک غزل لکھی ہے اس کے اشعار ملاحظہ ہوں

بدمستی شبینہ کا یہ شباب اُلٹا
جس میکدہ میں پہنچے جام شراب اُلٹا

ساقی سے کر رہا ہے شکوے شباب اُلٹا
کشتی مے میں کب تک جام شراب اُلٹا

شرم و حیا نے بڑھکر خود آئینہ دکھایا
بیتاب ہولے نے بڑھکر طرف نقاب اُلٹا

اُٹھتی نہیں نگاہیں شرم اے گناہ اُلفت
ہم ان سے کر رہے ہیں آخر حجاب اُلٹا

کامل

زمانہ حال کی ایک پردہ نشین عفت مآب تعلیم یافتہ سنی المذہب خاتون ہیں۔ کلام صاف اور ستھرا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

پی چکے جام ترے ہاتھ سے جو اے ساقی
حشر تک اب وہ نہیں ہوش میں آنے والے

چاہئے تجھ کو بھی ہو لاش اُٹھانے میں شریک
دفن ہوتے ہیں ترے ناز اُٹھانے والے

دوست کا نام لیں آکر سر بالیں دم بھر
وقت آخر مجھے یٰسین سنانے والے

ناز سے ہم تو بتوں کے ہوئے تنگ اے کامل
کعبہ کی سمت ہیں اب ہند کے جانے والے

جو کچھ کہ عہد ہے ترا پورا ہی کر اسے
او بے وفا تجھے ترے ایمان کی قسم

جب تلک کہ دم میں دم ہے، کہونگا میں بس یہی　　دیتا ہوں تجھ پر جان، تری جان کی قسم

کلثوم

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے۔ آپ کا کلام عصمت میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ ذیل کا مرثیہ جو آپ نے اپنے بیٹے بشیر کی وفات پر لکھا تھا یاس وحسرت کے جذبات کا مرقع ہے۔ اس نظم میں، ایک ظاہر بین نقاد کو، جو شاعری کو صرف الفاظ و تراکیب اور زبان کے معیار پر جانچنے کا عادی ہے، بہت سے عیب نظر آئیں گے۔ مثلاً دوسرے بند میں "میں نے" کے بجائے "میں" ولی وسودا کے زمانے میں جائز ہو تو ہو، اب جائز نہیں ساتویں بند میں "دھیان" (بہ اعلان نون) کی بجائے "دھیاں" (بغیر اعلان نون) نہایت غیر فصیح ہے اس بند کے آخر میں "جگر پر سانپ لوٹنا" محاورہ غلط ہے چونکہ محاورہ دل پر سانپ لوٹنا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے سب اعتراضات تسلیم۔ لیکن دراصل شاعری صرف الفاظ و زبان کا نام نہیں، شاعری نام ہے ترجمانیٔ جذبات کا اور اس حیثیت سے یہ نظم بہت بلند ہے:-

ایک اجڑے دل کی فریاد

کثرت سے غم کی سینہ و دل داغ داغ ہے　　یادِ پسر سے اپنا پریشاں دماغ ہے
ناکامیوں سے خانۂ دل بے چراغ ہے　　ایسے بھی ہوں گے جن کو کہ غم سے فراغ ہے

اپنی تو ہائے زیست مصیبت میں کٹتی ہے

رنج و غم و الم میں اذیت میں کٹتی ہے

سو سو مصیبتوں سے میں پالا بشیر تھا
اس بدنصیب گھر کا اُجالا بشیر تھا
صورت میں خو میں سب سے نرالا بشیر تھا
میرے چمن کا سروِ دو بالا بشیر تھا
چڑھتی جوانی ہی میں قضا اس کو کھا گئی
برچھی لگا گئی مجھے زخمی بنا گئی

بیٹھے بٹھائے مجھ پہ تو بپتا سی پڑ گئی
برچھی غموں کی ہائے کلیجہ میں گڑ گئی
افسوس یک بیک مری قسمت بگڑ گئی
کیسی ہری بھری مری کھیتی اُجڑ گئی
دکھیاری غم کی ماری نہ روئے تو کیا کرے
کثرت سے غم کی جان نہ کھوئے تو کیا کرے

چین آئے کیونکہ سینہ سے قلب و جگر گیا
دیکھوں جہاں میں کیا مرا نورِ نظر گیا
افسوس میرا لاڈلا اک دم میں مر گیا
ہائے ہائے مٹا گیا مجھے برباد کر گیا
ہے بیقرار دل مرا سیماب کی طرح
تڑپ رہی ہوں غم سے ماہیِ بے آب کی طرح

وہ دن کہاں گئے کہ وہ تھا شمعِ آرزو
گھر میں اُجالا ہو رہا تھا جس سے چار سو
ہائے ہائے یہ کیسی چل گئی بے وقت گرم لو
نغمے کے بدلے باغ میں ہے شورِ ہائے وہو
افسوس جڑ سے نخلِ تمنا اُکھڑ گیا
دم میں ہرا بھرا مرا گلشن اُجڑ گیا[1]

---

[1] چکبست کی مشہور نظم "راماین کا ایک سین" کا ایک شعر یہ ہے ؎
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا ؛ پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

آنکھوں میں آج میری سیہ ہو گیا جہاں　　اٹھتا ہے دل سے حسرت و ارمان کا دھواں
نکلے نہ دل سے کیونکہ مرے نالہ و فغاں　　افسوس لٹ گیا مرا بستی میں کارواں
کچھ رحم آیا مجھ پہ نہ اے آسماں تجھے
جل جل کے کیوں بھلا نہ میں دوں گالیاں تجھے

جب بھولی بھولی شکل کا آتا ہے مجھکو دھیاں[۵]　　گودی میں لیٹ کر وہ سنانا کہانیاں
وہ دھیمی دھیمی گفتگو اور توتلی زباں　　دن رات میرے دل میں چبھوتی ہیں برچھیاں
وہ لڑکھڑا کے بھاگنا جب یاد آتا ہے
میرے جگر پہ سانپ سا اک لوٹ جاتا ہے

میری کمائی لوٹ لی تو نے جو اے قضا　　برباد میں ہوئی ترے کیا ہاتھ آ گیا
مجھ دل جلی کے گھر میں فقط اک چراغ تھا　　بیدرد تو نے ہائے اسے بھی بجھا دیا
اے موت لے گئی تو کلیجہ نکال کر
اس غم سے کیوں کہ ہو نہ ٹکڑے مرا جگر

یہ مانا حکمِ حق سے تو بے اختیار ہے　　بندوں کی جان لینے میں مصروف کار ہے
موت و حیات مرضئ پروردگار ہے　　راہِ گریز اور نہ جائے قرار ہے
پر دل کے ہاتھوں تنگ ہوں صدمہ کا جوش ہے
بے بس ہوں فرطِ رنج سے بیجا خروش ہے

---

۵ "دھیاں" میں "ں" کا اعلان ضروری ہے پھر بھی یہ بند جہاں تک واقعات نگاری کا تعلق ہے قابلِ تعریف ہے "ج"

کنیز

محترمہ کنیز ہمیونہ مانڈہ کی رہنے والی ہیں۔ آپ کا کلام زنانہ رسائل خصوصاً خاتونِ مشرق میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ محاکات اور واقعہ نگاری سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس رنگ میں اچھا لکھتی ہیں احسان دانش اور جوش کے رنگ سے متاثر ہیں۔ اشعار پُرکیف و پُراثر ہیں، نمونہ یہ ہے :-

جا رہی ہے اک حسینہ مینڈھ پر — گاؤں سے کچھ فاصلے پر ننگے سر
بھوک کی شدت سے چہرہ نڈھال — فرطِ غم سے آرزوئیں پائمال
چشم سے لبریز پیمانے عیاں — آنسوؤں سے غم کے افسانے عیاں
ہائے یہ اٹھتی جوانی کا جمال — یہ حسینہ اور روٹی کا سوال
اس کو کھانا پیٹ بھر ملتا نہیں — کوئی غم کی داستاں سنتا نہیں
گرد سے ہیں اٹے معصوم بال — خشک ہو کر رہ گئے رنگیں بال
زردی کی ہے عارض پر نقاب — جس طرح بادل کی تہ میں ماہتاب
حسرت و ارمان بھی بکھرے ہوئے — حادثاتِ زندگی بکھرے ہوئے
اوڑھنے کو اک دوپٹہ بھی نہیں — آہ گردوں تو کسی کا بھی نہیں
زندگی گرداب میں آئی ہوئی — آبرو کی ناؤ چکرائی ہوئی
آسماں کی کج روی افسوس ہے — حسن کی یہ مفلسی افسوس ہے
آہ ہندوستان! تیری لڑکیاں — اس طرح سے ٹھوکریں کھائیں کہاں[1]

[1] صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ آہ یہ آفات یہ بربادیاں ؎ ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ تیری اب یہ حالت ہو گئی تیری قسمت منہ چھپا کر سو گئی
دل بھر آتا ہے تری برسات سے درد اٹھتا ہے ترے نغمات سے
آہ ہندوستان ایسا انقلاب سرنگوں ہے تیرے دامن میں شباب
ہے زمانے میں سکوں شاید محال
اب میں سمجھی زندگانی کا مآل

ل

لطیف

لطیف النساء بیگم نام اور لطیف تخلص ہے، حیدرآبادی خاتون ہیں آپ سید مظفرالدین سابق مہتمم پولیس کی دختر اور سید یوسف علی صاحب لکچرار سٹی کالج حیدرآباد کی شریکِ حیات ہیں۔

ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز ہائی اسکول حیدرآباد میں ہوئی اور پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اب محبوبیہ گرلز اسکول میں معلّمہ ہیں۔ نظم و نثر دونوں لکھتی ہیں۔ رسالہ سب رس کی خصوصی مضمون نگار ہیں۔ آپ کی نظمیں سادہ، سہل اور عام فہم ہوتی ہیں۔ آپ زیادہ تر بچوں کے لئے لکھتی ہیں اور اس کا خیال رکھتی ہیں کہ خیالات اور طرزِ ادا دونوں بچوں کے حسبِ حال ہوں۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

زبیری اپنی جتا رہے تھے نذیرن اپنا بتا رہے تھے
پکڑ کر لائے تھے اک مکوڑہ بہن کو اپنی ڈرا رہے تھے

سہم کے ہٹتی تھی پیچھے مریم
غریب بچی بلک رہی تھی
نہ بھایا قدرت کو ظلم ان کا
مکوڑے نے اب جو کاٹ کھایا

یہ "باؤ" کہہ کر جو آرہے تھے
ذکی میاں کھلکھلا رہے تھے
جو بے خطا کو ستا رہے تھے
سزا کئے کی یہ پا رہے تھے

تڑپ رہے تھے دبائے انگلی
بری طرح بلبلا رہے تھے

لیلیٰ

لیلیٰ بیگم نام اور لیلیٰ تخلص ہے۔ حیدرآباد دکن کی شاعرہ ہیں آپ سید امین الحسن صاحب ناظم عدالت حیدرآباد کی شریک حیات ہیں۔ شاعری کا شوق ہے۔ اپنے شوہر ہی سے تلمذ حاصل ہے، آپ کا کلام ادبی رسائل میں شایع ہوتا ہے، آپ کے کلام میں خیالات کی بلندی، رنگینی اور لطافت موجود ہے، نمونہ کلام یہ ہے۔

اس انداز سے آئے غصہ میں وہ
کہ ہر اک ستم مدعا ہو گیا

محبت کا اعجاز میں کیا کہوں
بڑھا درد، بڑھ کر دوا ہو گیا[۱]

---

[۱] غالب سے ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

محترمہ انوار فاطمہ شبنم لکھنوی

شاید اب عشق ہو گیا کامل
غم میں لذت سی پا رہی ہوں میں

م

محجوب

محبوب جہاں نام اور محجوب تخلص ہے، دورِ حاضر کی ایک اچھی غزل گو شاعرہ ہیں۔ آپ کی صرف ایک طرحی غزل ملی ہے، زبان شستہ اور طرزِ ادا صاف و پاکیزہ ہے۔

کروں میں اس سے عرض مدعا کیا		وہ سمجھے گا وفا نا آشنا کیا
تمنا تک ہے لطف زندگانی		تمنا مٹ گئی تو پھر رہا کیا
نہ اب وہ بال و پر ہیں اور نہ جرأت		چھٹے بھی گر قفس سے تو مزا کیا
سنیں جب میری باتیں ہنس کے بولے		یہ ہے تمہید عرض مدعا کیا
نہیں جب ان کو اندازہ جفا کا		تو کیا سمجھیں گے وہ میری وفا کیا

محبت میں جو اسے محجوب گزری
کہیں اب تم سے اس کا ماجرا کیا

مخفی

سعیدہ جہاں نام اور مخفی تخلص ہے آپ کے خود نوشتہ حالات جو آپ نے راقم الحروف کو اس تذکرہ کے لئے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:-

"میں ۱۵ جولائی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی معظم و بزرگ مولوی محمد شفیع خاں سے حاصل کی جو اردو، فارسی

اور عربی میں خاصی قابلیت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ شاعر بھی تھے۔ آپ کے صاحبزادے محمد علی خاں آثر رامپوری کے نام سے مشہور ہیں۔ اُردو، فارسی کی تعلیم مولوی صاحب موصوف سے حاصل کی لیکن جلد ہی تعلیمی سلسلہ ختم کرنا پڑا کیونکہ پندرہ سال کی عمر میں ۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء کو شادی ہوگئی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بارہ تیرہ سال کی عمر میں پیدا ہوا۔ ویسے تو یوں ہی والدین کے حکم کی تعمیل تھی لیکن شوق جوں کا توں رہا کیونکہ شادی عورت ہونے اور گھر بار کی ذمہ داری کا سارٹیفکیٹ تھی اب اتنی مہلت کہاں تھی کہ ازسرِ نو اس کا ارادہ کیا جاتا لیکن ہمت اور ذوقِ حقیقی نے پھر ایک کروٹ لی اور دل کے اندر دبی ہوئی چنگاری رفتہ رفتہ آتش فشاں بن گئی روزمرہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی ابتدا میرے شوہر رحمت نبی خاں نے کرائی۔ ایک ماہ بعد استاد ہمت ہار بیٹھے لیکن شاگرد کو اور بھی زیادہ شوق پیدا ہوگیا کچھ خاندانی معاملات ایسے تھے جن کی وجہ سے کوئی اُستاد یا اُستانی مقرر کر کے باقاعدہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بالآخر چھوٹے چھوٹے بچوں سے مدد لے کر ڈکشنری کی امداد سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی۔ میرے ذوقِ علمی کو مدِ نظر رکھ کر رحمت نبی خاں صاحب کے اُستاد قاضی صولت حسین خاں صاحب ایم۔ اے نے رائے دی کہ مجھے منشی الہ آباد کے امتحان میں شرکت

کی لہذا بغیر کسی استاد کے (کیونکہ بچپن کی اردو۔ فارسی تعلیم تھوڑی بہت تھی) امتحان میں شرکت کی اور کامیاب بھی ہوئی اس کے بعد میرے کرم فرما ماسٹر صولت حسین صاحب کی کوشش اور آپ کی امداد سے میں نے میٹرک امتحان پاس کیا اس کے بعد رفتہ رفتہ اتنی سہولت ہو گئی کہ میں ماسٹر صاحب موصوف سے گاہے گاہے اپنی مشکلات حل کر لیا کرتی تھی۔ اور آپ نے انتہائی جانفشانی اور کوشش سے ایف۔ اے کا امتحان دلا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے جو کچھ بھی ملا وہ ماسٹر صولت حسین صاحب کی شفقت اور مہربانی سے ملا۔ انھوں نے ہی مجھے ترقی کی راہ دکھلائی۔ صاحب موصوف معزز خاندان سے ہیں خاندان مغلیہ سے خطابات بھی حاصل کئے ہوئے ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی ان کے عزیز معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔

عربی کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد جان بیگ سے حاصل کی۔

تہذیب نسواں میں متعدد مضامین شائع ہوتے رہے اور دوسرے رسائل مثلاً ایشیا وغیرہ میں بھی ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے کئی ڈرامے۔ فیچر "سوتیلی ماں" "دلہن" وغیرہ براڈ کاسٹ ہوئے شوہر کی تعلیم کے سلسلہ میں علیگڑھ جانا پڑا۔ وہاں ادبی ذوق سے کافی متاثر ہوئی۔ محترم قبلہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے ادبی نکات و باریکیاں سمجھائیں اور اپنی شاگردی کا شرف بخشا جو میرے واسطے

باعث صد افتخار ہے۔ مختصر یہ کہ ابتدا مولوی محمد شفیع خاں نے کرائی اور تکمیل پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی قبلہ نے۔ ان کی رائے سے اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا۔ شاعری کا شوق بچپن سے رہا اور اس دوران میں جب موقع ملا کچھ نہ کچھ کہہ گزری۔ سب سے پہلی چیز آل انڈیا اردو کانفرنس بریلی کے موقعہ پر کہی جو مصرعۂ طرح پر لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور فوراً ہی علیگڑھ جانا پڑا۔ وہاں ادبی موجوں نے خوب پیاس بجھائی۔ بہت چیزیں کہیں، تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ گرلز کالج میں، زنانہ مسلم کانفرنس میں برابر موقع ملتا رہا اور میرے ذوق کو تسکین ملتی رہی۔

۱۹۳۶ء میں ایک سیاسی پمفلٹ نکالا۔ ایک ڈرامہ اسٹیج کے لئے تیار کیا۔

خاندان کے متعلق مصنف کی معلومات کافی ہیں۔　　　راقمہ مخفی"

محترمہ مخفی جناب قمر شاہ خاں صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کی صاحبزادی ہیں جو رامپور کے ایک مشہور اور بڑے رئیس ہیں۔ محترمہ کے خاندان میں زمانہ قدیم سے ادبی ذوق چلا آرہا ہے آپ کے جد امجد کے یہاں ہمیشہ شاعروں کا ہجوم رہا۔ آپ کے والد کے نانا محمد عثمان خاں صاحب رامپوری کا تذکرہ مولانا احسن مارہروی کی تاریخ نثر اردو حصہ اول اور شوق رامپوری کے تذکرہ کاملان رامپور میں موجود ہے۔ آپ کی شادی

جناب رحمت نبی خاں صاحب ایم۔اے (علیگ) سے ہوئی ہے جو راقم السطور کے دوست اور ہمدرس رہ چکے ہیں، آپ جناب جمیل خاں صاحب رئیس رام پور کے صاحبزادے ہیں اور بریلی میں مقیم ہیں۔ اس نسبت سے محترمہ مخفی اکثر ادبی دنیا میں "سعیدہ رحمت نبی بریلوی" کے نام سے مشہور ہیں:

محترمہ مخفی موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ خاتون ہیں آپ خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی خواہشمند ہیں اور ان کو علم اور زندگی کی برکتوں سے فیض یاب دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ نے اپنے ان جذبات کا اظہار اپنی اکثر نظموں میں فرمایا ہے، نظموں کے علاوہ آپ غزلیں بھی لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام صاف و پُر اثر، اور اسلوب بیان پاکیزہ ہے۔

ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ محترمہ کا خود منتخبہ کلام ہے جو آپ نے اس کتاب کے لیے ارسال فرمایا ہے۔

غزل [1]

چشم تر دیکھ، غم دل نہ نمایاں ہو جائے ۔۔۔ عشق کے سامنے اب حسن پشیماں ہو جائے
جانتا ہوں جب تمنا کو گناہِ اُلفت ۔۔۔ عشق وہ ہے جو نہاں رہ کے نمایاں ہو جائے
اپنی مجبوریٔ الفت کا نشانہ کہہ کر ۔۔۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ نہ پشیماں ہو جائے

---

[1] یہ ایک طرحی غزل ہے مصرعہ طرح یہ تھا "جو نظر بھر کے تجھے دیکھ لے حیراں ہو جائے"

داغِ الفت کی تجلی جو نمایاں ہو جائے
شعلۂ طور بھی اک بار پشیماں ہو جائے
ضبطِ غم سے نہیں یارائے خموشی مجھکو
تم جو کچھ پوچھ لو مشکل میری آساں ہو جائے
کاش یوں برق گرے خرمنِ دل پر مخفی
ذرہ ذرہ مری ہستی کا فروزاں ہو جائے

بیداریٔ نسواں [1]

اپنی کھوئی ہوئی توقیر نمایاں کر دیں
کیوں نہ تاریکیٔ محفل کو فروزاں کر دیں [2]
نورؔ سلطانہ و رضیہ کی حمیت کی قسم
عظمتِ رفتہ سے دنیا میں چراغاں کر دیں
فاطمہ زہرہ کے دل دوز تحمل کی قسم
گنبدِ چرخ کو اک بار تو لرزاں کر دیں
جبر اور ظلم کی بنیاد کو ڈھا کر بہنو
آؤ اب ہمتِ مردانہ کو حیراں کر دیں
تفرقے سارے یہ آپس کے مٹا ڈالیں ہم
آؤ اب جرأتِ نسواں کو نمایاں کر دیں
ہند ویران ہوا ہم کو ہی مخفی رکھکر
اٹھو اس اجڑے گلستاں میں بہاراں کر دیں

غزل

بتا دو تمھیں میری چاہت نہیں ہے
جدائی ہماری قیامت نہیں ہے

---

[1] یہ نظم آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ کا نفرنس کے موقعہ پر علیگڑھ میں فاطمہ جناح کی صدارت میں سنائی گئی۔

[2] علامہ اقبالؒ
اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

نہیں ہے تمھیں مجھ سے الفت نہیں ہے　بناوٹ ہے ساری یہ چاہت نہیں ہے
ہمیں تم سے ملنے کی حسرت نہیں ہے　مگر دور رہنے کی طاقت نہیں ہے
تمھیں یاد کرنے کی فرصت نہیں ہے　ہمیں بھول جانے کی عادت نہیں ہے

نہ کنزا اور ستہ نہ گھبرا کے سب کو
نہیں ہے یہ مخفی کی تربت نہیں ہے

"اُمید"

غم مخفی ہی علاج غمِ نسواں ہو گا
دردِ دل آپ ہی اپنے دکھ کا درماں ہو گا

ہو جو تاریکی پیہم ہے تو غم کیا بہنو　بے بسی بے کسی ہمدم ہے تو غم کیا بہنو
غیرتِ مردمی برہم ہے تو غم کیا بہنو　تپشِ غم ہی علاج غمِ دوراں ہو گا

(۲)

منہ چھپائے گا خود اندیشۂ صیاد مہیب　ہو گی بربادی ملی آبادیٔ نو کی تقریب
غرق ہو جائے گا اک روز طلسمِ تخریب　جب تمھیں اپنا خیالِ غمِ پنہاں ہو گا

(۳)

یہ گھٹائیں جو اٹھی ہیں افقِ دوراں سے　داغ مٹ جائیں گے اب سینۂ ہندوستاں سے
پھول برسیں گے ہمیں پر دہنِ نسواں سے　دہر اب نازکشِ ہمتِ نسواں ہو گا

(۴)

دور ہو جائے گا اک روز جہالت کا فساد　قہر اور مکر سے ہو جائے گی دنیا آزاد
ہاں جگائے گی زمانہ کو ہماری فریاد　خنجرِ حق جو اسی طرح نمایاں ہو گا

(۵)

عقلِ انصاف کا لہرائیں گے پرچم بڑھ کر
زیست کو بخشیں گے تسکینِ دو عالم بڑھ کر
بنتِ حوا کے لئے لائیں گے عزت بڑھ کر
یہ جہاں باعثِ صد عزتِ نسواں ہوگا

(۶)

دشت کو باغ بنا دے گی ہوائے دوراں
پھر نظر آئے گا ہر فرد ہی شاداں فرحاں
سرِ مغرور جھکا دے گی صدائے نسواں
دامنِ ہند گل افروزِ بہاراں ہوگا

(۷)

ہاں جہالت کا یہ تاریک زمانہ کب تک
اور رسوماتِ کہن کا یہ بہانہ کب تک
قید اور بند کا دل سوز فسانہ کب تک
ہوگا مہتابِ حقیقت کا درخشاں ہوگا

(۸)

خانۂ امن و مساوات بنے گی دنیا
عدل و انصاف کا گہوارہ بنے گی دنیا
غیرتِ جنتِ فردوس بنے گی دنیا
اخترِ امن و مساوات نمایاں ہوگا

(۹)

اف ہم بارِ اذیت یہ سہیں گے بہنو
اپنی ہمت سے کچھ اب ایسے بنیں گے بہنو
غمِ پیہم میں نہ اب ایسے پھنسیں گے بہنو
ہر بشر قوتِ احساس پہ حیراں ہوگا

(۱۰)

شمعِ بیداریِ نسواں ہی چراغاں ہوگی
آگہی جرأتِ نسواں پہ جو حیراں ہوگی
زندگی سر بکفِ احساس پہ نازاں ہوگی
ہند گلزارِ گل افروزِ گل افشاں ہوگا

(۱۱)

پست نظروں سے نہ دیکھے گا کوئی اب ہم کو
کیسے نظروں سے گرائیگا کوئی اب ہم کو
کیسے نفرت سے پکارے گا کوئی اب ہم کو
چرخ پہ کوکبِ نسواں ہی درخشاں ہوگا

(۱۲)

روحِ بیداریٔ احساس پہ یوں مائل ہے
ہم کو بیداریٔ نسواں کا یقیں کامل ہے
دردِ دل، دردِ جگر، سوزِ وفا حاصل ہے
جذبِ دل جرأتِ نسواں ہی پہ خنداں ہوگا

(۱۳)

غمِ دل اپنا جو مخفی ہے سنو تم بہنو
درسِ تاریخ کا بہنوں سے کچھ اب سیکھو
داستاں خالدہ ترکی کی ذرا تو دیکھو
یوں ہی اقبال[1] تمہارا ابھی نمایاں ہوگا

(۱۴)

جگمگا دے گا جہاں کو یہ مرا عزمِ سعید
ہاں ہلا دے گا فلک کو یہ مرا عزمِ سعید
اب مٹا دے گا غلامی کو مرا عزمِ سعید
دلِ پژمردہ جو تقدیر پہ خنداں ہوگا

دخترِ اسلام سے خطاب

دخترِ اسلام تو آغازِ خوش انجام ہے
تو نہیں شامل تو ہر کارِ جہاں ناکام ہے
کیوں نہیں آزاد ہوتی ان قیودِ خام سے

---

[1] علامہ اقبالؒ
در معرکۂ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی (ضربِ کلیم)

کیوں پریشانی ہے تجھ کو اس اندھیری شام سے
دردِ قومی کی تڑپ سینے میں گر باقی ہے تو
سوزِ ملت کی خلش کا کچھ اثر باقی ہے تو
قوم تیری کیوں تباہی کی طرف جاتی ہے اب
سوچ کر شاید یہی اس زرجہ شرماتی ہے تو
ظلمتِ دیرینہ میں آخر چلی جاتی ہے کیوں
بحرِ افکارِ مسلسل میں بہی جاتی ہے کیوں
تیرا ساحل چھوٹتا ہے اور تو خاموش ہے
تیرا بیڑا ڈوبتا ہے اور تو خاموش ہے
دوسری قومیں فضیلت پا رہی ہیں تجھ پہ اب
زحمتوں پر زحمتیں کیوں چھا رہی ہیں تجھ پہ اب
یادگارِ عظمتِ رفتہ ہے تو ! خاموش ہے !!
دل فگار اب غیرتِ رفتہ ہے تو ! خاموش ہے !!
یاد کر پچھلے سبق ، پچھلی وفا ، پچھلی وہ شان
یاد کر وہ آن اب اے دخترِ ہندوستان
ہاں اُلٹ خودداریِ نسواں کے وہ پہلے ورق
یاد کر تہذیب اور اخلاق کے بھولے سبق
تیری دنیا لُٹ رہی ہے تو بھی اب بیدار ہو
چپ پڑی کیوں گھٹ رہی ہے ، تو بھی اب بیدار ہو

ہاں خدارا رحم کر یہ خوابِ غفلت کب تلک؟
جبر و استبدادِ یہ قہر و مذلّت کب تلک؟
رفعتِ نسواں دکھا دے بس ابھی اک آن میں
نغمۂ شیریں سنا دے آج اپنی شان میں
اپنے پاکیزہ تخیّل کی بلندی سے کہے آ
دخترِ اسلام شانِ ستمندی سے کہے آ
خنجرِ حق ہاتھ میں لے شورِ آزادی مچا
عزم کے طوفان بہا، انصاف کے بادل اٹھا
ذوق میں زیب النساء بن ہمّتِ رضیہ دکھا
عقل میں تو نور بن اور عفّتِ زہرہ دکھا
پھونک دے تو اپنی آہوں سے خس و خاشاک کو
سرد کر دے آنسوؤں سے بیکسی کی آگ کو
عزم میں تو خالدہ بن جرأت سلمٰی دکھا
حلم میں تو فاطمہ بن رفعت اسمٰی دکھا
اپنی آزادی کے نغمے گا کے دنیا کو جگا
اور اپنے طالعِ خفتہ کو بیداری سکھا
عشرت و ثروت کو بیجا عیش سامانی کو چھوڑ
اپنی ساہیں یاد کر اندازِ دہرانی کو چھوڑ
اپنے احساسِ خودی کو آہ تو نے کیا کیا

آدمیت کی سعی کو آہ تو نے کب کیا
چھوڑ دے فیشن پرستی اور تباہی کے چلن
کھول دے اب راز ہستی بھول مستی کے چلن
تو نہیں زندہ فقط اپنے لئے یہ جان لے
رحمتِ کونین ہے میرا کہا تو مان لے
خود پرستی خود نمائی یہ نہیں تیرا شعار
پست نظری خود ستائی یہ نہیں تیرا شعار
بیکسوں کا تو ہے سہارا بے نواؤں کو سکوں
تو غریبوں کی مدد کر دے یتیموں کو سکوں
تو سہارا ڈھونڈھتی ہے خود سہارا بن کے آ
خونِ ملت سرد ہے اب تو شرارہ بن کے آ
طالبِ امداد تو ہو غیرتِ نسواں کہاں
تو کسی کے کام آ پھر دیکھ یہ حرماں کہاں
اپنے اخلاق و ہنر آداب و تہذیب کمال
وقف کر دے خدمتِ عالم کو اپنے جان و مال
دخترِ اسلام اپنی شان اب مخفی نہ رکھ
جوش میں آ گرمیِ ایمان اب مخفی نہ رکھ

مخفی

صالحہ بیگم نام اور مخفی تخلص ہے آپ خاتونِ مشرق کی مخصوص شاعرہ ہیں۔ اور زنانہ رسالوں میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا کلام صاف اور اسلوب بیان دلکش ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

ساقیٔ گلعذار آ بلبلِ نغمہ بار آ ۔۔۔ رحمتِ کردگار کو ساتھ لئے بہار آ
شورشِ اضطراب ہے یادِ رخِ نگار آ ۔۔۔ مونس و غمگسار آ راحتِ جانِ زار آ
ساقی کہاں کدھر ہے خم ہوش کا بھی پتہ نہیں ۔۔۔ ساغرِ دل میں غیب سے بادۂ خوشگوار آ
آتا ہے کون پوچھنے ہجر کے غم نصیب کو ۔۔۔ تیرا ہی انتظار ہے۔ بہرِ خدا قرار آ
خشک شجر امید کا کر نہ سکے بہے خدا ہرا ۔۔۔ آس لگی ہے کب سے منتظر جلد تو اے بہار آ
شاخوں سے بھول گیا ہے کس کا یہ دستِ ظلم تھا ۔۔۔ حشر کریں چمن میں ہم بلبل ہو گوار آ
حسن سے اور عشق سے نظم ہے کائنات کا ۔۔۔ سارے جہاں میں اے ندیم جا کے ذرا پکار آ
قبر شہیدِ ناز پر بھول کبھی چڑھے نہیں ۔۔۔ دوش سے اپنے قرض کو جا کے تو ہی اتار آ
ہو شبِ ہجر کو زوال یا نہ لگیں جو اس کے بال ۔۔۔ بادِ صبا تو جا ذرا زلفِ صنم سنوار آ
تیرے طلوعِ صبح میں تو ہے نمود نام میں ۔۔۔ دل کے اس آئینہ میں بھی عکسِ جمالِ یار آ

تیرے سوا کوئی نہیں مخفیٔ غم نصیب کا
خانۂ دل ہے گھر ترا اس میں تو بار بار آ

مدنی

شہنانہ بیگم نام اور مدنی تخلص ہے۔ ورنگل (دکن) میں قیام ہے

زنانہ رسالوں میں اکثر آپ کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور خواتین کو مغربی تہذیب و تعلیم کی ہلاکت آفرینیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپ کے کلام میں بھی زورِ خیالات کا اثر موجود ہے۔ آپ کا کلام صاف اور سنجیدہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

جہاں کا رنگ پلٹا اور زمانہ کی ہوا بدلی
اثر تہذیبِ مغرب کا یہ ہے ساری فضا بدلی
فقط تعلیمِ نسواں سے نہ اک ذرہ ہوا رخصت
مسلمانوں کی طرزِ زندگی حد سے سوا بدلی
ہمیں آزادئ مغرب نے بے پرواہ کیا اتنا
کہ جس فیشن کو دیکھا اپنی زینت برملا بدلی
ہمارا خُلق بدلا، ڈھنگ بدلا، ہر عمل بدلا
ہماری چال بدلی، طرز بدلی، ہر ادا بدلی
ہوائے مغربی نے جوشِ غیرت تک کیا ٹھنڈا
کہ حتیٰ آج اپنی فطرتی شرم و حیا بدلی

مضطر

محترمہ رفیعہ بانو رضویہ

محترمہ مضطر رضویہ دورِ جدید کی شاعرات میں ایک بلند درجہ رکھتی ہیں۔ آپ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور قطعات غزلیں اور نظمیں سب کچھ لکھی ہیں۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور پُر کیف ہے

جذبات اور واردات قلب کی ترجمانی آپ کا خاص جوہر ہے۔ آپ کے یہاں رومانیت کے گہرے نقوش ملتے ہیں جنہوں نے آپ کے کلام کو بہت دلدوز اور پُراثر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی طرح چاندنی اور ستارے آپ کی شاعری کے مخصوص مرغوب موضوعات ہیں۔ آپ کے اس قسم کے اشعار لغایت ملبند و دلکش ہوتے ہیں۔ آپ دنیائے ادب میں صرف ایک خوش گو شاعرہ ہی کی حیثیت سے متعارف نہیں بلکہ آپ ایک ملبند پایہ اور انشا پرداز۔ مضمون نویس اور افسانہ نگار بھی ہیں آپ کے افسانے اور مضامین اکثر ادبی رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا طرز بیان پاکیزہ اور اسلوب دلکش ہے۔ زبان پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

محترمہ مقصر رضویہ نے اپنے حالات زندگی اور شاعری پر جو روشنی ڈالی ہے وہ شکریہ کے ساتھ درج ذیل کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کا منتخبہ مرسلہ کلام بھی شکریہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

میری شاعری

"جناب مصنف صاحب کا اصرار پیہم ہے کہ میں ان کی کتاب کے لئے اپنے حالات لکھوں" کیا ضرورت ہے کہ نشتر کی رگوں سے زخموں کی مزاج پرسی کی جائے اور کانٹوں کی نوکوں سے پھولوں کا ہار گوندھا جائے۔" میں کیا اور میرے حالات کیا۔ کچھ یہ نہیں کہ میری زندگی خدا نہ کرے کوئی ناکام زندگی ہے۔ نہیں بلکہ میرے اس

انجماد اور افسردگی کا سبب میری خرابیٔ صحت ہے۔ اسی کے باعث زندگی کا محبوب مشغلہ "فکرِ سخن" بالکل ترک نہیں ہوا تو کم ضرور ہو گیا ہے۔

"جو شغل کبھی "شغلِ حیات" تھا اب وہ ماضی کا بھولا ہوا خواب ہے، اللہ رے نیرنگیٔ زمانہ! آہ وہ دلچسپ مصروفیتیں، وہ ہنستی ہوئی شاعرانہ مشغولیتیں اب کہاں؟ حق تو یہ ہے کہ شادی کے بعد کوئی عورت تخیّل پرست نہیں رہ سکتی، اگرچہ اس کو کتنی ہی آزادیاں میسّر ہوں، سکون و اطمینان حاصل ہو۔ لیجئے میں اپنی شاعری کا نوحہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ مجھے تو اپنے حالات لکھنے ہیں۔

"میری پیدائش ۱۹۲۰ء میں بمقام مامن (ضلع بلند شہر) ہوئی۔ میرا پورا نام رفیعہ بانو مضمر رضویہ ہے۔ مجھے ابتدا ہی سے شعر و سخن سے بڑی رغبت تھی۔ کچھ فضا بھی حسنِ اتفاق سے شاعرانہ ملی تھی۔ والد مرحوم فارسی اشعار کے گویا لغت تھے۔ مجھے بہت بچپن سے انھوں نے حافظ و سعدیؔ وغیرہ کے چیدہ چیدہ اشعار ازبر کرا دئے تھے۔ ۳۰ء میں میں نے گل و بلبل سے متعلق ایک شعر کہا تھا۔ سب سے پہلا شعر ذرا سنئے تو کیا عجیب سا تخیل ہے ؎

ہمیشہ مست تم رہتے ہو اپنی خوشبوؤں میں خود
اثر کیا ہوئے گا تم پر گلو شورِ عنا دل کا

"اس وقت میرے والد مرحوم انتقال فرما گئے تھے برادرِ گرامی

رفیق رضوی (فلم ڈائرکٹر) نے جب شاعری سے میرا یہ اُنس دیکھا تو بہت خوش ہوئے انہی کی کاوش و محنت کا نتیجہ تھا جو میں اتنی جلد شعر کہنے لگی۔

"عام لڑکیوں کی مانند گھر پر اردو، فارسی کی تعلیم حاصل کی "بھائی بمبئی" میں اک گمنام سے گاؤں میں۔ محض اعلیٰ درجہ کے رسالوں، کتابوں اور لغت کی مدد سے میں نے بغیر کسی اتالیق کے اپنے میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ نظمیں، مضامین اور افسانے خدا کے فضل و کرم سے خاصے لکھ سکتی تھی۔ مجھے اپنے دماغ پر خود ناز تھا، عصرِ حاضر کے بہت سے مردانہ و زنانہ رسائل میں میرا کلام شائع ہوتا تھا۔ میری شاعری کا انتہائی عروج سنہ ۱۹۴۰ء تک ہے اس کے بعد گویا انحطاط کی ابتدا رہی ہے۔ میری شادی سنہ ۱۹۴۰ء میں سیّد ارشاد حسین بی اے سے ہوئی۔ میرے خسر صاحب مرحوم سیّد اخلاق حسین صاحب دیوان تھے۔ مرحوم کا تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد اوّل میں آچکا ہے۔ خدا کے فضل سے میری سسرال والے شعر و ادب کے شائق اور اہلِ مذاق ہیں۔ یہاں بھی ماحول اچھا ملا۔ مگر دل و دماغ کی کیفیت نہیں کہی جا سکتی کہ کیا ہو گیا۔ اور اگرچہ شادی کے بعد بھی میں نے کافی عرصہ تک نظمیں کہیں۔ مگر میرا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ عہدِ دوشیزگی کے تخیّل میں جو رومان جو شعریت جو حسن، اور جو جوانی تھی وہ بعد شادی کچھ عرصہ تک قائم رہی۔

پھر بالکل فنا ہو گئی۔ حالانکہ نہ زندگی ایک کامیاب زندگی تھی، کیا یہ اک ناقابلِ فراموش حقیقت نہیں کہ "تکمیلِ آرزو" ہی آرزو کی موت ہے [۱]

"میں ابتدا میں اپنا کلام رشتہ کے ایک بزرگ کو دکھاتی تھی لیکن جب تمام اعزہ میری تعلیم اور میری شاعری کے خلاف نظر آئے تو بھائی جان کے اک دوست جناب احسن رضوی داناپوری سے اصلاح لینے لگی، وہ بھی کچھ عرصہ تک، پھر تو اللہ کا نام لیکر افسانے اور مضامین تو بالکل ہی اور کچھ نظمیں بھی بغیر کسی کو دکھائے شائع کروانے لگی۔

لیجئے اب انتخاب کلام ملاحظہ فرمائیے، پہلے کچھ قطعات اور سنہ ۱۹۳۹ء کی دو تین غزلیں دیکھئے۔ "راقمہ مضطر رضویہ"

قطعات

مجھ کو قدرت نے ودیعت کی ہے وہ حسنِ لطیف
روح میں چھپتی ہے نرم و پاک پھولوں کی شمیم
جگمگا اُٹھتے ہیں میرے نوجواں ماضی کے خواب
چھیڑتی ہے شوخ کلیوں کو جو گلشن میں نسیم

---

[۱] نفسیاتی ادب اس فقرہ پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے "ج"

چاندنی، تارے، سمندر، فصلِ گل، کیفِ بہار
اُف یہ انبوہِ تجلی، یہ ہجومِ رنگ و بو
اس طرف زانو پہ میرے ان کا روئے نازنیں
ہاں یقیناً آج میں ہوں کامیابِ آرزو[1]

اے ستارو! چشمِ شاعر کے چمکتے آنسوؤ
جاگ کر روتے ہو تم راتوں کو کیوں آخر کہو
دیکھتے رہتے ہو کیوں حسرت سے شاعر کی طرف
اس کے دامن میں مچلنے کی ہے کیا پھر آرزو؟

ستارے!
جو چرخ پر سیمیں ستارے اس طرح ہیں منتشر
جیسے حورانِ بہشتی کی ردائے نور سے
گر پڑے ہوں چند غنچے ٹوٹ کر ہنستے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی ؎
چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں
ایضاً ؎ کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
نہ جانے کیا مجھے یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

یا حوادث سے فرشتے جب اثر لینے لگے!
روشن و بیتاب آنسو ان کی آنکھوں سے گرے
یا فروغ نکہت و ناشاد کا جی دیکھ سکے!!!
آسمانوں کی جبینوں پر پسینے آ گئے

غزلیات

جو صرف ماتم دل گیسوئے جانانہ ہو جائے
تو ہستی عشق کی الجھا ہوا افسانہ ہو جائے

سمجھ جائے اگر انسان خود رعنائی دل کو
نگاہوں میں جہانِ رنگ و بو افسانہ ہو جائے

ارے ظالم! نہ تیری پردہ داری میں اگر جاہوں
تو ہر نقطہ کتابِ دل کا اک افسانہ ہو جائے

وفورِ غم سے قوت ضبط کی اب سلب ہوتی ہے
مجھے ڈر ہے نہ ان کا راز بھی افسانہ ہو جائے

گدازِ درد میں ڈوبے سے کچھ قطرے ہیں مژگاں پر
اگر تم دیکھ لو بہتا ہوا افسانہ ہو جائے

محبت راز رہتی ہے رہے جب تک نگاہوں میں
اسی کو بیخودی کہہ دے تو اک افسانہ ہو جائے

جذبات اُلٹ دیں گے چہرے سے نقاب آخر
اک چشمِ تماشا سے کب تک یہ حجاب آخر

دنیا کی خبر بھی ہے او محوِ جفا کوشی
کب تک یہ بہاریں ہیں کب تک یہ شباب آخر

اب دل کی عبارت بھی بے ربط ہوئی مضطرؔ
افسانۂ ہستی کی ہوتی ہے کتاب آخر[1]

اب میں ہوں باعثِ رسوائی ان کے واسطے
اب وہ ہیں زندگی کا آسرا میرے لئے

منظومات

قسم!

میرے ایوانِ تخیل کے مکیں — تیرے گیسوئے معنبر کی قسم
میرے کاشانۂ ہستی کے چراغ — تیرے رخسارِ منور کی قسم
نکہتِ حسن و ضیا کے پیکر — تیرے ملبوسِ معطر کی قسم
صدمۂ ہجر میں مشکل ہے سکوں — جذبِ شوق و غمِ مضطر کی قسم[2]

---

[1] مؤلف اخفر ؎ کیا تھا جس کو خود تجھے مرتب :: وہ افسانہ بھی بکھرا جا رہا ہے
[2] جگر مراد آبادی ؎ اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنے اُجڑے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم

میرے لئے ہے!

جذبات کی رَو ہیں تیرے شعروں کی جوانی
اے شاعرِ نوخیز و جواں میرے لئے ہے

رعنائیِ اندازِ بیاں ہے مری خاطر
یہ گرمیِ فریاد و فغاں میرے لئے ہے

ہر شعر میں تو شعلہ بہ لب ہے مری خاطر
ہر نظم میں تو نغمہ فشاں میرے لئے ہے

میں خود بھی ہوں واقف کہ یاں صبر و تحمّل
تو وقفِ غم و سوختہ جاں میرے لئے ہے

ہے میرے لئے محوِ سخن تیرا تخیّل
گویا تیرے ہونٹوں میں زباں میرے لئے ہے

فریبِ تصوّر!

(ماضی کے ایک واقعہ کی یادگار)

سسکیاں لیتی ہے جب بستر پہ زخمی آرزو
جب تمنّا کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو!!

روح میں جب چبھنے لگتی ہیں الم کی برچھیاں
جب جگر کو پھونکتی ہیں سوز کی چنگاریاں

آہ، ان لمحوں میں وہ سرمایۂ عیشِ حیات

وہ میرا نادیدہ ہمدم وہ بہارِ کائنات
جو جگاتا ہے روح کے پردوں کی رنگیں اوست سے
اک مجسم التجا سے دیدۂ آنکھوں میں لئے!
مجھ سے کہتا ہے کہ اے معبودۂ شعر و جمال
مطربِ عہدِ جوانی، ساقیٔ بزمِ خیال
نشۂ صہبائے الفت، جلوۂ حسنِ ازل
اٹھ نظامِ زندگی کو زورِ بازو سے بدل!
تجھ کو قدرت نے بنایا ہے عمل کے واسطے
جذبۂ بیدار جہدِ برمحل کے واسطے
تو اگر چاہے تو فتنے جاگ اٹھیں رفتار سے
آگ سی لگ جائے نیزیِ گرمیٔ افکار سے
اٹھ خدا کے واسطے اٹھ کس لئے خاموش ہے
کیا قیامت ہے کہ ساقی آج خود مدہوش ہے
اے مری حورِ تخیل شکوۂ سنجِ غم ہے کیوں؟
سچ بتا دے تو سراپا نالۂ و ماتم ہے کیوں؟
چونک اٹھتی ہوں یہ سن کر اپنے بزمِ خواب سے
اور ٹپک جاتے ہیں آنسو دیدۂ بیتاب سے
بیخودی میں دوڑتی ہوں صحنِ گلشن کی طرف
کھینچتی ہیں وحشتیں صحرا کے دامن کی طرف

یہ صدا سن کر دلِ مضطر سکوں پاتا نہیں
ڈھونڈھنے سے بھی مجھے کوئی نظر آتا نہیں

ہائے تہی دامن مگر مقصد سے جیبِ آرزو
کون یوں کھائے تصور میں فریبِ آرزو

عزم!

بدل دوں گی نظامِ زندگی کو سعیِ پیہم سے!
زمانہ کانپ اٹھے گا مرے عزمِ مصمم سے
سماجی قوتوں کو زورِ بازو سے مسل دوں گی
میں اس تہذیب کی ناگن کو پیروں سے کچل دوں گی
یہ محکومی، یہ بندش، یہ مذاق و فکر کی پستی
یہ روحوں کی غلامی، یہ سیہ کاری، یہ بدمستی
یہ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے افکارِ انسانی
یہ محکومی کی قرباں گاہ پر ذہنوں کی قربانی
یہ خونیں آنسوؤں پر ہنسنے والی سنگدل بستی
ندامت کے خمارِ سرگراں سے مضمحل بستی
یہ بستی جس نے ویراں کر دیا آباد روحوں کو
کیا ہے قیدِ زنجیرِ جنوں آزاد روحوں کو
جہاں انسانیت کے ولولوں کا خون ہوتا ہے

جفا دستور ہوتی ہے ستم قانون ہوتا ہے
جہاں تہذیب کی بنیاد ہے اشکوں پہ آہوں پہ
جہاں اخلاق کی بنیاد ڈالی ہے گناہوں پہ

جہاں عشق و محبت کو جنوں کا نام دیتے ہیں
درندے امن و تسکیں کا جہاں پیغام دیتے ہیں
جہاں پہرے لگائے ہیں نگاہوں پر زبانوں پر
بڑھاپے کی حکومت ہے جہاں کے نوجوانوں پر

جہاں جہل و ہوس کا نام علم و پارسائی ہے
جہاں بندوں پر انسانی خداؤں کی خدائی ہے
جہاں دوشیزگی خم ہے ہوس کے آستانوں پر
جہاں مذہب بکا کرتا ہے تقویٰ کی دکانوں پر

میں اس دنیا کو مضطر اپنے نعرے سے ہلاؤں گی
فروغِ سوزِ غم سے آگ دنیا میں لگاؤں گی
اٹھوں گی میں جلال و عزم و ہمت کا علم لیکر
بڑھوں گی موت کی صورت بغاوت کا علم لیکر
مرے بگڑے ہوئے تیور سے طوفاں دم بخود ہونگے
مرے بپھرے ہوئے نعروں سے انساں دم بخود ہونگے
جو طعنہ زن ہیں میرے ذوقِ شعر و فکرِ رنگیں پر

خدا شاہد وہ اک دن سر دھنیں گے میری نگیں پر
جنھیں کچھ لطف آتا ہے مرے دل کو ستانے میں
وہ اک دن راگ گائیں گے مرے سارے زمانے میں
میں مضمر ہوں ابھی مضمر ہے میری شانِ رحمانی
کوئی سمجھا نہیں اب تک مرا ذوقِ سخندانی

میں ہوں زیب النسا مخفی ابھی تک میری ہستی ہے
مرے افکارِ پُر انوار کی شبنم برستی ہے
مٹا سکتا ہے کوئی بزمِ ہستی میں کہاں مجھ کو
کہ قدرت نے عطا کی ہے حیاتِ جاوداں مجھ کو

شبنم!

اے کلی! اے شاہکارِ آب و گل روحِ بہار
صبحدم یہ میری آنکھیں دیکھتی ہیں آہ کیا
نورِ چشمِ گلستاں، پروردۂ نازِ بہار
تیری پلکوں پر چمکتے آنسوؤں سا جھمگھٹا
تونے دیکھا ہے خزاں کا کیا کوئی پُرہول خواب
کیا نظر آیا ہے تجھے فانی گلستاں کا شباب
تونے دیکھا پھول کا انجام حسرت ناک کیا

سیمگوں غنچوں کو پایا ہے گریباں چاک کیا

کچھ تو منھ سے بول آخر کیا نظر آیا تجھے
کس لئے کیا وجہ، یہ اندازِ غم بھایا تجھے
اُٹھ گیا کیا سامنے تیرے نقابِ زندگی
تو نے بالتشریح کیا پڑھ لی کتابِ زندگی

تخلیقِ نغمہ!

اگرچہ کیف و رنگینی تھی فردوسی فضاؤں میں
معطّر نور کے رقصاں شرارے تھے ہواؤں میں
وفورِ شادمانی سے کھلا جاتا تھا ہر غنچہ
ہوائیں دوشِ نکہت پر اُڑا جاتا تھا ہر غنچہ
بہاریں عطرِ گل کی شاخِ نسریں پر برستی تھیں
ہوائیں جھومتی تھیں اور فضائیں غرقِ مستی تھیں
اگرچہ نکہت و نزہت کی تھی ہر سو فراوانی
نہ تھی فکر و تخیّل میں کہیں اندوہ سامانی
یہ سب کچھ تھا مگر سب رونقیں سی پائی جاتی تھی
فضائیں تھی ابھی فردوس کی محرومِ موسیقی
نہ کلیاں باخبر تھیں ڈالیوں پر گنگنانے سے
نہ واقف تھیں ہوائیں کوئی دلکش گیت گانے سے

نہ تھیں کوثر کی لہریں آشنا لحنِ ترنّم سے
ٹپکتی تھی نہ موسیقی کسی گل کے تبسّم سے

یکایک خلد کی دنیا میں آدم کی دعا گونجی
اور ان کی التجاؤں سے ہوئی تخلیق حوّا کی

پھر اٹھیں جانبِ محبوب حوّا کی حسیں آنکھیں
اسے دینے لگیں درسِ محبت نرگسی آنکھیں

اٹھا کر پردۂ رنگِ حیا پھر اک تبسّم سا
نزاکت سے مقابل تارِ رنگیں پر ہوا پیدا

وہ نازک مسکراہٹ رفتہ رفتہ پھر بڑھی ایسی
فراواں موسمِ گل میں ہو پھولوں کی مہک جیسی

ملائک کے لبوں پر گنگناہٹ سی ہوئی پیدا
انھوں نے جب ہر اک سو ایک سرو و کیف گیں دیکھا

فضا میں ارغنوں بجنے لگا مدھم صداؤں سے
ہوا معمورِ نغمہ ہر گلی شیریں نواؤں سے

کوئی گانے لگا چھپ کر بہشتی آبشاروں میں
ترنّم ریزیاں کرنے لگی فطرت شراروں میں

ریاضِ خلد میں لہرا گئے جب دلنشیں نغمے
ربابِ و چنگ کے ہونے لگے افلاک پر چرچے

چٹک کر گلشنِ فردوس میں گانے لگیں کلیاں

خود اپنی ہی نوا پر وجد میں آنے لگیں کلیاں
ہوائیں ٹہنیوں کے ساتھ مل کر گنگنا اُٹھیں
حسیں پھولوں کی گردن سے لپٹ کر مسکرا اُٹھیں
یہ سب موسیقیاں پنہاں تھیں حوّا کے تبسم میں
جوابِ تان گونج اُٹھتی ہیں فضاؤں کے ترنم میں

تارے!

(۱۹۳۸ء کی ایک نظم)

کسی مدہوش کی خاطر جب شفق کے لالہ زاروں میں
ہوا مہرِ منوّر گم افق کے کوہساروں میں
دریچے کھل گئے گردوں کے مثلِ دیدۂ حیراں
اُتر آئیں جہانِ خامشی سے خواب کی پریاں
زمیں سے آسماں تک چھا گئی پُرہَول تاریکی
کہ جس سے کانپتی ہے روشنی ماہِ درخشاں کی
فضائیں ہو گئیں خاموش فطرت کے اشاروں سے
ہوائیں دم بخود تھیں شام کے مبہم نظاروں سے
یکایک پردۂ اسرارِ قدرت سے صدا آئی
کہ اے خیلِ ملائک، حاملانِ عرش دارائی
یہی گذرا ہے فکرِ قدرت و ذہنِ مشیّت

نہیں ہے آدمؑ و حوّا کا مسکن باغ جنّت میں
تم ان خاکستری پتلوں کو پہنچا دو زمینوں پر
یہ لکھ دو خامۂ تقدیر سے اُن کی جبینوں پر
نہ جب تک سختیاں جھیلیں گے یہ نارِ جہنّم کی
بہت دشوار ہے فطرت بدلنا نسلِ آدم کی
ہوئی آگاہ حکمِ غیب سے جب مخلوقِ نورانی
تو فوراً حکم کی تعمیل کی بے عذر و حیرانی
عیاں تھا رنگ مایوسی نگاہِ حسرت افزا سے
حقیقت میں نہ تھے آگاہ وہ قدرت کے منشا سے
یہ دم بھر کا تماشہ تھا اِدھر آئے اُدھر لوٹے
زمیں پر آدم و حوا کو تنہا چھوڑ کر لوٹے
خیالِ جنت الفردوس میں رونے لگے آدمؑ
فراقِ روضۂ رضواں میں جاں کھونے لگے آدمؑ
ابھی تک بزمِ ہستی پر اندھیری رات تھی چھائی
وہ تاریکیاں، وہ سناٹا، وہ خاموشی، وہ تنہائی
عیاں تھا ہر طرف اک ہیبتِ خاموش کا منظر
اندھیرے کی حکومت تھی جہاں کے ذرّہ ذرّہ پر
دلِ آدمؑ لرز اٹھا کہ یہ پُر ہول و ویرانہ
بجائے جنّتِ فردوس ہے اب میرا کاشانہ

عنانِ صبر چھوٹی ہاتھ سے اور اشک بھر آئے
سرشکِ غم کا یہ عالم کہ طوفاں موج پر آئے
ملائک نے جو دیکھی چشمِ آدم کی دُرافشانی
زمینِ خشک پر اشکِ مسلسل کی فراوانی
تو وہ تھرّا اُٹھے اس منظرِ ناکامیٔ و غم سے
زبسکہ نسبتِ سجدہ تھی اُن کو ذاتِ آدم سے
ملائک نے سرشکِ غم کو ہاتھوں ہاتھ بھر لیکر
بحدِ اندازہ حرمت ان کو چھڑکا آسمانوں پر
چھڑکتے ہی یکایک اشکِ آدم جگمگا اُٹھے
وفورِ شادمانی سے فرشتے گنگنا اُٹھے
وہی اشکِ ندامت اب بھی روپ اپنا دکھلاتے ہیں
ستارے بن کے راتوں کا مقدر جگمگاتے ہیں

ممتاز

ممتاز رفیع بیگم نام اور ممتاز تخلص ہے۔ مارہرہ وطن ہے بھوپال میں مقیم ہیں، آپ کا کلام اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ زبان صاف و شستہ استعمال کرتی ہیں۔ کلام سلجھا ہوا اور پُرکیف ہوتا ہے۔

عید کا چاند

مسرّت آشنا ہے عید کا چاند نویدِ جانفزا ہے عید کا چاند

ترقی کا سبق ملتا ہے اس سے — جو گھٹ گھٹ کر بڑھا ہے عید کا چاند
جھلکتے دردِ دل کا نور ہو گی — کہ اک شکلِ وفا ہے عید کا چاند
زمانہ آ گیا ہے خرمی کا — خوشی کی ابتدا ہے عید کا چاند
بہت ہی سر جھکائے آ رہا ہے — عروسِ نو بنا ہے عید کا چاند
ہر اک کے دل میں ہے اس کی محبت — یہ شکلِ دلربا ہے عید کا چاند
جو یہ آیا تو دردِ دل ہوا کم — مرا تو آشنا ہے عید کا چاند
مسرت کی فضا چھائی ہوئی ہے — بہت ہی غم ربا ہے عید کا چاند
کھلی جاتی ہیں اس سے دل کی کلیاں — بہارِ دلکشا ہے عید کا چاند
جو مہجورِ وطن ہیں ان کے دل پر — یہ شمشیرِ جفا ہے عید کا چاند
نظر آیا ہے اب تو سال بھر میں — کہ خود ہی بن گیا ہے عید کا چاند
بنا ہے مرکزِ اہلِ حقیقت — مگر صدق و صفا ہے عید کا چاند
کسی کی ابروئے پُرخم کے آگے — بہت کچھ جھک گیا ہے عید کا چاند
عزیزانِ وطن کی یاد لے کر — فلک پر آ رہا ہے عید کا چاند

نظر ہمتا نازؔ کی جمتی نہیں ہے
جمالِ دلربا ہے عید کا چاند

(ن)

نازؔ

محترمہ نازؔ بلگرامی اورنگ آباد دکن کی رہنے والی اور اردو کی ایک

قابلِ قدر شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر خاتونِ مشرق میں چھپتا رہتا ہے آپ کا کلام جذباتی حیثیت سے بلند اور پُرکیف ہے۔ زبان صاف اور طرزِ ادا پاکیزہ ہے نعت و منقبت بھی لکھتی ہیں۔ ایسی نظموں میں آپ کا جوشِ عقیدت جھلکتا ہے۔ کلام سنجیدہ، پُرکیف و بلند ہے۔

زندگانی کٹ رہی ہے ایک ہی اُمید پر　　جی رہی ہوں بس تمھاری آرزوئے دید پر
تم کو کیا احساس اک سرگشتہ و ناشاد کا　　تم سے بے درد اور درد اک عاشقِ برباد کا
سب بہاریں گلشنِ ہستی کی ویراں ہوچکیں　　سب تمنائیں مری خونابہ افشاں ہوچکیں
زندگی کیا ہے اب اک آزار ہے میرے لئے　　گلشنِ ہستی کا ہر گل خار ہے میرے لئے
وہ بھی کیا دن تھے کہ میری آرزوئیں شاد تھیں　　کیا زمانہ تھا کہ دل کی بستیاں آباد تھیں
یاالٰہی پھر وہی پچھلا زمانہ بھیج دے　　پھر وہی عیش و طرب کا کارخانہ بھیج دے
پھر محبت پر بہار آئے تمنا ہو جواں　　پھر اُمیدوں پر شباب آجائے دنیا ہو جواں
پھر چلے بادِ بہاری پھر کھلیں گلہائے عیش　　نغمہ ہائے عیش سے معمور ہو دنیائے عیش

کھول دے تو نازنیں یارب کتابِ زندگی
حال میں پڑھ لے وہ مستقبل کا بابِ زندگی۔

عقیدت کے پھول

گلشنِ رسالت میں

قلب میں تیری یاد ہے ذہن میں تیری رفعتیں
تجھ پہ نثار ہو جہاں، تجھ پہ نثار دولتیں

قلب میں تیرا ہی ہے جمال نظروں میں تیرا نور ہے
روح میں تیری عظمتیں قلب میں تیری برکتیں
سارے جہاں کے آفتاب سارے جہاں کے ماہتاب
سارے جہاں کی کائنات تجھ پہ نثار مدحتیں
تیرے ہی دم سے اے حبا. سارا جہاں ہے فیضیاب
وقف ہیں تجھ پہ شوکتیں وقف ہیں تجھ پہ برکتیں
نازؔ پہ بھی نگاہِ لطف کیجئے شاہِ باصفا!
نازؔ کے حال پر بھی ہوں لطف و کرم کی بارشیں

نازؔ

شفیق بیگم نام ہے اور نازؔ تخلص۔ موجودہ دور کی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ اکثر زنانہ رسالوں میں کلام چھپتا ہے۔ کلام صاف اور شستہ ہے

نقابِ عارضِ روشن ہٹا کے مسکرا دینا
ہمارے خرمنِ دل پر ذرا بجلی گرا دینا
خرامِ ناز سے تربت پہ اک ٹھوکر لگا دینا
مری سوتی ہوئی تقدیر کو آکر جگا دینا
لگی ہے آگ سینے میں پھکا جاتا ہے دل میرا
ذرا سے چشمِ تر بڑھتے ہوئے شعلے بجھا دینا
نہیں ہے رونے والا کوئی بھی بیکس کی میت پر

تمھیں آکر ذرا اشکوں کے دو قطرے بہا دینا

تمھارے کشتۂ الفت کی بس اتنی وصیت ہے
کہ بعدِ مرگ ہاتھوں سے مری میت اٹھا دینا

حوادث سے زمانہ کے نہ گھبرانا کبھی اے نازؔ
خدا کے ہاتھ ہے بگڑی ہوئی قسمت بنا دینا

نازؔ

ممتاز جہاں نام ہے نازؔ تخلص کرتی ہیں۔ غزل گو شاعرہ ہیں خوب کہتی ہیں۔ کلام اکثر زنانہ رسالوں میں شائع ہوتا ہے، رنگ یہ ہے:۔

کچھ اس قدر میں کھو گئی تیرے خیال میں
معلوم خود نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

اتنا سکوں نہیں کہ کروں عرضِ مدعا
نیرنگیٔ فلک ہے تمھاری نظر مجھے

حالت یہ نازؔ کی ہو عنایت کبھی کبھی
بگڑی کبھی بنے گی بتا چارہ گر مجھے

جورِ دنیا سے تنگ دل کیوں ہوں
ہم کو ملتا ہے اس ستم میں لطف

صبحِ امید ہے تجھ کو نشاط
ہم کو آتا ہے شامِ غم میں لطف

عین عرفاں ہے خود فراموشی
اپنی ہستی کے ہے عدم میں لطف

قولِ زریں ہے مت بھلا ممتاز
قصرِ دل ہی کے ہے عدم میں لطف

برجیس جود خاتون 'نازش'

نازش، محترمہ برجیس جو عرف للین

چمنستانِ دہر میں شاخِ گل سے ایک کلی پھوٹی مگر ابھی کھلنے والی ہی تھی کہ یکایک مرجھا گئی! ——— یہ ہے خلاصہ اس جواں مرگ شاعرہ کی حیات کا جس کا نام برجیس جو خاتون عرف للین (Lillian) اور تخلص نازش تھا!

محترم ڈاکٹر سید ریاض الحسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر سیرم انسٹی ٹیوٹ ایزٹ نگر، بریلی سابق پروفیسر ویٹنیری کالج لاہور کی دختر تھیں۔ لاہور میں ۲ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں۔ اور عین عنفوانِ شباب میں اٹھارہ سال ایک ماہ اور تیرہ یوم زندہ رہنے کے بعد صرف تین دن علیل رہ کر ۵ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء کو جانِ عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

محترمہ کے مختصر حالاتِ زندگی جو ان کے والد ماجد جناب ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب نے راقم الحروف کو لکھ کر دیئے ہیں درج ذیل ہیں:-

"۲ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں۔ دس سال کی عمر میں (ناظرہ) کلام اللہ ختم کیا جس کی والدین نے خوشی منائی اور بڑی دھوم دھام سے احباب کی دعوت کی۔ اس کے بعد گھر پر انگریزی اور اردو کی تعلیم شروع کی۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے تمام مضامین میں "میٹری کولیشن" کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۹۴۳ء میں الہ آباد بورڈ کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک ہوئی مگر اچانک چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے

سوکس (civics) کے پرچہ میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔
اور امتحان میں رہ گئی۔ ۱۹۴۲ء میں دوبارہ شامل امتحان ہوئی مگر
ابھی آٹھ ہی پرچے ختم کئے تھے اور تین باقی تھے کہ یکایک نہ ٹلنے
والا بلاوا آگیا ــــ اور ۵ اپریل کو داعی اجل کو لبیک کہا،
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون. مرنے سے دو گھنٹے پہلے یہ شعر پڑھا ؎

عرق آیا جبیں پر وقت مرزن آئینہ لاؤ
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

بے ثباتی دنیا اور اس کی ظاہرداری کا نقشہ ہر وقت دل میں
رہتا تھا۔ غالب کا مصرع :- دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
ـــ تقریباً تکیہ کلام تھا حضرت عالمگیر اورنگ زیبؒ کا یہ شعر بہت
پسند تھا۔

آنچہ ما کردیم بر خود، ہیچ نابینا نہ کرد
اندرون خانہ گم کردیم صاحب خانہ را

علاوہ ازیں اقبالؒ کی یہ رباعی بھی اکثر وردِ زبان رہتی

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

مرحومہ ماہ جنوری ۱۹۴۲ء میں مرض تپِ محرقہ ہذیان میں مبتلا

ہو گئی تھی - اس اثنا میں اپنی تمام تصاویر اور بیاض اور کچھ دیگر کاغذات خود ضائع کر دئے - اس لئے زیادہ کلام نہیں ملا -

اپنے اشعار میں کسی دوسرے سے اصلاح نہیں لی - کچھ کلام لاہور کے مقامی پرچوں اور روہیلکھنڈ اخبار بریلی میں چھپا ہے -

"راقم ریاض الحسن"

مرحومہ اپنے خاندان بھر میں ایک ہی لڑکی تھیں - آپ کی موت نے خاندان سے اس تنہا لڑکی کو بھی چھین لیا - آپ کی سیرت فضائل و محاسن کا گنجینہ تھی - آپ غریبوں کی ہمدرد، لاچاروں کی دستگیر اور مصیبت زدوں کی غمگسار تھیں، طبیعت میں سنجیدگی، انکسار، بردباری اور حلم موجود تھا علم و ادب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا - اگر ۱۹۴۳ء میں چھوٹے بھائی کے فرار ہو جانے کا حادثہ پیش نہ ہوا ہوتا جس نے محترمہ کو سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا تو اب تک آپ بی - اے کی متعلمہ ہوتیں - سیاسیات میں ام - اے کرنے کا ارادہ تھا - مگر موت کسی کو نہیں چھوڑتی -

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم، انصاف کی تصویر ہے (علامہ اقبالؒ)

اور ایک پرانی کہاوت ہے ——— ممکن ہے اس میں بھی کچھ سچ ہو ——— کہ نیک بندے خدا کو بھی جلد ہی پیارے ہو جاتے ہیں جواں مرگ عارف کی وفات پر مرزا غالب نے ایک دلدوز مرثیہ لکھا

تھا۔ جواں سال نازش کی وفات پر اس مرثیہ کے ایک شعر کو اس طرح پڑھنے کو جی چاہتا ہے،

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھی ابھی نازش
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتی کوئی دن اور

ایک انگریزی مقولہ ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں بنتے نہیں[1]۔ اور اس مقولہ کی صداقت کی شاہد تو مرحومہ کی حیات ہے۔ گھر کا ماحول شعر گوئی کے لئے نہایت ناموزوں تھا۔ والد کا تعلق سائنس اور علم الابدان سے تھا جس کے متعلق ورڈز ورتھ (Wordsworth) نے شکایت کی ہے کہ

Sweet is the lore which Nature brings;
Our meddling intellect
Mis-shapes the beauteous form of things,
We murder to dissect.

"فطرت حسین و دلکش معلومات و روایات کی حامل ہے۔
(لیکن) ہماری خواہ مخواہ دخل اندازی کرنے والی ذہنیت
اشیاء کے پیکرِ حسین کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔
ہم (حسن کی) تشریح کرنے کے لئے اس کو قتل کر دیتے ہیں۔"

---

1. "Poets are born, not made".

والدہ مکتب کی پڑھی ہوئی تھیں، پڑوس میں ہندوستان کے دیگر صوبجات کے باشندے تھے جن کو اُردو زبان سے نہ کوئی لگاؤ تھا نہ تعلق، رہائش سرکاری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تھی۔ اور ملنا جلنا ریلوے کلب کی ممبر یورپین خواتین سے، ایسے ماحول کو شعر گوئی سے کیا علاقہ پھر بھی مرحومہ کو قسامِ ازل کی طرف سے یہ ملکہ ودیعت ہوا تھا وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئی تھیں غیر مناسب ماحول نے اس جوہر قابل کو اچھی طرح پروان چڑھنے نہیں دیا۔ ورنہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر مناسب تربیت و ماحول ملتا اور عمر کچھ اور وفا کرتی تو مرحومہ سپہرِ ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکتیں۔

جیسا کہ محترمی ڈاکٹر سیّد ریاض الحسن صاحب نے تحریر فرمایا ہے مرحومہ کا بیشتر کلام تلف ہو گیا۔ یہ بات بھی راقم الحروف کو یقینی طور پر معلوم ہوئی ہے کہ مرحومہ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بحر مرحومہ کے باقیماندہ اشعار پر جب نظر پڑتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کم عمری میں اس قدر گہرائی و سنجیدگی اور حقائق و معارف سے اس قدر لگاؤ کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

مرحومہ کا جو کلام محفوظ رہ گیا ہے اس میں غزل، نظم، قصیدہ (منقبت) قطعہ، اور رباعی سب کی مثالیں ملتی ہیں۔ مرحومہ کو مذہب سے خاص شغف تھا اور آپ کا کلام مذہبی تعلیمات و روایات کے رنگ میں رچا ہوا ہے۔ شاعری میں مرحومہ کا ایک مخصوص رنگ ہے حقیقت، معرفت اور

تصوّف کی اکثر عمدہ مثالیں آپ کے یہاں ملتی ہیں، ذہنی اور روحانی اعتبار سے آپ کا تعلق شعراء کے اس طبقہ سے ہے جس کے پیش رو خواجہ میر درد تھے، اور دورِ جدید کی شاعرات میں یہ ایک خوشگوار اضافہ ہے اس دور میں خواجہ میر درد کا رنگ قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے، وہ زمانے نہیں رہے، وہ ماحول مٹ گیا، وہ ذہنیتیں بدل گئیں، اس لئے وہ رنگ بھی لوگوں نے چھوڑ دیا، یا زیادہ صحیح لفظوں میں وہ رنگ ان سے نبھ نہیں سکا۔ اس لئے جب مرحومہ کی زبان سے ایک دفعہ پھر ہم اسی قسم کی آواز سنتے ہیں، چاہے وہ کتنی ہی خفیف و کمزور کیوں نہ ہو، تو بے اختیار دل متاثر ہو جاتا ہے اور منھ سے داد و تحسین نکلنے لگتی ہے۔ مرحومہ کی اس رباعی کو پڑھ کر دیکھئے، کیا یہ ایک سترہ اٹھارہ سال کی بے باک و الھڑ لڑکی کا کلام معلوم ہوتا ہے؟

قدرت نہیں مولا کی بیاں پر موقوف ۔۔۔ وہ نور ہے خود نور کے اندر ملفوف
کیا مرتبہ نازش کا جو وہ کھولے زباں ۔۔۔ اوصاف بھی یکتا ہیں مثالِ موصوف

یا یہ شعر ؎

جو سوال لب پہ آئے تو ہوں اجب سزا ہیں
یہ ابھی سے کیوں فضا میں ہے صدائے لن ترانی

یا ان کا یہ قطعہ :-

اپنی حالت ہے آج ایسی غیر ۔۔۔ سر بھی کاندھوں پہ ہو گیا ہے بار
پڑھ رہی ہے یہ نازشِ رنجور ۔۔۔ رَبَّنَا قِنَا عَذَابَ النَّار

لیکن مرحومہ وقت کی ضرورت اور زمانے کے تقاضوں سے بے خبر نہیں

تھیں۔ ان کی نظم "ہندی نوجوان سے خطاب" کے جو اشعار آج باقی رہ گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ کے دل میں اپنے وطن کی پستی و زبوں حالی اور ملک والوں کی بے حسی و بے عملی کا احساس موجود تھا۔ اس نظم میں انھوں نے ہندی سپوتوں کو عمل کرنے اور آگے بڑھنے کی دعوت دی ہے۔

مرحومہ کا کلام جو آپ کے والد ماجد محترمی ڈاکٹر حسن صاحب نے آپ کی مختلف کاپیوں اور کاغذات سے ڈھونڈ کر نقل کیا ہے، درج ذیل ہے:-

غزل

تو ہے خالقِ دو عالم، ترا کام حکمرانی
میں ہوں وقفِ سجدہ ریزی یہی میری زندگانی

کہیں گریہ ہو رہا ہے کہیں رقصِ شادمانی
"ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسم زندگانی"[1]

جو سوال لب پہ آئے تو ہوں اجنبی سرا میں
یہ ابھی سے کیوں فضا میں ہے صدائے لن ترانی

یہ مرا نیاز دیکھو انھیں ناز کی قسم ہے
یہی ایک سجدہ مجھ کو ہے حیاتِ جاودانی

مری عاجزی میں پنہاں کوئی غرض یہ غیر ممکن
تمھیں منصفی سے کہہ دو ہے روا یہ بدگمانی

تمھیں خوف کیوں ہے اتنا جو بدن لرز رہا ہے
تہِ خاکِ جانا نازش ہے حیاتِ جاودانی

نعت

نبی ہو مصطفےٰ صل علیٰ نورِ خدا تم ہو
تمھیں یٰسین، تمھیں طٰہٰ، انھیں نام مزمل ہو

تمھارے نور سے پیشانیِ آدم چمکتی تھی
تمھیں اوّل، تمھیں آخر، تمھیں ہادیِ کامل ہو

یہاں زمزم دہاں کو تر پلادے جسکو چاہو تم
کہ جانِ میکدہ تم ہو تمھیں مختار و عامل ہو

[1] مصرع طرح

جمالِ ہمنشیں نورِ ہدایت بن کے جب چمکا		پکار اُٹھے ملا یک مرحبا نورِ مجمّل ہو
نہیں کچھ خوف اے نازش اگر کرب و مصیبت ہے
پکار دل سے آقا کو پڑے کیوں نیم بسمل ہو

(قصیدہ در منقبت جناب زینبؓ بنت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا)

گر باغ امکاں باغ ہے پھولوں کی نکہت آپ ہیں
رفعت کی رفعت آپ ہیں صولت کی صولت آپ ہیں
اسلاف کی اجداد کی دنیا میں عزت آپ ہیں
حسنینؓ پر نوحہ کناں معنیٔ رقّت آپ ہیں
بنتِ علیؓ و فاطمہؓ بنتِ محمدؐ آپ ہیں
خاتونِ جنّتؓ کی قسم خاتونِ جنّت آپ ہیں

اے زینبؓ عالی نسب یہ مرتبہ ہے آپ کا
قدسی کھڑے ہیں سرنگوں یہ دبدبہ ہے آپ کا
خورشید ہو کیسے عیاں جب سر کھلا ہے آپ کا
ہیں تابعِ فرماں سبھی بے شک خدا ہے آپ کا
صلوات نازش آپ پر یہ ہدیہ ناچیز ہے
کیا لائے یہ احقر بشر جو چیز ہے ناچیز ہے

وہ جدِّ امجد آپ کے یعنی نبی خیر البشر
صلی اللہ علیہ و آلہٖ اک شان جن کی سر بسر
وہ ساکنِ علّیین ہیں جائے کہاں ان تک نظر

لَولَاکَ ان کی شان ہے کرتی ہوں قصہ مختصر
من تشنہ و دل خستہ ام این ہدیہ ناکارہ است
بہرِ خدا نظرِ کرم، ایں نازش بے چارہ است

(نظم "ہندی نوجوان سے خطاب" کے چند اشعار)

تو سو گیا ہے راہ میں، اُٹھ جاگ اے ہندی جواں
سب قافلے منزل پہ ہیں، پیچھے ہے تیرا کارواں
تیرے قویٰ ہیں مضمحل، آنکھیں تری بے نور ہیں
ہشیار ہے ہشیار ہو، ہیں موت کے یہ سب نشاں
مضمون بندی چھوڑ کر، اب تو وغا کی فکر کر
کس کام کی ہے بانگِ گل، جب جل چکا ہو آشیاں
ہاں علم ہے دولت بڑی، لیکن ہے محتاجِ عمل
تو بھی بڑھا آگے قدم، قوموں کا ہے یہ امتحاں

قطعہ

اپنی حالت ہے آج ایسی غیر — سر بھی کاندھوں پہ ہو گیا ہے بار
پڑھ رہی ہے یہ نازش رنجور — رَبَّنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّار

رباعیات

قدرت نہیں مولا کی ہے بیان موقوف -- وہ نور ہے خود نور کے اندر ملفوف

کیا مرتبہ نازش کا جو وہ کھولے زباں　　اوصاف بھی یکتا ہیں مثالِ موصوف

کیا خوف ہے اعدا سے جو آن بن ٹھہرے　　رہتے ہیں یہاں جن و ملک کے پہرے
نازش کو ہے اللہ و محمدؐ کی پناہ　　خود پنجتنِ پاک ہیں دل میں ٹھہرے

قد بھی زیبا ہے نقش یہ ہیں رنگ یہ ہیں　　دنیا میں سجاوٹ کے بھی ڈھنگ یہ ہیں
لیکن کسے معلوم ہے نازش یہ راز　　کیوں صانع قدرت نے رچے رنگ یہ ہیں

اے دل ز شراب عشق احمدؐ بر خیز　　ساقی کی قسم ابھی نہیں ہے کچھ تیز
کافی ہیں مجھے پنجتنِ پاک مرے　　کیا خوف اگر دہر ہے فتنہ انگیز

کیا ہی خوش بخت ہیں وہ جو گزر جاتے ہیں　　اس سے پہلے کہ زمانہ میں بگڑ جاتے ہیں
کس کو رہنا ہے یہاں غور تو کر تو نازش　　وہ ہی خوش بخت ہیں جو عشق میں مر جاتے ہیں

امتحاں دیکھو تو سر پر آ گیا　　ہم نے جو کچھ تھا کیا اچھا کیا
اپنے بس میں اور نازش تھا ہی کیا　　لیس للانسان الا ما سعی

تضمین

ایسا زمانہ بدلا ہر چیز ہے شر ریز　　ہر سمت اک تباہی طوفان اک بلا خیز

نازش پہ رحم یارب اب ہو گئی ہوا تیز　　"کشتی شکستہ ایم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار و آشنا را" (حافظ)

نازک

نازک بیگم نام اور نازک تخلص ہے کیمنڈی کی رہنے والی ہیں۔ دورِ حاضر کی ایک خوشگو اور خوش فکر شاعرہ ہیں، کلام میں بڑا سوز و گداز اور حسرت ہے، آپ کے یہاں شدید جذبات پائے جاتے ہیں حسرت آمیز جذبات کی ترجمانی آپ کے کلام کی ممتاز خصوصیت ہے اور اس پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

ذراسی بات تھی عرضِ تمنا پر بگڑ بیٹھے　　وہ میری عمر بھر کی داستانِ درد کیا سنتے
وہ عالم ہی عجب تھا سیکڑوں دل میں امنگیں تھیں　　نصیحت ابتدائے عشق میں ناصح کی کیا سنتے
یہ حسرت آخری حسرت ہے بیمارِ محبت کی　　کسی صورت سے وہ حالِ دلِ زارِ آشنا سنتے

ہوا ہے جلوہ گاہِ عام میں جلوہ نما کوئی
کبھی اے کاش نازک ہم بھی یہ دلکش صدا سنتے

نثار

نثار فاطمہ نام اور نثار تخلص ہے۔ دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ شاعرہ ہیں نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام سنجیدہ، شستہ اور پُر کیف ہے، جذباتی و وجدانی اعتبار سے بھی اشعار بہت بلند ہوتے ہیں

اسلوبِ بیان پاکیزہ و دلکش ہے کلام و بیان میں پختگی موجود ہے -

محبّت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیرِ سلاسل کی
شکایت کیجیے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی

حصولِ آرزو اور ہیں فریبِ آرزو ہے یہ
نگاہیں اب بھی برگشتہ ہیں مجھ سے میرے قاتل کی

وفورِ شوق میں اُٹھی تمیزِ مشکل و آساں
خیابِ عشق نے آساں مری ہر ایک مشکل کی

محبت کے سمندر میں بہے جانا ہی مقصد ہے
میں بیگانہ ہوں ساحل سے خبر کیا مجھ کو ساحل کی

خبردار اے نشاں ان سے نہ کہنا رازِ اُلفت کا
کہ ناکامی سزا ہے انکشافِ حالتِ دل کی

نجمہ تصدق ایم - اے - بی ٹی

نجمہ کے خود نوشتہ حالات درج ذیل ہیں جو انھوں نے بڑی عجلت میں سپردِ قلم کئے ہیں چنانچہ خود لکھتی ہیں "جلدی میں جو کچھ ہو سکا بھیج رہی ہوں"

"نام شمشاد نجمہ - تصدق کسی خاندانی مناسبت سے رکھا گیا -

پیدائش - جولائی ۱۹۱۷ء

وطن - سیالکوٹ

تعلیم - ام - اے - بی - ٹی -

نجمہ تصدق ایم-اے بی-ٹی

میرا خاندان زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ہے قدامت پرست میں نے اپنی تمام تر تعلیم اپنے مکرم بھائی اور شفیق ماں کی بدولت حاصل کی ہے۔ شروع شروع میں مجھے اُردو، فارسی میں انشاء پردازی کا بےحد شوق تھا۔ لیکن فوراً بعد انقلابِ زمانہ نے میرا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ بڑی بہن اور والدہ مرحومہ کی وفات حسرت آیات نے مجھے یکسر زندگی سے بیزار کر دیا۔ چنانچہ میری سب سے پہلی نظم بہن کی یاد میں تھی افسوس ہے کہ وہ نظم زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی۔ ورنہ وہ ایک نہایت ہی بلند پایہ چیز تھی۔ میری اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں خاندان بھر میں منافقت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سب نے مخالفت کی لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی تعلیم میں مصروف رہی لیکن اس دوران میں شاعری کی آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی بی۔ٹی کر چکنے کے بعد جب میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئی تو پھر یہ دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ پیہم حادثات اور افکار نے میری صحت پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ دائمُ المریض بنا دیا ہے۔

تعلیمی ضروریات کے بعد جو وقت بھی بچتا ہے وہ مطالعہ کتب یا شغلِ شعر گوئی میں گزرتا ہے۔ مجھے اپنے کتب خانہ پر ہمیشہ ناز رہا ہے اور رہے گا۔ اس میں بیشمار قدیم کتابیں متعدد زبانوں کی

موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ جنگ نے بیرونی ڈاک میں خرابیاں پیدا کردی ہیں۔ ورنہ اب بھی کبھی کبھی طہران۔ قاہرہ پیرس سے فارسی۔ عربی فرنچ اور دیگر زبانوں کے رسائل آجاتے تھے۔

میری ملنے والیوں کو اکثر مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں کیوں ان سے کھل کر باتیں نہیں کرتی۔ لیکن سچ کہتی ہوں کہ اگر میں مروتاً کبھی مسکراتی بھی ہوں تو اس مسکراہٹ میں بالکل خلوص نہیں ہوتا۔ کیا کروں۔ آخر دل ہی تو ہے۔ گو ریاضی میرا خاص مضمون ہے اور مجھے تحصیل معیشت کے لئے اسی سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن میں ہمہ تن اس کی خشک فضا میں ہی سمو کر نہیں رہ گئی۔ میری شاعری پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ میری شاعری میرے اس ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے جس کو حوادث زمانہ نے پیس کر رکھ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں یاس اور قنوطیت کافی حد تک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں پڑھنے والوں کو رومان اور رنگینی بھی مل جاتی ہے جو ان کے لئے تفنن طبع کا سامان بہم پہنچا دیتی ہے۔

بعض ناقدین کو اعتراض ہے کہ نجمہ عریاں لکھتی ہیں۔ عورت کو اظہار جذبات میں اس قدر بیباک نہیں ہونا چاہیئے۔ بجا ارشاد ہے عورت کو اتنا بیباک نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن خیال فرمائیے کہ دل کی آواز کو کیسے دبایا جا سکتا ہے۔ جو دل محسوس کرتا ہے وہ کہہ دینے کو جی چاہتا ہے آخر محسوسات دل کیوں بغیر لگی لپٹی رکھے ظاہر نہ کئے جائیں۔

میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ جو شاعر اپنے وارداتِ قلبی اور محسوسات و مشاہدات کو چھپاتا ہے وہ تصنع اور ریا سے کام لیتا ہے اسے ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس کی شاعری کو ادب میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔" اور نہ وہ صرف خود کو دھوکا دے رہا ہے بلکہ ادب سے بھی بغض روا رکھتا ہے۔ خیر۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ہاں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوں۔ نجمہ تصدق "نجمہ کے سو شعر" ایوانِ ادب علی گڑھ کی طرف سے شایع ہو چکے ہیں اس کی مرتبہ آنسہ ناجیہ خانم شروانیہ ہیں ایک اور مجموعہ کلام "نجمستان" شایع ہونے والا ہے۔ آج کل رسالہ ادیب کے حصۂ نسواں کی آپ ادارت فرما رہی ہیں۔ شاہکار لاہور، شاعر آگرہ، ساقی دہلی، پیامِ ادب حیدرآباد دکن۔ مشہور و نجکل دہلی، زیب النسا، حور، بیسویں صدی لاہور میں آپ کا کلام چھپ چکا ہے

نجمہ نے پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ دراصل ان کی شاعری کے اولین محرکات خانگی سانحات تھے جن کے متعلق انھوں نے اپنے حالات میں اشارہ کیا ہے۔ ہمشیر اور والدہ کی وفات نے نجمہ کو رنج و غم کا پیکر بنا دیا تھا۔ اسی تنہائی اور خاموشی کے عالم میں اس حزن و ملال کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ظاہر ہے کہ وہ شاعری جس کی اساس اس قسم کے شدید حقیقی جذبات پر قائم ہو کس قدر بلند ہوگی۔ یہی جذبات کی صداقت آمیز اور بے لاگ ترجمانی ہے جس نے اس جواں سال شاعرہ کو سپہرِ ادب کا ماہتاب بنا دیا۔

نجمہ[1] انگلستان کے جواں مرگ اور آسماں جاہ شعرا شیلی[2] (Shelley) اور کیٹس[3] (Keats) کی ہمنوا ہے اس کی فطرت شیلی اور کیٹس کی طرح الم نصیب اور رومانیت پرور ہے۔ اس میں ان ہی شعرا کی طرح احساس جمال اور حسن شناسی موجود ہے اس میں انھیں کی طرح جذبات کا ہیجان اور جوانی کا جوش موجزن ہے۔

نجمہ کی شاعری خود اس کے ایک مصرعہ کی زبان میں

"سراپا غزل اور مجسم شراب"

ہے، وہ عشق و جوانی کا ایک نغمہ ہے ——— رس بھرا، سرشار، بیخود، تند و تیز بہکا ہوا نغمہ! وہ شباب و محبت کا ایک طوفان ہے جس میں ہر خیالِ ہوا

---

1. محترمہ کے حالات اور کلام عین وقت پر موصول ہوئے ان کو ایک نظر پڑھنے کے بعد جب میں کلام پر تبصرہ لکھنے بیٹھا تو ضمیر جمع غائب کا استعمال میرے لئے مشکل ہوگیا اور بے اختیار قلم سے ضمیر واحد غائب نکل گئی اس میں کوئی سوئے ادب کا پہلو نہیں میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی صیغۂ واحد میں جو اختصاص اور احترام ہوتا ہے وہ صیغۂ جمع میں نہیں ہوتا۔ مجھے امید ہے کہ ارباب نظر اور خصوصاً محترمہ نجمہ اس کو اسی نظر سے دیکھیں گی۔ آپ کا کلام بھی نسبتاً زیادہ پیش کر رہا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ محترمہ نے اپنا کافی کلام ارسال کردیا تھا اور کلام اس قدر پرکیف تھا کہ پہلی نظر میں اس میں کچھ زیادہ تخفیف کرنا مشکل تھا

2. Percey Bysshe Shelley (1792-1822)

3. John Keats (1795-1821)

بہہ گیا ہے، وہ ماحول، اخلاق، سماج، غرضکہ اپنے گردو پیش کی ہر قید و بند سے بے نیاز ہو کر نغمہ زن ہے، یہاں تک کہ خود اس کی ہستی ایک نغمہ بن کر اس کے نغموں میں کھو گئی ہے۔

کچھ نکھرے نکھرے گیت ہیں جو ہونٹوں سے برستے رہتے ہیں
ایک میٹھی میٹھی آگ ہے جو ہر سو بھڑکائے جاتی ہوں
خود اپنی لے کو سنتی ہوں، خوش ہوتی ہوں سر دھنتی ہوں
اشعار میں ڈھال کے اشکوں کو مستی میں گائے جاتی ہوں

اس کی دنیا "شعر و خواب" اور "رنگ و نور" کی دنیا ہے اس میں "ماہ و انجم" کی درخشانی ہے۔

میری دنیا ہے شعر و خواب رنگ و نور کی دنیا
مہ و انجم کی گویا ضو فشانی لے کے آئی ہوں

اس کی نظر میں دنیا کا ذرّہ ذرّہ عشق و محبّت کا حامل اور عشق و محبّت کا طالب ہے اس کا مستی بھرا پیغام ہے:

عطرِ وفا کی خوشبو سے ظرفِ محبت کو مہکا
مست نگاہوں سے پی کر نغمہ دنیا پر چھا جا

وہ خود سراپا اک آغوشِ محبّت ہے۔ — محبّت کا گرم اور دھڑکتا ہوا آغوش

محبّت کا آغوش ہوں میں سراپا
تجھے بھی جو چاہوں تو سانچے میں ڈھالوں

اس کی بیباک اور بیتاب تمناؤں کا تقاضہ ہے کہ

چاندنی، مے، بہار، خلوتِ ناز
ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

اور یہی اس کا مسلکِ حیات ہے اور یہی اس کی شاعری کا پیغام

شعورِ خرد کے اندھیرے میں گھر کے　　دیئے بے خودی کے جلاتا چلا جا

محبت زندہ دارِ رنگ و بو ہے　　محبت زندگی کی آبرو ہے

محبت کی ذہن دادِ ملِ حل کے نجمہ　　گنوائیں نہ لمحات حسن و جوانی

اُس کے نغموں کے محرکات کیا ہیں ـــــ اس کا جواب خود نجمہ کی زبان سے سنئے

مرا دل بھی ہے محسوسات کا آتشکدہ آخر
عجب کیا ہے جو ذوقِ شعر خوانی سیکھ آئی ہوں

اُس کی شاعری میں انتہائی ربودگی اور بے خودی ہے، اس میں اس درجہ نفاستِ خیال اور لطافتِ بیان ہے، اس قدر شعریت اور رنگینی ہے کہ اس کی مثال اُردو شاعری میں ڈھونڈھنا مشکل ہے وہ اس قدر گہری داخلیت کی حامل ہے کہ اس میں دل کی دھڑکنوں کی تڑپ موجود ہے

نجمہ بے قرار تو نورِ پیامِ صبح ہے!
بن کے ستارۂ سحر چرخ پہ جھلملائے جا

نجمہ کے نغموں کی ایک بہت بڑی خصوصیت ان کی شدید "رومانیت"

ہے، رومانیت کے اس قدر گہرے اور تابندہ نقوش حیا، آدا، اور شبنم
کے یہاں بھی نہیں ملتے'' اس کی رومانیت ایک گہرے دکھ میں ڈوبی
ہوئی ایک ابدی و لافانی غم میں سموئی ہوئی ہے ایک حسین و دلدوز تشنگی
ہے جو اس کی رومانیت سے بغلگیر ہے، اس کی آنسوؤں سے بوجھل
آنکھیں سنہرے خوابوں کی امین ہیں۔

پھر نجمہ سمندر سینوں میں بننے لگے قصر امیدوں کے
پھر ریت کے گرتے ساحل پر بنیاد اٹھائے جاتی ہوں

یہ نور و تاریکی ـــــ دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، یہ
جگمگاتی اور جھلملاتی ہوئی رومانیت جذبۂ عشق کا جمالی پہلو ہے، اور یہ
درد و تڑپ یہ قنوطیت اس جذبہ کو لافانی اور لایموت بنا دینے والی
گہری حقیقت ـــــ ہر لافانی جذبۂ عشق کی بنیاد، قنوط و یاس ہی پر
قائم ہوتی ہے، نجمہ کا دل بھی اس لافانی جذبۂ غم کا لذت شناس ہے
اور یہی درد و تپش اس کے رومانیت سے بوجھل نغموں کا سنگِ بنیاد
ہے، اس کے دلِ دردمند کا عالم یہ ہے۔

شبِ غم کی آنکھوں کا آنسو ہوں نجمہ
یونہی صبح تک جھلملاتی رہوں گی

یہ کیا دیدیا دینے والے مجھے ـــــ مسلسل خلش مستقل اضطراب

رگِ زندگی ہوں کہاں مجھ کو راحت
ازل سے میں دکھتی چلی آ رہی ہوں

محبت کی میں شام فرقت ہوں نجمہ
مصیبت سے کتنی جلی جا رہی ہوں

بجھ گئے روشن امیدوں کے چراغ زیست اب اک شام ظلمت بار ہے

چکبست کا خیال تھا کہ شعر میں جب تک نازک خیالی اور رنگینی نہ ہو شعر شعر نہیں ہوتا اور یہ ایک حقیقت ہے خود نجمہ نے "رس" اور "حسن" کو شعر کے لئے لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔

نجمہ ہیں شعر و نغمہ سب جان توانہ لیکن
کچھ رس ہو راگنی میں اور حسن شاعری میں

اور نجمہ کا کلام اسی معیار پر بہ تمام و کمال پورا اترتا ہے اس کے یہاں بڑی صفائی اور پختگی پاکیزگی اور دلکشی ہے اس کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت نفاست خیال اور ندرت ادا ہے مثلاً

ان کی آنکھیں زیر لب کہتی ہیں رشک کہکشاں
جب کبھی راتوں کو نجمہ یاد آ جاتی ہوں میں [1]

---

[1] بہت عرصہ ہوا مولانا اصغر گونڈوی نے آنسو کو "ستارہ" اور "ستارہ سحری" ضرور کہا تھا

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سر مژگاں کوئی

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

مگر آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو "رشک کہکشاں" کہنا نجمہ کا حصہ ہے۔

اے دوست شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
نجمہ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیئے

تو اک بھینی بھینی سی کلیوں کی بُو ہیں اک کھویا کھویا جوانی کا خواب
دلوں سے جہاں سے زمان و مکاں سے

ہیں تارے ہم وفا ہوں اُٹھی جا رہی ہوں

پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی ہر چیز ترے مست تبسم پہ لٹا دی
پھر بادِ بہاری نگہ ناز کو کر کے اس جانِ گلستاں نے کلی دل کی کھلا دی

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے شراب پھول سبو مسکرا دیئے

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی طرح چاند تارے، چاندنی، اور چاندنی رات نجمہ کا ایک محبوب موضوع ہے اور اس کے اس قسم کے اشعار نہایت بلند اور لطیف ہیں۔

یہ پُر کیف راتیں یہ رنگیں نظارے یہ میری تمنا یہ تیری جوانی
تاروں کی مست چھاؤں میں اب بھی کبھی کبھی
کرتی ہوں یاد بھولی ہوئی داستاں کو میں[1]

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی
کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
نہ جانے کیا مجھے یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

وہ شب تاب جلوے وہ بادلوں کی چھاؤں　　　کبھی میں نے ایسا بھی دیکھا ہے خواب[1]

وہ مست مست رات وہ بادہ بدست رات　　　اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے

بھیر بھیڑ کے اُن چاندنی راتوں کا فسانہ[2]

سوئی ہوئی اُمید مرے دل کی جگا دی

ہلکی ہلکی خنکیوں میں نکھری نکھری چاندنی

داستانِ حسن دُہرانے کا موسم آگیا

مسئلہ حسن و عشق کی بابت دنیا میں اب تک چار نظریے قائم ہوئے ہیں۔ (ا) عشق خالقِ حسن (ب) حسن خالقِ عشق (ج) حسن و عشق دو مستقل اور قائم بالذات حقیقتیں (د) حسن محض۔ اس سلسلہ میں نجمہ پہلے نظریہ کی قائل ہے اس نے اس کا اظہار اپنے کلام میں جا بجا نہایت لطیف انداز میں کیا

اعجاز ہیں سب یہ ہی تخیلِ حسیں کے　　　جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی

چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

[2] فراق گورکھپوری

جب شبِ مہ میں ان کی نظر ایک کہانی ہوتی تھی
بھول بھی جا ان راتوں کو، یاد نہ کر ان باتوں کو

ہے اُن کے رنگ و بو میں کچھ خونِ دل بھی شامل
میری بھی کچھ جھلک ہے کلیوں کی تازگی میں [1]

ان کی نظر میں دیکھ لیا اپنے آپ کو
میرا ہی جلوہ مجھ کو دکھا کر چلے گئے [2]

لیکن حسن وعشق کی ان لطیف اور سبک رنگینیوں کے ساتھ اس کے یہاں ژرف نگاہی، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی مثالیں بھی موجود ہیں، یہ آفاقیت اور یہ وسعت نظر ملاحظہ ہو

تارے مرے مشفق مری خورشید و مہ مرے
ہمت سے اس جہان پہ چھانے کی دیر ہے
میری نظر نظامِ جہاں کا ہے انقلاب
دنیا کو بے قرار بنانے کی دیر ہے
ہر آدمی ہے اپنی جگہ ایک کائنات
اُجڑے ہوئے دلوں کو بسانے کی دیر ہے

شیلے اور کیٹس کی طرح نجمہ ابھی اس ہیجانی، ہنگامی، طوفانی دور سے گذر رہی ہے جس کو شباب کہتے ہیں وہ شیلے اور کیٹس کی طرح ابھی

---

[1] مومن نے اس نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

اور ہی رنگ آج ہے عارض گلعذار میں
خونِ دل اپنا تھا مگر گونہ رخ طراز میں

[2] اور اصغر گونڈوی نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

مشتعل جذبات سے نبرد آزما ہے کبھی ان کی رو میں بہہ جاتی ہے اور کبھی خود ان کو اپنے دامن میں سمیٹ کر بہا لیجاتی ہے۔ یہ ہے حقیقت اس عریانی کی جس کے متعلق خود نجمہ نے اپنے حالات میں اشارہ کیا ہے اور جس کی بنا پر اس کے اکثر ناقدین نے اس پر اعتراض کیا ہے لیکن در اصل وہ ترجمانیِ جذبات کے علاوہ اور کچھ نہیں اور خالص شاعرانہ اور ادبی نقطۂ نگاہ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، رہا اخلاقی سوال تو توقع ہے کہ کیٹس کی طرح عمر و زمانہ خود اس کے جذبات کے اشتعال کو سکون و سنجیدگی سے آشنا کر دیگا اور یہ توقع بے بنیاد نہیں۔ چونکہ آج بھی اس کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں زندگی کے تقاضوں کی ہمہ گیری اور وسعت و آفاقیت موجود ہے حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے زمانے کا ہر غم اٹھانا چلا جا[1]

تری نظر سے چمن سارا سرمدی بن جائے
کلی کلی کی زباں سے پیام پیدا کر[2]

---

[1] علامہ اقبال

بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

[2] علامہ اقبالؒ

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر (بالِ جبریل صفحہ ۱۹۵)

کسی کے رُخ کے حجابات خود بخود اٹھ جائیں
نگاہِ پاک، دلِ پختہ کام پیدا کر
قدم چومے گی منزل ذوق میں کر بال و پر پیدا
سراپا شوق بن آگے نکل جا کاروانوں سے

جہاں تک اس کے آرٹ کا تعلق ہے وہ نکتہ چینی اور عیب جوئی سے بالاتر ہے، اس عمر میں نجمہ نے جس بلند اور پختہ آرٹ کی مثالیں پیش کی ہیں وہ یقیناً لائقِ تحسین و ستائش ہیں۔

نجمہ کے آرٹ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے نہایت موزوں الفاظ، اور مترنم بحریں انتخاب کرتی ہے اُس کے نغموں میں بڑی موسیقیت ہے اور یہ خصوصیت اس کے اشعار کے کیف کو اور بڑھا دیتی ہے آہنگ و ترنم کے سلسلہ میں خود اس کا یہ شعر اسی کے کلام پر صادق آتا ہے۔

جن پہ موسیقیوں کو وجد آئے ہائے اس مستِ ناز کی تانیں

اس کے کلام میں جذبات کی جو شدت اور گرمی، جو حرارت، صداقت اور زندگی ہے وہ اس بات کی کافی ضمانت کہ وقت اور زمانہ اس کو آسانی سے نہیں مٹا سکتا۔

کچھ اشعار کے علاوہ ذیل کا سب کلام محترمہ کا ارسال کیا ہوا ہے۔ ترتیب میری ہے۔

غزلیات

خود مٹ گئی نہ پا سکی تیرے نشاں کو میں
سمجھی تھی سہل شوق کی راہ گراں کو میں[1]

یہ آرزوئے جوشِ تجسس کا ہے مآل
بھولا ہے کارواں مجھے اور کارواں کو میں

سوزِ جنوں کی آگ سے اک روز پھونک دوں
وہم و گماں کو، جذبۂ سود و زیاں کو میں

تاروں کی مست چھاؤں میں اب بھی کبھی کبھی
کرتی ہوں یاد بھولی ہوئی داستاں کو میں[2]

ہر ہر قدم پہ میری جبیں سجدہ ریز ہے
کعبہ سمجھ رہی ہوں تیری آستاں کو میں

نجمہ نہ پوچھ مجھ سے مری داستانِ زیست
المختصر کہ یاد رہوں گی جہاں کو میں[3]

---

[1] خواجہ حافظ اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاسًا وَّنَاوِلْهَا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

[2] ڈاکٹر عندلیب شادانی
کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب ایسا ہی منظر تھا نہ جانے کیوں مجھے یاد آگیا تاروں کی جھلمل سے

[3] میر (؟) یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ؛ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ ،

افسانۂ نگاہِ محبت نہ پوچھئے
کہتے ہیں کس کو حشرِ مسرت نہ پوچھئے
وہ مست مست رات وہ بادہ بدست رات
اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے
ہوتی ہے دل میں اک خلشِ بیقرار سی
واللہ اس نظر کی شرارت نہ پوچھئے
عالم تمام آنسوؤں کا ایک سیل تھا
مجھ سے فسانۂ شبِ فرقت نہ پوچھئے
راتوں کو کر رہی ہوں ستاروں سے گفتگو
مجھ سے مرے جنوں کی حکایت نہ پوچھئے
کیا ہو گیا ہے آپ کی تحبہ کو کیا کہوں
حالت نہ پوچھئے مری حالت نہ پوچھئے

یہ مے، یہ فضائیں، یہ جنوں ریز نظارے
اے کاش کوئی مجھ کو حسیں لے میں پکارے
اعجاز ہیں سب میری ہی تخیلِ حسیں کے
جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے
یہ کون میری روح کی گہرائی میں چھو جا
یہ کس نے مرے بگڑے ہوئے حال سنوارے
جب تاکہ بہائے گا مرے حال پہ آنسو
او میری محبت کے چمکتے ہوئے تارے
. رستا ہوا پھول تبسم کی نظر سے
آ، دل کے شعلے میں جوانی کو اُبھارے
تحبہ نہ کہیں مجھ کو گنہگار بنا دیں
یہ بہکی ہوئی رات، یہ ہنستے ہوئے تارے

ہم نے جو دردِ دل کے فسانے سنا دیے
آنکھوں سے کائنات کی آنسو بہا دیے

اللہ رے ابتدائے محبت کی بےخودی
ہم نے حجابِ دید کے جھگڑے مٹا دیے

توبہ کا پاس تھا مجھے لیکن میں کیا کروں
تیری نگاہِ مست نے ساغر پلا دیے

اتنا بلند ذوق نہیں اہلِ عشق کا
یہ کیا سمجھ کے حسن نے آنسو بہا دیے

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو مسکرا دیے

اے دوستِ شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
نجمہ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیے

اس نگاہِ مست سے جب وجد میں آتی ہوں میں
کیف و رنگ و نور کی دنیا پہ چھا جاتی ہوں میں

کیا کہوں کیا ہے محبت کا فریبِ خود نگر
دیکھتی ہوں جس طرف خود ہی نظر آتی ہوں میں

چاہتی تو ہوں کہ موجوں سے رہوں دامن کشاں
کشتیٔ غم ہوں بھنور میں پھر بھی آجاتی ہوں میں

صبح تک ٹھہرا نظر آتا ہے دَورِ آسماں
جب تصوّر میں ترے راتوں کو کھو جاتی ہوں میں

جام گر پڑتا ہے ساقی تھرتھراتے ہیں ہاتھ
تیری آنکھیں دیکھ کر نشّے میں آجاتی ہوں میں [1]

[1] سوداؔ
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ان کی آنکھیں دیر تک رہتی ہیں رشکِ کہکشاں
جب کبھی راتوں کو نجمہ یاد آجاتی ہوں میں

جلووں کو باریاب کئے جا رہی ہوں میں
قلب و نظر خراب کئے جا رہی ہوں میں

بیداریوں کی شمع جلا کر جہان میں
تجدیدِ انقلاب کئے جا رہی ہوں میں

مہکی ہوئی ہیں لطیف جوانی کے کیف سے
ہر چیز کو شراب کئے جا رہی ہوں میں

کتنا بلند ہے میری تعمیر کا مذاق
تاروں کو آفتاب کئے جا رہی ہوں میں

کیوں میں گناہِ عشق سے ڈرتی ہوں اس قدر
ہستی کو کیوں عذاب کئے جا رہی ہوں میں

نجمہ نگاہِ شوق کو حدِ نگاہ تک
جلووں سے فیضیاب کئے جا رہی ہوں میں

عشق روحِ رواں نہ ہو جائے یہ بلا جزوِ جاں نہ ہو جائے [1]

---

[1] علامہ اقبالؒ

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے (بالِ جبریل)

مجھ کو دیکھو نہ مست نظروں سے — ضبطِ دل رائیگاں نہ ہو جائے[1]
الاماں تیری محشر آرائی — ذرّہ ذرّہ جہاں نہ ہو جائے
یہ تیری انکھڑیوں کی دل طلبی — پھر تمنّا جواں نہ ہو جائے
یہ حوادث، یہ درد، یا اللہ! — زیست بارِ گراں نہ ہو جائے

یہ میری داستانِ غم نجمہ
حُسن کی داستاں نہ ہو جائے

یہ دور کی وادی سے مجھے کس نے صدا دی — اک آگ سے مرے دل میں محبت کی لگا دی
پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی — ہر چیز ترے مست تبسم پہ لٹا دی
یہ کون مری سوچ کی گہرائی میں جھوما — اُجڑی ہوئی بستی یہ مری کس نے بسا دی
وہ بات جسے دل نے چھپایا تھا بمشکل — دنیا کو تری مست نگاہوں نے بتا دی
پھر گونجنے لگے روح سے رنگین شرارے — پھر ہجر کی روداد پپیہے نے سنا دی
پھر کر دیا مدہوش مجھے ہوش میں لاکر — پھر مست نگاہوں نے نگاہوں کو پلا دی
پھر چھیڑ کے ان چاندنی راتوں کا فسانہ — سوئی ہوئی اُمید مرے دل کی جگا دی
پھر بادہ بہاری نگہ ناز کو کر کے — اس جانِ گلستاں نے کلی دل کی کھلا دی
اس شرمِ جفا پر تری قربان وفائیں — جب شکوۂ بیداد کیا آنکھ جھکا دی

---

[1] مؤلف احقر ؎

دل کی دنیا تڑپ اٹھی پھر آج — آگ دل میں بھڑک اٹھی پھر آج
اس نے دیکھا کچھ اس طرح سے مجھے — ساری ہستی لرز اٹھی پھر آج

پھر ہنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ہے مجھے نجمہ
پھر سینۂ تارِ رباب میں اک شمع جلا دی[1]

کہو تو میں اپنے غموں کی کہانی | سنا دوں تمھیں آنسوؤں کی زبانی
فنا ہو گیا آدمی عشق کر کے | خرد کی کوئی بات اس نے نہ مانی
بجھے آنسوؤں سے نہ آہوں سے کم ہو | محبت ہے اک آتشِ غیر فانی
یہ پُر کیف راتیں، یہ رنگیں نظارے | یہ میری تمنا، وہ تیری جوانی
مرا سوزِ پنہاں، ترا سازِ پیہم | کہانی سے ہوتی ہے پیدا کہانی
زمانے میں مجھ کو نہ بدنام کر دے | مرے حال پر یہ تری مہربانی
محبت کی دیں داد مل جل کے نجمہ
گنوائیں نہ لمحاتِ حسن و جوانی

جب مرے پاس وہ نہیں ہوتے | اُن سے ہوتی ہیں راز کی باتیں[2]
ختم ہوں گی نہ حشر کے دن تک | دلِ حسرت نواز کی باتیں
نغمۂ شوق میں نے کیوں چھیڑا | کون سمجھے گا راز کی باتیں
یاد آ کے گدگداتی ہیں | حسنِ خاطر نواز کی باتیں
پھونک دیں تلخیٔ حوادث کو | آ کریں سوز و ساز کی باتیں
جن پہ موسیقیوں کو وجد آئے | ہائے اس مست ناز کی باتیں[3]

---

[1] مؤلف احقر سے نظرِ التفات پھر اٹھی ؛ آج شعلوں میں جل رہا ہوں میں

[2] مومن:۔ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا ؛ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

[3] مومن:۔ اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک ؛ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تم نہ سمجھے تو کون سمجھے گا میری راز و نیاز کی باتیں

لب پہ مہر سکوت ہو نجمہ
ہوں نگاہوں سے راز کی باتیں

کب نگاہیں ملائیں گے ہم تم کب قیامت اٹھائیں گے ہم تم
جھوم اٹھیں گے ماہ و انجم بھی کبھی وہ گیت گائیں گے ہم تم
جن سے ہو جلوے کی فضا رنگیں ایسی ہولی منائیں گے ہم تم
راہ روکے گا تو نصیب کو بھی ٹھوکروں میں اڑائیں گے ہم تم
میں رگِ حسن، تم رگِ الفت یوں ہی زکھ پائے جائیں گے ہم تم
تم ہو اک چاند میں ہوں اک تارا عرش پر جگمگائیں گے ہم تم
آگ غم کی اگر بھڑک اٹھی آنسوؤں سے بجھائیں گے ہم تم

چاند تاروں سے دور اے نجمہ
اپنی دنیا بسائیں گے ہم تم

مرے لب پر حدیثِ آرزو ہے نہ جانے کون میرے روبرو ہے
محبت زندہ دارِ رنگ و بو ہے محبت زندگی کی آبرو ہے
مرے خاموش دل میں شامِ فرقت یہ کیسا شورِ ایکسی ہائے و ہو ہے
اسی کی رو میں دنیا بہہ رہی ہے جوانی ایک موجِ رنگ و بو ہے
محبت میں یہ کیسا وقت آیا ہماری خامشی بھی گفتگو ہے
کسی کی یاد سے تازہ کریں دل روپہلی چاندنی ہے آبِ جو ہے
تجھے مل جائے نجمہ دولتِ غم میرے دل کی یہی اک آرزو ہے

ناچیز ہوں مگر ترے آنے کی دیر ہے
ذرے کو آفتاب بنانے کی دیر ہے

اہلِ زمانہ چونکنے والے ہیں خواب سے
ان غافلوں کا شانہ ہلانے کی دیر ہے

دنیا تڑپ اُٹھے گی محبت کے ذکر سے
اک داستانِ درد سنانے کی دیر ہے

تارے مرے شفق مری خورشید و مہ مرے
ہمت سے اس جہان پہ چھانے کی دیر ہے

میری نظر نظامِ جہاں کا ہے انقلاب
دنیا کو بیقرار بنانے کی دیر ہے

ہر آدمی ہے اپنی جگہ ایک کائنات
اُجڑے ہوئے دلوں کو بسانے کی دیر ہے

سنتی ہوں شامِ ہجر کی ہلچل درد میں
بس ایک تیرِ غم کے چلانے کی دیر ہے

آخر سنبھل ہی جاؤں گی دنیائے عشق میں
دو چار بار ٹھوکریں کھانے کی دیر ہے

تجھ کو سناؤں گی میں محبت کی داستاں
اے دوست تیرے دیس میں آنے کی دیر ہے

جھومے گی رات وجد میں آئے گی کائنات
نجمہ ترے ستار اُٹھانے کی دیر ہے

سامانِ صد بہار کیے جا رہی ہوں میں
داغ اپنے آشکار کیے جا رہی ہوں میں

خود سے تجھے دوچار کیے جا رہی ہوں میں
غفلت کو ہوشیار کیے جا رہی ہوں میں

جادو نگاہِ شوق نہیں پھر بھی حسن کو
آیا ہوا سا پیار کیے جا رہی ہوں میں

مدت سے گرچہ دیکھ رہی ہوں خود اپنی راہ
تیرا بھی انتظار کیے جا رہی ہوں میں

آنکھوں میں اپنی جھونک ڈال کے اس آنکھ کو
نا شستہ ہوشیار کیے جا رہی ہوں میں

آنا کسی کا آج بھی ممکن نہیں مگر
کیوں دیر سے سنگار کیے جا رہی ہوں میں

آہٹ سی پا رہی ہوں تمہی دل کے آس پاس
یا تجھ کو رازدار کیے جا رہی ہوں میں

اس طرح نجمہ کا بھولنا آسان تو نہیں
کیوں خود کو سوگوار کیے جا رہی ہوں میں

مقصود تجربہ ہے کہ آغازِ عشق کو
انجام سے دوچار کئے جا رہی ہوں میں

مجھ سے بھی کر رہی ہوں الگ تجھکو ہاں تجھے
یکتائے روزگار کئے جا رہی ہوں میں

اپنی نگاہِ شوق سے دنیائے حسن کا
ہر راز آشکار کئے جا رہی ہوں میں

دنیا سدا بہار، محبت سدا سہاگ
کیوں نالہ بار بار کئے جا رہی ہوں میں

نجمہ اب آ چلی ہے ستاروں کو نیند سی
کیوں ان کا انتظار کئے جا رہی ہوں میں

قربت بھی بُعد ہے یہ بتا کر چلے گئے
اک چیستاں وہ اور بنا کر چلے گئے

خود کو قصور وار بنا کر چلے گئے
وہ مجھ کو شرمسار بنا کر چلے گئے

اب وہ نہیں تو ڈھونڈتی ہوں اپنے آپ کو
مجھ کو مجھی سے آج چھپا کر چلے گئے

کچھ مسکرا رہی تھیں نگاہیں دمِ وداع
کچھ بجلیاں سی دل پہ گرا کر چلے گئے

تھی مشتِ خاک پھر بھی تھی شائستۂ کرم
کیوں مجھ سے دامن اپنا بچا کر چلے گئے

دل سے نکل کے دل ہی میں پھر بند ہو گئے
تفریقِ قرب و بُعد مٹا کر چلے گئے

ان کی نظر میں دیکھ لیا اپنے آپ کو
مجھ کو مرا ہی جلوہ دکھا کر چلے گئے

جس رہگذارِ شوق سے ان کا گزر ہوا
اک شمعِ آرزو کی جلا کر چلے گئے

ہونٹوں کا وہ سکوت نگاہوں کا وہ خطاب
اک داستانِ شوق سنا کر چلے گئے

اب ہے جدھر نگاہ اُدھر جلوہ گاہ ہے
وہ کائناتِ شوق پہ چھا کر چلے گئے

نجمہ غم و نشاط میں اب فرق ہے محال
ایسا وہ زور دل میں اٹھا کر چلے گئے

کریں یاد تم کو کہ دل سے بھلا دیں
ہم آخر غمِ عشق کو کیا بنا دیں

ڈبو کر غموں کے سمندر میں خود کو　　محبت کی کشتی کنارے لگا دیں

خراباتِ عالم کی ویرانیوں سے　　اگر ہو سکے زندگی کو صدا دیں

مٹا دیں وہ سائے زمانہ کو لیکن　　یہ ممکن نہیں نقشِ الفت مٹا دیں

حیاتِ محبت کی تکمیل کر کے　　حدیں موت اور زندگی کی ملا دیں

نگاہیں تری پھیرنے پر جو آئیں　　رلا کر ہنسا دیں ہنسا کر رلا دیں

محبت سے مخمور کر کے دلوں کو　　ان اجڑی ہوئی بستیوں کو بسا دیں

سرِ منزلِ دوست اہلِ محبت　　مقدر کو بھی ٹھوکروں میں اڑا دیں

وہ نقشِ وفا ہوں جسے وہ نگاہیں　　گھٹا دیں بڑھا دیں بنا دیں مٹا دیں

محبت عبادت بھی جرم و خطا بھی　　وہ کس کو جزا دیں وہ کس کو سزا دیں

ترے عشق کے درد سے مسکرا کر　　شبستانِ غم کو نہ کیوں جگمگا دیں

کہانی کہیں شامِ فرقت کی نجمہ
ستاروں کو کچھ آپ بیتی سنا دیں

اسی آئینے میں امروز فردا دیکھ لیتی ہوں
تری اٹھی جھکی نظروں میں کیا کیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی دنیا کے اندر کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
کبھی اپنے ہی اندر ایک دنیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی صحرا میں آتے ہیں نظر گلزار کے جلوے
کبھی میں دامنِ گلشن میں صحرا دیکھ لیتی ہوں

مری دوشیزگی جب پھول بن کر مسکراتی ہے

نگاہِ عشق کا دامن پہ دھبا دیکھ لیتی ہوں
فنا بھی ہے بقا بھی ہے نگاہِ شوق ساماں میں
عدم اندر عدم دنیا میں دنیا دیکھ لیتی ہوں
سمجھتی ہوں کہ یہ بھی اک فریبِ حسن ہے لیکن
نگاہِ ناز میں شرمِ تمنّا دیکھ لیتی ہوں
کہیں بیتابیاں گم ہو گئی ہیں قربِ جاناں سے
نگاہیں شاد ہو جائیں بس اتنا دیکھ لیتی ہوں
وہ آنکھیں دیکھ کر میں اک شانِ بے نیازی سے
قدح خانے میں سمتِ جام و مینا دیکھ لیتی ہوں
کسی کے ڈبڈبائے آنسوؤں میں پچھلی راتوں کو
میں نجمہ اپنی قسمت کا ستارا دیکھ لیتی ہوں

بیخودی کے ساز پر گانے کا موسم آ گیا
آ گیا پی کر بہک جانے کا موسم آ گیا
رنج و غم سے دل کو بہلانے کا موسم آ گیا
تلخیوں سے لذتیں پانے کا موسم آ گیا
یاس کے پردوں میں پھر اُمید نے لیں کروٹیں
پھر فریبِ زندگی کھانے کا موسم آ گیا
پھر پیامِ آمدِ جاناں سکونِ شام ہے
سیج پر کلیوں کے کھل جانے کا موسم آ گیا

یہ تڑپ، یہ درد، یہ رگ رگ میں ہلکی سی کسک
یہ شباب آیا کہ مر جانے کا موسم آ گیا
توڑ کر ہمدم ہر اک رسمِ درِ کونین کو
لغزشوں پر لغزشیں کھانے کا موسم آ گیا
ہلکی ہلکی خنکیوں میں نکھری نکھری چاندنی
داستانِ حسن دہرانے کا موسم آ گیا
دردِ فرقت میں بھی قربت کی جھلک سی آ چلی
اب تو دل ہی دل میں للچانے کا موسم آ گیا
پھر گلِ رخسار ہوں گے شبنمستاں در کنار
اشکِ غم کے پھر بکھر جانے کا موسم آ گیا
وادیٔ الفت میں نجمہ پھر بھٹکتے ہیں قدم
ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کا موسم آ گیا

سینے میں میرے جوشِ محبت کو دیکھ لے
سامانِ صد ہزار قیامت کو دیکھ لے
کیوں بادہ خواریوں کی اٹھاتا ہے زحمتیں
مستی بھری ان آنکھوں کی حالت کو دیکھ لے
رودادِ آزمائشِ فرہاد و قیس کیا
اے دل تو آج اپنی ہی ہمت کو دیکھ لے
فرصت ہو سیرِ لالہ و گل سے اگر تجھے

اے دوست میری خوں شدہ حسرت کو دیکھ لے

تو آفتابِ حشر ہے، میں ہوں شبِ فراق
آ اور میری صبح قیامت کو دیکھ لے

پھر کر سکے نہ تذکرۂ آہوئے حرم
کوئی اگر اس آنکھ کی وحشت کو دیکھ لے

پھر بجلیاں چھپیں گی نہ تیری نگاہ میں
اک دن تو میری شوخ طبیعت کو دیکھ لے

نشتر بھی تو ہے مرہم زخم نہاں بھی تو
اے چشم یار دل کی جراحت کو دیکھ لے

نجمہ ترے بدلتے ہی دنیا بدل گئی
کونین کی پھری ہوئی قسمت کو دیکھ لے

الٰہی کون نظروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
کہ دل کا ذرّہ ذرّہ ماہِ کامل ہوتا جاتا ہے

خدا رکھے ترے دردِ محبّت کو خدا رکھے
یہی اب زندگانی بھر کا حاصل ہوتا جاتا ہے

شعور و ذہن میں اک روشنی محسوس کرتی ہوں
میری ہستی میں آخر کون شامل ہوتا جاتا ہے

کوئی اے ناخدا تدبیر بھی ہے پار اُترنے کی
سفینہ زندگی کا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

کسی کے شوخ جلووں کی کرشمہ زائیاں توبہ
وہ عارف ہوتا جاتا ہے جو غافل ہوتا جاتا ہے
گل و لالہ سے اکثر چوٹ لگتی ہے مگر پھر بھی
دلِ ناداں بہاروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
نہ جانے کون سا یہ راہِ الفت میں مقام آیا
کہ تیرا درد ہی اب تو مرا دل ہوتا جاتا ہے
سلجھتی ہی نہیں ہیں عشق سے بھی زیست کی گرہیں
کہ دردِ غم ہی دردِ غم کا حاصل ہوتا جاتا ہے
کسی نے رس بھری نظروں سے دیکھا اس طرح مجھ کو
کہ تجھ سے بے نیازِ دو جہاں دل ہوتا جاتا ہے

محبت میں کیا دوں محبت میں کیا لوں — تجھے دے سکے دل تجھ کو اپنا بنا لوں
ادھر آؤ پہلو میں تم کو بٹھا لوں — ذرا حوصلے اپنے دل کے نکالوں
دفورِ محبت بھی ہے اک مصیبت — میں تجھ کو سنبھالوں کہ خود کو سنبھالوں
گلستاں گلستاں خیاباں خیاباں — تجھے دیکھ کر غنچۂ دل کھلا لوں
ابھی کر نہ مجبورِ تسخیرِ عالم — ذرا ان آنکھوں سے جادو جگا لوں
دلِ مضطرب کو میں دوں گی سکوں بھی — دھڑکنے کا اس کے کچھ انداز پا لوں
دوام و بقا میرے بس میں ہے غافل — بنوں گی مگر نقشِ ہستی مٹا لوں
بڑھا دوں ذرا وسعتیں اپنے دل کی — ترے درد کا حوصلہ آزما لوں
مقدر سے تدبیر کی کب چلی ہے — نہ آئے مجھے موت گر زہر کھا لوں

محبت کا آغوش ہوں میں سراپا — تجھے بھی جو چاہوں تو سانچے میں ڈھالوں
غمِ دوست اک روز مٹنا ہے مجھ کو — ابھی اور کچھ دن ترے کام آ لوں

اُفق پر ہیں پھر جگمگاؤں گی نجمہ
درِ یار پر پہلے قسمت جگا لوں

طلب میں تری بچ کے ہیں شش جہت سے
کسی سمت کھنچتی چلی جا رہی ہوں

مجھے کھو دیا تیری فرقت نے ایسا
خود اپنی نظر سے چھپی جا رہی ہوں

دل افسردہ، لب خشک، آنکھیں بھی پُر نم
مگر مسکرائے چلی جا رہی ہوں

رگِ زندگی ہوں کہاں مجھ کو راحت
ازل سے میں دکھتی چلی جا رہی ہوں

دلوں سے جہاں سے زمان و مکاں سے
میں رسمِ وفا ہوں اٹھی جا رہی ہوں

جہاں میں ہے رفتار میری انوکھی
بصد ہوش و صد بیخودی جا رہی ہوں

محبت محبت، زمانہ زمانہ
پیاپے بدلتی چلی جا رہی ہوں

ترے عشق کی بن گئی ہوں کہانی

کہی جا رہی ہوں سنی جا رہی ہوں
محبت کی میں شام فرقت ہوں نجمہ
مصیبت سے کٹتی چلی جا رہی ہوں

کیونکر گزر رہے ہیں مری زندگی کے دن
یہ میں تمھیں بتا نہیں سکتی ہوں کیا کروں
مجھ کو ترے فراق کا احساس ہے مگر
میں ترے پاس آ نہیں سکتی ہوں کیا کروں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی آگ محبت کہیں جسے
یہ آگ میں بجھا نہیں سکتی ہوں کیا کروں
نجمہ ترے خیال میں برباد ہو گئی
یہ بات اب چھپا نہیں سکتی ہوں کیا کروں

میں بجھ گئی کہ نبضِ دو عالم ہی بجھ گئی
دنیا ترے بغیر نہ بہلا سکی مجھے
کچھ ایسی بے دلی سے گزرتی گئی حیات
جی ہی سکی میں اور نہ موت آ سکی مجھے
دنیا ہمہ نشاط و جوانی سہی مگر
دنیا کسی فریب میں کب لا سکی مجھے
آئی تھی بیخودی میں صدا سکوں کبھی
آوازِ بازگشت نہ پھر آ سکی مجھے
میرا ہی تھا یہ ظرف کہ ان حادثوں میں بھی
یہ تلخیٔ حیات نہ گھبرا سکی مجھے
نجمہ یہ میں، یہ سیلِ حوادث، یہ شامِ غم
حیرت نہیں اجل نہ اگر پا سکی مجھے

لرزاں ہیں جو روح کے پردوں میں انوار لٹائے جاتی ہوں
ہستی کے ذرّے ذرّے کو خورشید بنائے جاتی ہوں
کچھ نکھرے نکھرے گیت ہیں جو ہونٹوں سے برستے رہتے ہیں
اک میٹھی میٹھی آگ ہے جو ہر سو بھڑکائے جاتی ہوں

خود اپنی لَے کو سنتی ہوں خوش ہوتی ہوں سر دُھنتی ہوں
اشعار میں ڈھال کے اشکوں کو مستی میں گائے جاتی ہوں

دل اکثر چوٹیں سہتا ہے اور چُپ چُپ روتا رہتا ہے [۱]
گو سر تا پا غم ہوں لیکن ہنستی ہوں ہنسائے جاتی ہوں

موہوم سی ایک تمنّا کی خاطر، یہ حوادث توبہ ہے
پھولوں کی محبّت میں کانٹے آنکھوں سے لگائے جاتی ہوں

کیا جانے کس سے کہتی ہوں خوابوں کے سنہرے افسانے
ٹھہرو کہ ابھی میں آتی ہوں، ٹھہرو کہ بِن آئے جاتی ہوں

معلوم کبھی یہ ہوتا ہے محصور ہوں چاند ستاروں میں
محسوس کبھی یہ کرتی ہوں ذرّوں میں سمائے جاتی ہوں

نجمہ پھر سندر سپنوں میں بننے لگے قصرِ امیدوں کے
پھر ریت کے گرتے ساحل پر بنیاد اُٹھائے جاتی ہوں

آ دُپٹے سے لگا کر دوں تجھیں دادِ وفا
یہ تُنا پھر اک یہ غم یہ چشمِ تر میرے لئے

دل ترے نوروز، رنگا رنگ ہیں راتیں تری
اور یہ ویرانیٔ شام و سحر میرے لئے

بے سر و سامانیوں میں یہ گماں گزرا کہ ہیں
یہ مہ و خورشید و انجم چرخ پر میرے لئے

برقِ باراں میرے سیارے مرے میری شفق
بجلیاں میری ہیں اور برگ و شجر میرے لئے

میری خاطر گیسوئے ابر سیہ کے پیچ و خم
ندیوں کی صاف بل کھائی کمر میرے لئے

---

[۱] تیسر سے اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
میں راتوں کو اُٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

گردشِ دوراں ہے میری جستجو کے واسطے
ہے ازل سے تا ابد دورِ قمر میرے لئے

جس طرف سے بھی میں نکلوں جو ہو میری رہگذر
فرشِ رہ آنکھیں کئے ہیں بام و در میرے لئے

سب کرشمے حسن کے ہیں کیا ثواب کیا گناہ
نور و ظلمت میری خاطر خیر و شر میرے لئے

تو مری تازہ بتازہ رنگ میرا تو بہ تو
روز پیدا ہے نیا اک زندہ در میرے لئے

میری ہی خاطر ہیں حسن و عشق کی نیرنگیاں
ہے ہر اک دیوانہ و دیوانہ گر میرے لئے

مالکِ کون و مکاں ہوں شاعرِ فطرت ہوں میں
یہ زمیں یہ آسماں یہ بحر و بر میرے لئے

میری ہستی انقلاب انقلاب انقلاب
نظمِ عالم آج ہے زیر و زبر میرے لئے

مجھ سے وہ چھپتا ہے تجھ بن کے میری ہی نگاہ
پردہ داری ہے باندازِ دگر میرے لئے

کرم تیرا کہ سوزِ جاودانی لے کے آئی ہوں
مگر یہ کیا کہ میں اک عمرِ فانی لے کے آئی ہوں

یہ کس کافر کی محفل ہے کہ جس میں نذر کرنے کو
میں دل کی دھڑکنیں آنکھوں کا پانی لے کے آئی ہوں

یہ دنیا! یہ خلوص و عشق کے رنگ آفریں نغمے
بیاباں میں گلستاں کی کہانی لے کے آئی ہوں

بھڑک کر شعلہ بن جائے کہ بجھ کر راکھ ہو جائے
ہوا کی زد پہ شمعِ زندگانی لے کے آئی ہوں

مری دنیا ہے شعر و خواب و رنگ و نور کی دنیا
مہ و انجم کی گویا ضو فشانی لے کے آئی ہوں

اگر چاہوں یہ دنیا پھونک ڈالوں اپنے نغموں سے
کہ میں سانسوں میں شعلوں کی روانی لیکے آئی ہوں
مرا دل بھی ہے محسوسات کا آتش کدہ آخر
عجب کیا ہے جو ذوقِ شعر خوانی لے کے آئی ہوں
ضیا اندوز ہوں اک آسمانی نور سے تحسینہ
زمیں پر چاند تاروں کی جوانی لے کے آئی ہوں

ہر نفس جلتی ہوئی تلوار ہے
زندگی اک مستقل آزار ہے
مسکرانا تو بڑی شے ہے یہاں
اب تو رونے سے بھی جی بیزار ہے
زیست کے ماحول میں چاروں طرف
ایک گہری تیرگی بیدار ہے
ولولے گھٹتے ہوئے مرتے ہوئے
منجمد سی گرمیٔ افکار ہے
بجھ گئے روشن امیدوں کے چراغ
زیست اک اک شامِ ظلمت بار ہے
زندگانی ہر قدم، ہر موڑ پر
ایک محکم آہنی دیوار ہے
کاش میری وقعتیں سمجھیں وہ لوگ
جن کو میری شاعری سے پیار ہے

مطربِ خوشنوا ابھی سازِ طرب بجائے جا
بھول چلی ہوں دردِ ہجر ہاں یہی راگ گائے جا
وعدوں کی اُن کے داستاں چھیڑ کے دل دکھائے جا
بجھتی چراغ سے چراغ اے شبِ غم جلائے جا
جوہرِ آبِ خضر بھی گرچہ اسی میں ہے نہاں

خنجرِ نازِ حسن کو زہر میں بھی بجھائے جا

اے دلِ بیقرار آج فرصتِ ترکِ عشق ہے
اب ہمہ تن ہیں گوش ہوں قصۂ غم سنائے جا

تجھ سے سکونِ حال کی حسرتِ آرزو ہو گیا
غم ہی تو ہے بڑھائے جا دل ہی تو ہے دکھائے جا

اے دلِ مصلحت شناس حرف نہ تجھ پہ آنے پائے
حسن کے ناز اٹھائے جا عشق کے کام آئے جا

اس کی گدا نوازیاں عام ہیں بے حساب ہیں!
مل ہی رہیگا کچھ نہ کچھ دستِ طلب بڑھائے جا

نجمہ بیقرار تو نورِ پیامِ صبح ہے
بن کے ستارۂ سحر چرخ پہ جھلملائے جا

سب یہ آثارِ غم بدل جاتے — تو جو آتا چراغ جل جاتے
ابھی منزل ہے دامنِ جاناں — اشکِ خونیں بھی سنبھل جاتے
یوں تو انجامِ عاشقی معلوم — حوصلے دل کے کچھ نکل جاتے
خیر سے کارِ عشق تھے دشوار — سہل ہوتے اگر تو کھل جاتے
خیر گذری بدل گئی دنیا — قہر ہوتا جو تم بدل جاتے
کل بھی اک روز آج ہو جاتا — آج جاتے نہ وہ تو کل جاتے
طور و کعبہ سے ہم پھرے مایوس — اور کچھ دور تک نکل جاتے

تری چشم مے بار و مست شراب
زمانے کو کر دے گی اک دن خراب[1]

تو اک کھلتی بھینی سی کلیوں کی بُو
ہیں اک کھویا کھویا جوانی کا خواب

نظر بہکی بہکی ادا مست مست
یہ الھڑ جوانی یہ کافر شباب

جبیں چاند سی اور لب پھول سے
ترا جسم اک پرتوِ ماہتاب

وہ آہیں ہوائیں وہ اُٹھتی گھٹا
بس اک گنگناتا سا جامِ شراب[2]

وہ شب تاب جلوے وہ تاروں کی چھاؤں
کبھی میں نے ایسا بھی دیکھا تھا خواب

اِدھر آؤ تم سے کہوں ایک بات
سراپا غزل اور مجسم شراب

یہ ساغر ہے یہ مے ہے یہ ساز ہے
بنا دو جہاں کو بہشتِ شباب

یہ کیا دے دیا پینے والے مجھے
مسلسل خلش مستقل اضطراب

پلا دو کسی روز تم مجھ کو بھی
ہٹاؤ کسی روز رخ سے نقاب

اپنی خوشیوں کے عارضی جذبات
غم میں تحلیل کر رہی ہوں میں

کوششیں ہیں کہ غم سے بچ جاؤں
خود کو تبدیل کر رہی ہوں میں

ماضی و حال کے مصائب سے
اپنی تکمیل کر رہی ہوں میں

کہہ رہی ہوں ترے ستم کو کرم
خوب تاویل کر رہی ہوں میں

---

[1] اس غزل میں میر حسن کی مثنوی کی بحر استعمال کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

رہی کوئی دانتوں میں انگلی کو داب
کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

[2] میر حسن:۔ پلا ساقیا مجھ کو اک جامِ مل
جوانی میں آئے ہیں ایامِ گل

موت کی وادیوں میں جاتا ہے　کتنی تعجیل کر رہی ہوں میں
کل ارادوں میں جان ڈالوں گی　آج تشکیل کر رہی ہوں میں

زندگی کی حقیقتیں سب ہیں
صرف تخئیل کر رہی ہوں میں

پھر وہ حیرت گاہِ غم ہائے کہن یاد آگئی
شامِ غربت میں مجھے صبحِ وطن یاد آگئی

بلبلِ رنگیں نوا کو دفعتہً دورِ چمن
رونقِ رنگینیٔ صحنِ چمن یاد آگئی

گلستاں در گلستاں ہیں میری رنگیں خلوتیں
یاد اس کی ــــ انجمن در انجمن یاد آگئی

زندگی کے والہانہ دور میں گذری ہوئی
کوئی شب نغمہ طراز و نغمہ زن یاد آگئی

جب کبھی آیا عزیزانِ وطن کا کچھ خیال
تلخیٔ بے مہریٔ اہلِ وطن یاد آگئی

دیکھ کر پردیس میں تجھ پہ توقیرِ ادب
دیس کی ناقدریٔ اربابِ فن یاد آگئی

وہ جب سامنے تھے ادب درمیاں تھا　انھیں دیکھ لینے کا موقع کہاں تھا
نمودِ ابھی دھوکا تھی چھپنا گماں تھا　نہ کوئی عیاں تھا نہ کوئی نہاں تھا
سرِ شاخِ گلشن ابھی آشیاں تھا　ابھی برق چمکی تو مطلق دھواں تھا

وہ دن بھی کبھی تھے کہ زیبا تھی دنیا　　زمیں تھی زمیں آسماں آسماں تھا
یہ کھلتا نہیں کچھ وہ تم تھے کہ میں تھی　　مگر یہ کہ حائل کوئی درمیاں تھا
شبِ ہجر میں تم بہت یاد آئے　　بھری چاندنی تھی سہانا سماں تھا
فقط ایک رستے میں تھا راہبر دل　　مگر شورِ دل کارواں کارواں تھا
محبت سے پہلے بھی دنیا یہی تھی　　یہی سرزمیں تھی یہی آسماں تھا
یہ احساس ہوتا ہے ملتے ہی تجھ سے　　کہ جیسے ازل ہی سے تو مہرباں تھا

یہ قصہ ہے اب کا کہ تجھ پہ جواں ہے
وہ قصہ ہے جب کا تو آتش جواں تھا

ان لبوں میں ہے شرابِ آتشیں میرے لئے
وہ حسیں یا نہیں وہ جسم مرمریں میرے لئے
کیف و سرمستی کی دنیا محفلِ رقص و سرود
کر گئی قائم وہ چشم سرمگیں میرے لئے
گردشِ ایام کی نبضیں یکایک رک گئیں
کس نے پھیلا دی یہ زلفِ عنبریں میرے لئے
دردِ دل، سوزِ محبت، اشکِ غم اور اضطراب
اک مصیبت ہو گیا قلبِ حزیں میرے لئے

لہ ڈاکٹر عندلیب شادانی ؎　میں آہ کر کے اپنے خیالوں میں کھو گیا
کچھ ذکر تھا بہار و شبِ ماہتاب کا

بار جانا ہے مجھے قوسِ قزح کے اُس طرف
منتظر ہے ایک دنیائے حسیں میرے لئے
انجمن تیری، یہ شمعیں تیری، یہ رونق تیری
بزم عالم میں سکھ کچھ بھی نہیں میرے لئے
پھر سکونِ روح میرا آ نہ جائے وجد میں
چھڑ نہ جائے پھر کوئی نغمہ کہیں میرے لئے
تجھ کو زیبا ہے اگر تجھ کہے تو رات دن
یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے

محبت کے دکھ سکھ اٹھاتی رہونگی　　یونہی زندگانی مٹاتی رہوں گی
غمِ ہجر میں مسکراتی رہوں گی　　تری یاد کے ناز اٹھاتی رہوں گی
محبت میں نقشے نئی زندگی کے　　بناتی رہوں گی مٹاتی رہوں گی
نگاہیں ملا دوں گی اک روز تجھ سے　　ابھی کچھ دن آنکھیں چراتی رہوں گی
سوا میرے دنیا میں ہے کون تیرا　　میں اپنے غم ترے کام آتی رہوں گی
رکھونگی ہری زندگانی کی کھیتی　　محبت کے آنسو بہاتی رہوں گی
کبھی ہی، اتنی سی رہونگی کسی سے　　یونہی حسن کو آزماتی رہوں گی
محبت کی بزم سکون و طرب میں　　میں لو کی طرح تھرتھراتی رہوں گی
ہو کیوں رائیگاں درد میری صدا کا　　ترانے محبت کے گاتی رہوں گی
یہی سعیِ بیسود ہے شغل میرا　　تری یاد دل سے بھلاتی رہوں گی
نظر ہے مری داستانِ محبت　　کہانی سی تم کو سناتی رہوں گی

شبِ غم کی آنکھوں کا آنسو ہوں نجمہ
یونہی صبح تک جھلملاتی رہوں گی

"منظومات"

امرت سر پردہ کلب

بجلیوں کی اور شراروں کی زمیں
چاند تاروں سیم پاروں کی زمیں
قہقہے آرام پاتے ہیں یہاں
پھول سے لب مسکراتے ہیں یہاں
اُف یہ ملبوسات ہوتا ہے گماں
جیسے کوئی ساڑیوں کی ہو دکاں
عشق کے ارمان پلتے ہیں یہاں
شعر اور رومان پلتے ہیں یہاں
ریشموں میں جھلملاتی لڑکیاں
اینڈتی اور لڑکھڑاتی لڑکیاں
نکہتیں بکھری ہوئی سی چار سو
مستیاں بکھری ہوئی سی چار سو
سحر کاری جلوہ تابی ہر طرف
دیدہ و دل کی خرابی ہر طرف
مضطرب ہیں حسن کے جلوے یہاں
اس نمائش گاہ میں پردہ کہاں

یہ مقام آبروئے عشق ہے
حسن کو خود جستجوئے عشق ہے

"رودِ جہلم"

(شہر جہلم کے قریب شام کا ایک منظر)

جہلم اک رودِ نظر افروز اک سیم رواں
زمزمہ پرواز لہروں کا یہ سیلِ بیکراں
چاندنی لپٹی ہوئی سی ساغرِ بلور میں
گیت کچھ بہتے ہوئے سے آسمانی نور میں

قطرہ قطرہ رقص کرتا وجد فرماتا ہوا
لہر لہراتی ہوئی گرداب چکراتا ہوا
بہ سبک رفتار رنگوں سے گیتوں کی الاپ
سرمئی ساحل سے یہ شفاف لہروں کا ملاپ
دیدنی ہے رات کی تاریکیوں میں آج سماں
ریل کے پل پر چمکتی جھلملاتی گاڑیاں
جنت نظارہ حسن انجم و مہتاب ہے
اک بالائے فلک اک چاند زیر آب ہے
مست رو لہروں کے پاکیزہ سحر انگیز راگ
رس بھرے کیف آفریں شاداب و شیریں راگ

جب بھی امرت سر کے ہنگاموں سے گھبراتی ہوں میں
اُٹھ کے بجمہ رودِ جہلم پر چلی آتی ہوں میں

آغازِ عشق

تلوّن

آغازِ محبت میں وہ اک صبح خراماں
آنکھوں میں سمٹے ہوئے سو رنگ کے طوفاں
اب تک ہے تصور میں وہ بیدار نظارہ
وہ مست سماں اب بھی نگاہوں میں ہے رقصاں
سانچے میں جوانی کے وہ ڈھالی ہوئی مورت
حوروں کے تبسم کی جھلک رخ پہ فروزاں
دزدیدہ نگاہوں میں وہ دزدیدہ تبسم
وہ برق مجسم کبھی پنہاں کبھی عریاں
وہ عہدِ جوانی کی تمناؤں کا مرکز
وہ قامتِ خوش جس سے خجل سروِ گلستاں
وہ جوشِ شباب اور وہ شرمیلی ادائیں
پیغامِ جنوں دل کے لئے عشوۂ پنہاں
انگڑائی سی لے کر ہوئی بیدار محبت
جذبات کی مستی ہوئی خورشید گلستاں
اُمید کی آغوش میں پلتے رہے جذبے
آغاز میں ہوتا ہے مگر عشق بھی ناداں

(۲) انجامِ عشق

اک وقت پھر آتا ہے کہ مرجاتی ہے امید
فرصت نہیں ملتی کہ سئیں چاک گریباں
ہوتی نہیں مانوس کسی شے سے طبیعت
خاطر بھی پریشان، تخیل بھی پریشاں
بڑھ جاتی ہے افکارِ معیشت کی کشائش
دوزخ سی نظر آتی ہے یہ جنتِ دوراں
اُدھر دل میں رہتا نہیں پہلا سا تموّج
ہو جاتا ہے یوں بھسمٔ عشق کا ساماں
گھٹ جاتا ہے ذوقِ عمل و جوشِ تمنا
بڑھ جاتی ہے مایوسیٔ دل تا حدِ امکاں
مٹ جاتی ہے تابندگیٔ کاکل و رخسار
جس طرح چھپے ابر میں خورشیدِ درخشاں
بیگانگیٔ دہر کی ہوتی ہے یہ صورت
محسن کوئی ہوتا نہیں آمادۂ احساں

---

(۳) تجدیدِ عشق

پھر فتنے جوانی کے مچلتے ہیں رگوں میں
پھر دل کا ہر اک گوشہ ہے صد حشر بداماں

(باقی آئندہ صفحہ پر)

پھر حُسن کی دنیا میں ہے یک گونہ تغیّر
ہے زودِ پشیماں کا ہر اندازِ پشیماں
پھر دیتی ہے پیغامِ جنوں میری خرابی
پھر اس کے حسیں چہرے پہ زلفیں ہیں پریشاں
پھر چھیڑتی ہیں میری تمناؤں کو نظریں
پھر روح کو تجدیدِ محبت کا ہے ارماں
پھر یاد دلاتی ہیں مجھے عہدِ گذشتہ
کیوں ہوتے ہیں پھر میری تباہی کے یہ ساماں
احساس کی دنیا متغیّر ہوئی یارب
ہے کون جو اب روک دے جذبات کے طوفاں
عورت کی ادائیں نہ ہوں بیباک الٰہی
عورت کی اداؤں سے لرز جاتا ہے یماں

اجتناب

خدا کے واسطے لطف آفریں نظر کو روک
خدنگِ عشق کے اقدامِ پُرخطر کو روک

[پچھلے صفحے سے]
لہ فیض احمد فیض ؎ مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار (نقش فریادی)

پیامِ دردِ محبت کی رہگذر کو روک
مری قبائے جنوں تار تار ہونے دے
میں خوش ہوں مجھ کو یونہی سوگوار رہنے دے

سنا نہ مجھ کو محبت کے عنبریں نغمے
حواس و ہوش کے رہزن ہیں یہ حسیں نغمے
جنوں شکار و طرب خیز و دلنشیں نغمے

تعلقاتِ محبت کو استوار نہ کر
مجھے حسین نگاہوں کا تو شکار نہ کر

طرح طرح سے تیری یاد کو بھلایا ہے
جگر کی آگ کو خوناب سے بجھایا ہے
دلِ خراب کو تخریب سے بچایا ہے

تو پھر تعلقِ نو کا مجھے پیام نہ دے
مجھے شرابِ محبت کے مست جام نہ دے

غمِ فراق میں تو بھی نہ کر بسر راتیں
بھلا تو شوقِ محبت کی وہ ملاقاتیں
خیال و خواب سمجھ لے وہ پیار کی باتیں

مرے فراق میں تو زندگی خراب نہ کر
دلِ تباہ کو مرہونِ اضطراب نہ کر

۱۔ شمیم جمیلی

تڑپ تڑپ کے گزاریں فراق کی راتیں
سسک سسک کے بھلائی ہیں پیار کی باتیں
رلا رہی ہیں مگر شام کی ملاقاتیں

تأثرات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

ترے خطوط سے ظاہر ہے اضطرار ترا
وفورِ گریہ سے ہے دیدہ اشکبار ترا
دل حزیں بھی ہے غمناک و سوگوار ترا
مگر یہ تیری محبت فریب ہے بالکل
یہ دردو رنج یہ کلفت فریب ہے بالکل

نہ حالِ زار پہ مجھ کے اب کرم کر تو
نہ اس کے واسطے دل مائلِ الم کر تو
نہ دے پیام محبت نہ پھر ستم کر تو
اسے فسردہ نظر دل فگار رہنے دے
اسے اسیرِ غم انتظار رہنے دے

قطعات

عطرِ وفا کی خوشبو سے ظرفِ محبت کو مہکا
مست نگاہوں سے پی کر مجھ دنیا پر چھا جا

تجھ کو اپنے قریب پاتی ہوں دل پہ چھایا ہوا ہے تیرا خیال
کیا تجھے بھی میں یاد آتی ہوں کتنا نازک ہے تجھ سے میرا سوال

سانیٹ[1] (Sonnet)

(۱)

جس طرح صبح کے انوار کی بارش ہو جائے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یا ہو آغوشِ چمن زار میں طوفانِ بہار
پتّی پتّی پہ کھلا رکھا ہو قرانِ بہار
کوئی پھولوں کا ہی لے لے کے سہارا سو جائے

یا ہو خوابوں کے جزیروں میں کوئی نغمہ طرازؔ
جھوم کر آئے گھٹا میکدہ کاندھے پہ لئے
کوئی صہبا کسی دوشیزہ کے ہونٹوں سے پیئے
چھیڑ دے جیسے جوانی کوئی گونجا ہوا ساز

[حاشیہ صفحہ ۶۸۱]
۵ "سانٹ" (Sonnet) چودہ مصرعوں کی ایک مخصوص نظم کو کہتے ہیں، محققین میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ اول اوّل سانٹ کس جگہ ایجاد ہوا۔ اس سلسلہ میں سسلی اور پرادنس (جو فرانس کا ایک صوبہ ہے) کے نام لئے جاتے ہیں لیکن یہ بات محقق ہے کہ اطالیہ میں یہ تیرھویں صدی ہجری میں آیا اور یہاں سے دوسرے ملکوں میں پھیلا، اطالیہ میں ڈانٹے (Dante)، پیٹرارک (Petrarch) اور مائیکل انجیلو (Michel Angelo) اس صنف شاعری کے زبردست علمبردار گزرے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد اطالیہ سے سانٹ فرانس آیا اور پھر فرانس سے ملکہ الزبتھ (Queen Elizabeth) کے دورانِ حکومت یعنی سولھویں صدی میں

طامس وائٹ (Thamas wyatt) اور ہنری ہوورڈ ارل آف سرے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحنِ میخانہ میں ہلکی کوئی رقصاں ہو جائے
دل کے ہر تار سے نغموں کی صدا آنے لگے
تاروں کی چھاؤں میں یا چاندنی لہرانے لگے
جیسے ویرانہ کوئی بزمِ چراغاں ہو جائے
آج کل یوں ہی مری عمر بسر ہوتی ہے
یعنی لمحاتِ محبت میں گذر ہوتی ہے

پچھلے صفحہ سے (Henry Howred Earl of surrey) کے ذریعہ انگلستان آیا اور انگریزی شاعری کا ایک جزبن گیا۔ شکسپیر (Shakespeare)۔ ملٹن (Milton) اور ورڈز ورتھ (Wordsworth) انگریزی میں سانٹ کے زبردست لکھنے والے گزرے ہیں۔ اب بیسویں صدی میں انگریزی ادب کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ یہ صنفِ سخن اُردو میں آرہی ہے اُردو میں اس کو قطعہ کی ایک مخصوص صورت کہہ سکتے ہیں۔

"سانٹ" (Sonnet) اطالوی زبان کے لفظ "سانی ٹو" (Sonneto) سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی چھوٹی سی آواز کے ہیں۔ ابتداءً یہ ایک مختصر سی نظم ہوتی تھی جو ساز کے ساتھ ترنم سے گائی جاتی تھی۔ اب سانٹ صرف ایک مختصر نظم کو کہتے ہیں۔ ساز کے ساتھ گانے کی شرط اب اس میں باقی نہیں رہی ہے۔ قطعہ کے طرح سانٹ میں صرف ایک خیال یا جذبہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔

سانٹ صرف چودہ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ چودہ مصرعے دو حصوں میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲)

یادِ ایّام

زندگی کے وہ جواں لمحات اب تک یاد ہیں
چوڑیوں کی گت پہ فردوسی ترانے چھیڑنا
غیر فانی عشق کے رنگیں فسانے چھیڑنا
وہ سنہرے دن حسیں اوقات اب تک یاد ہیں

عہدِ بے فکری کے وہ دن اور راتیں یاد ہیں

[پچھلے صفحہ سے] منقسم ہوتے ہیں - پہلے حصے میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اور دوسرے حصے میں چھ - اصطلاحی زبان میں پہلے حصہ کو "آکٹیو" (Octave) اور دوسرے حصہ کو "سسٹیٹ" (Sestet) کہتے ہیں - "آکٹیو" چار چار مصرعوں کے دو بندوں پر مشتمل ہوتا ہے اور "سسٹیٹ" تین تین مصرعوں کے دو بندوں پر۔ "آکٹیو" میں کسی خیال کا اظہار و آغاز ہوتا ہے آٹھویں مصرعہ میں گریز ہوتا ہے اور "سسٹیٹ" میں اس خیال کی تکمیل و انجام

ردیف و قافیہ کے اعتبار سے "آکٹیو" کے مصرعوں کی ترتیب و تنظیم متعین ہوتی ہے - وہ ترتیب یہ ہے - اب ب ا - اب ب ا اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا مصرعہ، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں مصرعہ سے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرے، تیسرے چھٹے اور ساتویں مصرعہ میں ایک ہی ردیف و قافیہ ہوتا ہے

دیکھنا بیداریوں میں بھی سرور انگیز خواب
چھاؤں میں پھولوں کی پڑھنا کوئی شعروں کی کتاب
مجھ کو کالج کے مرے باغات اب تک یاد ہیں

حادثوں نے اب بدل دی زندگی کی شاہراہ
ہونٹ کے تھکتے ہوئے داغوں سے دل ناکام ہے

[پچھلے صفحے سے] "سسٹیٹ" میں یہ ترتیب کئی مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے
سانیٹ کی اطالوی قسم کو کلاسیکل (Classical) یا پیٹرارکن
(Petrarchan) قسم بھی کہتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کے اعتبار سے
اس کی ترتیب کی تین خاص صورتیں یہ ہیں:

"آکٹیو"	"سسٹیٹ"
(۱) اب ب ا - اب ب ا۔	ج د س - ج د س
(۲) اب ب ا - اب ب ا۔	ج د ج - د ج د
(۳) اب ب ا - اب ب ا	ج د س - د ج س

اس میں ملٹن عموماً پہلی ترتیب کا تتبع کرتا ہے اور ورڈزورتھ دوسری ترتیب کا۔
ردیف و قافیہ کے اعتبار سے سانیٹ کی اس کے علاوہ ایک اور قسم
ہے جس کو انگریزی قسم (English Type) کہتے ہیں۔ اس میں چار چار
مصرعوں کے تین بند ہوتے ہیں اور آخر میں ٹیپ کا ایک شعر۔ شیکسپیئر نے

زندگی صحرا کی اک جھلسی ہوئی سی شام ہے
اب سمٹ کر رہ گئی ہے میری بالیدہ نگاہ
زلیست کے احساس کو کھوئے بھی مدت ہو گئی
مسکرانا کیا کہ اب روئے بھی مدت ہو گئی

[پچھلے صفحہ سے] اس قسم کی ترتیب قائم رکھی ہے۔ انگریزی سانٹ کی ترتیب کی دو مخصوص صورتیں یہ ہیں:۔

شکسپیر کی ترتیب	بند	بند	بند	ٹیپ کا شعر
	اب اب۔	ج د ج د۔	س ص س ص۔	ع ع
اسپنسر کی ترتیب	اب اب۔	ب ج ب ج۔	ج د ج د	س س

سانٹ کی اس ترتیب میں شعرا نے اکثر تصرف کئے ہیں مثلاً موجودہ دور میں ریوپرٹ بروک (Rupert Brooke) نے سانٹ کیلئے اپنی خاص یہ ترتیب اختیار کی ہے۔

اب اب - ج د ج د س ص ع س ص ع

اردو میں ابھی سانٹ کہنے والے بہت کم ہیں۔ اختر شیرانی نے البتہ کچھ قابل اعتنا سانٹ لکھے ہیں۔ محترمہ نجمہ کے مندرجہ بالا دونوں سانٹ خصوصاً پہلا ــــ جذباتی اعتبار سے بہت بلند ہیں اور ان میں بڑی شعریت اور رنگینی موجود ہے البتہ آپ نے ردیف وقافیہ کی ترتیب کی ان مقررہ صورتوں کا تتبع نہیں کیا ہے۔ آپ نے خود اپنی نئی ترتیب اختیار کی ہے آپکے سانٹ کی مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں ہر ایک کی

اشعار

دل میں ہجومِ یاس و تمنا لئے ہوئے
دنیا سے جا رہی ہوں میں دنیا لئے ہوئے

میں مٹ چکی ہوں پھر بھی کسی کی نظر میں ہوں
ہے موت زندگی کا سہارا لئے ہوئے

تجھ کو بھی جو دیکھ سکو چشمِ شوق سے
ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا لئے ہوئے

جی کھول کر کچھ آج تو رونے دے ہم نشیں
مدت ہوئی ہے درد کا درماں کئے ہوئے[1]

ملتے ہیں دونوں وقت کہ آتا ہے کوئی یاد
عارض پہ کاکلوں کو پریشاں کئے ہوئے[2]

ظلمت نصیب گوشۂ خلوت میں شامِ غم
بیٹھے ہیں داغِ دل کو فروزاں کئے ہوئے[3]

(پچھلے صفحہ سے) ترتیب مختلف ہے پہلے سانٹ کی ترتیب یہ ہے :-

بند	بند	بند	ٹیپ کا شعر
اب ب ا	ج د ج	اس س ا	ص ص

دوسرے سانٹ کی ترتیب یہ ہے

اب ب ا	اج ج ا	دس س د	ص ص

[1] غالب ۔ پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ؛ مدت ہوئی ہے چاک گریباں کئے ہوئے

[2] فراق گورکھپوری ۔ یہ تیرگی، یہ ابتری، یہ نکہتیں یہ سنسنیاں
کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلفِ عنبریں کہیں

[3] غالب جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ؛ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ہر آنکھ ہے اک جلوۂ معصوم کی جویا
لیکن اُسے انکار ہے معلوم نہیں کیوں

دل کشمکشِ زیست سے ہے مرگ بہ آغوش
جینے پہ بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں[1]

یہ کس نے ڈوبتی نبضوں پہ رکھا دستِ ناز اپنا
کہ دنیا میری نظروں میں جواں معلوم ہوتی ہے

---

[1] اس زمین میں جتنی غزلیں راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں ان میں بہترین غزل جگر مراد آبادی کی ہے۔ جذباتی و وجدانی اعتبار سے یہ غزل بہت بلند ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بیتاب ہے، بیخواب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل ماہیٔ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و باصرار
وہ جرعہ بھی زہر آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
اب تک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھبرائے ہوئے دل کو
اک شعلۂ بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

کل تک یہی دنیا سبدِ گل تھی مگر آج
بے رنگ ہے بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

منہ تکتے ہیں تدبیر کوئی کر نہیں سکتے
شل ہمتِ احباب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

جو ساز کہ خود نغمۂ عرباں تھا اسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

("شعلۂ طور" صفحہ ۸۳)

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو، مسکرا دیے
اے دوست شوق دید کی سرمستیاں تو دیکھ
تجھ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیے

مآلِ ارتباطِ باہمی ہے دید کے قابل
تڑپ اُٹھتا ہے میرے ساتھ میرا غمگسار اکثر
مری نظروں سے پوچھے کوئی شانِ حسن غم دیدہ
انھیں بیتاب دیکھا ہے بچشم اشکبار اکثر
سمجھنے کو سمجھتی ہوں مزاجِ حسن اے تجھ
مگر کرتی ہوں دانستہ کسی کا اعتبار اکثر

فنا ہو گیا آدمی عشق کر کے
خرد کی کوئی بات اس نے نہ مانی
بجھے آنسوؤں سے نہ اِس دل کی گرمی
محبت ہے اک آتشِ غیر فانی[1]
یہ پرکیف راتیں یہ رنگیں نظارے
یہ میری تمنا یہ تیری جوانی

---

[1] غالب:- عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب: کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

کیوں ہلکی ہلکی آگ نہ سینے میں جل اُٹھے
سنتی ہوں مجھ کو تم سے محبت ہے اِن دنوں
کیا کم تھے تیرے حسنِ جواں کے تکلفات
یہ سادگی تو اور قیامت ہے اِن دنوں

خون بن کر مری آنکھوں سے ٹپکنے والے
نور بن کر مری آنکھوں میں سمایا کیوں تھا[1]
چومتی پھرتی ہے ہر پھول کا عارض نجمہ
اس کو عکسِ رخِ گلفام دکھایا کیوں تھا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب دل ملنے لگتے ہیں
محبت کی نظر اُس وقت پہچانی نہیں جاتی
ستارے جگمگا کر آنکھ میں پھر ڈوب جاتے ہیں
محبت میں مگر نجمہ پریشانی نہیں جاتی[2]

ہے مجھے سازگار یہ دنیا ذکرِ روزِ حساب رہنے دے

---

[1] فانیؔ:- دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے :: تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
[2] ملاحظہ ہو صفحہ: تبسم ملیح آبادی ص ۵۳۳

حالِ دل ہے یہ نہ تو نہیں | کچھ سُنا کچھ حجاب رہنے دے
منفعل ہو نہ شانِ غفاری | معصیت کا حساب رہنے دے [۱]

حُسن بے اعتبار ہے لیکن | تم پہ ہم اعتبار کرتے ہیں
حُسن کی اور کچھ بڑھا قیمت | نقدِ جاں ہم نثار کرتے ہیں [۲]

قدم چومے گی منزل ذوق میں کر بال و پر پیدا
سراپا شوق بن آگے نکل جا کاروانوں سے

تری نظر سے چمن سازِ سرمدی بن جائے
کلی کلی کی زباں سے پیام پیدا کر
کسی کے رخ سے حجابات خود بخود اٹھ جائیں
نگاہ پاک، دلِ پختہ کام پیدا کر

غم نہ کر للہ اتنا غم نہ کر میرے لئے | زندگی کیا ہے فقط ناکامیوں کا نام ہے

---

[۱] علامہ اقبال ؒ سے | روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر | (بالِ جبریل)

[۲] امیر خسرو سے | قیمت خود را دو عالم گفتہ :: نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے — زمانہ کا ہر غم اٹھاتا چلا جا
مرا ذوق محتاجِ بادہ نہیں ہے — نگاہوں سے مجھ کو پلاتا چلا جا
شعور و خرد کے اندھیرے میں گھر کے — دیئے بیخودی کے جلاتا چلا جا

چاندنی، مے، بہار، خلوتِ ناز — ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

شبنم کہ آنسو دونوں ہیں، اس فرق کو لیکن کیا کہئے
جو خاک پہ ہے وہ پانی ہے جو پھول پہ ہے وہ موتی ہے

تصورات کی دنیا ہے اک فریبِ نظر — وہ آگیا — وہ رکا — وہ چلا گیا کوئی
چراغِ عارضِ پُر نور کی ضیاؤں سے — سیاہ خانۂ دل جگمگا گیا کوئی

کبھی ادھر بھی چلے آؤ کیف برساتے — سبو کدے کی فضائیں سلام کہتی ہیں
خیالِ دوست، یہ چپکے سے ان سے کہہ دینا — تمھیں کسی کی وفائیں سلام کہتی ہیں
نظامِ کون و مکاں جن میں محوِ گردش ہے — وہ اشکبار نگاہیں سلام کہتی ہیں

"کچھ اور رک کے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی"[۵] — دبی دبی سی شرارت ہے کھیل سکتی ہوں
اداسیاں مری بن جائیں داستانِ نشاط — خود اپنے غم کی حکایت سے کھیل سکتی ہوں
نسیمِ صبح مری کم سنی کی خوشبو ہے — کلی کلی کی ہیں نکہت سے کھیل سکتی ہوں

---

۵ - یہ مصرعہ فراق گورکھپوری کا ہے

نجمہ

محترمہ نجمہ رحمت اللہ بی۔اے کا تعلق بھی پنجاب کی سرزمین سے ہے۔ آپ لاہور میں رہتی ہیں، اور نئی شاعرات میں سے ہیں مگر خوب لکھتی ہیں۔ ترجمانی جذبات، رومان اور مناظر فطرت کی مصوری آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ کی شاعری کا وہ حصہ جس میں کیفیات قلب کی ترجمانی ہے بہت کامیاب اور بلند پایہ ہے، اس میں سوز و گداز بھی ہے اور کیف و اثر بھی۔ آپ کی منظر نگاری بھی کامیاب ہے آپ کی رومانی نظموں میں اختر شیرانی کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک خوش گو، قابل قدر اور کامیاب شاعرہ ہیں۔

درد حیا و دال

بہت ستایا ہے اس چرخِ نیلگوں نے مجھے
جلا کے خاک کیا آتشِ دروں نے مجھے
مرا یہ بخت سدا ہی ستم شعار رہا
یہ دل ہمیشہ ہی سینے میں سوگوار رہا[1]
ہجومِ غم نے رلایا ہے مجھ کو جی بھر کے
ان آنسوؤں نے مٹایا ہے مجھ کو جی بھر کے

---

[1] مومن:- میرے یہ بخت ہائے بخت، ایسے نصیب یا نصیب
چارہ یاس امید جستہ، مرگ علاج مضطری

ہوا زمانے کی اک دن نہ مجھ کو راس آئی
کبھی خوشی بھی نہ بھولے سے میرے پاس آئی
کبھی تو غیر نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کبھی پھر اپنوں نے دل میرا توڑ پھوڑ دیا
اُمید و بیم میں آنسو بہائے ہیں میں نے
بڑے نصیب پہ گوہر لٹائے ہیں میں نے
قدم قدم پہ میری آرزو کا مدفن ہے
تمام دنیا کے خار اور میرا دامن ہے[1]

عہدِ رفتہ

بہارِ جانفزا جا کر چمن سے پھر بھی آتی ہے
گھٹا کالی برس کر اک دفعہ پھر بھی تو چھاتی ہے
ستارے دن کو بجھ جاتے ہیں پھر شب کو چمکتے ہیں
فلک پر رات بھر شوخی سے ہنس ہنس کر دمکتے ہیں
شفق کی جھیل میں خورشید شب کو ڈوب جاتا ہے
درِ قصرِ اُفق سے جھانک کر پھر مسکراتا ہے

---

[1] مومن :- یکدل و گونہ گونہ زخم، ایک تن و فوج فوج خصم
یک جگر و ہزار نیش، یک سر و صد گراں سری

اگر مرجھا گئے ہیں پھول اور غنچے تو کیا پروا
پرندے ہیں اگر مغموم گلشن کے تو کیا پروا
خزاں کے بعد یہ پھول اور غنچے پھر بھی مہکیں گے
بہار آتے ہی طائر ڈالیوں پر پھر بھی چہکیں گے
اگر تاریک رات آتی ہے آ۔ ہمدم تو آنے دے
اگر جنگل کی ندی خشک ہوتی ہے تو ہو جائے
کبھی تو چاندنی رات آکے یہ ظلمت مٹائے گی
یہ ندی پھر بہے اور شیریں گیت گائے گی
نشاں گذری ہوئی گھڑیوں کا لیکن پھر نہیں ملتا
کنول مرجھا کے دل کا اک دفعہ پھر سے نہیں کھلتا

اُفق کے پار [1]

اُفق کے پار اس دل کش فضا میں
جہاں رقصاں ہیں مہرومہ کی کرنیں
گھٹا غم کی نہیں جس سمت چھائی
حسیں اور پر سکوں ہے آبِ وادی
وہاں رنگینیاں قوسِ قزح کی
بناتی ہیں فضا کو ارغوانی
وہاں کے پھول مرجھاتے نہیں ہیں
کبھی صیاد واں آتے نہیں ہیں
وہاں غم کے ہیں آنسو اور نہ آہیں
نہ غمگیں ہیں کسی کی واں نگاہیں
وہاں ہے چاندنی پھول اور تارے
مقدس ہیں وہاں کے سب نظارے

---

[1] ملاحظہ ہو محترمہ صفیہ بیگم شمیم ملیح آبادی کی نظم آرزوئے دل

وہاں کرتی ہیں خوشیاں رقص ہر سُو
مرے ہمدم مجھے لے چل وہیں تو
وہاں کے باسیوں کے قہقہوں میں
وہاں کے طائروں کے چہچہوں میں
جفا و جور سب کچھ بھول جائیں
کبھی واپس نہ اس دنیا میں آئیں

شام

ڈوبتے آفتاب کی کرنیں
چند لمحوں میں ہو گئیں روپوش
ہلکا ہلکا سا نغمۂ بلبل کا
درد اور سوز سے ہے ہم آغوش
سر جھکا کر کھڑے ہیں کھیتوں میں
پیلے پیلے سے پھول سرسوں کے
گرتے ہیں کانپ کانپ کر پتے
بید مجنوں کی شاخ لرزاں سے
ملکۂ شب کی پُر فسوں خوشبو
صحنِ گلشن میں ہر طرف پھیلی
باغ کے اک اُداس کونے میں
کوک اُٹھی دل شکستہ کویل بھی
پھول چپ چاپ ہیں اکیلی مغموم
چھپ کے پتوں میں سو گیا بھونرا
گیت اک گا رہا ہے غم انگیز
دور کھیتوں میں ایک چرواہا

افسردہ بہار

موسم گل آ گیا کوہ و دمن شاداب ہیں
بیکراں خوشیوں کے ہر سُو اُٹھ رہے سیلاب ہیں
بلبلیں پھولوں پہ گانے کے لیے بیتاب ہیں
مسکرا کے غنچوں نے دکھلائی ہیں رعنائیاں

یاسمین نے گلستاں میں کی ہیں حسن افزائیاں
کس قدر کیف آفریں ہیں یہ بہار آرائیاں

ہے فضا پر چھا گیا ابرِ مسرت چار سُو
دھیرے دھیرے گا رہا ہے ایک نغمہ آبِ جو

پھر رہی ہے ہو کے آوارہ ہوا میں مُشکِ بُو
کر رہی ہیں رقص مل کر ہر روش پر تتلیاں
مست ہو کر جھومتی ہیں ہر شجر کی ڈالیاں

پھول اور کلیوں سے کرتی ہیں ہوائیں شوخیاں
کروٹیں سبزے نے لی ہیں لہلہانے کے لئے
آ گئے باغوں میں طائر چہچہانے کے لئے

میرے اس آئے ہوئے دل کو دکھانے کے لئے
بج رہا ہے سازِ عشرت اور فضا مدہوش ہے
بیخود و مخمور ہے ہر ایک شے مے نوش ہے

دل مرا لیکن ابھی تک غم سے ہم آغوش ہے
یادِ ایامِ گزشتہ لے کے آئی ہے بہار
روح پر افسردگی سحاب کے چھائی ہے بہار

"ساون"

وہ گھر گھر کے آئی ہیں کالی گھٹائیں　　ہیں مستی سے بھرپور ٹھنڈی ہوائیں

وہ بارش کے قطرے ہر اک برگِ گل پر — چمکتے ہیں یوں جیسے ہوں لعل و گوہر
یہ برسات کی رت ہے کتنی سہانی — ہر اک چیز پر چھا رہی ہے جوانی
حسیں پھول ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں — ستارے سے سبزے پہ بکھرے ہوئے ہیں
اُچھلتا ہے آغوشِ دریا میں پانی — مچلتی ہیں رہ رہ کے موجیں سہانی
کنارے پہ سبزے کا یہ لہلہانا — پرندوں کا اشجار پر چہچہانا
خوشی رقص کرتی گلستاں میں آئی — ہنسے پھول ننھی کلی مسکرائی
بہار آفریں ہے گلوں کی صباحت — ہر اک سمت آوارہ پھرتی ہے نکہت
یہ کوہسار یہ گلستاں دیکھتے ہیں — یہ ساون کا دلکش سماں دیکھتے ہیں

کوئی بھولی سی یاد آنے لگی ہے[1]
دلِ مضطرب کو ستانے لگی ہے

دورِ خزاں

باغ میں بکھرے ہوئے ہیں خشک پتے چار سُو
اُڑ گیا دورِ خزاں سے گلستاں کا رنگ و بو
آبجُو کے پاس نرگس آہ سر بر دوش ہے
ننھے بھونرے کا سُریلا راگ بھی خاموش ہے

---

[1] فراق گورکھپوری ؎ شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

ہیں شجر بے برگ اور سب آشیاں اُجڑے ہوئے
ہو چکے رخصت چمن سے طائروں کے چہچہے
قمریوں کا سرو پر بالکل نہیں نام و نشاں
اب نہ وہ بلبل کے نالے ہیں نہ کوئل کی فغاں
وہ سنہری سرخ اور نیلے گلوں کی کیاریاں
کھو کے اپنی دلکشی سب ہو گئیں وقفِ خزاں
یاسمیں کی ننھی کلیوں پر پڑی ہے خاک دھول
رو رہی ہیں فاختائیں اور فضائیں ہیں ملول
کرتی تھی ہر دم جہاں بادِ صبا اٹکھیلیاں
واں عنادل مل کے اب کرتے ہیں آہ و زاریاں
خشک جھاڑی ہیں جب آ کر سرسراتی ہے ہوا
نغمۂ محزوں سے گونج اٹھتی ہے گلشن کی فضا
کلیاں کملائی ہوئی ہیں پھول مرجھائے ہوئے
ہر طرف افسردگی کے سائے ہیں چھائے ہوئے
باغ میں ہر چیز آتی ہے نظر ماتم کناں
اُف خدایا کس قدر اندوہگیں ہے یہ سماں

آمدِ بہار

گلشن میں کس ادا سے ہے آئی ہوئی بہار

پھولوں پہ حُسن بن کے ہے چھائی ہوئی بہار
مصروفِ رقص ندّی کے پانی پہ ہے حباب
کرتی ہیں شوخی ناز سے امواجِ سطحِ آب
صہبا اثر ہے باغ میں خوشبوئے یاسمیں
سبزے کا حسن سبز ہے کیا سحر آفریں
گلشن کے پھول پتّوں پہ ہے آگیا نکھار
وہ تتلیوں کا ناچنا گلشن میں بار بار
باغ اور بن میں گھر کے وہ آنا سحاب کا
ٹھنڈی ہوا میں جھومنا لے کر گلاب کا
جوشِ طرب سے جھومتی ہیں سبز ڈالیاں
جُھک کر گُلوں کو چومتی ہیں سبز ڈالیاں[1]
ہلکے سُروں میں گیت سُناتے ہیں آبشار
مسرور ہیں بہار در آغوشِ سبزہ زار
ہیں نغمہ زن طیورِ حسیں ہر درخت پر
خود حُسن حکمراں ہے ہر کوہ و دشت پر
پھولوں کی شال اوڑھ کے نازاں ہے کائنات

---

[1] میر حسن:- گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر نشہ کا سا عالم گلستاں پر (مثنوی بدرِ منیر)

سازِ طرب پہ آج غزل خواں ہے کائنات
کیف آفریں فضائیں ہیں اور جاں فزا سماں
ہے گلستاں پہ گلشنِ فردوس کا گماں

نجمی

طاہرہ نجمی نام اور نجمی تخلّص ہے، دورِ حاضر کی ایک خوش فکر اور اچھی شاعرہ ہیں۔ کلام وجدانی اعتبار سے بلند ہے، آپ کے یہاں جذبات بھی ہیں اور حسن ادا بھی، کلام پُرکیف اور رنگین ہے، طرزِ ادا پاکیزہ اور دلکش ہے۔

کیا کہوں پھر کس کو تابِ جلوۂ جانانہ تھی
خود نگاہِ شوق ہی جب دید سے بیگانہ تھی
دل میں اک دنیا کے پنہاں اُلفتِ جانانہ تھی
اُس کی محفل میں نگاہِ شوق بھی بیگانہ تھی
دیکھنا اعجاز اُس کے التفاتِ ناز کا
آرزو خود آج وقفِ سجدۂ شکرانہ تھی
قصّۂ دل بیخودی میں کچھ کہا کچھ رہ گیا
حسرتِ عرضِ محبت کتنی بے تابانہ تھی
رنگِ مستی میں تھی محفل سر بسر ڈوبی ہوئی
گردشِ چشمِ فسوں گر گردشِ پیمانہ تھی

حال تجھی سے تجاہل کے برتنے کا سبب
میں نے مانا آپ کو اغیار کی پروا نہ تھی

نسرین

شہر بانو نام اور نسرین تخلص ہے۔ سید ولایت حسین صاحب نقوی کی دختر ہیں۔ ۱۳۳۶ھ میں آپ کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی۔ سید ولایت حسین سرکار نظام کے سررشتہ جات مال اور پولیس میں کارگزار رہ چکے ہیں، ان کے والد مولوی سید محمد حسین شہید فارسی اور اردو کے ادیب گزرے ہیں۔

محترمہ شہر بانو کے نانا باقر نواز جنگ حکیم میر باقی علی مرحوم ایک قابل اور لائق فرد تھے۔ اس طرح محترمہ نسرین کی پرورش علمی ماحول میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم محبوبیہ گرلز اسکول میں ہوئی۔ ابتدا سے جونیر کیمبرج تک آپ نے یہاں تعلیم پائی اور ہمیشہ امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتی رہیں۔ ۱۹۳۵ء میں امتحان سینئر کیمبرج میں کامیاب ہوئیں اور اسی سال مدراس یونیورسٹی کے امتحان ایس۔ ایل۔ سی میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور انعام اور وظیفہ حاصل کیا۔

اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے آپ انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے امتحانات میں شریک ہوئیں، آپ کو اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے اور آپ کے اکثر مضامین اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کو جسمانی ورزش اور کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے اور محبوبیہ گرلز اسکول

میں گیمس کیپٹن رہ چکی ہیں۔

آپ کا کلام سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ زبان بھی صاف استعمال کرتی ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

کلی چٹکی، چمن پھولا، نسیمِ مشک بار آئی
دکن میں جوبلی کیا آئی اک فصلِ بہار آئی

اُڑا کرتی تھی جس جا خاک اُگی ہے زعفراں اُس جا
نسیمِ صبح نے عنبر کی بارش ایسی برسائی

پرندے خوش نوا شاخوں پہ بیٹھے گیت گاتے ہیں
چٹکتے ہیں جو غنچے آتی ہے آوازِ عید آئی

پھلا پھولا ہے گلزارِ شاہی باغِ عالم میں
یہ سوئے حیدرآباد دکن بانگِ ہزار آئی

حکومت ہے شہا تیری قلوبِ اہلِ عالم پر
عجب شاہی ترے حصے میں شاہِ نامدار آئی

غنچۂ خاطرِ مغموم کھلے جاتے ہیں
آمدِ موسمِ گُل کی ہے زمانہ میں پکار

اپنے گلشن میں ہمیشہ ہی رہا دورِ خزاں
راستہ بھول کے اپنے کدھر آئی ہے بہار

خوفِ گل چیں کا کبھی ہے کبھی صیاد کا ڈر
دلِ بلبل کو اگر آئے بھی تو کیا آئے قرار

———

نسرین

عابدہ خانم نام ہے اور متھرا وطن۔ پہلے آپ پروین تخلص کرتی تھیں مگر جب اور خواتین نے یہ تخلص اختیار کر لیا تو آپ نے اس کو ترک کر کے نسرین تخلص اختیار کیا۔ آپ دورِ حاضر کی ایک نہایت خوش گو اور بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام پر جذباتی اور رومانی رنگ چھایا ہوا ہے اور اس رنگ میں آپ بہت خوب لکھتی ہیں، کلام اکثر رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے، رباعیاں، نظمیں، غزلیں، سب کچھ لکھتی ہیں۔ واردات و احساس قلب کی ترجمانی، لطیف و شاعرانہ تشبیہیں، کیف و اثر اور طرزِ ادا کی لطافت و دلکشی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں، سوز و گداز کے ساتھ ساتھ طبیعت میں مزاح کا جوہر بھی موجود ہے، آپ کے اشعار بہت صاف، پُر کیف اور پُر تاثیر ہوتے ہیں

خبر میری نہ لی برباد کر کے فتنہ گر تو نے
میں تکتی رہ گئی اور پھیر لی اپنی نظر تو نے

سزا ملتی ہے لیکن، بیوفا اتنی نہیں ملتی
ذرا سے جرمِ اُلفت پر ستایا عمر بھر تو نے

فریبِ کامیابی اے دلِ مضطر مبارک ہو
اک اُمیدِ اثر پر آہ کھینچی رات بھر تو نے

لطائفِ رہگذارِ ہجر کے کچھ تو سنا پروین

علیگڑھ سے کیا ہے خوب منظر کا سفر تو نے

"ساغر عالم رنگ و بو"[1]

پہلا رُخ

یہ وقار، یہ متانت، یہ مزاکم صباحت
یہ جبیں صبح طلعت، یہ تلاطم لیاقت
یہ حسین وضع تمکیں یہ نظر کی دل فریبی
یہ تناسب موثر یہ فسون جامہ زیبی
لب رنگ آفریں میں یہ چھپا ہوا تبسم
یہ دہان غنچہ پیرا، یہ نزاکت تکلم
ہے فسانہ ہر ادا میں ہر نگہ میں نئی کہانی
یہ شباب سی امنگیں یہ شراب سی جوانی

دوسرا رُخ

یہ لگاوٹیں، یہ شوخی، یہ ادائے بیحجابی
کسی کنج گل میں جیسے ہو پڑا کوئی شرابی
یہ عذار ہوس کا کل یہ نمائش پریشاں
کہ شراب جیسے اُڑ کر بنے آتش گلستاں
یہ کھلا ہوا گریباں یہ نمود جوش و مستی
یہ خمار ریز آنکھیں یہ شباب مے پرستی
تری مستیاں وہ سمجھے جو خراب رنگ و بو ہو
ارے او جوان ساغر یہ جہاں اور تو ہو

"دعائے شام"

کیوں ہیں پڑے ہوئے اُداس کیف مری نگاہ میں

---

[1] موصوفہ نے یہ نظم جناب ساغر صاحب نظامی کی ایک تصویر دیکھ کر کہی تھی جو "ساغر عالم رنگ و بو" کے عنوان سے غالباً نومبر ۱۹۲۶ء میں پیمانہ میں شائع ہوئی تھی

پردے گرے ہوئے ہیں کیا حُسن کی بارگاہ میں
دل ہی نہیں کہ تجھ کو دوں نذرِ محبتِ ازل
آنکھیں نہیں کہ آ رہوں میں بھی تری نگاہ میں
ہائے وہ رحم گُن نظر جس کی کرم نمائیاں
بن گئیں سازِ زندگی عشق کی سوزگاہ میں
پھر تری برہمی کی یاد رنگ اُڑا کے لے چلی
دیکھ رہی ہوں میں تجھے پھر اُفقِ سیاہ میں
دعوتِ صبرِ دل تجھے دے نہ سکے معاف کر
بند پڑے تھے راستے ہر نفسِ تباہ میں
ہاں ترا عشوۂ خضاب نہیں مائلِ کرم
ہاں نہیں اب مری نگاہ تیری حسیں نگاہ میں
غیر سکونِ دل نہ بن، خیر نہ التفات کر
آنے دے ذکر تو مرا پرسشِ گاہ گاہ میں
کچھ نہیں چاہتی مگر اک نگۂ غلط اثر
ہمتِ اعتراف ہو جس سے لبِ گناہ میں
گوشِ حقیقت آشنا نوحہ خستہ کا م سُن
مہر سحر نمائے دل عرضِ نیاز شام سُن

رباعیات

در ودِ سرما

(۱)

برسات گئی تو فصلِ سرما آئی　　بادامن تر نسیمِ دریا آئی
اللہ ری سردھری وادیٔ نجد　　بردیمنی میں چھپ کے لیلیٰ آئی

(۲)

باغوں میں وہ لطفِ سیر کا بھی نہ رہا　　پھر خاف کا ذوق جانفزا بھی نہ رہا
سردی نے نشاطِ صبح پانی کر دی　　جمنا پہ نہانے کا مزا بھی نہ رہا

(۳)

گرما میں وہ سرگرمیٔ احباب کہاں　　وہ جلوۂ بحر و موج و سیماب کہاں
آسودگیٔ لحافِ رنگیں معلوم　　نظارۂ تاج و شبِ مہتاب کہاں

(۴)

دل سرد ہے جا بادۂ عنّابی لا　　سونے کے لئے حسین مہتابی لا
دس بجنے کو آئے نیند کا نام نہیں　　اے اوّل شب لباسِ شب خوابی لا

نسیم

نسیم فاطمہ نام اور نسیم تخلّص ہے، آگرہ وطن ہے آپ اردو کی اچھی شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر رسالہ عصمت میں شائع ہوتا رہتا ہے زبان شستہ استعمال کرتی ہیں۔ آپ کے اشعار سنجیدہ جذبات کے حامل ہوتے ہیں:-

"دو آنسو"

علامہ راشد الخیری رح کی یاد میں

اے جہاں دارِ معانی علم کے سرمایہ دار
تو نہیں باقی، ہے لیکن آج تک تیرا وقار

یاد آیا ہے کہ رونق تھی ترے دم سے عیاں
یاد آیا ہے کہ تو گلشن میں تھا جانِ بہار

تو نے دنیا میں بڑھائی عزتِ نسوانیت
ہو رہے ہیں آج ہم بھی نوعِ انساں میں شمار

تیرے دل کا خون صبحِ زندگی میں صرف ہے
اور شامِ زندگی کرتی ہے تیری بیقرار

ہر گلِ باغِ معانی ہے خزاں سے بے نیاز
تو نے اپنے خون سے سینچا ہے صحنِ لالہ زار

تیری ہر تصنیف ہے غم کا مرقع بے مثال
درد کی تصویر ہے ہر نقش تیرا نقش کار

طبقۂ نسواں میں پھونکی تو نے آزادی کی روح
تو ہی اک عورت کے دکھ کا تھا جہاں میں رازدار

دارِ فانی سے گئے تجھ کو ہوئی مدت مگر
یاد کرتی ہے تجھے اب بھی نسیمِ سوگوار

نشتر

قیصر جہاں بیگم نام اور نشتر تخلص ہے، لکھنؤ کی شاعرہ ہیں کلام میں روایتی رنگ غالب ہے مگر انداز پختہ ہے۔ اشعار صاف اور عمدہ ہیں۔

چمن میں آج آمد ہے جو اس سروِ خراماں کی
بہارِ رفتہ پھر آئی ہوا بدلی گلستاں کی

دھواں اٹھتا ہے جس دم آہ کرتا ہوں شبِ فرقت
نہ پوچھ اے ہمنفس حالت ہمارے قلبِ سوزاں کی

یہ ادنیٰ سی عنایت تھی جنونِ فتنہ ساماں کی
کہ چھانی خاک ہم نے عمر بھر کوہ و بیاباں کی
کسی کے گیسوئے پُرخم جو نشتر یاد آتے ہیں
مری آنکھوں میں پھرتی ہے سیاہی شامِ ہجراں کی

نقاب

دورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ نام معلوم نہیں تخلّص نقاب ہے۔ اشعار صاف اور پُر اثر ہیں۔

وہ ہجراں کے صدمے اُٹھائے ہوئے ہیں
کہ ہاتھوں سے دل کو دبائے ہوئے ہیں
اگر سر کروں جائیں چوتھے فلک پر
یہ نالے مرے آزمائے ہوئے ہیں
وہ منھ کیا دکھائیں گے محشر میں مجھ کو
جو آنکھیں ابھی سے چرائے ہوئے ہیں
نہ تھے گھر میں غیروں کے بیٹھے یہ مانا
مگر کچھ تو ہے جو لجائے ہوئے ہیں[۱]

---

[۱] نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

نکہت

رفعت جہاں نام اور نکہت تخلص ہے آپ گلشن آباد کی رہنے والی ہیں، غزل گو شاعرات ہیں آپ ایک خاص درجہ رکھتی ہیں رنگ سنجیدہ اور کلام پاکیزہ ہے۔ آپ کو زبان و محاورات پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے آپ کے اکثر اشعار نہایت بلند و موثر ہیں۔

خفا ہو کس لئے میں نے کہا کیا — بتاؤ تو ہوئی مجھ سے خطا کیا
حسینوں کا جفا کاری ہے پیشہ — بھر ان کی بے وفائی کا گلا کیا
شکستہ ساز کو کیوں چھیڑتے ہو — مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا
جو سر پاؤں تک کافر ہیں کافر — انہیں نام خدا سے واسطا کیا
نہیں جب اہل ساحل کی ضرورت — تو پھر فکر خدا و ناخدا کیا

جفا بھی اب تو عنقا ہو گئی ہے
وفا کا ذکر اے نکہت بھلا کیا

نکہت

شکیلہ بیگم نام اور نکہت تخلص ہے۔ کھنڈوہ کی رہنے والی ہیں۔ کلام میں جذباتی رنگ غالب ہے۔ خیالات لطیف، نرم اور شاعرانہ ہیں۔ اگر طرز ادا میں تھوڑی سی پختگی اور پیدا ہو گئی تو آپ اردو کی اچھی شاعرہ ہوں گی۔ کلام میں رومانی رنگ نمایاں ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

گلوں کو اوس سے نہلا کے جا چکی ہے بہار
مجھے تو خون کے آنسو رلا چکی ہے بہار
مری تو دنیا مٹاکر ہی جاچکی ہے بہار
فقط مجھے یہ ہی نغمہ سکھا چکی ہے بہار
بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

ان عندلیبوں کے نغموں کی لوریوں کی قسم
نسیمِ صبح کی ان میٹھی تھپکیوں کی قسم
وہ تیری یاد کی دل دوز ہچکیوں کی قسم
تجھے گلستاں کی رنگین تتلیوں کی قسم
بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

اگرچہ مایۂ تسکین خریدنا ہے تجھے
اگرچہ بادۂ رنگیں خریدنا ہے تجھے
جو اس کا جلوۂ رنگیں خریدنا ہے تجھے
اگرچہ ہمتِ گلچیں خریدنا ہے تجھے
بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

غمِ حیات میں گر پھر بہار لانا ہے
شرارِ حسن کی مینا سے گرچہ پلینا ہے
اگرچہ اودی گھٹاؤں کو پھر بلانا ہے

جو انتقامِ جفائے بہار لینا ہے
بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

نوبیلا

مسز بمنی نوبیلا سنگھا اردو کی ایک خوشگو اور خوش فکر شاعرہ ہیں - آپ کا کلام بہت صاف اور جذباتی اعتبار سے بہت بلند اور پُر کیف ہوتا ہے - آپ کا رنگ پختہ اور طرزِ ادا پاکیزہ شستہ اور دلکش ہے - خصوصاً چھوٹی بحروں میں بہت خوب لکھتی ہیں - نمونہ کلام یہ ہے :-

کیا سنائے کوئی فسانۂ دل
جس کا انجام ہے نہ ہے آغاز
آج کچھ ان لبوں نے فرمایا
ہے یہی میری خامشی کا راز
ہم بھی ہیں زرخورِ نگاہِ کرم
ہم بھی ہیں آپ کے رہینِ نیاز

نور

نور جہاں بیگم نام اور نور تخلص ہے - بدایوں مولد ہے، آپ کے خود نوشتہ حالات درج ذیل ہیں :-

" عارف پور نوادہ نامی بستی میں جو بدایوں سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے ۱۹۰۵ء میں میری پیدائش ہوئی میرے والد چودھری اساس الدین وہاں کے رئیسوں میں سے تھے - ابھی میں چار ہی سال

کی تھی کہ میرے والد ماجد رحلت فرما گئے۔ والد نے اپنی زندگی کی یادگار دو بہنیں اور ایک بھائی چھوڑا۔ ہمشیرہ کی عمر چھ سال کی اور بھائی چار ماہ کا تھا، اور یہی ہماری زندگی کا سہارا تھا۔ ابھی والد کے انتقال کو صرف تین ہی سال گزرے تھے کہ بھائی بھی ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا۔ اب صرف آغوشِ مادر ہی باقی رہی، باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد آبائی جائداد ہم دونوں بہنوں کو ملی۔ اور ان مشکلات کا سامنا ہم کو بھی کرنا پڑا جو عموماً دنیا کی یتیم اور بیواؤں کو کرنا پڑتا ہے۔

چچا اس خیال سے کہ ہماری جائداد باہر نہ چلی جائے۔ ہم لوگوں کی شادی اپنے خاندان میں جاہل لڑکوں سے کرنا چاہتے تھے۔ امّی اس امر کے خلاف تھیں۔ چنانچہ انھوں نے میری شادی اپنے بھانجہ سے کردی۔ حالانکہ یہ بھی صرف انٹرنس پاس تھے اور کسی دفتر میں نوکر تھے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم پائۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے تھے۔ شادی کے بعد میں نے چند وجوہات کی بنا پر اپنی جائداد کے سہارے اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دی اور مسلم یونیورسٹی میں داخل کرا کے چھوڑا۔ لیکن خوش قسمتی کہ میرے شوہر کو یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور وہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے جو اس وقت پر پرو وائس چانسلری کے عہدہ پر ممتاز تھے اسٹینو گرافر ہو گئے۔ اب ملازمت بھی تھی اور تعلیم بھی پرائیویٹ

امتحان بھی دے سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کے بعد میں نے ان کو اپنی زندگی کا کل سرمایہ دیکر انگلستان بھیجا۔ اقربا نے بھی مالی مدد دی۔ وہاں سے وہ بی۔ اے (آنرز) اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اسلامی تاریخ میں لے کر چھ سال بعد واپس ہوئے

انگلستان سے واپسی پر کنواری لڑکی کا نام ان کی شادی کا عنوان بن گیا۔ میں نے بہت چاہا کہ اس روز بد سے سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر تقدیر کے آگے ایک نہ چلی۔ اور آخر اپریل ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اپنا نکاح شاکر حسین بیرسٹر میرٹھ کی دختر حلیمہ بیگم سے کرلیا۔ بہ غریب سات ماہ بعد نذرِ اجل ہوئی۔ میں نے بجد بجد کوشش کی کہ اب دوسری شادی نہ کریں چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں ان کے ساتھ بدایوں گئی۔ خیال تھا کہ ساس اور دوسرے اقربا ان کو ہمراکر دیں گے مگر میری کوئی کوشش و منت سماجت کارگر نہ ہوئی۔ اور میرے شوہر ڈاکٹر امیر حسن صدیقی بعہدۂ پرنسپل مدرسہ کالج کراچی چلے گئے اور تیسری شادی کی فکر میں ہیں۔ میں اب اپنی زندگی کے دن اپنی بہن کے ساتھ گذار رہی ہوں۔

میری تعلیم کسی کالج و مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت خانہ داری اور مذہبی تعلیم پر مشتمل تھی میری معلمہ صرف میری والدہ تھیں　　　نورجہاں "ثروت"

محترمہ دَورِ حاضر کی ایک نہایت قادر الکلام اور پختہ گو شاعرہ ہیں لفظ لفظ سے کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے، آپ کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے زبردست و سخت گیر نقّاد کے الفاظ یہ ہیں:-

"بہت اچھی شاعرہ ہیں .... نظم کہتی ہیں اور خوب کہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی طرح مضبوط کہنے والی خاتونیں دورِ حاضر میں کم ہیں" [۱]

محترمہ نے نظم، غزل، نعت، منقبت اور مرثیہ سب پر قلم اٹھایا ہے۔ خصوصاً نظم میں آپ اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ محترمہ کے سوانح حیات نہایت دلدوز ہیں جیسا کہ اُن کے خود نوشتہ حالات سے ظاہر ہے، اس لئے آپ کا سوز و گداز رسمی و روایتی نہیں حقیقی ہے آپ کی نظمیں آپ کی الم شناس فطرت کی ترجمان ہیں، ان میں زندگی کے سچّے واقعات اور ذاتی و شخصی طور پر محسوس کئے ہوئے شدید جذبات نہایت سادگی و صداقت کے ساتھ نظم کر دیئے گئے۔ اس لئے ان کا کیف و اثر پائیندہ و دیرپا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نزاکتِ خیال اور شعریت کا دامن کہیں ہاتھ سے چھٹنے نہیں پایا جس کی وجہ سے آپ کا کلام نہایت دلکش اور پُر اثر ہو گیا ہے

---

[۱] یہ جملے ڈاکٹر شادانی کے اُس مکتوب سے ماخوذ ہیں جو محترم نے ۲ جنوری ۱۹۶۲ء کو راقم الحروف کو لکھا تھا۔ "ج"

حسن و صداقت، محترمہ کے آرٹ کے ترکیبی اجزا ہیں ۔۔۔۔ اور ہر سچا قائم رہنے والا آرٹ ان ہی دو اجزاء سے ترکیب پاتا ہے"!
محترمہ کو اسلامیات سے گہرا لگاؤ ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے بعض نہایت بلند اور قابل قدر نظموں کی تخلیق کی ہے۔ جن کے صوری و معنوی محاسن قابلِ تحسین ہیں۔ اس رنگ میں محترمہ علامہ اقبال سے بیحد متاثر نظر آتی ہیں اور یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ محترمہ نے علامہ مرحوم کے رنگ کو اچھی طرح سمجھکر صحیح قسم کی تقلید کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بہت کامیاب ہے، علامہ مرحوم کا اثر محترمہ پر لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ قومی و مذہبی نظموں میں، آپ کی زبان و خیالات پر علامہ اقبالؒ کا رنگ چھایا ہوا ہے، علامہ اقبالؒ کی ایسی کامیاب تقلید کے نمونے ابھی شاعرات کی دنیا میں کم ہیں۔

"شبِ عاشورہ" نامکمل اور تشنہ ہونے کے باوجود محترمہ کی ایک زبردست کامیاب نظم ہے، ہمارے مرثیہ نگاروں کے پیش نظر مرثیہ کا مقصد "رونا رُلانا" رہا ہے اس لئے ان کی بیشتر مساعی ایسے بے بنیاد واقعات کی تخلیق و اظہار میں صرف ہو گئی ہیں جن سے صرف یہ مقصد حاصل ہوسکے اور اکثر اس سعی لاحاصل میں اسلام کے کچھ زبردست اور بزرگ ترین افراد کے کیریکٹروں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا گیا ہے، غالباً یہ بات ان کی نظر سے محو ہو گئی کہ ہائے وہو کے اس تمام شور و غل میں اُن

افراد کی صحیح اور سچی عظمتیں دب کر رہ گئیں۔ اور دنیا ان کو ان بلندیوں پر نہیں دیکھ سکی جہاں وہ واقعتاً سرگرم خرام تھے، اس سلسلہ میں محترمہ کی نظم "شب عاشورہ" نہایت اہم ہے۔ یہ ایک نمونہ ہے جس سے ہمارے مرثیہ گویوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اصل میں یہ رنگ تھا جس کو مرثیوں کی روح رواں ہونا چاہیئے تھا، مگر غلط مقصد کے تعیّن نے ہمارے بیشتر مرثیہ نگاروں کی نظروں سے اس حقیقی اور سچّے مقصد کو محو کر دیا۔

محترمہ نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن دراصل یہ ان کا رنگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں میں وہ اتنی کامیاب نظر نہیں آتیں جتنی کہ نظموں میں ہیں۔

سطورِ ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے وہ سب باستثنائے "شبِ عاشورہ" محترمہ کا اپنا انتخاب ہے۔ البتہ ترتیب میری ہے نظم "شب عاشورہ" بھی میں نے شامل کر دی ہے۔

(الف) واقعہ نگاری اور جذبات کی دلآویز ترجمانی

پیش کش

(تقریب عقد ثانی ڈاکٹر امیر حسن)

مل گیا میری وفاؤں کا صلہ اے ہمدم
عہدِ اُلفت کا جو تھا خوب نبھایا تو نے

میری اُمیدوں کے خرمن پہ گرائی بجلی
دل کو وقفِ غم و آلام بنایا تو نے

وقت کے ہاتھ سے بھی جو نہیں مٹنے کا کبھی
میرے سینے پہ وہ اک زخم لگایا تو نے

ہو گئی میری تمناؤں کی دنیا تاریک
اب ہنسوں گی نہ کبھی ایسا رلایا تو نے

جن لبوں سے میں سنا کرتی تھی جینے کی نوید
اُن سے اب موت کا پیغام سنایا تو نے

بہہ گئی جس میں مرے امن و سکوں کی بستی
رنج کا دل میں وہ طوفان اٹھایا تو نے

داغِ غم سے مرے سینے میں چراغاں کر کے
شمع ساں محفلِ ہستی میں جلایا تو نے

شاد تھی میں مجھے ناشاد کیا ہے تو نے
مختصر یہ ہے کہ برباد کیا ہے تو نے

ہاں مگر پھر بھی مرے دل سے نکلتی ہے دعا
زندگی کو مری ناشاد بنانے والے

تیری دنیا میں مسرت کی فراوانی ہو
اے مجھے آتشِ فرقت میں جلانے والے

گلشنِ دہر میں تو شاد ہو آباد رہے
بجلیاں خرمنِ ہستی پہ گرانے والے

دل کے آئینے پہ آئے نہ کبھی گردِ ملال
اے مری زیست کو تاریک بنانے والے

تیری محفل میں مسرت کے ترانے گونجیں
اے مجھے نغمۂ آلام سنانے والے

تیری ہستی پہ رہے امن و سکوں کا پرتو
دل میں طوفانِ غم و رنج اٹھانے والے

شمع سے تیری رہے تیرا شبستاں روشن
نور کی شمعِ ارماں کو بجھانے والے

ہے دعا غنچۂ خاطر ترا مرجھانے نہ پائے
تیرے گلشن میں کبھی دورِ خزاں آنے نہ پائے

ماں کی تربت پر

بہرِ تسلیم تری نورِ نظر آئی ہے
نذر کو چشمِ عقیدت کے گہر لائی ہے

قبر سے اٹھ اسے سینے سے لگا لے امی
نورِ فریاد کو تربت پہ تری آئی ہے

چھائی ہیں سحر پہ ظلم کی گھٹائیں ایسی
طاقتِ شکوہ ہے نہ تابِ شکیبائی ہے

جس کے آغاز نے بےچین کیا تھا تجھ کو
اس کے انجام کی وہ لیکے خبر آئی ہے

پھر گئیں مجھ سے زمانہ کی ہوائیں اے قوم
میری رسوائی ہے اور خلق تماشائی ہے

نقشِ سجدہ ترے در کا تھا جبیں پر جن کی
مشغلہ ان کا مذاقِ ستم آرائی ہے

تیری ہی شمع نے اب پھونک دی محفل تیری
انتخاب آج ترا تیری ہی رسوائی ہے

مٹ گئی آخری رونق بھی تری محفل کی
حسنِ اغیار ہے اور انجمن آرائی ہے

جو پسینے پہ ترے خون گراتی تھی کبھی
دشمنِ جاں مری اب وہ تری ہرجائی ہے

کیا رکھے خلق سے امید وفا کی کوئی
نہیں دنیا میں برے وقت کا ساتھی کوئی

بند ہے بیس برس سے تری ہستی کی کتاب
ملتا ہے نور کو اب تک مگر اس کا ہر باب

نالۂ نیم شبی، گریۂ پیہم تیرا
بسترِ غم پہ تڑپنا ترا مثلِ سیماب

ناز تھا جن کی وفاؤں پہ تجھے دنیا میں
آج رکھتے نہیں وہ اپنی جفاؤں کا جواب

وقف تھے ہاتھ ترے جن کی دعاؤں کے لئے
ان کے ہاتھوں سے پھٹی تیرے فسانہ کی کتاب

محو تھا قلب ترا جن کی ہوا خواہی میں
ڈھا گیا گھر کو ترے ان کے ستم کا سیلاب

نعشِ بسمل کی تو مقتل میں تڑپتی چھوڑی
نذریں لے لیکے بڑھے جانبِ قاتل احباب

جو تری انجمنِ نور کا شیدائی تھا
ہے وہ اصنامِ سمن بر کا پرستارِ شباب

تیرے گہوارۂ الفت میں پلا تھا جو کبھی
کر گیا لختِ جگر کا وہ تری خانہ خراب

ہتر نی غمزوں نے بنیاد ہلا دی تیری
رنگِ تخریب بنا کافر مستانہ شباب

غرقِ خوناب رہا تین برس دل میرا
گھر سے بےگھر کیا اور پھر دیا پاگل کا خطاب

آج ہمسایہ بنانے سے اُسے ہیں بیزار — جس کی خاطر وہ لیے پھرتے ہیں پا بہ رکاب
کر دیا زیست کو ہم رنگ سقر اس کے لئے — جس نے دنیا میں دکھائے انھیں فردوس کے خواب
کھوٹے داموں کے عوض بیچ دے عظمت تیری — تو زرے ہوگا نہ اے مادرِ تقدیس مآب
دیکھ مٹی میں ملا دوں گا میں عزت تیری — طالبِ قرضہ جو ہوتی ہو یہ دیتے ہیں جواب
چارپائی بھی نہ چھوڑی مرے سونے کے لئے — لے گئے چھین کے سب مجھ سے وہ گھر کا اسباب
دل کی گہرائیوں میں ذوقِ طلب ہے باقی — ڈھونڈھتی ہے انھیں ابھی بھی نگاہِ بیتاب

کنجِ عزلت میں مری بے سر و سامانی دیکھ
اپنی اس انجمنِ شوق کی ویرانی دیکھ

روداد ستم

(نورا ممّی کے مزار پر ۱۹۴۳ء میں)

کیا انقلاب ہے فلکِ کج مدار کا — ممّی بجھا چراغ بھی تیرے مزار کا
تنویر زیست موت کی ظلمت میں کھو گئی — روشن سحر مری شبِ دیجور ہو گئی
کشتی بھنور میں چھوڑ کے وہ ناخدا گیا — موجوں کی رو میں اپنا سفینہ بہا گیا
ناآشنا مذاقِ نظر سے نظر ہوئی — جو پیار کی نگہ تھی، وہی فتنہ گر ہوئی
میرا نہ تھا کوئی، ترا ہر کوئی زندہ تھا — بھائی بھتیجے بھلنجے بہنوئی زندہ تھا
آیا نہ کام وقت پہ ممّی کوئی مرے — افسوس مجھ سے پھر گئے سب اقربا ترے
ایسا تھا دشمنی پہ مصر آسماں مری — سننا نہ تھا جہاں میں کوئی داستاں مری
کرتی تھی ان کا عیش منغص فغاں مری — کٹتی تھی ہر نالے پہ گویا زباں مری
جو تیرے گل تھے خارِ مغیلاں ہوئے مجھے — تھے جو سپر وہ خنجرِ براں ہوئے مجھے

دل رفتہ رفتہ رنج کا خوگر بنا لیا
سایہ میں یاس کی کسی کے غرض گھر بنا لیا

اک روز دی خبر یہ سحر کے نقیب نے
نجمِ صبح نے عابدِ شب کے خطیب نے

لوٹا اجل نے آ کے دیارِ حبیب کو
سر سے گرا دیا تاجِ حیاتِ رقیب کو

آئی قضا کسی کی ہوا نام سحر کا
دامن پہ میرے لگ گیا الزام سحر کا

تھا کون سا وہ ظلم جو میں نے سہا نہیں
اس پر بھی اپنے منھ سے کچھ ان کو کہا نہیں

مدت ہوئی تھی کہنے کو یوں ایک سال کی
صدیاں یہاں گذر گئیں کرب و ملال کی

نامہرباں کو مہر پہ مائل جو پایا پھر
اک دن کسی بہانہ سے ان کو بلایا پھر

آ تو گئے وہ پھر وہی تیور چڑھے ہوئے
نظریں تھیں یا کہ سان پہ خنجر چڑھے ہوئے

عنوانِ شوق بدلے نہ دل کی کتاب کے
شائق تھے اب وہ بارِ دگر انتخاب کے

سمجھی تھی میں ہیں روٹھے منا لوں گی ان کو پھر
دو چار دن میں اپنا بنا لوں گی ان کو پھر

جوہر وہ خاکساری کے ان کو دکھاؤں گی
ان کے حضور اپنی خودی کو مٹاؤں گی

لیکن یہ انکسار اسی کو پسند ہے
جس کی نظر وسیع ہے فطرت بلند ہے

کی میں نے ہر طرح سے ادا رسم بندگی
بھائی انھیں مگر نہ ذرا رسم بندگی

الجھے ہوئے خیالوں کو سلجھا سکی نہ میں
باز ان کو اس خیال سے بھی لا سکی نہ میں

آئے نہ ہوش میں وہ نہ سودائے سر گیا
ہفتہ سے بھی سوا انھیں رہتے گزر گیا

جھولی درِ سخی سے نہ یہ بھیک کی بھری
کی میں نے ان کے روبرو دس دن گداگری

اٹھے وہ نالے اب کہ دلِ بیقرار سے

تنگ آگئی ہیں زندگیٔ مستعار سے

دل نے کہا یہ جاتے ہیں گھر میں کیوں چلوں
احوال جا کے اہلِ وطن سے بیاں کروں
جس نے دیا تھا ہاتھ مرا ان کے ہاتھ میں
جاؤنگی ان کے پاس انھیں لیکے ساتھ میں
پر ان کو رحم تھا نہ دلِ زار پر مرے
پہلو تہی دکھاتے تھے اصرار پر مرے

آخر کو منتوں سے بچہر آمادہ کر لیا
جبراً انھوں نے ساتھ میں یہ بارِ سر لیا

اُٹھی وطن میں کیا مری تقدیر کرنے کو
اک عمر چاہیئے اسے تحریر کرنے کو
بڑ بال مری دوا کی وہ لے جانا ساس کا
یہ کہہ کے اپنے بیٹے کو زکھلانا ساس کا
ڈائن یہ میرے گھر کی صفائی کو آئی ہے
بیوی تمھاری زہر تمھیں دینے لائی ہے
رکھنے یہ میرے راضی تھے وہ پیشتر ہی کب
بھڑکا دی ماں کی باتوں نے اور آتشِ غضب
سنتے ہی جوشِ غیظ کا فی الحال آ گیا
دنیا ہلی زمین کو بھونچال آ گیا
غصّہ کی آندھی قہر کا طوفان غضب کا جوش
تھے فرطِ اشتعال سے مغلوب سب کے ہوش
دم توڑتا تھا وقت کے انصاف کا نظام
احساسِ رحم ان کی حکومت میں تھا حرام

پہونچا پکڑ کے خالو نے گھر سے نکالا پھر
اور پا پیادہ راہِ گذر سے نکالا پھر

گردوں پہ پھر لے چکا تھا راہ شام کی
شب لے رہی تھی ہاتھوں میں باگ انتظام کی
جب بائے اپنے باڑے کی جانب روانہ تھے
رخ سارے طائروں کے سوئے آشیانہ تھے
مزدور خوش تھے گھر کی طرف تیز گام تھے
پلّے سٹرک کے ہاتھوں میں جیبوں میں دام تھے
سڑکوں پہ غل سواریٔ سرمایہ داری کا
گلشن میں جیسے شور ہوا ابرِ بہاری کا

ہر شخص اپنے گھر کی طرف تیز گام تھا
راحت کی جستجو میں ہر اک خوش خرام تھا

دہ میں تھی آج جس کا ٹھکانا نہ تھا کوئی
دنیا میں جس کا اپنا بگانہ نہ تھا کوئی

دل بیٹھا جا رہا تھا مرا اس خیال سے
آگاہ اب کسے کروں میں اپنے حال سے

اس منزلِ حیات کا رہبر نہیں کوئی
یہ شب جہاں بسر کروں وہ گھر نہیں کوئی

کوئی نہیں ہے اپنا بلاؤں میں ایک کسے
یہ حال بے کسی کا سناؤں میں اب کسے

آنکھیں جواب دے چکی تھیں سر میں درد تھا
ہاتھوں میں رعشہ، خشک گلا، جسم سرد تھا

گرمی کی فصل پیاس کی شدت وہ الاماں
لب خشک کانٹے حلق میں، سوکھی ہوئی زباں

تارِ نفس میں خنجرِ قاتل کی چال تھی
یعنی کہ موت زیست کی پرسانِ حال تھی

ہونٹوں سے پیاس چہرے سے بھوک آشکار تھی
اور پردہ دار چادرِ گرد و غبار تھی

چوکھٹ انہی کی پکڑے کھڑی رہ گئی تھی میں
سر کو جھکائے اشکوں سے منہ دھو رہی تھی میں

آیا نہ ان میں سے کوئی تسکین دینے کو
قسمت کی بگڑی بخت کی پھوٹی کسے لینے کو

حسرت سے آسماں کی طرف منہ اٹھایا پھر
اور ایک راہ گیر سے تانگہ منگایا پھر

آئی وہاں سے دیدۂ گریاں لئے ہوئے
گھر تیرے پہنچی حالِ پریشاں لئے ہوئے

بابا ملے نہ تم نہ برادر ملا مجھے
ویران بے چراغ ترا گھر ملا مجھے

نکلا نہ تم میں سے کوئی جب میرے لینے کو
ویرانی آئی دوڑ کے تسکین دینے کو

ہر خانہ گھر کا قدموں سے میرے چمٹ گیا
جوتوں میں ریت بھر گیا کوڑا لپٹ گیا

اللہ ہی جانتا ہے وہ شب کس طرح کٹی
اللہ ہی اللہ کرتے میں دن نکلا تو کٹی

المختصر بس صبح گئی ماموں جان کے ہاں بھی فضا خلاف تھی بس ناتواں کے
ماما ملی جو در پہ مجھے اتفاق سے وہ آئی میرے پاس بڑے اشتیاق سے
اس سے کہا کہ تو مرے ماموں سے جا کے کہہ تو کچھ جواب دیں وہ مجھے مجھ سے آکے کہہ
کہنا کہ لونڈی آپ سے ملنے کو آئی ہے کم بخت و بدنصیب ہے غم کی ستائی ہے
کہنے نہ پائی تھی ابھی ماما مرا کہا چہرہ بگڑ گیا جو مری مامی جان کا
چلا کے اس سے بولیں تو آئی ہے کیوں بتا پیغام بدنصیب کا لائی ہے کیوں بتا
قسمت کی پھوٹی ہے کہ مقدر کی ماری ہے، ہم اس کے ہیں کوئی نہ وہ کوئی ہماری ہے،
پردہ ہے اس سے اپنا ہوں ہم کیسے سامنے یہ کہہ کے در کو بند کیا نیک نام نے

لڑ کر نکالا شوہر خواہر نے امی جان
دلوا دی کنڈی تیرے برادر نے امی جان

مجبور ہو کے قبر پہ اب تیری آئی ہوں اور زیر لب یہ نالۂ جانکاہ لائی ہوں
افسانۂ حیات کی تکمیل ہو چکی امی تمہارے حکم کی تعمیل ہو چکی
اب ختم ہو چکے مرے سب کار زندگی اور اٹھ چکا وہ پردۂ اسرار زندگی
میری حیات اصل صعوبات بن چکی ہر سانس اپنی مرگِ مفاجات بن چکی
صبح طرب کی دید کہاں شام ہو چکی قسمت مری بہارِ تمنا کو رو چکی
مہلک حملۂ ہجر کا آزار ہو چکا اچھا شبِ فراق کا بیمار ہو گیا
بلبل قفس میں رنج اسیری بھی سہہ چکی چھٹ کر چمن سے گوشۂ زنداں میں رہ چکی
یہ مشتِ خاک بجلیوں سے فیض پا چکی شعلوں سے سب فضائے چمن جگمگا چکی
تاثیر تیرے دودھ کی اماں دکھا چکی بھینٹ اپنی حسرتوں کی جہاں میں چڑھا چکی

خوں دے کے تازہ کر چکی رسمِ وفا کو میں
خاموش رہ کے سہہ چکی ہر اک جفا کو میں
جی چاہتا ہے نالوں سے محشر بپا کروں
پاسِ حیا ہے مانعِ اظہار کیا کروں
دل دے رہا ہے جذبۂ غیرت کو جوش اب
فطرت خودی کو دیتی ہے دارو ئے ہوش اب

قصہ جو یہ عدالتِ دنیا چکائے گی!
محشر میں تیرے آگے مجھے شرم آئے گی

کل صبح کوچ ہے مرا تیرے دیار سے
آؤں گی اب کبھی نہ لپٹنے مزار سے
غربت میں جو پڑے گی مصیبت اُٹھاؤں گی
اب لوٹ کر دیار کو تیرے نہ آؤں گی
لیجے سلامِ آخری اس دل فگار کا
بے کس کا بے وطن کا غریب الدیار کا
آشفتہ حال لختِ جگر کا سلام لو
اس تیرہ بخت نورِ نظر کا سلام لو
اپنی جگر فگار و مسافر کا لو سلام
اپنی تباہ دسوختہ اختر کا لو سلام
گر اتفاق سے کہیں مل جائیں آپ کو
کہنا مرا سلام برادر کو باپ کو

ہو خاتمہ بخیر دعا آپ کیجئے
اور اذن اپنی نور کو رخصت کا دیجئے

(ب) اسلامیات۔ قومی و مذہبی جذبات

قدرت کا پیغام خورشیدِ رسالت کے نام

جب ختمِ نبوّت کے ستاروں کا ہوا کام
خورشیدِ رسالت کو دیا حق نے یہ پیغام
آدم کے سفینے پہ ہے ابلیس کا قبضہ
کیا دور کہ بیڑے کو ڈبونے یہ بد انجام
پوشیدہ تنِ کعبہ میں اب روحِ تباں ہے
یزداں کی جگہ جلوہ کناں پیکرِ اصنام

بالکل ہی مجھے بھول گئی فطرتِ انساں
اب اور ہی کچھ ہو گئے اُن کے سحر و شام
اے دوست نکل پردہ سے اور بزمِ جہاں دیکھ
خلوت کا نہیں وقت یہ جلوت کا ہے ہنگام
تنویرِ نظر بن کے ہر اک دل میں سما جا
چمکا مری دنیا کے سب ایوان در و بام

آفاق سے ظلمات کے لشکر کو بدر کر
عشاقِ جہاں کی شبِ ہجراں کو سحر کر

ہر شخص کا سر پھر مرے سجدہ کو جھکا دے
پھر خالق و مخلوق کے رشتہ کو ملا دے[1]
دروازہ سے مندر کے برہمن کو اٹھا کر
لا کعبے میں اور زینتِ محراب بنا دے
قشقہ کی جگہ سجدۂ خالق کا نشاں ہو
پیشانیٔ آدم کو پھر اگلی سی ضیا دے

کر غرق تو سرمایہ پرستی کا سفینہ
تابندہ ہو مزدور کی قسمت کا نگینہ[2]

انجم نے سرِ چرخ سے مژدہ یہ سنایا
خورشیدِ رسالت افقِ دہر پہ آیا
خالق نے اسے رخصتِ تنویر عطا کی[3]
وہ مہرِ مبیں برجِ شرف سے نکل آیا

---

[1] علامہ اقبالؒ ۔ کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو (بالِ جبریل)

[2] علامہ اقبالؒ ۔ تو قادر و مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں :: ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ :: دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات (بالِ جبریل)

[3] علامہ اقبال نے بھی ضربِ کلیم میں یہ ترکیب استعمال کی ہے
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو :: جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

آئینۂ ایام میں چمکا مہِ قدرت توحید نے رنگِ رخِ تثلیث اڑایا
تاباں ہوا وہ نورِ الٰہی جو زمیں پر کہنے لگی ہے چرخ سے فضل مرا پایا
آمد جو ہوئی کوکبِ محبوبِ خدا کی
اِک دھوم مچی صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ کی

شبِ عاشورہ

پڑی ٹھنڈی جو خورشیدِ فلک کی گرم بازاری
عطا شب رات کو حق نے کیا تاجِ جہانداری
نہ پہلے اور نہ پھر اُس کے بشر کی یاد میں آئی
یہ وہ شب تھی جو تنہا عالمِ ایجاد میں آئی
یہ وہ شب تھی لٹا تھا جس میں تاجِ سطوتِ ملت
یہ وہ شب تھی مٹا تھا جس میں نازِ شوکتِ ملت
یہ وہ شب تھی کہ تھی تربت پر نقاحق کا دل دادہ
سحر کو جس کی رن میں لٹ گیا یثرب کا شہزادہ
یہ وہ شب تھی الم سے جس کے چرخِ پیر مضطر تھا
پیاسا تین دن کا نائبِ ساقیِ کوثر تھا
یہ شب پیغامِ تخریبِ جہاں دیتی ہوئی آئی
مکمل مصیبت کا بار سر لیتی ہوئی آئی

زمینِ کربلا پہنے ہوئے تھی ماتمی جامہ
نہاں تھا آستیں میں محشرِ فردا کا ہنگامہ
خزاں کی تھی چڑھائی اور باغِ شاہِؐ طیبہ تھا
ہواؤں کے تھے جھونکے اور چراغِ طاقِ کعبہ تھا
گھٹائیں چھائی تھیں غم کی ہلالِ عیدِ زہراؓ پر
تھے طوفانی تھپیڑے کشتیٔ امیدِ زہراؓ پر
علیؓ کا چاند تھا اور گرد رنج و غم کا ہالا تھا
سحر کو ہاشمی خورشیدِ انور گہنے والا تھا
اندھیرا چھایا تھا، عالم پہ وہ ظلم و تعدّی کا
نہ تھا دنیا میں حامی کوئی اس دنیا کے ہادی کا
بچھا تھا ریت کے اوپر نبی زادہ کا سجّادہ
جبینِ آئینہ کردار پیشِ حق تھی اُفتادہ
صدائے نغمۂ وحدت سے پُر ہر تارِ ہستی تھا
فروغِ جلوۂ اقبال سے دل ایماں کی بستی تھا
اُٹھی تھیں بحرِ ہستی کے کنارے عشق کی موجیں
کہ جس میں ڈوبتی تھیں کل غم و افکار کی فوجیں
منازل کر گیا جب ضبط کے طے صبر انسانی
ہوئے اوجھل نگاہوں سے حجابِ عالمِ فانی
خزاں کی گود میں جلوے نظر آئے بہاروں کے

زمینِ کربلا پر سر جھکے تھے چاند تاروں کے
گروہِ انبیا میں پھر جمالِ مصطفےٰ دیکھا
پریشاں بال، رخ پر گرد، عمامہ جدا دیکھا
فضائے کربلا کا منظرِ غم ناک کھلا یا
نبیؐ نے یوں نواسے سے مخاطب ہو کے فرمایا
نہ گھبرا مرحلہ طے جلد یہ جانِ پدر ہوگا
تو کل مہمان گلزارِ جناں میں میرے گھر ہوگا
جبینِ پاس فہتابِ درخشاں بن چمک اٹھی
ضیاءِ داغِ دل مہرِ فلک بن کر دمک اٹھی
ہوئی رخصت شبِ عاشورہ کہتی بزمِ ہستی سے
پڑے گا کام اک دن پھر مجھے دنیا کی بستی سے
نشانِ آثارِ سحر لیکن ابھی غالب اندھیرا تھا
افق کو چار سو سے فوجِ تاریکی نے گھیرا تھا
ستارے شوقِ دیدِ شاہ میں ٹوٹے سے پڑتے تھے
فلک کے ہاتھ سے جام و سبو چھوٹے سے پڑتے تھے
کیا ارشاد فرزندِ رسولِ حق نے اکبرؓ سے
عرب کے ماہِ نو ادرشہر بانوؓ کے گلِ تر سے
وفا کی آخری منزل پہ اے جاں اب پدر آیا
تہِ تیغ امتحاں دینے کو زہراؓ کا پسر آیا

ہماری داستانِ حسرت و غم مختصر ہوگی
اب اس کے بعد دنیا میں نہ پھر اپنی سحر ہوگی

اذاں اک بار کہہ لو ورنہ پھر مہلت کہاں ہوگی
نہ ہم ہوں گے نہ تم ہوگے نہ یہ بانگِ اذاں ہوگی

اذانِ صبح دی اکبرؓ نے جب ارشادِ عالی سے
زمیں دشتِ بلا کی گونج اٹھی صوتِ جمالی سے

اذاں جب دے چکا ایران اور یثرب کا شہزادہ
بچھایا ریت کے اوپر نبی زادوں نے سجادہ

امامت آپ نے فرمائی پھر ان جاں نثاروں کی
نمازِ آخری آخر ہوئی طاعت گزاروں کی

ہوئی کافور ظلمت روشنی پھیلی جہاں بھر میں
گریباں صبح نے پھاڑا غمِ آلِ پیمبرؐ میں

پرندے آشیانوں میں جھکائے سر پڑے تھے سب
چراگاہوں سے چوپائے بھی منہ پھیرے کھڑے تھے سب

گلستاں میں ہوا ہر چار جانب خاک اڑاتی تھی
وفورِ غم سے شق گلزار میں ہر گل کی چھاتی تھی

چمن میں عندلیبِ زار یہ کہتی تھی پھولوں سے
بہارِ مصطفےٰ ہو جائے گی تاراج غولوں سے

سمیٹا دلبرِ زہراؓ نے آخر اپنا سجادہ

جماعت جاں نثاروں کی ہوئی مرنے پہ آمادہ
گیا خیمہ میں رخصت کو پسر شیر الٰہیؓ کا
کہ تا ہمشیر کر لے آخری دیدار بھائی کا

وہ عالم آپ کو اس وقت خیمے میں نظر آیا
کہ جس کو دیکھ کر قلب شہ مظلوم بھر آیا
ہر اک کی صورت پر نور تھی تفسیر حسرت کی
کوئی غم کا مرقع تھی کوئی تصویر حسرت کی

بدقت آپ نے اپنے دل بیتاب کو روکا
بہت مشکل سے اس اٹھتے ہوئے سیلاب کو روکا
کہا پھر اعتنا آپ نے ہمشیر خستہ سے
گرفتار بلا آفت رسیدہ دل شکستہ سے

پرستار خدا، اے عاشق حق، ثانی زہراؓ
لگا ہے آج اولاد علیؓ پر موت کا پہرا
نہاں ہے ساحل امید ان کا یاس و حرماں میں
سفینہ زندگی کا آ گیا آغوش طوفاں میں

ہوئی رخصت خیال زیست کی ہنگامہ آرائی
رہے گی یادگار خلق دائم میری تنہائی
مجھے معلوم ہے جو بعد میرے تم پہ گزرے گی
جلے گا خیمہ اور چادر سر عطرت سے اترے گی

کہو باطل کے ڈر سے چھوڑ دوں دعوےٰ صداقت کے
سرِ سبطِ نبی جھک جائے آگے اس حکومت کے
یہ سن کر عندلیبِ گلستانِ مصطفیٰ بولی
گلِ گلزارِ زہراؑ نورِ چشمِ مرتضیٰؑ بولی
کہ اے آئینۂ صدق و صفا کے خوشنما جوہر
مقدّس معدنِ مہر و وفا کے بے بہا گوہر
یہ شاید لے رہے ہو امتحاں زہراؑ کی دختر کا
تمھیں منظور ہے آج آزمانا اپنی خواہر کا
حمیّت کا شرف ہم ہیں، وفا کا رنگ و بو ہم ہیں
صداقت کے محب ہیں، اوجِ باطل کے عدو ہم ہیں
بہارِ گلشنِ فردوس ہیں دنیا کے رہبر ہیں
ضیاءِ قصرِ جنّت، زینتِ محراب و منبر ہیں
شرافت کے گہر ہیں ہم نبوّت کے مکیں ہم ہیں
جہاں میں غیرتِ حق کی امانت کے امیں ہم ہیں
خیالِ مرگ سے عزمِ مجاہد رک نہیں سکتا
سرِ ایماں کبھی باطل کے آگے جھک نہیں سکتا
نہ گھبراؤ وہی ہے آج کے دن آسرا اپنا
سفینہ ہیں نبیؐ کا ہم خدا ہے ناخدا اپنا
مجھے منظور ہے راہِ خدا میں سر کٹا دو تم

صداقت کے لئے دنیا کی ہر دولت لٹا دو تم
یہ کہہ کر ہو گئیں فرطِ الم سے اشکبار آنکھیں!
نہ تھا ممکن کہ ہوں جذباتِ دل کی پردہ دار آنکھیں

مسلم سے خطاب

آہ مسلم ہے یہ تیرے خوابِ غفلت کا اثر
قوم پر تیری جو چھایا ہے فلاکت کا اثر

لرزہ براندام تجھ سے روم اور ایران تھے
قیصر و کسریٰ ترے در کے کبھی دربان تھے

تیرے سر پہ فخر کرتا تھا جہانبانی کا تاج
تیرے بیت المال میں تھا ہفت کشور کا خراج

تیرے توسن کی عناں تھمتی نہ تھی سیلاب سے
مضطرب ہوتا نہ تھا تو وادیٔ بے آب سے

بحر کے اندر سفینہ تیرا بازی کھیلتا
اس کی موجوں کو مثالِ موج تھا تو ریلتا

تیرا بیڑہ خضر کا منت کشِ احساں نہ تھا
یعنی تو مرعوب موجِ بحرِ بے پایاں نہ تھا

بدر کے میدان کے کار نمایاں یاد کر
تنگ دستی تنگ دامانی کے ساماں یاد کر

رزم کی رنگیں فضا مسلم کے سر کا تاج تھی
موت کی منزل شہیدوں کے لئے معراج تھی

برق کے مانند چمکی تیری تیغ نا صبور
کفر کے خرمن کا تونے جس جگہ پایا ظہور

تھر تھرا تا تیرے ڈر سے تھا کبھی چرخ کہن
کفر کے ماہِ سحر کو لگ گیا تجھ سے گہن

ہر ذرہ عالم کر دیا زندہ تیری تکبیر نے
طالع خفتہ کو چونکایا تیری تدبیر نے

تھیں وہ تلواریں تمھیں صحرا نشینوں کی کبھی
چاٹتی تھیں جو لہو شاہی جبینوں کا کبھی

راہِ گم کردہ کا رہبر ناخدا کی آس تھا
خضر تھا صحرا میں تو دریا میں تو الیاس تھا

حکم ناطق تھا ترا منطق تری تقریر تھی
کاتبِ تقدیر کا لکھا تری تحریر تھی

فیض شبنم کا تھا تو ابر بہاری کی بہار
مدعا کلیوں کا تھا اور محفلِ گل کا سنگھار

خوئے مسلم جب کہ کعبے کے نگہبانوں کی تھی
ہفت کشور میں حکومت تم شتربانوں کی تھی
خود نمائی سے تری خوجبت ملک یگانہ تھی

تجھ پہ قرباں شمع ایمن صورتِ پروانہ تھی
مردہ دنیا زندہ تیری صحبت قم سے ہوگئی
کیوں وہ آوازِ مسیحا اب صدا کو کھو گئی

چھوڑ بیٹھا آہ مسلم تو اصولِ زندگی
مغربی تقلید نے کھوئی تیری تابندگی
بے نیازی نے تری کھویا تیری فطرت کا راز
تھا تقاضا عشق کا مسلم تری پچھلی نماز
جب کہ محرابِ عبادت میں جھکا بہرِ نماز
عبد اور معبود میں ہونے لگے راز و نیاز
جب اٹھاتا تھا دعا کے واسطے تو اپنے ہاتھ
آیۂ لا تقنطو تسکین کو ہوتی تھی ساتھ
جب کلام اللہ کے اوراق گردانی میں تھے
مرحبا بال ملک تیری نگہبانی میں تھے
پیکرِ آدم کی گل دنیا میں اب باقی نہیں
جام ہے توحید کا باقی مگر ساقی نہیں
عشق کا دل کھو گیا اب حسن بے تاثیر ہے
شمع محفل جل رہی ہے آنکھ بے تنویر ہے
یاد کا جب اس کی محفل میں نہیں تیری گذر
آہ بے تاثیر تیری تیرے نالے بے اثر

چھا گئے ادبار کے بادل تری تہذیب پر
کفر نے بیڑا اٹھایا ہے تری تخریب پر
نبر سے ور کے پاسبانوں کے سروں پر تاج ہے
اور نونانِ شبینہ کے لئے محتاج ہے

ہے حوادث کے تھپیڑوں میں ترا بیڑا اسیر
ناخدا آ ہوش میں ڈوبا ترا تاج و سریر
جستجو گل کی ہے تجھ کو باغِ ویراں میں عبث
ڈھونڈھتا ہے آبِ حیواں کو بیاباں میں عبث

زندگی تیری نہ ہو کیوں نذرِ طوفانِ الم
جادۂ دینِ محمدؐ پر نہیں تیرا قدم
لذتِ تکبیر سے ناآشنا ہے دل ترا
اور بندے ماتم ہے نعرۂ منزل ترا
تو اگر پھر وہ گذشتہ شان و شوکت چاہیئے
دردِ ملت چاہیئے، پاسِ شریعت چاہیئے[1]

اسلام

آہ اے اسلام تھا تو رونقِ مہر مبیں
تیری تابانی سے روشن تھی زمانہ کی جبیں
تو خدا کا اس جہاں میں آخری پیغام تھا[2]

[1] و [2] (نوٹ اگلے صفحہ پر)

لانے والا تھا ترا محبوب رب العالمیں

تھا چمن معمور تیرا نغمۂ توحید سے
اس چمن کے عندلیبوں کی صدا تھی دلنشیں

تیرے قدموں پر فرازِ آسماں تھا سجدہ ریز
تجھ سے تھی بستی زمیں کی غیرت عرش بریں

خرقۂ درویش تھا ملبوس شاہی کا سہیم
تھے گدایانِ حرم کے پاؤں پر تاج و نگیں

(پچھلے صفحہ سے)

۲ے اتفاقیہ طور پر یہ مصرعہ علامہ اقبالؒ سے مل گیا ہے (نور)

اس نظم پر علامہ اقبالؒ کا رنگ کس حد تک چھایا ہوا ہے اس کا اندازہ مرثیۂ صقلیہ کے ابتدائی اشعار سے ہو سکتا ہے جو علامہ اقبالؒ نے یورپ سے ہندوستان آتے وقت لکھا تھا۔ اشعار ملاحظہ ہوں :-

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہان تازہ کا پیغام تھا جس کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

زلزلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے (بانگ درا صہ ۱۴۱)

تیرے طائر بے خطر تھے حیلۂ صیاد سے
یورشِ ظلم و ستم سے دل نہ تھا ان کا غمیں

بجلیوں کا آشیاں تھی تیری تیغِ بے نیام [۱]
کر دیا تھا راکھ اس نے خرمنِ اعدائے دیں

تیری آغوشِ محبت عیش کا گہوارہ تھی
تیری نکہت نکہتِ گل سے سوا ناز آفریں

آتشِ نمرود مسلم کے لئے گلزار تھی
اس کے دل میں بھی تھا ابراہیمؑ کا نورِ یقیں

آسماں بھی تھا جبیں گستر تری دہلیز پر
خندہ زن تھی رفعتِ گردوں پہ تیری سرزمیں

فتح و نصرت تھی جلوس کامیابی ہم رکاب
سینۂ باطل تھا ہیبت سے تری اندوہگیں

تیرے دریوزہ گروں کے سر پہ تاجِ ہفت اقلیم تھا
ان کے تھی زیرِ نگیں یہ وسعتِ روئے زمیں

کاتبِ تقدیر کی تحریر جاتی تھی بدل
بندۂ مومن کا دل تھا مہبطِ روح الامیں [۲]

---

۱ علامہ اقبالؒ ع بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

۲ علامہ اقبالؒ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (بانگِ درا)

چھوڑ کر تجھ کو ہوئے ہم ننگِ دین ننگِ وطن
ذلتیں سب کو ہماری درسِ عبرت ہو گئیں

خانماں برباد ایسے دہر میں ہم ہو گئے
بعد مردن گور بھی ہم کو نہیں ملتی کہیں

پائمالی کو تری اُٹھے ہیں وہ دشمن ترے
ہاتھ سے تیرے اماں جنکو نہ ملتی تھی کہیں

شورشِ طوفانِ باطل آج ہے محشر بدوش
اور چلی ہے کفر کی آندھی بجھانے شمعِ دیں

تیرے تاروں میں ابھی بیتاب ہے سازِ کہن
تشنۂ مضراب ہے لیکن یہ سازِ دلنشیں

تیری محفل بھی ہے باقی رونقِ محفل بھی ہے
تیری محفل میں مگر افراد وہ باقی نہیں

جل رہی ہے شمعِ محفل بھی اسی انداز سے
آہ پروانوں میں لیکن ذوقِ خودسوزی نہیں

بادۂ توحید سے سرشار پھر کر دے انھیں
تشنہ کاموں کو عطا کر پھر وہ جامِ احمریں

محمد علی جناح کی آمد پر

ہے نہیں قائم کبھی اک رنگ پر دورِ جہاں

ہر نفس ہے اک پیامِ انقلابِ آسماں
ذرّہ ذرّہ ہے جہاں کا محشرِ صد اضطراب
غیر ممکن اس خرابے میں سکونِ جاوداں
ہے قرارِ زندگی ہم معنیٔ رمزِ اجل
ہے سکوتِ مستقل ہمدوشِ مرگِ ناگہاں
ہے یہی آئینۂ ہستی یہی رازِ حیات
زندگی کیا ہے عمل کا ایک مسلسل امتحاں
ایک دن وہ بھی تھا جب تو مالکِ کونین تھا
تیری سطوت کی قسم کھاتے تھے ارض و سماں
تیرے قدموں پر جھکا تھا قیصر و کسریٰ کا تاج
رہتا تھا ٹھوکر پہ تیری تختِ جم تاجِ کیاں
تیری جولانگاہ تھے روم و عراق و مصر و شام
تھے ترے زیرِ نگیں اسپین اور ہندوستاں
جو مسلماں فخرِ موجودات تھا، ہے آج وہ
ننگِ خلقت، ننگِ دیں، ننگِ وطن، ننگِ جہاں[1]
بت شکن تھی جس کی ہر اک ضرب مانندِ خلیل
آج ہے وہ خود نثارِ عشوۂ نازِ بتاں

---

[1] علامہ اقبال سے
جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ مذہب ننگِ دیں ننگِ وطن (جاوید نامہ)

آستاں پر جس کے ہوتا تھا جبیں گستر فلک[1]
آج اُس کا سر ہے اور غیروں کا سنگِ آستاں
جو نہ جھکتا تھا کسی طاقت کے آگے جز خدا
آج بندے ماترم ان کی زباں پر ہے رواں
جو کبھی نسل و وطن کی قید سے آزاد تھا
آج مذہب سے زیادہ ہے اُسے ہندوستاں
الغرض بے غیرتی و بے حسی سے تھا قریب
دامنِ عقل و خرد اُڑ جائیں ہو کر دھجیاں
ایک کروٹ اور بدلی دفعتاً ایام نے
ہو گیا پھر ہمکنارِ موسمِ گل بوستاں
پا لیا بیمارِ غم نے چارۂ دردِ نہاں
مل گیا بھٹکے ہوئے رہرو کو منزل کا نشاں
اے جناح! اے قومِ مسلم کے امیرِ کارواں
چارہ سازِ دردِ ملت تیری فکرِ نکتہ داں
اے کہ میدانِ سیاست میں نہیں تیری نظیر
تجربے میں پیر ہے تو اور ہمت میں جواں
مسلمِ خوابیدہ کو تو نے دیا درسِ عمل
بیخودی کا دَور تو نے کر دیا خوابِ گراں

[1] علامہ اقبال۔ جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک (بانگِ درا)

لقمۂ تر جو مسلمانوں کو تھے سمجھے ہوئے
اب انہیں زورِ عمل ان کا کریگا سخت گراں
کر دے تازہ اپنی نا ہبر جہانبانی سے پھر
عظمت اسلام کی بھولی ہوئی وہ داستاں

(ج) غزلیات

بات کیا ہے وہ تجلی پسِ طور نہیں
عشق مجبور سہی حسن تو مجبور نہیں

جس میں مرضی ہو تری اپنی رضا بھی ہے نہی
خود پرستی ہو محبت کا یہ دستور نہیں

چارہ گر بہر خدا چھوڑ دے فکر درماں
بھر سکے وقت کا مرہم یہ وہ ناسور نہیں

نگہِ چشم کرم کارِ رفو کرتی ہے
ہاں درستی دل صد چاک کی منظور نہیں[۱]

بھر سکے سوزش داغِ شبِ فرقت جس سے
آہ اے جیب سحر تجھ میں وہ کافور نہیں

اب کسے ساغرِ مے آکے پلائے ساقی
نذر سر دینے کو سرمد نہیں منصور نہیں

اب سنائی نہیں دیتے ارنی کے چرچے
جلوۂ طور تو ہے عاشقِ مہجور نہیں[۲]

پاسِ صیاد نے روکا ہے بمشکل ورنہ
تن ہے پابندِ قفس نالہ تو مجبور نہیں

قہر سے تیرے زیادہ ہے عنایت تیری
بخش دے نور کو رحمت سے یہ کچھ دور نہیں

---

[۱] علامہ اقبال ؎ الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے (بانگِ درا)

[۲] جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں۔

در سنی اس دلِ صد چاک کی کیا تجھ کو مشکل تھی
نگاہوں میں تری تھے سیکڑوں تارِ رفو پنہاں
گلِ امید کی حسرت رہی میرے گلستاں کو
بہارِ لطف میں تیری تھے لاکھوں رنگ و بو پنہاں
ترستی رہ گئی ایک ایک قطرہ کو مری محفل
تری چشمِ کرم میں گرچہ تھے جام و سبو پنہاں
کھلے گا ناخنِ تدبیر سے کیا عقدۂ مشکل
خرد ہے زیرِ دامانِ قضائے حیلہ جو پنہاں

غزل!

پھر کھنچ گئی اچانک ہمدم کمانِ تقدیر
برسے دلِ حزیں پر جور و ستم کے پھر تیر

غیروں سے جب ملے ہم اپنا بنا کے چھوڑا
اور کر سکے نہ ان کو کرنا تھا جن کو تسخیر

اوروں کے چاک قسمت ہم نے رفو کیے تھے
اور سی سکے نہ اپنا افسوس چاکِ تقدیر[1]

اس درجہ سوءِ ظن ہے ہر بات دل شکن ہے
لائے کہاں سے ہر دن اک دل نیا یہ دلگیر

پاسِ وفا ہمارا مُہرِ دہن بنا ہے
کس طرح ہو سکے گی احوالِ دل کی تفسیر

آزاد کب تھی بلبل جو دام میں پھنسی اب
صیاد خود رگِ گل تھی اس کے حق میں زنجیر

---

[1] اسرار الحق مجاز:- سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں سی نہ سکے (آہنگ ص۲۴)

کیوں سرخ ہو رہی ہیں پھر تیلیاں قفس کی ۔۔۔ اے اشکِ خوں نیا گل شاید کھلائے تقدیر
آیا جو در پہ مجرم رحمت نے اس کو بخشا ۔۔۔ کیا قابلِ تلافی تھی نور کی نہ تقصیر

نوشابہ

نوشابہ خاتون نام اور نوشابہ تخلص ہے۔ قریشی نسبتِ خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آپ حیدر آباد دکن کی رہنے والی اور اُردو کی مشہور شاعرہ ہیں۔ آپ کے والد مولوی عبدالحق صاحب سابق مددگار ناظم کوتوالی اضلاع تھے۔

محترمہ نوشابہ خاتون کی تعلیم ابتداء سے آخر تک خانگی طور پر ہوئی۔ اس تعلیم سے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان خواتین میں جنھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ڈگری حاصل کی ہے آپ سب سے پہلی خاتون ہیں۔

آپ کو دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ آپ کا کلام رسالہ عصمت میں اکثر شایع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "موجِ تخیّل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، ہر صنفِ سخن پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے کلام میں صفائی و بلندی موجود ہے، طرزِ ادا کی ندرت، اور خیالات کی بلند پروازی قابلِ داد ہے، کلام میں سوز و درد بھی ہے۔ آپ اقبال ؒ کے رنگ سے بھی متاثر ہوتی ہیں۔ آپ نے جنسی محبت کے تصور سے ملبند ہو کر زندگی کے حقائق پر بھی نظر ڈالی ہے آپ کے یہاں تلقینِ عمل بھی ہے اور

درسِ حیات بھی، قومی اور ملّی رنگ کی نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ آپ نے طبقۂ نسواں کی اصلاح کی بھی کوشش کی ہے اور توہم اور جہالت اور سماج کے غلط رسم و رواج کے خلاف بھی احتجاج کیا ہے

ہے نوائے تلخ یا رب سوز و سازِ زندگی　　　　نغمۂ شیریں سُنا بر ربطِ نوازِ زندگی
اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن　　　　شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گدازِ زندگی
منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا!　　　　آشکارا ہو گیا دم بھر میں رازِ زندگی
ہے سکونِ موت سے بدتر سکونِ انجماد　　　　سعی و حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی[1]

کلیجے مسلم کے جل چکے ہیں، گلوں پہ خنجر بھی چل چکے ہیں
کہ اہلِ یورپ ستم سے اپنی ہماری طاقت کچل چکے ہیں
وہ شورِ ظلم و غضب کا اُٹھا، ہوئی قیامت زمیں پہ برپا
کہ خونخوارانِ فتنہ افزا، بگڑ چکے ہیں، مچل چکے ہیں
وہ آگ حرصِ شکم کی بھڑکی کہ جس سے پانی کو قوم ترسی
امان غائب پناہ کیسی، پہاڑ آتش اُگل چکے ہیں
نہ جائے مسلم کی آہ خالی، بلند ہو پرچمِ ہلالی
پھر وہ آجائے اب جلالی وہ فتنے اٹھیں جو ٹل چکے ہیں

---

[1] علامہ اقبالؒ　فریبِ نظر ہے سکون و ثبات :: تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی :: فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
(ساقی نامہ بالِ جبریل)

ادائے قاتل پہ آفریں ہے، یہ قولِ نوشابۂ حزیں ہے
تصورِ جور یہ دل نشیں ہے، قدم ہمارے پھسل چکے ہیں

خواہرانِ محترم بیدار ہو بیدار ہو　　تا کجے خوابِ گراں ہشیار ہو ہشیار ہو
تا بکے سامانِ نکبت، ہستیٔ بیکار ہو　　رزم گاہِ دہر میں آمادۂ پیکار ہو
ہے تاسف آفریں بہنو ہماری زندگی　　درسِ عبرت دے رہی ہے نکبت و واماندگی

تختۂ مشقِ ستم ہیں تنگ اپنی جان سے
ہمتیں ہیں پست، خالی قلب ہیں ایقان سے
زندگی بدتر ہماری کیوں نہ ہو حیوان سے
علم سے محروم ہیں، بے بہرہ ہیں ایمان سے
معتقد ہیں ہم شگونوں کے کہیں اوہام کے
فلسفہ سے ہم نہیں واقف ذرا اسلام کے

آہ بے علمی ہماری زیست کا مقصود ہے
جہل و نادانی ہمارے واسطے محمود ہے
ہائے کیسی کشمکش میں ہستیٔ بے بود ہے
ضعف میں احساس حالِ زار ہی مفقود ہے
نوش دارو زہرِ قاتل ہے ہمارے واسطے
دور سے نزدیک منزل ہے ہمارے واسطے

جامۂ ہستی کی لے وحشت اُڑا دے دھجّیاں
اب جدا مہماں ترا دنیائے دوں ہونے کو ہے
کیوں تری حسرت پہ خونناب نہ روئے بیکسی
تھا جو قسمت کا لکھا پورا وہ یوں ہونیکو ہے

حال کیا پوچھتے ہو سوختہ سامانی کا ۔۔۔ درد سرمایہ ہوا زندگیٔ فانی کا
دیکھ کر حالِ پریشانِ دلِ زار کہا ۔۔۔ یہ مرقع ہے یقیناً کسی دیوانی کا
عکس بتلا نہ سکا فطرتِ انسانی کا ۔۔۔ یہی باعث ہوا آئینہ کی حیرانی کا
سنگِ در بعض نے سنگِ رہِ مقصد سمجھا ۔۔۔ یہ صلہ ہم کو ملا آپ کی دربانی کا

قدرتِ کردگار ہے ذرۂ خاک سے عیاں ۔۔۔ ظاہر و آشکار ہے شانِ خدائے دوجہاں
باغ و راغ گل بدوش [1] ۔۔۔ قوتِ نامیہ بجوش
ساری زمیں ہے سبز پوش ۔۔۔ دامنِ کوہ گل فروش
رنگِ شفق ہے لالہ گوں چرخ کا دل ہوا ہے خوں [2] ۔۔۔ نورِ سپہر ہے فزوں، چادرِ آب سیم گوں
نکہتِ گل ہے عطر بار ۔۔۔ دشت و جبل ہیں لالہ زار
ورد و سمن کی ہے بہار ۔۔۔ قدرتِ حق ہے آشکار

---

[1] علامہ اقبالؒ: خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید (پیامِ مشرق)
[2] " شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے (بالِ جبریل)

روح فزا نسیم ہے پھیلی ہوئی شمیم ہے
فضلِ خدا عمیم ہے خطہ ہی نعیم ہے

مولانا راشد الخیری کی وفات پر

(۱)

وا دریغا! بجھ چکی شمع شبستانِ حیات
چھپ گیا بدلی میں اب وہ مہرِ تابانِ حیات
تھی ضیا پاشِ جہاں جس کی منوّر زندگی
چھپ گیا افسوس وہ خورشیدِ رخشانِ حیات
یاد دلوا تا رہا جو قوم کو بھولا سبق
جس نے ملت کو بتایا رازِ پنہانِ حیات
وہ وسیع الحوصلہ، عالی شیم، والا ہمم
تنگ تھا جس کے لئے افسوس دامانِ حیات
آہ وہ بزمِ ادب کی شمع آخر بجھ گئی
تشنگانِ علم! ہے تاریک میدانِ حیات
اب سنائیں گے کسے ہم درد و غم کی داستاں
کون بتلائے گا اب تدبیر و درمانِ حیات
لٹ گیا افسوس وہ سرمایۂ نقدِ حیات
ہائے محوِ جستجو ہیں یاں غریبانِ حیات
زندگی بے کیف ہے سونی ہوئی بزمِ ادب

کیا کہوں کیونکر لکھوں، جاتی رہی ہے جانِ حیات

(۲)

مجلسِ علم و ادب کا بجھ گیا روشن چراغ
ہو نہ جائے آہ دنیا کے لئے تاریک تار
اٹھ گیا وہ ناخدائے کشتیٔ صنفِ لطیف
اب لگائے گا الٰہی کون اس بیڑے کو پار
تھا وہ تزئینِ ادب، جانِ ادب، کانِ ادب
یعنی اقلیمِ سخن کا تاجدارِ پُروقار
مدتوں دیتا رہا جو درسِ تفسیرِ حیات
اس سے خالی ہو چکی ہے گیتیٔ ناپائدار
قالبِ خاکی نظر سے لاکھ پنہاں ہو گیا
کارنامے ان کے دنیا میں ہیں اب تک یادگار
ہے یہی تفسیر کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کی
ہے حبابِ آسا سراسر ہستیٔ ناپائدار
تا کجے نوشابہ ناشاد فریاد و فغاں
اب اٹھیں دستِ دعا پیشِ جنابِ کردگار

---

(۹)

وفا

وفا تخلص ہے۔ ریاست ٹونک کی رہنے والی ہیں۔ دورِ حاضر کی

ایک زبردست غزل گو شاعرہ ہیں۔ کلام وجدانی اور جذباتی اعتبار سے بہت بلند اور بغایت پُر تاثیر ہے۔ جذبات و احساساتِ قلب کی ترجمانی پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ آپ کے کلام میں نہایت شدید اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے جذبات کی فراوانی ہے جس نے آپ کے اشعار کو بغایت دلکش اور موثر بنا دیا ہے، طرزِ ادا سے کہنہ مشقی اور پختگی ظاہر ہے۔ اکثر مشکل زمینوں میں لکھتی ہیں۔ مگر کیف و اثر ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ مثلاً ذیل کی غزل کی ردیف "کبھی ایسی تو نہ تھی" مشکل ہے مگر غزل صرف پُرکیف و بلند ہی نہیں حاصلِ کلام ہے۔ اس میں سلسلہ بندی کا رنگ موجود ہے۔

شکوۂ غم

ہر گھڑی رونے کی عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
جان لیوا تری فرقت کبھی ایسی تو نہ تھی

موت ہی جیسے کہ اب اس سے چھڑا سکتی ہے
زندگی مجھ پہ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی

یوں کبھی ضیق نہ تھی اپنے ہر اک سانس سے میں
زندگی سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

جیسے دل سینے میں ڈوبا ہی چلا جاتا ہے
کھوئی کھوئی مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنی ہستی پہ خود اک بار ہوئی جاتی ہوں

خود سے بیزار طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسے اجڑ لئے غمِ عشق سے ہو اس کا خمیر
دلِ ناشاد کی فطرت کبھی ایسی تو نہ تھی
دلِ ناشاد کسی طرح سنبھلتا ہی نہیں
جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی
دل کسی کام میں کمبخت بہلتا ہی نہیں
اپنے ہر کام سے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
لاکھ تدبیر کروں بن نہیں پڑتی کوئی
ناموافق میری قسمت کبھی ایسی تو نہ تھی
التجاؤں میں اثر ہے، نہ دعاؤں میں اثر
مجھ سے برگشتہ مشیت کبھی ایسی تو نہ تھی
دشمنوں سے بھی سمجھنے لگوں ان کو بدتر
دوستوں سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
زندگی جیسے کہ ممکن ہی نہیں تیرے بغیر
تیرے آنے کی ضرورت کبھی ایسی تو نہ تھی
تجھ سے کچھ کہنے کا ارماں کبھی ایسا تو نہ تھا
تجھ سے کچھ سننے کی حسرت کبھی ایسی تو نہ تھی
یوں تو وفا سے ہوئے ناراض تم اکثر لیکن
جیسی اب ہے تمہیں نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی[1]

(نوٹ اگلے صفحہ پر)

وفا

محترمہ ح۔ن۔ وفا موجودہ دَور کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ کلام میں سوز و گداز، صفائی اور متانت موجود ہے۔ آپ کا دل مغلیہ خاندان کی تباہی پر بہت دکھا۔ اور اس موضوع پر آپ نے اکثر نظمیں لکھی ہیں۔ آپ کا کلام زنانہ رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے، رنگ یہ ہے:-

پلّے کہاں قلم یہ مرا طاقتِ بیاں
تحریر کیں جگر سے کرے غم کی داستاں

ہے یاد تجھ کو اے فلکِ نیلگوں وہ روز
جس دن تباہ ہوگیا مغلیہ خانداں

خاتون جن پہ عفت و عصمت نثار تھی
جی بھر کے جن کو دیکھنے پایا نہ آسماں

اس گھر کے بدنصیب و ستم دیدہ فلک
افراد میں تھی غمزدہ اک بچہ والی ماں

نکلی وہ ڈر سے جان کے کچھ عورتوں کے ساتھ
جب لوٹ سے نہ بچ سکیں عصمت کی دیویاں

بیچارگی و خوف و ستم وہ غدر کی رات
سلطان کے حرم کے لئے آہ الاماں

تھی لب پہ آہ، پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے
اور اس پہ یہ ستم کہ نہیں کوئی پاسباں

نکلا جو دن تو شہر سے کوسوں ہی دور تھیں
جنگل تھا وہ نخیل، عیش کا باقی نہ تھا نشاں

وہ ناز میں پلی ہوئی معصوم صورتیں
آب و طعام کا نہ ملا تھا جنھیں نشاں

ابتر تھا حال سب سے اسی شیرخوار کا
پانی نہیں تو دودھ کہاں تھا بھلا وہاں

ماں مامتا کی ماری نے دوپٹہ پھاڑ کر
اس کپڑے سے پسر کو لٹایا زمیں پہ واں

---

[1] غالب - بارہا دیکھی ہیں اُنکی رنجشیں ؛ پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے۔

[2] فیض احمد فیض :- وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں (نقشِ فریادی صفحہ ۹۱)

[illegible] صفحہ

بھرنے لگی تلاش میں پانی کی چار سو
سمجھاتی لاکھ سب یقیں کہ اس میں ہے خوفِ جاں

تا نصفِ شب کسی طرح لائی وہ غمزدہ
تھا موت کا فرشتہ مگر سرپے جھکا اذاں

بچے کو بس کے کوزہ میں پانی پلا دیا
لب پر دعا تھی اور نظر سوئے آسماں

یوں لگ چکی تھی پانی پلاتا ہوا ستم
اک ہچکی آئی کر گئی پرواز اس کی جاں

اٹھی جو ماں تو خاک پہ اس گل کے گر پڑی
دم توڑ کر وہ جا کے بنی خلد آشیاں

دونوں کی قبر آج بھی عبرت کا ہے نشاں
ماتم گسار جس پہ وفا خود ہے آسماں

وحید

وحید النساء نام اور وحید تخلص ہے، آگرہ کی رہنے والی ہیں، اور دورِ حاضر کی ایک قابل قدر غزل گو شاعرہ ہیں۔ جذبات کی ترجمانی، سوز و گداز، درد و اثر، آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ سنجیدہ، شائستہ اور فارسی آمیز زبان میں لکھتی ہیں۔ آپ کے اکثر اشعار بہت بلند ہیں۔

دنیا سے جا رہی ہوں تمنا لئے ہوئے
دل ہے کہ ایک یاس کی دنیا لئے ہوئے[1]

---

[1] نجمہ تصدق: ؎ دل میں ہجوم شوق و تمنا لئے ہوئے
دنیا سے جا رہی ہوں میں دنیا لئے ہوئے

صد سوزشِ جراحت و صد شورشِ فراق
دل ہے اک اضطراب کی دنیا لئے ہوئے

ارمان و عشق و حسرت و حرمان و درد و یاس
آئی ہوں بزمِ یار سے کیا کیا لئے ہوئے

اب آرزو ہے کوئی نہ ارمان ہے کوئی
مایوس موت کی ہوں تمنّا لئے ہوئے

مصروف شغلِ مشقِ تصوّر ہے رات دن
دل میں ترے خیال کی دنیا لئے ہوئے

اُمّیدِ چارہ سازئی بیمار الوداع
خود ہے جگر میں دردِ مسیحا لئے ہوئے

پہلو میں ہے مرے دلِ صد آرزو وحید
ہر آرزو ہے شوق کی دنیا لئے ہوئے

(۵)

ہمایوں

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے، میرٹھ کی رہنے والی ہیں۔ رسالوں میں کلام دینے سے احتراز کرتی ہیں۔ دورِ حاضر کی ایک تعلیم یافتہ اور خوش فکر شاعرہ ہیں، اُردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں سے واقف ہیں، آپ کے کلام میں بڑی شاعرانہ لطافت و پاکیزگی ہے،

جذباتی اعتبار سے بھی کلام بلند اور مؤثر ہے۔ ندرتِ ادا قابلِ داد ہے۔ آپ کے اشعار میں پُرکیف سادگی اور زبان میں شستگی اور صفائی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اساتذہ کے کلام سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔

وعدۂ وصل کر نہیں لیتے
پھول کی طرح مسکراتے ہیں

بس تسلی نہ دو دمِ رخصت
جائیے آپ روز آتے ہیں

نہیں ملتے اگر غریبوں سے
اُن کو دیوانہ کیوں بناتے ہیں

رند سے اعتبار توبہ کا
کالی کالی گھٹا کے ساتھ اُٹھا

یاس نے جب سے دل کو توڑ دیا
پھر دعاؤں کو بھی نہ ہاتھ اُٹھا

مَیں تو کم بخت ہوں اور نام ھمایوں ہے مرا
انھیں باتوں سے فلک سخت جگر خوں ہے مرا

ضمیمہ

ضمیمہ

شاعرات کے حالات اور کلام کا فراہم کرنا جوئے شیر کا لانا تھا ہر امکانی کوشش کے باوجود بھی کچھ شاعرات اب تک خاموش ہیں اور کچھ کے حالات اور انتخاب کلام اُس وقت موصول ہوئے ہیں جب تذکرہ طباعت کے بالکل آخری مرحلوں میں تھا۔ اس لئے ان شاعرات کو کتاب میں حروف تہجی کے اعتبار سے اپنے صحیح مقامات پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ اُن کو یہاں ضمیمہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انشاءاللہ آیندہ ایڈیشن میں یہ نقص دور کر دیا جائیگا[1]

جمیل

---

[1] تمام شاعرات سے ایک دفعہ پھر التماس ہے کہ وہ اپنے حالات اور کلام راقم الحروف کو ارسال فرما دیں تاکہ آیندہ اڈیشن میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُن کے خود نوشتہ حالات اور خود منتخبہ اشعار پیش کئے جا سکیں۔

"ج"

اختر محترمہ سیدہ سردار اختر حیدر آبادی۔

محترمہ سیدہ سردار اختر کا تذکرہ ان ہی اوراق میں پہلے (صفحہ ۲۲۱ تا صفحہ ۲۲۹) ہو چکا ہے، محترمہ کے تفصیلی حالات جو آپ کے آفس سکریٹری محترم جناب سید الحسن صاحب نے لکھا ارسال فرمائے ہیں ابھی ابھی موصول ہوئے ہیں اور چونکہ ان سے اکثر مفید و دلچسپ مزید معلومات کا اضافہ ہوتا ہے اس لیئے ان کو ضمیمہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ جناب سید الحسن صاحب نے محترمہ کے کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ یہ حالات معہ تبصرہ کے شکریہ کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ راقم الحروف کی طرف سے محترمہ کے کلام پر پچھلے صفحات میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس لئے راقم الحروف یہاں دوبارہ اپنی طرف سے اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

آج سیدہ اختر حیدر آبادی کو "شخصیات" کے باب میں پیش کرنا ہے۔ پہلی بار ان صفحات میں ایک شاعرہ کے حالات شائع ہو رہے ہیں۔ ورنہ یہ باب مردوں کے لیئے مخصوص ہے۔ بنگلور کی کانفرنس کے حالات کی اشاعت کے بعد سے اب تک بعض لوگ برابر مصر ہیں کہ سیدہ اختر حیدر آبادی کی تصویر اور اُن کے تفصیلی حالات شائع کئے جائیں زیر نظر تذکرہ اسی اصرار اور اشتیاق کی ایک تکمیل ہے۔

سیدہ اختر کا نام سردار بیگم اور نواب خاندانی لقب ہے۔ ۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو مملکت آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئیں۔

والد ماجد کا نام سید امیر حسن ہے - جد امجد نواب سید کریم حسن خاں قمر لکھنوی مرزا داغ کے تلامذہ میں سے تھے اور صاحب ثروت بھی ددھیال کی طرح سیدہ اختر کی نہال بھی شرف و بزرگی اور برتری میں کسی طرح کم نہیں اور کرنول میں اب تک یہ خاندان عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - سیدہ نجیب الطرفین ہیں - سیدہ اختر کا آبائی وطن لکھنؤ ہے - جب لکھنؤ کی بہاریں خزاں آلود ہو گئیں - جب عیش و نشاط کے ہنگامے ختم ہو گئے اور اودھ کے آخری تاجدار کو مٹیا برج کے محبس میں قید کر دیا گیا تو سیدہ کے آبا و اجداد نواب سید قطب الدین (کلکٹر) وغیرہ ترک سکونت کر کے حیدر آباد آنے پر مجبور ہو گئے - اب بھی لکھنؤ میں "لال محل" اور "موتی محل" اُن کی یادگار سے ہیں - حیدر آباد آنے کے بعد یہاں بھی اس خاندان کو اعزاز نصیب ہوا اور سیدہ کے افراد خاندانی اب تک عزت و آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں چار سال کی عمر میں سیدہ اختر شفقت پدری سے محروم ہو گئیں اور اُن کی تعلیم و تربیت اور حفاظت پرورش اُن کے حقیقی چچا محبوب علی صاحب خلف الصدق مولوی چراغ علی المخاطب نواب اعظم یار جنگ بہادر نے اپنے ذمہ ہمت پر لی - ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی - فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے محبوبیہ گرلس اسکول میں داخل کر دیا گیا - وہ بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئیں ۱۹۳۲ء میں خاں صاحب عبد الغنی گورنمنٹ آڈیٹر

کنٹراکٹر رئیس نصیر آباد (راجپوتانہ) سے شادی ہوگئی کچھ تو ورثتاً اور کچھ ذاتی ذوق و وجدان کی بدولت ابتدائی عمر ہی میں سیدہ کو ادب و شعر سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی شادی ہونے کے بعد جب زندگی کی تمام مسرتیں اور خوشکامیاں نصیب ہوئیں ماحول میں آزادی اور مزاج میں حکمرانی پیدا ہوئی تو ادب و شعر کے ذوق نے نئی انگڑائی لی۔ ایسی انگڑائی جو مستیوں سے بوجھل، خمار میں ڈوبی ہوئی اور نشہ میں چور رہتی۔ چنانچہ اس کا دھارا اس انداز میں شروع ہوا

خدا رکھے محبت حاصل صد زندگانی ہے
تبسم ہی تبسم ہے جوانی ہی جوانی ہے
یہی بس مختصر سی داستانِ غم کی کہانی ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ جو بجھ جائے تو پانی ہے

کیا پوچھتے ہو عشق کی افتاد کا عالم
خاموش بھی رہنے میں ہے فریاد کا عالم
ہر سانس میں ہے حسن پہ آشوب کا پیغام
ہر گام پہ ہے عشقِ ستم زاد کا عالم

اُف رے تمائینِ محبت لب ہلا سکتے نہیں
نالہ کر سکتے نہیں نغمہ سنا سکتے نہیں
واہ رے جذب محبت اُف رے مجبوریِ حسن
بھول جانے پر بھی وہ مجھکو بھلا سکتے نہیں

مختصر ہے بس یہ اختر شرح آداب وفا
آگ سی دل میں لگی ہے اور بجھا سکتے نہیں

مرد ہو یا عورت سب پر کسی نہ کسی وقت خدمت کا ایک جذبہ طاری ہوتا ہے خواہ وہ خدمت شوہر کی ہو یا ہمسایہ کی حسن کی ہو یا عشق

کی، قوم کی ہو یا ملک کی، مذہب کی ہو یا سیاست کی، ادب کی ہو یا زبان کی، اگر حالات مساعد اور جذبات حقیقی ہوتے ہیں تو جذبۂ خدمت یقیناً بالیدگی اختیار کرتا ہے۔ سیدہ اختر کے دل میں بھی قوم و ملک اور اپنی صنف کی خدمات کا جذبہ پیدا ہوا اتفاقِ وقت دیکھئے کہ سیدہ کو دامے درمے سخنے اور قدمے غرض ہر طرح خدمت کا موقع ملا۔ سیدہ نے مختلف پلیٹ فارموں سے اپنی درد میں ڈوبی ہوئی آواز قوم و ملک تک پہونچائی۔ پھر کیا تھا ہر طرف سیدہ کا استقبال ہونے لگا۔ عوام و خواص اُن ضربوں کو محسوس کرنے لگے جو سیدہ اپنی تقاریر سے عوام اور خوابیدہ قوم کے دماغوں پر لگا رہی تھیں ۱۹۳۷ء میں پراونشل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جس وقت سیدہ اختر پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کر رہی تھیں۔ اُس وقت پنڈال کے ہر گوشہ سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہو رہی تھی تمام لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے تھے اور مقررین انگشت بہ دندان تھے۔ حاضرینِ جلسہ کی نگاہیں سیدہ کی طرف اُٹھیں اور پھر بعد عقیدت جھک گئیں اور اعترافِ حقیقت کے لیئے مولانا عبدالحامد بدایونی کھڑے ہوئے۔ سیدہ کی تعریف و توصیف کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں تمام مسلمانانِ ہند کی جانب سے سیدہ کی خدمت میں "خطیبۂ ہند" کا خطاب پیش کرتا ہوں۔ مولائے محترم کا یہ اعلان کرنا تھا کہ تمام ہال "خطیبۂ ہند" "زندہ باد" اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اُٹھا۔ تقریباً دس منٹ تک یہی عالم رہا۔

سیدہ اختر اب بھی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ خواتین کی اصلاح کرتی رہتی ہیں اور اُن میں بیداری اور تعلیمی ذوق پیدا کرنے کی جانکاہ کوششیں اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنے تجربہ اور مطالعہ کو وسیع کرنے کے لئے ۱۹۳۶ء میں سیدہ نے مشرق بعید کا سفر کیا اور وہاں بطور خاص خواتین کی زندگی کا مطالعہ اور ہندوستانی خواتین سے موازنہ کیا وہ لکھتی ہیں کہ میں نے ہندوستانی خواتین کو ہر طرح پست اور بے عمل پایا۔ اس سفر نے اُن کے ارادہ اور عمل کو اور تقویت بخشی۔ اُن کے دل کی تڑپ اور کسک میں اور اضافہ ہوا۔ واپسی کے بعد اونھوں نے زیادہ تیزی کے ساتھ اصلاح خواتین کے لیے قدم بڑھایا مشرق بعید میں بھی سیدہ نے اکثر مقامات پر تقریریں کیں وہاں کے اداروں اور اخباروں نے سیدہ کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور سیدہ کے محاسن سے اپنے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ کئے۔ سیدہ اختر انتہائی نڈر۔ باہمت۔ آہنی عزم رکھنے والی بے باک اور بے خوف خاتون ہیں اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتیں اور اعلائے کلمۃ الحق میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ ان کا قول ہے کہ ایک مصلح میں خلوص اور بے غرضی ہونی چاہیے۔ وہ گولیوں کی بوچھار کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ تعلّی نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ سیدہ مجاہدانہ جذبہ کی مالک ہیں۔ ایک زمانہ میں موجودہ سیاسی پارٹیوں میں خاکسار تحریک سے وقتی طور پر اونھیں لگاؤ پیدا

ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اس تحریک میں شریک ہوگئیں اور اپنے عزم وعمل سے اس تحریک میں بھی چار چاند لگا دیئے۔ پُرخلوص خدمات کے سلسلے میں سیدہ کو پہلے سالارِ تبلیغ اور پھر سالارِ "محاذ لکھنؤ" بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں جس وقت حکومت اور خاکساروں کے مابین ٹکر ہوئی تو سیّدہ اختر مردانہ وار میدانِ جنگ میں "سالار محاذ" یو۔ پی بن کر آئیں اور چند ہی دنوں میں علامہ مشرقی نے انھیں اپنے یہاں کا سب سے بڑا عہدہ "ناظم جنگ محاذ یو پی" دے دیا۔ موصوفہ نے اپنے عہدہ کا چارج لیتے ہی محاذ لکھنؤ کے نظام کو بے حد مضبوط کر دیا اور ہزارہا خاکساروں کو احکام دینے اور سب کا مکمل انتظام کرنے کی تنہا ذمہ دار بن گئیں۔ جب خاکساروں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تو سیدہ نے کان پور کو خاکساروں کا ہیڈ کوارٹر قرار دیدیا۔ حکام شہر اس سے بہت گھبرائے اس لئے کہ نقضِ امن کا اندیشہ تھا۔ کانپور میں دفعہ ۱۴۴ بھی قائم تھی۔ اس کے باوجود سیدہ تمام خاکساروں کے ساتھ بیلچے لیکر شہر کا گشت کرتی تھیں۔ چنانچہ کانپور کے کلکٹر صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک ہزار مسلح پولیس اور گورا پلٹن کے ساتھ سیدہ کی کوٹھی "فردوس اختر" پر آئے اور سیدہ سے جو اُس وقت جرنیلی لباس میں تھیں مطالبہ کیا کہ وہ فوراً خاکساروں کو کان پور سے باہر بھیج دیں اور بیلچے پولیس کے حوالہ کر دیں۔ سیدہ نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ خاکساروں کی جماعت ایک پُرامن

جماعت ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی خدمت گزار ہے' وغیرہ وغیرہ' حکام نے سیدہ کو گرفتاری کی دھمکی دی اس پر سیدہ نے جو کچھ جواب باد و قابلِ غور و فکر ہے۔ کہنے لگیں :-

"بسم اللہ میں گرفتاری کے لیئے تیار ہوں۔ آپ اپنی مشین گنوں کو حرکت میں لایئے۔ سینہ حاضر ہے۔ مجھے گرفتاری تو کیا مرنے سے بھی اِنکار نہیں۔ لیکن نتائج کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

واقعہ بہت طویل ہے' دکھانا یہ ہے کہ سیدہ کا جذبۂ خدمت کتنا جوان اور پُر جوش ہے اور اُن میں کس قدر حوصلہ مندی ہو آجکل سیدہ اختر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ کی صدر ہیں۔ قومی اداروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ غریبوں کی امداد۔ یتیموں کی پرورش اُن کا خاص شیوہ ہے اُن کی زندگی کا ہر لمحہ انہماک میں کٹتا ہے۔ اور وہ مصروفیت ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتی ہیں۔

قومی اور ملّی خدمات کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ ادب و شعر پر صرف ہوتا ہے جس طرح قومی خدمات کے سلسلے میں سیدہ کو شہرت حاصل ہے اسی طرح ادبی اور شعری دنیا میں بھی وہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ مشاعروں میں اُن کا کلام پسند کیا جاتا ہو نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل ہے نومبر ۱۹۴۲ء میں سیدہ نے ریاست میسور کے دار السلطنت بنگلور میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد

کی جس کے آخری اجلاس میں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے سیدہ کو "زهرۂ سخن" کا خطاب عطا فرمایا. جب سے سیدہ نے قوم و ملک کی خدمت اپنے ذمہ ہمت پرلی ہے اُس وقت سے شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ہے تغزل میں وہ سنجیدگی پسند کرتی ہیں چنانچہ کہتی ہیں ؎

جن سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز — مجھکو سُنا دیجئے پھر وہ نواہائے راز
ذوقِ طلب ہے تو پھر سُود و زیاں سے گذر — راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز
آہی گئی آج نیند سایۂ درِ یار پر — بیخودیٔ آرزو عمر ہو تیری دراز

سیدہ اختر نے نظمیں بھی بکثرت کہی ہیں۔ جن میں رومانی بھی ہیں اصلاحی بھی اور سیاسی بھی" نعرۂ مجاہد" سیدہ کی طویل نظم ہے چند شعر سُنیئے۔

سامنے سے میرے ہٹ جاؤ مجاہد ہوں میں — خاکپائے عمرؓ و حیدرؓ و خالدؓ ہوں میں
مردِ مومن ہوں ہر اک شے مرے ادراک میں ہے — برشِ تیغ مری ہر نگہ پاک میں ہے
آسماں پر ہے مری جرأت و ہمت کا دماغ — میں نے دُنیا میں جلایا ہے شجاعت کا چراغ
جان دینے پہ مجھے ناز ہے اللہ اللہ — موت اک زندگیٔ راز ہے اللہ اللہ
زندگی تیغ و تبر میں ہے نہ تلوار میں ہے — زندگی ایک مسلمان کے ایثار میں ہے
آتشِ وادیٔ ایمن مری تعمیر میں ہے — خدمت ضربِ کلیمی مری تقدیر میں ہے
دلِ پُرجوش میں اک آگ دبی رکھتی ہوں — تپشِ عشقِ حسینؑ ابن علیؓ رکھتی ہوں

مجکو سب یاد ہی اسلاف کا افسون جہاد   موجزن ہی میری رگ رگ میں ہی خون جہاد

ایک اور نظم کے دو بند دیکھیے:۔

جاگ اُٹھا ہے ذرہ ذرہ اور تم ہو محو خواب!
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب!

آسماں پر مہرِ تاباں ہو گیا ہے جلوہ گر
رات کی تاریکیوں پر چھا چکا نورِ سحر
ہائے تم اب تک طلوعِ صبح سے ہو بیخبر
حیرت اُن ذروں پہ جو ہیں ناشناسِ آفتاب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب!

خوابِ بیدار ہوا ای نوحہ خوانِ ہست و بود
دعوتِ فکر و عمل ہوتا ہی شاعر کا وجود
لعنت ایسی زندگی پر جس کا مقصد ہو جمود
زندگی تو در حقیقت ہے مسلسل اضطراب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب

سیدہ کسی سے اصلاح نہیں لیتیں اُن کی شاعری میں متانت اُبھار اور جوش پایا جاتا ہے۔ کلام نہ زیادہ مغلق ہے اور نہ بالکل سیدھا سادا نظموں غزلوں اور قطعات۔ رباعیات۔ افسانوں اور مضامین کے

کئی مجموعے تیار ہیں اور عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ ہمیں قومی و ملکی جذبات کے ساتھ بغیر پس و پیش سیدہ کی شعری اور ادبی خدمات کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی خواتین میں سیدہ اختر کا پایہ بہت بلند ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں جنوبی ہند کا آل انڈیا مشاعرہ و کانفرنس سیدہ کے علمی و ادبی کارناموں میں ایک درخشاں اور پائندہ نقش ہے۔ جس کی صدارت خود سیدہ اختر نے فرمائی اور جس میں ہندوستان کے کم و بیش تمام مشاہیر ادبا و شعرا اور ممتاز حضرات نے شرکت کی اور لطف کی بات یہ ہے اس مشاعرے اور کانفرنس کے تمام کثیر اخراجات سیدہ نے خود اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔ ہندوستان کے جن ممتاز حضرات نے اس مشاعرے میں شرکت کی ہے۔ اُن کے دل کی ہر دھڑکن سیدہ اختر کے اخلاق، مہماں نوازی، ادبی جوش اور پرخلوص سخاوت کی شاہد ہے۔ اور زمانہ اُن سے اِن حقائق کی تصدیق کر سکتا ہے، دور کیوں جایئے۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء سے "شاعر آگرہ" میں مسلسل اس مشاعرے اور کانفرنس کی روداد اور اُن کے دلچسپ حالات شائع ہو رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں آج تک اتنا عظیم بالشان، منظم اور تمام ہندوستان کی ادبی نمایندگی کرنے والا مشاعرہ نہیں ہوا۔

سعید الحسن آفس سکریٹری"

آمنہ 'برجیس'

برجلیس

محترمہ آمنہ برجلیس کے خودنوشتہ حالات جو آپ نے اس تذکرہ کے لیئے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں۔

"خودنوشت سے پہلے اعتذار کی ضرورت سمجھتے ہوئے چند سطور لکھنا مناسب سمجھتی ہوں:۔

مصنف نے مجھے تین چار ماہ کے دوران میں، خودنوشت نمونۂ کلام اور فوٹو کے لیئے کم و بیش دس بارہ خطوط روانہ کیئے تاخیر کا باعث، میری آشفتگی، مزاج سمجھئے یا زندگی کی الجھنوں، اور گوناگوں مصروفیتوں پر محمول فرمائیے۔ تکمیلِ فرمایش میں کافی دیر ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے:۔

خودنوشت چند سطور پر مشتمل ہے۔

میری پیدائش بمبئی میں ہوئی۔ تربیت اور تعلیم کا زیادہ حصہ یہیں گذرا۔ سکونت بمبئی سمجھئے، الہ آباد سمجھیئے، پرتاب گڈھ سمجھیئے یا لکھنؤ، میرے نزدیک میرا وطن ہندوستان ہے اور میری نظر میں کسی خاص شہر یا مقام میں تخصیص نہیں۔

جب تک بمبئی میں رہی، تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی تکمیل بھی آسانی سے ہوتی رہی اور چونکہ ابتدا سے میں نے ادبی ماحول میں پرورش پائی تھی، مجھے شعر گوئی کا ذوق وہیں سے پیدا ہوا۔ اس کے بعد کئی مقامات پر مختصر سکونت اور قیام کے بعد لکھنؤ آگئی۔ یہاں

تعلیم کے ساتھ ساتھ میں نے بہت محتاط ہو کر شعر گوئی کا آغاز کیا۔
مجھے اپنے کلام کی اشاعت اور نام و نمود کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔
اور نہ اب ہے۔ اس لیے میری چیزیں آج تک ہندوستان کے صرف
تین رسائل میں شائع ہوئیں جس میں سب سے پہلا پرچہ "اضطراب"
بنارس ہے، دوسرا "نگار" لکھنؤ اور تیسرا "ادیب" دلی۔ اضطراب
میں اشاعت کا باعث محترمی مسعود اختر جمال، نگار میں گرامی قدر
نیاز فتحپوری اور ادیب میں برادر گرامی اسرار الحق مجاز۔
میں بہت کم کہتی ہوں اور جو کچھ بھی کہتی ہوں وہ میرے اپنے
جذبات ہوتے ہیں۔ کسی خارجی شے سے متاثر ہو کر میں نے کبھی کچھ
نہیں کہا تھا مگر حال میں مجھے ایک فرمائشی نظم کہنی پڑی جو "نغمۂ آتشیں"
میں گزشتہ سال شائع ہوئی ہے۔
نمونہ کلام کے طور پر چند چیزیں حاضر ہیں :۔

آمنہ برجبیں بقلمہٗ لکھنؤ

محترمہ آمنہ برجبیں کی شاعری بالکل جذباتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے
اس میں نفسی تجربات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں
گہرائی اثر اور صداقت پیدا ہو گئی ہے جس کا کیف دیرپا اور پایندہ ہے۔
ہندوستان میں موجودہ دور، زندگی کا ایک انقلابی دور ہے۔ زندگی کا
پرانا نظام بوسیدہ ہو کر درہم برہم ہو رہا ہے مگر نیا نظام ابھی پوری طرح عالم وجود
میں نہیں آیا۔ موجودہ نسل کے نوجوان افراد کو ابھی اپنا نصب العین، اپنا مقصد

اور مسلکِ حیات پوری طرح واضح نہیں۔ تجربہ اور تعلیم کی وسعت نے انھیں ذہنی آزادی ضرور دے دی ہے۔ مگر مادّی، معاشرتی اور سماجی رکاوٹیں ابھی سدِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کے ذہن کو ابھی اس درمیانی دور کی پیچیدگیوں اور مشکلوں سے دوچار رہنا پڑ رہا ہے۔ ان واقعات نے ایک عام ہیجان، ایک مبہم خلش اور بیزاری و مایوسی کی ایک ہمہ گیر کیفیت پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کیفیات موجودہ شاعری کی سب سے عام اور سب سے نمایاں خصوصیات بن گئی ہیں، اور یہی خصوصیات محترمہ بجبیں کے کلام میں نمایاں ہیں۔ مبہم ماضی اور تاریک مستقبل جن کے اندھیروں میں سے کبھی کبھی امید کی کچھ روشن شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ اس کے ضروری اجزا ہیں۔ ان کیفیات میں گھر کر غمِ زیست کی موجودہ الجھنوں اور مصیبتوں کو محو کر دینے کے لیے بعض طبیعتیں ہوس کے کارہائے نشاط میں جذب ہو جاتی ہیں، اور بعض اپنے ہیجان اور جذبات کا کوئی مرکز تلاش کرتی ہیں اور کسی خیالی یا حقیقی محبوب کے آغوش میں سر رکھ کر ایک اعلیٰ جذبۂ محبت کی بیخودی میں غمِ امروز کو غرق کر دیتی ہیں۔ محترمہ جبیں کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔

اس ذہنی ہیجان اور اس مبہم خلش کی کیفیت ملاحظہ ہو

دل سے مٹ جائے محبت کہ ہے نقشِ دوام
آج وہ کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے

نغمۂ ساز بھی ساقی بھی مے و مینا بھی
دل مگر پھر بھی پریشان ہے یہ کیا عالم ہے

غمِ امروز کی یہ کیفیت ہے۔

مگر اب وہ پُرکیف باتیں نہیں ہیں   وہ دن اب نہیں ہیں وہ راتیں نہیں ہیں
مگر اس ہیجان و خلش اور اس غمِ امروز کا مداوا یہ ہے
لبِ زندگی پر محبت کا نغمہ   تری آرزو بن کے تھرا رہا ہے
جدا ہوں، مگر آج میرا تصور   انھیں اپنی آغوش میں پا رہا ہے

محترمہ کا کلام فن کارانہ ہے اس میں نازک اور لطیف احساسات ہیں، شاعرانہ خلوص ہے، شیریں تغزل ہے۔ وہ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال سے واقف ہیں اور ان کا انتخاب بڑے سلیقہ سے کرتی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کے انداز بیان میں ایک پاکیزگی اور نفاست ہے جس سے ان کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

محترمہ کا مرسلہ انتخاب درج ذیل ہے، آپ کی نظم "نغمۂ بیداری" جو "نغمۂ آتشیں" میں چھپی ہے اور جس کا ذکر محترمہ نے سطور بالا میں فرمایا ہے۔ آپ کے مرسلہ کلام کے علاوہ پیش کی جا رہی ہے۔ اس نظم کے دو بند حذف کر دیے گئے ہیں:

حجابِ نغمہ

تصورات کے موتی لٹا رہی ہوں میں   تمھاری یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں
تعینات کے پردے اٹھا رہی ہوں میں   خیال و فکر کی جنت بسا رہی ہوں میں
شبِ فراق میں یوں اُن کی یاد آتی ہے   کہ جیسے اُن کو بھی خود یاد آ رہی ہوں میں
اُٹھا دیا ہی شبستانِ زندگی کا نقاب   مثالِ شمعِ سحر جھلملا رہی ہوں میں
کمالِ جذبِ تصور کا معجزہ ہے یہ   اُنھیں خود اپنی جگہ آج پا رہی ہوں میں

کسی کی برقِ محبت ہم کو یاد کرتی ہوں
خود اپنے دل کا نشیمن جلا رہی ہوں میں

یہ انقلاب محبت میں کیا ہوا ہے جبیں
کہ دل سے نقشِ تمنا مٹا رہی ہوں میں

فردوسِ خیال

تخیل نگاہوں سے شرما رہا ہے
کوئی آج رہ رہ کے یاد آرہا ہے

کہیں جیسے دیکھا تھا اک خواب رنگیں
مجھیں دیکھ کر یہ خیال آرہا ہے

نظر ہے کہ مائل بہ پرواز ہر دم
قدم ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے

لبِ زندگی پر محبت کا نغمہ
تری آرزو بن کے تھرا رہا ہے

سکوں بخش تھا جس کا رنگیں تصور
وہی آج پھر دل کو تڑپا رہا ہے

فدائے محبت نے چھیڑا تھا جس کو
فضا پر وہی زمزمہ چھا رہا ہے

تمنائے دل آج پھر جاگ اٹھی ہے
کوئی نغمۂ شوق پھر گا رہا ہے

جدا ہوں مگر آج میرا تصور
انھیں اپنی آغوش میں پا رہا ہے

نقوشِ ماضی

مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ
گذرتی تھی جب زندگی والہانہ

فضاؤں میں رقصاں مسرت کی لہریں
محبت میں ڈوبا ہوا اک فسانہ

ہر اک بات تھی دلنوازی کے شایاں
ہر اک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ

ہر اک ذوقِ باطن۔ ہر اک شوقِ پنہاں
وفا کی حقیقت۔ جنوں کا فسانہ

نظر در حجِ سرشار کا اک تبسم
نفس بر بطِ عشق کا اک ترانہ

منانا کہوں یا بگڑنا کہوں میں — خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ
کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت — کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ
کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں — مذاقِ محبت کبھی عارفانہ
کبھی روح پرور ادائیں تمہاری — کبھی برہمی تھی سخن گسترانہ
تغافل کے پردے میں دل کی لگاوٹ — تجاہل - محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پُرکیف باتیں نہیں ہیں
وہ دن اب نہیں ہیں وہ راتیں نہیں ہیں

غزل

ہائے کیا تابشِ خورشید، رمِ شبنم ہے — میرے احساس کی دنیا بھی ترا عالم ہے
دل سے مٹ جائے محبت کہ یہ نقشِ دوام — آج یہ کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے
کسی طوفانِ مسرت کی خبر ہے شاید — نغمۂ شوق کی لے آج جو کچھ مدھم ہے
نغمہ و ساز بھی، ساقی بھی، مے و مینا بھی — دل مگر پھر بھی پریشاں ہے یہ کیا عالم ہے
کیوں چھلک اُٹھتی ہے رہ رہ کے یہ احساس کی مے — کیا مری یاد میں وہ چشمِ حسیں پُرنم ہے
عشق ہی کیف جوانی ہے، مگر افسردہ — حسن ہی نقشِ حقیقت ہے مگر مبہم ہے

میرا افسانہ تو دلچسپ ہے لیکن ہم جلیس
نہ ہمہ نغمۂ عشرت، نہ ہمہ ماتم ہے

نغمۂ بیداری

ہشیار ہو اے اربابِ وطن — بیدار ہو اے اربابِ وطن
ظلمت کا گریباں چاک ہے پھر

دامانِ سحر نمناک ہے پھر
اب شعلہ نفس ادراک ہے پھر
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

وہ بزمِ نشاط و رقص نہیں
بے نور ہوئے ماہ و پروین
تاریک ہوئی زہرہ کی جبیں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

اب جام و صبو کا ہوش کہاں
دل میں وہ مئے سرجوش کہاں
ساقی وہ کہاں مے نوش کہاں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

یہ ابر ہے یا آہوں کا دھواں
یہ برق ہے یا شمشیر رواں
برہم ہے فضائے کون و مکاں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

دیکھو یہ چمن برباد نہ ہو
پامالِ غمِ بیداد نہ ہو
پھر چرخِ ستم ایجاد نہ ہو
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

یہ جنگ کی خونیں تدبیریں
یہ جبر و ہوس کی تعزیریں
ڈوبی ہیں لہو میں شمشیریں
ہشیار رہو اے اربابِ وطن بیدار رہو اے اربابِ وطن
لیکن یہ زمانہ بدلے گا
اک دن یہ فسانہ بدلے گا
خوں ریز ترانہ بدلے گا
ہشیار رہو اے اربابِ وطن بیدار رہو اے اربابِ وطن

بیدل ۔ محترمہ رسول جہاں بیگم۔

محترمہ رسول جہاں بیگم بیدلؔ، بیگم ڈاکٹر رفعت حسین صاحب صدیقی ایم ایس، سی، پی، ایچ، ڈی، (علیگ) ڈی فل (آکسن) کی شریکِ حیات اور محترمہ نورجہاں بیگم نورؔ کی بڑی بہن ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے حالات جو خود رقم فرما کر ارسال کئے ہیں درج ذیل ہیں:۔

"سنہ۱۹۱۶ء میں عارف پور نواده کے خوش حال خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد چودھری اساس الدین وہاں کی متمول ہستیوں میں سے تھے لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور صرف انتالیس سال کی عمر میں راہی مُلکِ بقا ہوئے۔ اب ایک بھائی تھا اور دو بہنیں اور آغوشِ مادر۔ ہماری ساری آرزوئیں اور اُمیدیں اِس چھوٹے سے بھائی کے دم سے

وابستہ تھیں۔ لیکن تین سال بعد وہ بھی ہمیشہ کے لیئے داغ مفارقت دے گیا۔ اُمّی نے باوجود بیوگی کی تکالیف اور دیگر مصائب کے ہماری نہایت ناز ونعم سے پرورش کی۔ والد کی وفات سے شادی تک کا کُل زمانہ نانا کے سایہ عاطفت میں گزرا۔ ۱۹۲۱ء میں میرا نکاح میرے والد کے قریبی رشتہ کے بھتیجے سے ہو گیا۔ ابھی رخصت بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نکاح سے چند ہی ماہ بعد امی بھی جن کا والد کی وفات کے بعد بیشتر وقت یادِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ راہیِ باغِ جناں ہوئیں۔ میرے نانا نے میری رخصت مثل اپنی بیٹیوں کے کی۔ میرے شوہر کی تعلیم اُس وقت تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں ایم۔ ایس۔ سی و ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں ہیں اسی دوران میں ان کے ساتھ علی گڑھ رہی۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال بغرض اعلیٰ تعلیم انگلستان چلے گئے۔ اکسفورڈ سے ڈی فل کی ڈگری کیمسٹری میں لیکر ۱۹۳۶ء میں واپس ہوئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں یہ پہلے شخص ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں میرے شوہر ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی کا آتے ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ کیمسٹری میں تقرر ہو گیا دسمبر ۱۹۴۲ء میں امپریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ امپریل ایگریکلچرل کیمسٹ کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا اور دہلی چلے آئے جو کہ اب ہمارا مسکن ہے۔

میرے اس وقت چار بچے ہیں دو لڑکیاں اور دو لڑکے جو سب کے سب زیرِ تعلیم ہیں۔ میری تعلیم کسی اسکول یا مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ بابا کے مکان کی چار دیواری میں۔ شعر و شاعری سے مناسبت کچھ شروع عمر سے تھی۔

بیدلؔ

محترمہ دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ اور پر گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام پر قومی اور مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اسلام اور بانی اسلام (صلعم) سے آپ کو عشق ہے جس کا اظہار آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نعتیں اکثر بہت بلند اور پر اثر ہوتی ہیں آپ نے مسلمانوں کو اُن کی دیرینہ عظمت یاد دلائی ہے۔ اور اُن کو اُن کی موجودہ غفلت سے بیدار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس رنگ میں آپ علامہ اقبالؒ سے متاثر نظر آتی ہیں۔ آپ کا دل طبقہ نسواں کی عام مظلومیت، جہالت، غفلت اور پستی پر بھی دکھا ہے اور آپ نے ان کی اصلاح کی بھی کوشش کی ہے۔ آپ نے مردوں سے حقوق نسواں کا مطالبہ کیا ہے اور عورتوں کو اُن کے حقوق و فرائض یاد دلائے ہیں۔ آپ مشرقی و اسلامی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور جوہرِ نسوانیت کے صحیح نشو و نما کے لئے اس تہذیب کو ضروری اور مفید خیال کرتی ہیں۔ آپ نے مسلمان مرد اور عورتوں کو بیداری اور عمل کا پیغام دیا ہے۔

محترمہ کا مرسلہ انتخاب کلام درج ذیل ہے:-

نعت

وہ رسولؐ ہاشمی والا نسب عالی جناب　　منظہر نورِ خدا برجِ شرف کا آفتاب
رحمت للعلمین جس کو دیا حق نے خطاب　　وہ شہ امی لقبؐ اور صاحب ام الکتاب

رونق بزم جہان و گلشنِ قدرت کا پھول
باعثِ تخلیقِ عالم جس کی ہے شان نزول

جس نے باطل کے سفینہ کو ڈبویا وہ رسولؐ　　جس نے کفر و جہل کی ظلمت کو کھویا وہ رسولؐ
اُمتِ عاصی کی خاطر جو نہ سویا وہ رسولؐ　　پیشِ خالق رات بھر سجدہ میں رویا وہ رسولؐ

جس نے اپنے خوں سے سینچا گلشن اسلام کو
کر دیا روشن زمانہ میں خدا کے نام کو

نورِ یزداں سے منور جس کی ذاتِ پاک ہے　　عطرِ عرفاں سے معطر جس کی ذاتِ پاک ہے
خلق کی حامی و یاور جس کی ذاتِ پاک ہے　　قاسم تسنیم و کوثر جس کی ذات پاک ہے

جس کی چشمِ لطف ہے غمخوار ہر دل گیر کی
جس کے در کی خاک ہے نائبِ ہے اکسیر کی

وہ بہارِ بزمِ ہستی کا گل سرو رواں　　ساکنِ محمودِ اعلیٰ مالک باغ جناں
جس کا ہے قصر معلیٰ سجدہ گاہِ قدسیاں　　جس کو بخشا حق نے جبرئیلِ امیں سا رازداں

فخر دنیا فخر دیں - فخر عجم - فخر عرب
روز محشر ہے شفیع المذنبین جس کا لقب

وہ مجسم رحم لیکن ظالموں پر سخت گیر　　جس کی شانِ پاک ہے آیا بشیراً اور نذیر
مالکِ کونین اور لذت کش نانِ شعیر　　بہترین خلق لیکن بندۂ رب قدیر

فقر و شاہی کو ہے نازش جس کی ذاتِ پاک پر
عرش پر جس کے قدم لیکن جبیں ہے خاک پر

وارثِ تاجِ کیاں و تختِ جم جس کے غلام
جن کی تیغوں نے بدل ڈالا نظامِ صبح شام

توسنِ ایام کی تھی جن کے ہاتھوں میں لگام
روند ڈالا جن کے رہوار و نے روم مصر شام

کارنامے اُن کے اب بھی اک جہاں کو یاد ہیں
اُن کے نقشِ پا سے اب بھی رہ گزر آباد ہیں

ختم کر طولِ بیاں اب بیدلِ خستہ جگر
ان مبارک ہستیوں کے واسطے سے عرض کر

اے خدا پھر دامنِ اسلام کو وہ دُرِ گُہر
جس کی تابانی سے خیرہ ہو زمانہ کی نظر

اے خدا صدیقؓ و فاروقؓ و علیؓ کو بھیج دے
سومناتِ دہر میں پھر غزنوی کو بھیج دے

مہکا وہ گُلِ لولاک لما جب یثرب کے گلزاروں میں
توحید کی نکہت پھیل گئی تثلیث کے سارے اداروں میں

عالم سے جہالت دور ہوئی۔ دنیا سے جفا کافور ہوئی
مندر میں اذاں کا شور اُٹھا۔ توبہ کی صدا میخواروں میں

وہ دولتِ سرمدی جو طیبہ کی گلیوں میں لُٹی
اربابِ ہوس کو وہ نہ ملی سلطانوں کے درباروں میں

اے ابرِ سخا۔ ہاں جھوم کے آ۔ ہے شورِ عطش پیاسوں میں بپا
اے جانِ مسیحا چشمِ کرم اب تاب نہیں بیماروں میں

ہیں تیری گلی کے خاک بسر صد قیصر و کسریٰ سے بڑھکر
ہیں تیری ادا کے دیوانے خود دنیا کے ہشیاروں میں
وہ جس نے دیا منزل کا پتا وہ جس نے دکھائی راہ ہدیٰ
گم کردہ منزل قافلہ تھا جب غم کی راہ گزاروں میں
جو رنگ جہاں میں ظہور کا ہے، صدقہ یہ اُسی کے نور کا ہی
ہے اُس کی تجلی تاروں میں، ہی اس کی مہک گلزاروں میں
اب خواب فنا سے اُس کو جگا پھر مسلم خوابیدہ کو سنا
جو نعرۂ حق گونجا تھا کبھی میدانوں میں کہساروں میں
سرسبز ہوا گلزار جہاں فیضان سحاب رحمت سے
پھولوں کا تو بیدل ذکر ہی کیا باقی نہیں سختی خاروں میں

یثرب کے جانے والے

اے دیارِ شہ ذیجاہ کے جانے والے　　خاص دربارِ شہنشاہ کے جانے والے
سرورِ خلق کی درگاہ کے جانے والے　　منزل رحمت اللہ کے جانے والے
ہم سے برگشتہ نصیبوں کی خبر لیتا جا
تو سلامِ دل تفسیدہ جگر لیتا جا
تجھ کو قسمت نے دکھائے ہیں یہ ایام سعید　　کیوں نہ ہو اوج شرف پر ہی ترا نجم امید
تو ہی اور گلشن یثرب کی بہار جاوید　　ہیں نہیں جلوۂ جاناں کے اگر قابلِ دید
فرش رہ کے لئے تو میری نظر لیتا جا

تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

شکر کر دل سے ادا بخت کی بیداری کا　　تو ہوا خیر سے موجب کرمِ باری کا
ہاں مگر یاں رہے رسم وفاداری کا　　شغل ہوتا درِ محبوب گہرباری کا

ہو ضرورت تو مرے دیدۂ تر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

ضو فشاں جب تری قسمت کا ستارہ ہوگا　　سامنے مسکنِ محبوبِ دل آرا ہوگا
گنبدِ سبز کا جی بھر کے نظارہ ہوگا　　باریابی کا سرِ بزم اشارا ہوگا

اپنی رنگین بیانی میں اثر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

جب ملے آہ رسا کو تیری اذنِ پرواز　　پہونچے تقدیر تجھے لیکے سرِ محفلِ ناز
کوئی تحفہ تو نہیں لائقِ سلطانِ حجاز　　مگر اک عرض ہے ناچیز کی ای بندہ نواز

نذر کو چشمِ عقیدت کے گہر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

ڈوبتی ناؤ کو ساحل پہ لگانے کے لیے　　بند آفت سے اسیروں کو چھڑانے کیلیے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کیلیے　　قصۂ کاوشِ غم اُن کو سُنانے کے لیے

روح میں سوز، دعاؤں میں اثر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

آہ[1] میں طاقتِ پرواز نہیں ہے نہ سہی　　عشق میں جذب کا انداز نہیں ہے نہ سہی
نالہ تاثیر سے دمساز نہیں ہے نہ سہی　　دل تجلی سے سرافراز نہیں ہے نہ سہی

---

[1] (نوٹ صفحہ ۷۸۳ پر ملاحظہ کیجئے)

میری شب کرنے کو مانند سحر لیتا جا
تو سلام دل تفسیدہ جگر لیتا جا

پہونچے جب سرور کونین کے کاشانے پر	کہیو اب روح ہی آمادہ نکل جانے پر
ننگ ہے جامۂ ہستی ترے دیوانے پر	دل بیتاب بہلتا نہیں بہلانے پر
خبر شیفتۂ خاک بسر لیتا جا
تو سلام دل تفسیدہ جگر لیتا جا

سر پہ ادبار کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے	طاقت ضبط نہ یارائے شکیبائی ہے
تیرے بدخواہ ہیں اور انجمن آرائی ہے	تیرے خدام ہیں اور ذلت و رسوائی ہے
عرض یہ پیش شہ دین و بشر لیتا جا
تو سلام دل تفسیدہ جگر لیتا جا

نوٹ صفحہ ۷۸۲ مثلاً علامہ اقبال

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی	جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی	اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے	(بانگ درا شکوہ ص ۱۸۲)

ملاحظہ اقبال ؟

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے	کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

ہم

دل ہے آشفتہ طبیعت ہے فغانی میری　　قلق انگیز ہے اندوہ بیانی میری
نہ کہی جائیگی تجھ سے یہ کہانی میری　　خوب ہوتا جو بیاں ہوتی زبانی میری
تو پئے ذکرِ مرا قلب و جگر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

السلام اے شہ مکی مدنی العربی　　السلام اے قرشی ہاشمی و مطلبی
السلام اے مہ اوجِ فلک خوش نقبی　　السلام اے گہرِ قلزمِ والا نسبی
درِ آقا پہ عقیدت سے غلام آئے ہیں
ہند کے خستہ جگر بہرِ سلام آئے ہیں

لیجیئے بندِ مصیبت کے اسیروں کا سلام　　لیجیئے یا شہِ کونین فقیروں کا سلام
فاقہ مستوں کا غریبوں کا امیروں کا سلام　　قوم کے طفلوں کا برناؤں کا پیروں کا سلام
گر سلام اپنا قبول شہِ والا ہو جائے
شبِ تاریکِ مصائب میں اُجالا ہو جائے

رودادِ سوال

چھپا رکھا تھا شکوہ دل میں ہم نے دل کے محرم کا　　بنا رکھا تھا خرمن اپنا سینہ شعلۂ غم کا
نہ خوگر ہو سکا جب دردِ دل صدماتِ پیہم کا　　وسیلہ بن گیا زخمِ جگر تدبیرِ مرہم کا
لبِ خاموش نے آخر سکوتِ دائمی توڑا
قلوبِ مطمئن نے دامنِ صبر و سکوں چھوڑا
تمنا بن کے حبِ سینے سے آہوں کا شرار اُٹھا　　برسنے دیدۂ تر شل ابرِ نو بہار اُٹھا

تڑپ کر صورتِ سیماب قلبِ بے قرار اُٹھا
قفس میں طائرِ جاں مضطرب ہو کر پکار اُٹھا
رقم کر خونِ حسرت سے فسانہ زندگانی کا
سنا ہیں ضعفِ غالب کو ورق اپنی کہانی کا

نہ پوچھو کیفیت ہم سے ہماری جذبۂ دل کی
ہوئی گُل روتے روتے شمع آخر اپنی محفل کی
نہ کی صیاد نے پروا ذرا شورِ عنادل کی
کہ ویرانہ قفس کا انتہا تھی اپنی منزل کی
بنا کر تختۂ مشقِ ستم جلاد نے رکھا
ہمیں پابند کر کے بانیٔ بیداد نے رکھا

رکھا بیزار جاں سے نت نئی آزار نے صد یوں
لٹائے نقدِ الفت چشمِ گوہر بار نے صد یوں
رکھا پابندِ آفت چرخِ کج رفتار نے صد یوں
جلایا اپنا گلشن آتشِ پیکار نے صد یوں
عذابِ روح تھا ہر سانس گو خوفِ شماتت سے
نہ پھیرا منہ کو لیکن حکمِ ناطق کی اطاعت سے

سہے ہم نے ہزاروں حسرت و آلام دنیا میں
رکھا محرومیٔ تقدیر نے ناکام دنیا میں
نہ پایا کوئی پل کوئی گھڑی آرام دنیا میں
رہے مرغِ قفس ہو کر اسیرِ دام دنیا میں
جہاں میں گوہرِ مہر و وفا کی آبرو بن کر
رہے خاموش مثلِ گُل پریشاں مثلِ بو بن کر

گرے گی جانِ مضطر پر الم کی بجلیاں کب تک
بنیں گی یہاں گھر کی ستم آرائیاں کب تک
حوادث کے تھپیڑوں کی تلاطم خیزیاں کب تک
رہیں گی ورطۂ غم میں ہماری کشتیاں کب تک
اُجاڑے گا تمہارا ظلم کب تک جانستاں ہنگر
ہمارے گلشنِ امید کو بادِ خزاں ہنگر

ہمیں دیکھو گے تم کبتک حقارت کی نگاہوں سے
رہیگی دشمنی کبتک تمہیں ہم بے گناہوں سے
دھواں کبتک اٹھیگا اپنی دردِ انگیز آہوں سے
رہیگی تا کجا بے اعتنائی دادخواہوں سے
رہیگا بند کبتک ہم پہ آزادی کا دروازہ
کہاں تک آرزو کا خوں رخِ مظلوم کا غازہ

رہے دنیا میں ہم دکھتے ہوئے دل کی صدا بنکر
کہیں بے نور آنکھوں کے لئے نور و ضیا بنکر
کہیں بیکس ضعیفوں کے سہارے کو عصا بنکر
ادا کرتے رہے حق پیکرِ مہر و وفا بنکر
دیا ہے ہر طریقہ سے ثبوت اپنی صفائی کا
رہا اس پر بھی زندہ نام ہم سے بیوفائی کا

بنایا عفت و شرم و حیا کو پاسدار اپنا
عمل پوشاک اور زیور رہا صبر و قرار اپنا
رکھا پوشیدہ دل میں جذبۂ بے اختیار اپنا
رہا تلخی میں بھی غم کی تخیل خوشگوار اپنا
دکھایا عزم ہم نے معدنِ صدق و صفا ہو کر
گزاری زندگی پابند آئینِ وفا رہ کر

بسے گو دل میں تم کا شانۂ دل کے مکیں بنکر
امانت قوم کی برباد کی لیکن امیں بنکر
روا رکھا ستم ہم پر نبیؐ کے جانشیں بنکر
اجاڑا تم نے گلشن تخلیہ زاغ دیں بنکر
کہو انصاف سے خود۔ کیا ٹھکانا ہے مظالم کا
رکھے اسلام پر الزام جو اپنے مظالم کا

بزرگانِ طریقت بھی نرالی شان رکھتے ہیں
وہ کہنے کو خدا کے حکم پر ایمان رکھتے ہیں
صداقت کے لئے اپنی سند قرآن رکھتے ہیں
غضب ہے مصحف پر کھلا بہتان رکھتے ہیں
سناتے ہیں یہ پڑھکر ترجمہ آیاتِ قرآں کا

کہ اس میں صاف ہی فرمان قیدِ بندِ نسواں کا

ہیں موتی اک صدف کے ایک گلشن کے ثمر دونوں
ہوئے اک نخل کے سایہ میں پل کر بارور دونوں
ہیں اک صانع کی صنعت کے کرشموں کا اثر دونوں
ہیں اک خالق کے بندے ایک رحمت کی نظر دونوں
کیا کیوں بند ہم پر اُس نے بابِ علم و آزادی
ہوئی منظور کیوں قدرت کو اپنی خانہ بربادی

بتاؤ تو طریقہ بانیٔ اسلام کا کیا تھا
ہماری سر پہ احسان اُن کے فیضِ عام کا کیا تھا
تمھیں معلوم ہے آغاز اس انجام کا کیا تھا
کلام اللہ میں حق اس ہستیٔ ناکام کا کیا تھا
اگر دشمن ہے اک عالم تو ہو، اللہ یاور ہے
پڑھو قرآن میں ھُنَّ لباسٌ حکمِ داور ہے

وہ جس کی ذاتِ اقدس بن کے الطافِ عمیم آئی
وہ رحمت ساتھ جس کے رحمتِ ذاتِ قدیم آئی
جہاں میں ساغرِ توحید کی بن کر قسیم آئی
لٹاتی بوئے وحدت باغ میں بن کر نسیم آئی
سرِ فاراں پہ جھنڈا جس نے آزادی کا لہرایا
گریزاں جس کے پرتو سے ہوا الحاد کا سایا

وہ محبوبِ خدا، سردارِ عالم، ہادیٔ دوراں
وہ کل کی عقل پر غالب تھی جس کی عقلِ یکہ داں
کفیلِ طبقۂ نسواں تھا جس کا سایۂ داماں
بنا جس کا کرم ہم بیکسوں کی زیست کا ساماں
دیئے تھے جو حقوقِ زندگی اُس پاک ہستی نے
کیے نذرِ فنا وہ سب تمھاری چیرہ دستی نے

قوانینِ شریعت کا بنا کر رازداں ہم کو
رفاہِ زندگی میں کر دیا ذی اختیار ہم کو
سیاسی مجلسوں میں اُس نے بخشا اقتدار ہم کو
بنایا محفلِ علم و ادب کا حصہ دار ہم کو

ملی اس کے عمل میں طبقۂ نسواں کو آزادی
شریکِ حال قسمت بن گیا اسلام کا ہادی[1]

کتابوں میں خواتینِ سلف کا حال زندہ ہے　　زمانے میں ہمارا عزم و استقلال زندہ ہے
رضیہ کی حکومت نورؔ کا اقبال زندہ ہے　　زبیدہ کا تجمل خولہ کا اجلال زندہ ہے

ابھی ہے اپنا سینہ شوکتِ ماضی کا آئینہ
دکھاتا ہے جو اپنے عکس میں احوالِ پارینہ

خبر ہے صنفِ نازک ہی کی وہ جنسِ گرانمایہ　　کہ جس کے سر پہ پہلے پرچمِ اسلام لہرایا
وہ جس نے خلق میں اول مسلماں کا لقب پایا　　کیا نذرِ پیمبر زندگی کا اپنی سرمایا

نتیجہ ہے یہ ازواجِ پیمبر کی ثقاہت کا
ذخیرہ ہے جو دنیا میں احادیثِ نبوت کا[2]

نہاں قدموں میں جس کے روضۂ رضواں کی تفسیریں[3]　　کہیں جس کی دعا سے کاتبِ قدرت کی تحریریں
ہوئیں روشن افق پر ماہ بن کر جن کی تقدیریں　　اسی خوابِ پریشاں کی ہیں عالم میں تعبیریں

مشامِ ہر دو عالم ہیں معطر جن کی نکہت سے
ہوئے ہیں بارور وہ گل اسی شاخِ محبت سے[4]

---

[1] اسلام کی تاریخ میں ام المومنین حضرت بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ سب سے پہلی مسلمان ہیں۔ "ن ج"

[2] ام المومنین حضرت بی بی عائشہؓ کی بدولت احادیث کا ایک بڑا درست اور گرانمایہ ذخیرہ ہم تک پہنچا۔ "ن ج"

[3] اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف جس میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ "ن ج"

[4] علامہ اقبالؒ :-

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی　　کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن　　اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

(ضرب کلیم)

تمہاری ذات جب تک کشتیٔ حق کا سہارا تھی — وفاداری ہماری قوم پر سب آشکارا تھی
تمہیں ہم سے مساوات عمل جب تک گوارا تھی — فضائے گلشن اسلام جنت کا نظارا تھی
نہ کھٹکا تھا حوادث کا نہ غم افتاد کا اُس کو
نہ گلچیں کا خطر تھا اور نہ ڈر صیاد کا اُس کو

خود اپنے ہاتھ سے تخریب ملت کی بنا ڈالی — ہمیں جاہل بنا کر تم نے ملت خود مٹا ڈالی
مصیبت کس زمانے کی ہمارے سر پہ لا ڈالی — جو کشت آرزو خون جگر سے سینچی تھی سکھا ڈالی
نہیں ممکن کہ تاریکی میں ہو روشن نظر پیدا
ضیائے مہر رخشندہ سے ہوتی ہے سحر پیدا

ابھی ہے وقت باقی اپنی کج فہمی سے باز آؤ — مسلماں ہو تو احکام شریعت کو بجا لاؤ
ہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کی لذت سے نہ ترساؤ — بنا کر ہم کو بسمل کنج عزلت میں نہ تڑپاؤ
گذر جائے مبادا اس کا وقت اور بات رہ جائے
نکل جائے یہ موقع حسرت مافات رہ جائے

خبر ہے قائد اعظم نے جو تم کو نصیحت کی — کہ شمشیر و قلم دونوں ہیں زینت کاخ ملت کی
مگر ان دونوں سے بڑھ کر کہیں طاقت ہے عورت کی — حقیقت میں یہی بنیاد ہے قومی عمارت کی
وہ ملت پا نہیں سکتی کبھی انوار آزادی
معطل اور ناکارہ ہو جس کی نصف آبادی

غم آگیں کس قدر یہ داستان تلخ کامی ہے — جو قسمت سے کوئی آزادیٔ نسواں کا حامی ہے
تو آزادی نہیں وہ اہلِ مغرب کی غلامی ہے — نگاہِ دل کی بیباکی ہوس کی بے لگامی ہے
یہ آزادی ہماری دکھ کا درماں ہو نہیں سکتی

یہ تاریکی حریفِ مہرِ تاباں ہو نہیں سکتی

مآل اس تربیت کا ہے فقط ذوقِ تن آسانی
نہ اس میں جذبۂ غیرت نہ احساس مسلمانی
سعادت فاطمہؓ کی ہے نہ صدیقہؓ کی تابانی
قبیلِ اسوۂ حسنہ ہے یہ تعلیم نسوانی

نگاہِ ناز کو اپنی جو یوں بیباک کرتے ہیں
وہ اپنے ہاتھ سے عصمت کا پردہ چاک کرتے ہیں

نگہ بیباک ہوتی ہے تو دل تاریک ہوتے ہیں
گریزاں شرم و غیرت سو سے نزدیک ہوتے ہیں
حجاب آمیز ہوتے ہیں تو جلوے ٹھیک ہوتے ہیں
توازن رکھنے والے لائق تبریک ہوتے ہیں

نگہ کی خیرگی اچھی نہ دل کی تیرگی اچھی
اُجالا جس سے دنیا میں رہے وہ روشنی اچھی

اُصولِ دینِ بیضا کی علمبردار بن جاؤں
اخوت کی سپر اسلام کی تلوار بن جاؤں
گلستانِ عمل کی عندلیب زار بن جاؤں
تہِ دل سے کنیزِ احمدِ مختارؐ بن جاؤں

ہوں سرگرمِ عمل کشتِ وفا کی آبیاری کو
سمجھ کر اپنا فرضِ اولیں طاعت گزاری کو

خدایا ہم کنیزوں کو عمل کی تو ہدایت دے
ارادوں میں بلندی حوصلوں میں استقامت دے
شجاعت اُمِ عمارہؓ کی اسماؓ کی فراست دے
ہو قائم سطوتِ اسلام جس سے وہ صداقت دے

نشانِ پرچمِ نسواں کو پھر عالم میں بالا کر
وفاؤں کا ہماری پھر جہاں میں بول بالا کر

مسلم سے خطاب

اے مسلماں ملتِ خیر البشر کے تاجدار پیکرِ سعی و عمل تھا زیست کا تیری معیار
آیۂ لا تقنطو کا راز تجھ پر آشکار سورہ انا فتحنا سے عیاں تیرا وقار
اک زمانہ خوشہ چیں تھا تیرے فیضِ عام کا
تجھ سے دنیا میں ہوا سر سبز باغ اسلام کا

حق میں اربابِ دغل کے تیری تیغِ بے نیام بن کے دستِ لم یزل لیتی تھی اپنا انتقام
خلق کو درسِ عمل تھا تیرا حسنِ انتظام اور نگاہِ ژرف بیں کو خود فروشی کا پیام
تو صداقت کے چمن کا اک گلِ شاداب تھا
معدنِ جود و سخا کا گوہرِ نایاب تھا

تیری نظروں میں جہانِ آب و گل سے تھیں بلند تیری فطرت تھی فضائے لامکاں سے بہرہ مند
گردشِ چرخِ کہن تھی تیرے حق میں سودمند انقلابِ دہرِ فانی سے نہ تھا تجھکو گزند
تیری ہستی نغمۂ توحید کا اک ساز تھی
کفر کش باطل شکن جس کی ہر اک آواز تھی

یورشِ ظلم و ستم کا گرم جب بازار تھا کفر کا آتش کدہ تیرے لیے گلزار تھا
حق کی خاطر تو ہمیشہ برسرِ پیکار تھا خطرۂ جاں تھا نہ خوفِ مرگ سے بیزار تھا
خوف تھا تجھکو نہ برق و صرصر و صیاد سے
گلستاں محفوظ تھا تیرا ہر اک افتاد سے

تیرے ہاتھوں میں عناں تھی توسنِ ایام کی رفعتِ پرواز ہمسر چرخِ نیلی فام کی
تھی فروزاں شمع تجھ سے ملتِ اسلام کی تیری جولانگاہ وسعت روم و مصر و شام کی

تیری ہمت لیتی تھی اسکندر و دارا سے باج
تھا قدم بوسی کو حاضر قیصر و کسریٰ کا تاج

رشکِ صد گلزار تھی تیری گلستاں کی بہار
جس کی شاخیں نغمۂ توحید سے تھیں استوار

تجھ کو تھا سرداری ملت کا خلعت زرنگار
زیر فرماں تھی تیری شمس و قمر لیل و نہار

کائناتِ بزم ہستی حکم پہ استادہ تھی
پیر گردوں کی جبیں در پر تری افتادہ تھی

پرچم اقبال تھا تیرا کبھی کشور نشاں
کشتی امید کی تھی رحمتِ حق بادباں

فصلِ گل کو ابر نیساں تیرا فیضِ بیکراں
قہر تیرا خرمن باطل کو تھا برقِ تپاں

دل کو جب سے محو ذوقِ خود پرستی کر لیا
آپ کو غارت گر ناموسِ ہستی کر لیا

آج ہستی تیری وقفِ ماتم امید ہے
تو ہے مردہ تیری عظمت زندہ جاوید ہے

اٹھ کہ پھر در پیش بزم دہر کی تجدید ہے
تیری پیشانی میں تاباں جلوہ توحید ہے

دور کر غفلت کے پردوں کو دلِ بیتاب سے
طالع خفتہ کو چونکا دے خودی کے خواب سے

زینتِ محفل تھا کل تا آج ہے تنگ جہاں
وجہ عبرت بن گئی دنیا کو تیری داستاں

تیرے قبضہ میں تھی کل تک یہ زمین و آسماں
ہے شبِ ظلمت میں اب درماندہ منزل کارواں

تھا جو کل فریاد رس وہ آج خود ناشاد ہے
تاجدار ہفت کشور خانماں برباد ہے

گل بدامن دہر میں اغیار کے گلزار ہیں
اور تری گلشن کی زیبائش کھٹکتے خار ہیں

بادۂ عشرت کی لذت سے عدو سرشار ہیں تیرے ارمان زندگی کے نام سے بیزار ہیں
کفر کی حق کے مقابل میں جزخوانی بھی دیکھ
بتکدے کی رونق اور مسجد کی ویرانی بھی دیکھ

ناخدا جاتا رہے بیڑی کی عبرت خیز ہے اُف یہ منظر کس قدر دل لرزو درد انگیز ہے
لنگر کشتی شکستہ بحر طوفاں خیز ہے آسماں برگشتہ ہے باد مخالف تیز ہے
پھر شکستہ ہمت عالی سے اپنی کام لے
کر کے قسمت پر بھروسہ بادباں کو تھام لے

زندگی اقوام عالم کی سراپا جوش ہے تو خمار بے خودی میں کس قدر مدہوش ہے
بربط امید سے اب یاس ہم آغوش ہے وقت سے پہلے رباب زندگی خاموش ہے
سر پہ تیرے آج ہے چھائی گھٹا ادبار کی
آشیاں ہے نذر زنبرا برق شعلہ بار کی

کھو نہ وقف یاس ہو کر شان استقلال کو خندہ پیشانی سے اٹھ قسمت کے استقبال کو
ہاں دکھا دے جوہر شمشیر فرخ فال کو عہد ماضی سے ملا دے حال و استقبال کو
خون آبائی رگوں میں جوش کھائے کاش پھر
دے درفش کاویانی کو شکست فاش پھر

جب سے تیری نبض ہستی کی حمیت کھو گئی دامن امید پہ سر رکھ کے قسمت سو گئی
کشت دل میں یاس تخم درد و حرماں بو گئی شمع احمر بجھ گئی بے نور خلوت ہو گئی
عشرت ماضی کی بس لب پر کہانی رہ گئی
نشہ رخصت ہو گیا اور سر گرانی رہ گئی

تجھ سے کہتا ہے یہ فطرت کا تقاضا بر ملا　　　جادۂ حق پہ چل، اس کجروی سے باز آ
کفر کی آندھی بجھا دے شمعِ دینِ مصطفےٰؐ　　　ہے یہی تیری عقیدت ہے یہی پاسِ وفا

حق کے پروانوں سے خالی حیف یہ محفل ہوئی
قومِ مسلم آہ کیوں زناریٔ باطل ہوئی

تیری ملت بھی وہی ہے ہادیٔ ملت وہی ہے　　　نورِ وحدت بھی وہی ہے جوششِ رحمت وہی ہے
مصحفِ ناطق ہے اب تک مخزنِ حکمت وہی ہے　　　ہے ابھی توحید میں تسخیر کی طاقت وہی

ہے پیمبرؐ بھی وہی تیرا وہی اسلام ہے
لیکن اے مسلم تری غفلت کا یہ انجام ہے

چارہ سازِ دردِ ملت حامیٔ دینِ متین　　　جس کے پرتو سے ہوئی روشن عرب کی سرزمیں
کی عطا حق نے جسے سرداریٔ دنیا و دیں　　　باعثِ تخلیقِ عالم رحمۃ للعٰلمینؐ

قول اکملت لکم ہے جس کے افسر کا نگیں
''قاب قوسین'' اور او ادنیٰ کی خلوت کا مکیں

چھوڑ کر راہِ رضائے سیدؐ ابرار کو　　　بھول کر عہدِ وفائے احمدؐ مختار کو
پھینک کر سر سے ردائے رحمتِ غفار کو　　　محو کر کے یاد سے اسلاف کے کردار کو

روحِ آزادی کو پابندِ غلامی کر لیا
ملتِ اسلام کو تو نے مقامی کر لیا[1]

---

[1] علامہ اقبال:-

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو　　　امت احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو

(جوابِ شکوہ)

اب بھی اے کج رو مسافر کج روی یہ چھوڑ دے
باگ رہواروں کی اب منزل کی جانب موڑ دے
توڑ دے جتنے بھی ہیں اصنام باطل توڑ دے
رشتہ الفت محمد مصطفےٰ سے جوڑ دے

ہو کے مست اکبار پھر اس بادۂ پرجوش سے
دور کردے لعنتِ بارِ غلامی دوش سے

پھر دکھا دے ذوالفقارِ حیدرؓ کی شان کو
اور ابوبکرؓ و عمرؓ کی قوتِ ایمان کو
زندہ کردے پھر جہاں میں سطوت عثمانؓ کو
پنجۂ باطل سے کر آزاد ہندستان کو

چھیڑ دے سازِ خودی توحید کی مضراب سے
جاگ اٹھیں پھر نیند کے ماتے فنا کے خواب سے

ساز بزم اب بھی پر ہو نعرہ تکبیر سے
ہو گیا خاموش لیکن شومیٔ تقدیر سے
ہاں مٹا دے نقش باطل جلوہ شمشیر سے
لے کے ایثار و تحمل کا سبق شبیرؓ سے

وقت ہے اب بھی کہ تو یہ بے نیازی چھوڑ دے
روحِ حریت دکھا طوقِ غلامی توڑ دے

عورت

کیا ہے عورت؟ صانع قدرت کا رنگیں شاہکار
نشۂ مے کی لطافت حسن فطرت کی بہار
غنچہ و گل کا تبسم موجِ دریا کا خرام
خود فراموشی کی دعوت خود فروشی کا پیام
کیا ہے عورت ایک رنگیں اور دلکش خواب ہے
یا نزاکت کے چمن کا اک گلِ شاداب ہے

آہ اے شاعر حقیقت کی نہیں تجھکو خبر
کس قدر محدود و ظاہر بیں ہے اف تیری نظر

ہے دلِ سادہ نوا سرگشتۂ رنگِ مجاز
کیا ہے عورت؟ عفت و شرم و حیا کی پاسباں
حاملِ انسانیت اور غمگسارِ کائنات
الفتِ معصوم اس کی جیسے طفلی کی حیات
محفلِ تخلیقِ آدم کی وہ شمعِ جانفزا
عمر کے نغموں سے پر ہے اس کا سازِ زندگی
سادگی پر اس کی قرباں سینکڑوں رنگینیاں
ہو اگر حاصل مقدر ہو نگاہِ ژرف بیں
اس کی آغوشِ کرم طفلی کی جنت سرسبز
ہے معلم درسِ اول کے پڑھانے کے لئے
ہیں مثالِ مہ جو ہستی کے افق پر جلوہ گر
جن کی نکہت سے مشامِ دو جہاں ہے فیضیاب
استواری اور استقلال میں مشہور ہے
اس کا زیور ہے عمل پوشاک ہے صبر و قرار
ہے وہ صابر دل جو ہے شیرہ گو غم کے شرار
تختۂ مشقِ ستم یا کشتۂ بیداد ہو
ملتے ہیں اکثر وفاؤں کے ثمر جور و ستم
خیر خواہِ قوم ہے اس کا دلِ درد آشنا
آفریں وہ اس کے دل کا جذبۂ بے اختیار

مجھ سے سن عورت کی فطرت کا سمجھنا ہے جو راز
پیکرِ سعی و عمل تصویرِ تمکین و وقار
جس کے سوز و ساز سے ہے رونقِ بزمِ حیات
ہے خداوندِ جہاں کا دستِ شفقت اس کی ذات
زندگی کی ظلمتوں کو جس نے روشن کر دیا
اس کی چشم دوربیں آگاہِ رازِ زندگی
اس کی خاموشی میں پنہاں اس کا اندازِ بیاں
اس کے قدموں کے ہے زیرِ سایہ فردوسِ بریں
اس کا زانو تختِ شاہی دستِ شفقت تاجِ زر
خضرِ رہ ہے منزلِ مقصد بتلانے کے لیے
ہیں اسی معدن کے وہ سارے درخشندہ گہر
ہیں اسی گلشن کے پروردہ وہ گلہائے خوش آب
وقت کی یورش سے اس کے دل کی دنیا دور ہے
غم کی تلخی میں بھی ہے اس کا تخیل خوشگوار
چہرہ سے لیکن نہ ہوگی دل کی حالت آشکار
پھر بھی ناممکن زباں آلودہ فریاد ہو
پھر بھی ہے پابندِ آئینِ وفا اس کا قدم
ہے سراپا صدق و صبر و مہر و ایثار و وفا
کرتی ہے وہ اپنی ہمت سے کڑی راہوں کو پار

بیدلؔ اس جنسِ گراں مایہ کی ارزانی ہے آج
ماند اس نایاب گوہر کی درخشانی ہے آج

غزل

دیکھ کر اذنِ طرب ساقی میخانے کا — جھک کے منہ چوم لیا شیشے نے پیمانے کا
سازِ عشرت سے نکلتی ہے صدائے ماتم — کیا یہ دنیا ہے مرقع مرے غم خانے کا
نظر آتی ہے ہر اک بت میں خدا کی صورت — سلسلہ کعبہ سے ملتا ہے صنم خانے کا
آج وہ محفلِ اغیار میں آتا ہے نظر — دل مرا آئینہ ہے جس کے پری خانے کا
درس لے زندگی شمع سے اے پروانے — عاشقی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا[1]
حرم و دیر میں کس طرح لگے دل اُس کا — جس کی نظروں میں ہو نقشہ ترے کاشانے کا
دیکھ جاؤ مرے مرنے کا تماشہ تم بھی — آخری باب ہے یہ زیست کے افسانے کا

بیدلؔ اس طرح سے کچھ عمر بسر کی ہم نے
زندگی کا ہوا اطلاق نہ مر جانے کا[2]

---

[1] فانی :-
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

[2] فانی :-
فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

بیکسؔ :- محترمہ بلقیس فاطمہ۔

محترمہ بلقیس فاطمہ بیکسؔ محترمہ عبرتؔ کی دختر ہیں اور گوالیار کی رہنے والی ہیں۔ آپ کے حالات جو آپ کے عزیز جناب خواجہ محفوظ حسین صاحب نے لشکر گوالیار سے لکھکر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

"بلقیس فاطمہ صاحبہ بیکسؔ ۵ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بمقام میرٹھ پیدا ہوئیں تعلیم و تربیت سب گھر پر حاصل کی۔ آپ کی والدہ عبرتؔ ایک شاعرہ اور نہایت اعلیٰ قسم کی خاتون ہیں۔ ماحول ہمیشہ ادبی اور سیاسی رہا جس نے بلقیس فاطمہ کے دل و دماغ پر اپنا گہرا عکس ڈالا۔ آپ کی تمام زندگی تاہنوز ادبی اور سیاسی رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے ایک خواتین کی انجمن خود قائم کی جس کا نام "انجمن خواتین پردہ نشین" ہے۔ اسی اثناء میں مسلم لڑکیوں کے واسطے ایک اسکول بھی قائم کیا جس کا نام "قادریہ گرلز اسکول" ہے یہ اسکول مڈل (Middle) تک ہے۔

فارسی اور اردو میں آپ کو کافی دسترس ہے۔ بی۔ اے کی طالبات کو فارسی وغیرہ پڑھاتی ہیں۔ شاعری ۱۲ سال کی عمر سے شروع کی ہے۔ اول اول تو اس کی اصلاح والدہ صاحبہ نے فرمائی بعد میں قاضی محمد ریاض الدین انصاری۔ ایم۔ اے حیوری سے اصلاح لی۔

خان بہادر سید محمد حسین صاحب کے فرزند لفٹیننٹ سید محمد اطہر صاحب بی۔ اے (اکسن) کے ساتھ موصوفہ کی شادی ۲۱ فروری سنہ ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔"

راقم خواجہ محفوظ"

محترمہ کے ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ بعنوان "جذبات بیکس" موسومہ بہ "نالۂ بیکس" ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جس پر قاضی ریاض الدین صاحب ریاض انصاری ایم۔ اے جیوری لشکر گوالیار نے مقدمہ لکھا ہے اور تمہید خود محترمہ نے تحریر کی ہے۔ یہ ۴۶ صفحات کی ایک مختصر کتاب ہے۔

محترمہ کے دل میں بچپن ہی سے قومی وملی درد موجود ہے۔ آپ نے گوالیار میں ایک انجمن خواتین اور ایک مدرسۂ نسواں قائم کیا ہے جس کا ذکر اوپر آپ کے حالات میں آچکا ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے "رضاکار مستورات" کی ایک جماعت بھی قائم کی جس کا کام بقول مقدمہ نگار۔ "شریف مسلمانوں کے یہاں شادی وغمی کے مواقع پر ان خاندانوں کی بقدر استطاعت اور موافق ضرورت امداد کرنا ہے۔ اور مراسم بیجا پر اصلاحی لکچر دینا ہے۔"

محترمہ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جہاں تعلیم نسواں کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ آپ نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے ذاتی شوق وانہماک اور اپنی والدہ کی قابل تربیت میں حاصل کیا۔ آپ کی شاعری اور جذبۂ قومی کی ابتدا، جیسا کہ محترمہ نے خود "تمہید" میں تحریر فرمایا ہے نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی سابق ممبر کونسل آف ریجنسی گوالیار کی تصنیف "صبح نور" کے مطالعہ سے ہوئی۔ اس کے بعد علامہ اقبال اور مولانا حالی کی نظموں کے مطالعہ نے آپ کو متاثر کیا اور اُس وقت سے آپ قومی وملی رنگ میں کہنے لگیں۔ آپ نہایت متشرع اور پردہ نشین

خاتون ہیں اور مسلمان بچیوں کے لئے مذہبی تعلیم کو نہایت ضروری خیال کرتی ہیں
محترمہ نے مجاز کی نظموں پر جو تضمینیں لکھی ہیں اور ان میں جن شریفانہ
جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے وہ خواتین کے لئے لائق فخر ہیں۔ یہ
صحیح ہے کہ ابھی محترمہ کے کلام میں فن کارانہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی ہے مگر
آپ نے اپنی منزل کی "سمت" دریافت کر لی ہے اور آپ راستے ہیں ہیں۔
آپ نے اپنا ایک رنگ مخصوص کر لیا ہے اور امید ہے کہ مشق، تجربہ اور عمر
کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام میں بھی پختگی پیدا ہو جائے گی۔ آپکے مرسلہ
کلام کا انتخاب درج ذیل ہے:۔

نوجوان خاتون سے

تضمین بر نظم مجاز

حجاب لم یزل ہم نے سیکھی ہے حیاداری
صدف کے دم سے حاصل ہے گہر کو بھی ضیاباری

اسی پردے نے بخشی روح عالم کو سبکساری
تقاضا کس لئے ہو کیوں ہوا ہے حکم یہ جاری

"حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا"

ہماری پاس جو ہتھیار ہیں ہم ان سے واقف ہیں
ہمارے جو نہاں کردار ہیں ہم ان سے واقف ہیں

ہماری پاس غنچہ دار ہیں ہم ان سے واقف ہیں
جو یہ کہتے ہیں وہ غدار ہیں ہم ان سے واقف ہیں

"تیری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا"

ہمیں معلوم ہے عورت کی جو کچھ ہے عملداری
کہیں ہے ٹھوکروں میں اور کہیں ہے باد بہاری

کہیں وہ ملکۂ دل بن کے کرتی ہو جہانداری
یہ فرما کر نہ کیجے آپ مستورات کی خواری
"تری چین جبیں خود اک سزا قانون فطرت میں
اسی شمشیر سے کار سزا لیتی تو اچھا تھا"
تمہارے اس تملق نے کیا برباد لاکھوں کو
تمہاری اس خوشامد نے کیا رسوا ہزاروں کو
بھلی لگنے لگیں باتیں یہ خاتونوں کے کانوں کو
انھیں باتوں پہ کر ڈالا انھوں نے چاک پردوں کو
"ترے زیر نگیں گھر ہو محل ہو قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا"
کہیں تو رات دن فتنے جگانے کا تقاضا ہے
کہیں گانے بجانے کے لیے ارشاد ہوتا ہے
کہیں ارض و سما لینے کا ہم کو حکم ملتا ہے
پھر اس پر بھی یہ فرمانا تماشہ ہی اچھا ہے
"اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا"
یہ ہنگر چوڑیاں نسوانیت پر ٹھٹکے کہتے ہیں
بہت چین جبیں کی تمکنت پر ٹھٹکے کہتے ہیں
بھلا وہ اور کسی شیطانیت پر ٹھٹکے کہتے ہیں
سبحان اللہ وہ تو حریت پر ٹھٹکے کہتے ہیں
"ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا"

تضمین متضاد بر نظم مجازؔ "ارباب نشاط"

چھا گیا افلاک عبرت پر جو ابر ارتقا
چھین کر نور بصر خورشید غیرت چھپ گیا
بجلیاں گرنے لگیں عزت کا خرمن جل اٹھا
"عہد روشن" نے کیا پھر تو چراغاں جا بجا

" دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم "

عشوۂ ترکانہ ہر جا محوِ بیخودی بیحجاب　　　حسن و رنگینی کے ہر سو کھلکھلاتے تھے گلاب
محو شانِ ہند ڈالے جا بجا دامِ شباب　　　دور رہے تھے جامِ صہبا تھا عجب دورِ شراب

" نازپروردہ حسین افکارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز "

جن کی بے باکی پہ دنیا رہے شرافت شرمسار　　　جن کی بربادی پہ تھی تہذیبِ مشرق سوگوار
جن کی بے عنوانیوں سے بیحجابی آشکار　　　حسنِ خانہ جلوہ بازار کا آئینہ دار

" جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ ندامت پاش پاش "

قشقہ سیمائے آزادی ہوئیں رسوائیاں　　　غازۂ روئے شرافت بن گئیں بے باکیاں
پیرہن جسمِ نگاریں کا ہوئیں عریانیاں　　　پھر سرِ بازار ہیں ہائے غضب لمعہ چکاں

" وہ حسین پیشانیاں آئینۂ تمکینِ ناز
وہ رسیلی مدبھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز "

ہیں یہ تابوتِ تمدن اپنے کاندھوں پر لئے　　　اپنے صدیوں کے چلن چلتی ہیں ٹھکرائے ہوئے
کفر کا جادو جگائے دین سے پردہ کئے　　　دخترانِ اہلِ عرفاں کیا یہی ہیں دیکھئے

" وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار "

کیا انھیں کے واسطے اتری تھیں آیاتِ حجاب　　　اب چمکتی ہیں جو بن کر آسماں پر آفتاب

آنکھ جھپکاتا ہی جنکو دیکھکر تیغ و شباب
بجلیاں چمکارہا ہی جن کا یوں دورِ شباب

رُخ پہ شادابی لبوں ہیں رنگ تبسم برق پاش
چست پیراہن نمایاں جسم سیمیں کی تراش

وعدۂ فردا کہاں یہ رنگ سامانی کہاں
حور و غلماں کا تصور جم نہیں سکتا یہاں
ختم تب کیجے داستاں ہوتی ہی کانوں پر گراں
سُن رہے ہیں ہم بھلا کر اپنا سب سود و زیاں

قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی نے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت

تیغ "لا" سے تھے کبھی جو صف شکن باطل شکن
دبدبہ جن کا نرالا اور انوکھا تھا چلن
جن کی صولت سے دھڑکتے تھے صنم اور برہمن
راگ وحدت کے مغنی سنتے ہیں ہو کر مگن

جام زریں کی کھنک سی قلقل مینا کے ساتھ
قدسیوں کی لے سرود بربطِ زہرا کے ساتھ

جو مجسم نور یزداں ضرب الا اللہ سے
جس کے پرتو سے بنیں لاکھوں جہاں انوار کے
جس کی رفعت رفعت اوج ثریا سے ملے
وہ بتوں کے قہقہوں پر جان و دل دیں ہائے

شوخیٔ لب ناز فرما خندۂ بیباک پہ
نور و موسیقی کی اک بارش سی فرش خاک پہ

خطاب بہ دلدادگان عصرِ نو

اسلام کی عزت کو مٹا ڈالنے والو
اسلام کی بنیاد ہلا ڈالنے والو
اسلام کی شمع کو بجھا ڈالنے والو
بنیادِ اخوت ہیں خلا ڈالنے والو

کیوں دامنِ اسلام پہ تم داغ ہوئی ہو
کس واسطے تم داغی اسلام ہوئی ہو

بدلی ہے طبیعت تو بدل ڈالو خدا بھی بھاتی نہیں جب بات رسولِ بطحا کی
آتی ہے پسند کفر و ضلالت کی فضا ہی اب مٹ چکی جو دل میں نہاں بوئے وفا تھی

کیوں کرتے ہو بدنام محبت کو وفا کو
ہر حال میں جب چھوڑ چکے صدق و صفا کو

الفقر کی سنت کو بھلا بیٹھے ہو دل سے پھر کہتے ہو پیرو ہیں رسول اور خدا کے
احکام سے پھر کر بھی یہ دعوے ہیں تمہارے تم ہو گئے اب خواہش نفسانی کے پیچھے

بدلی ہیں فضائیں چمنستانِ جہاں کی
بدلی ہوئی ہے طبع رسا پیر و جواں کی

دیتے ہیں پتہ جو ہر ذاتی یہ تمہارے بغلوں میں ہی قرآن تو شیطاں سے اشارے
کرتے ہو جو بے پردہ حسینوں کے نظارے جذبات شریفانہ مٹے جاتے ہیں سارے

ہے تم کو نہ عزت کا نہ ناموس کا کھٹکا
تعلیم کی صہبا کا لگا خوب یہ چسکا

کافر بنو اور کافرہ بیٹی کو بناؤ اغیار کی محفل ہو تو بیوی کو بچاؤ
ہو بزم طرب گرم تو بہنوں کو بلاؤ بے باک مناظر ہوں تو اماں کو دکھاؤ

لو داد زمانہ سے زمانہ کی ہوا سے
کیا کام تمھیں دین سے ایماں سے خدا سے

نغمۂ ہندی

مہر و وفا سے ہاتھ دھلے ہیں نیا ہے منجدھار
پریم کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے کیسے ہوں اُس پار
حرص و حسد میں دیدے گیانی دیدہ پربھو آگ
بھائی برادر آپس والے جوگن ڈشٹی کا سکھلائیں
اپنوں سے جو دل برکا دیں آگ تعصب کی بھڑکائیں
ان کی بدھی ٹھکرا دیجو رکھیونا تو ایک سو لاگ

شکوہ خواتینِ مشرق

وفا آشنا دل ہمارا جو پایا ۔۔۔ ہمیں خوب دل بھر کے تم نے ستایا
خدا کو تمہارا وتیرہ نہ بھایا ۔۔۔ سروں پر تمہاری فلاکت کو آیا
قہر بن کے تہذیب مغرب کا سایہ

محبت کا پہنے ہوئے تھے جو گہنا ۔۔۔ سدا ظلم سہنا مگر کچھ نہ کہنا
مصیبت میں پھنسکر بھی خاموش رہنا ۔۔۔ ہمارا مقدر ہمارا یہ کہنا
جفاؤں کو سہنا وفاؤں میں بہنا

ستم پر ستم جور پر جور سہتے ۔۔۔ شرافت سے لیکن قدم بھر نہ ٹلتے
مروت میں جیتے محبت میں مرتے ۔۔۔ بحالِ زبوں صرفِ بیداد رہتے
مگر ظالموں کو بھی ظالم نہ کہتے

لقب ہم کو پاؤں کی جوتی ملا تھا ۔۔۔ وفاؤں کا گویا ہماری صلہ تھا

مگر ہم کو پھر بھی نہ کوئی گلا تھا یہ دل پھر بھی ہر وقت صرفِ ولہ تھا
ہمارا یہ دل اور یہ حوصلہ تھا

بنا کر قفس میں ہمارا نشیمن چڑھا کر دریچوں میں چلمن پہ چلمن
گھروں میں نہ رکھا کہیں ایک روزن ہمیں کر دیا تم نے یوں زیرِ مدفن
نہیں گو یا ہم کو تمنائے گلشن

مگر جس کو کو کہتے ہو تم دورِ رنگیں اسی میں تمہارن کی بربادیاں تھیں
لیئے تھیں جو آغوش میں لطف تمکیں انھیں نے یہ تم کو بہاریں دکھا دیں
جو تم پر قیامت کی گھڑیاں یہ آئیں

جو پردہ نشیں آشکارا ہوئی ہے وہ بامِ فلک پر ستارا ہوئی ہے
جو اس دور میں جلوہ آرا ہوئی ہے تمھارے دلوں کا سہارا ہوئی ہے
یہ کیوں بے حیائی گوارا ہوئی ہے

نہ جس میں حیا ہے نہ جس میں وفا ہے مجسم ریا ہے سراپا دغا ہے
نہ بہر دعا ہے نہ بہر دوا ہے خود آرائیوں میں فقط مبتلا ہے
بظاہر بلا ہے بہ باطن قضا ہے

ہمارے تو رکھا تھا آنچل کا پردہ کیا ہم نے آوازِ چھاگل کا پردہ
ہوا ہم سے اندھے کا پاگل کا پردہ کیا دل کا آنکھوں کا کاجل کا پردہ
قیامت کا آفت کا ہل چل کا پردہ

تو پھر اب یہ بے پردگی عام کیوں ہے مہِ مشرقی بر سرِ بام کیوں ہے
یہ صبحِ تفاخر میں اب شام کیوں ہے یہ خودداریوں کا خوش انجام کیوں ہے

اب ان جوتیوں پر یہ انعام کیوں ہے

دخترِ ہندی

مندرجہ ذیل نظم آج سے ۳۱ سال پہلے لکھی گئی جبکہ قومی خدمات پر گامزن ہونے میں دقتوں اور مشکلوں سے زبردست تصادم ہوا تھا۔

پامالِ جفا جذبۂ معصوم ہے تیرا
جس گھر میں ولادت سے ہوا تیری اُجالا
صد گونہ تلطف میں محبت میں پلی تو
گو تجھ پہ اعزہ کے مراعات بہت ہیں
قصہ نہیں سنتا کوئی لیکن ترے دل کا
جذبات کی تیری کوئی پرسش نہیں ہوتی
ہوتا نہیں کچھ پاس ترے ذوقِ طبع کا
لب ہائے سکوں ساز سے کچھ کہہ نہیں سکتی
ہوتی رہی دنیا میں یہی مشقِ ستم تو

اے دخترِ ہندی یہ مقسوم ہے تیرا
جس گھر میں تری آنکھ کھلی ہوش سنبھالا
آنکھوں میں پھری دل میں بسی گھر میں رہی تو
ہر ایک کے الطاف و عنایات بہت ہیں
دستور یہاں ہے یہی ہر قوم و ملل کا
"عورت ہے" ترے دل کی پرستش نہیں ہوتی
ہوتا نہیں یاں درد کا دختر کے مداوا
جذبات کے طوفاں میں زباں ہل نہیں سکتی
مقسوم یہاں ہے کہ رہے صرفِ الم تو

غزلیات[1]

جیف ہے اپنی زیست پر ایسے مٹے ہیں آن میں
لطف نہیں نیاز میں کیف نہیں نماز میں

---

[1] انتخاب از نالۂ بیکس

میرے دلِ نزار کا ظرف تو دیکھیے ذرا
جلوۂ طور ہی لیے اپنی حریم ناز میں
بیکسِ زار کا نور از پھر بھی نہ پا سکا کوئی
ہوتی رہی صدا بلند سوز کی غم کے ساز میں

جس کو سینچا تھا کبھی خون جگر سے تو نے
آج ہوتا ہے وہی تیرا گلستاں برباد
ہے دعا تجھ سے یہ بیکس کی خدایا سن لے
ورنہ ہو جائیگا مسلم کا گلستاں برباد

لیلیٰ پردہ نشیں تو نے ستم کیا کر دیا
بیٹھ کر پردہ میں کیا خود کو رسوا کر دیا
کون پا سکتا ترے راز نہانی کو مگر
تو نے اپنے ہاتھ سے سب رازِ افشا کر دیا
بیٹھ کر ہر محمل دل میں تماشائی بنا
اور کل مخلوق کو وقفِ تماشا کر دیا

شمع محترمہ عظمت اقبال

محترمہ عظمت اقبال کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں (صفحہ ۵۹۰ تا صفحہ ۵۹۱) عظمت تخلص کے تحت ہو چکا تھا۔ پہلے آپ عظمت تخلص کرتی تھیں مگر شوہر کی وفات کے بعد سے اس کو ترک کر کے شمع تخلص کرنے لگی ہیں، راقم السطور کے نام آپ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتی ہیں۔

"شروع شروع میں میں عظمت ہی تخلص کیا کرتی تھی۔ اور اس وقت تک اس کے تبدیل کرنے کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا جب تک کہ میری زندگی جو کہ مسلسل قہقہہ تھی آنسوؤں کا تار ہو کر نہ رہ گئی"

آپ چودھری نعمت اللہ صاحب ایڈووکیٹ (لکھنؤ) کی صاحبزادی اور محترمہ

عظمت اقبال 'شمع'

کنیز فاطمہ حیا کی چھوٹی بہن ہیں۔ آپ کی زندگی ایک غم انگیز افسانہ ہے جس کا اثر آپ کی شاعری پر بدرجہ اتم موجود ہے آپ کی شاعری خود آپ ہی کے لفظوں میں "عشق کا گذرا ہوا افسانہ" اور "اُجڑے ہوئے دل کی داستان" ہے۔ آپ کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اس میں جوش و تپش اور یاس و حسرت کے تمام دلائل موجود ہیں۔ امید ہے کہ زمانہ کے ساتھ کلام میں پختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔

محترمہ کے خود نوشت حالات اور مرسلہ کلام درج ذیل ہے:

"اوائل عمری کے زمانہ میں اپنی بڑی ہمشیرہ صاحبہ (حیا) کی دیکھا دیکھی میں نے بھی شعر کہے اور میری بہن نے اصلاح کر دی۔ پھر پڑھنے لکھنے کی مصروفیت میں وہ ذوق پروان نہ چڑھ سکا اور میری شادی ہو گئی، اس درمیان میں بھی میں شاعری سے بیگانہ محض رہی۔ مگر زمانہ نے مجھے پانچ ہی سال بعد مجھے ایک ایسے صدمے سے دوچار کر دیا جس کا تصور ہی زندہ درگور کرنے کو کافی تھا لیکن مشیت کے سامنے دنیا ہمیشہ سر تسلیم خم کرتی رہی ہے، اسی طرح میں بھی اپنے پرستار اور فرشتہ خصلت شوہر سے جدا کر لی گئی، بہر نوع میرے دل کی گہرائیوں سے جو بے پناہ غم کی آہیں لبوں پر آجاتی ہیں یہ وہی پارے ہیں چاہے انھیں کوئی شاعری سے تعبیر کرے چاہے میرے المناک آنسو اور آہوں سے!

عظمت اقبال شمع"

داستانِ درد

دردِ دل تھم جا ذرا آنسو بہانے دے مجھے
عشق کا گذرا فسانہ یاد آنے دے مجھے

اُف سُلگ اٹھا ہے سارا جسم دل کی آگ سے
آتشِ دل اشکِ خونیں سے بہانے دے مجھے

ڈوبتی ہے کشتیٔ دل ناخدا کوئی نہیں
کشتیٔ دل آج پھر ساحل پہ لانے دے مجھے

اے دلِ ناکام ارمانوں کا ماتم کب تلک
حسرتوں کی آج اک تربت بنانے دے مجھے

پھر تصور گریہ سامانی کے طوفانوں میں ہے
پھر جبینِ شوق قدموں پر جھکانے دے مجھے

ان دنوں پھر بزمِ دل ہے آہ کیوں اُجڑی ہوئی
اک خیال و خواب کی دنیا بسانے دے مجھے

ضبطِ غم کی انتہا ہے شمعِ سوزِ نہاں!
داستاں اُجڑے ہوئے دل کی سنانے دے مجھے

دل میں جب بے چینیوں کی لذتیں پاتی ہوں میں
ہوش کی منزل سے کوسوں دور ہو جاتی ہوں میں

یہ گھٹائیں، یہ بہاریں، یہ ہوائیں، یہ فضا
ہر گلِ نظارہ میں فطرت کی بُو پاتی ہوں میں

اک کشاکش ہر قدم، ہر لحظہ پیش اک امتحاں
ہر نفس برہم نظامِ زندگی پاتی ہوں میں

کارفرما کون سی قوت دلِ محزوں میں ہے
جی میں کیا کچھ ہے مگر کہنے نہیں پاتی ہوں میں

ہر تبسم بھی میرا اک داستانِ درد ہے
مسکراتی ہوں تو اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہوں میں

ضبطِ غم کی چارہ فرمائی کو گذریں مدتیں
زندگی کی کشمکش سے اب تو گھبراتی ہوں میں

سازِ خاموشی میں بھی ہیں غم کے نغمے صد ہزار
آشکارا ہے وہ جس کو راز بتلاتی ہوں میں

کتنی لامحدود ہیں اس بیخودی کی وسعتیں
منزلِ ادراک سے آگے بڑھی جاتی ہوں میں

نبضِ غم ساکت ہے، اور نباضِ فطرت ہے خموش
جیسے اک کھوئی ہوئی شے آج پھر پاتی ہوں میں

گرچہ شمع جل بجھی شمع شبستانِ امید
دل کے خاکستر میں کچھ اب بھی شرر پاتی ہوں میں

جوانی میری آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے
کوئی برقِ طپاں دل کے قریں معلوم ہوتی ہے

نظر کی وسعتوں میں ان کے جلوے بس گئے ایسے

کہ ہر صورت نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

گرے پڑتے ہیں سجدے خم ہوئی جاتی ہے پیشانی
نظر کو حسن ہی کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

ہوئی تکمیل شاید آج اے سوزِ دروں تیری
کہ اب ہر سانس آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے

مجھے معلوم ہے انجام گو دنیائے فانی کا
خدایا پھر بھی کتنی دلنشیں معلوم ہوتی ہے

جدائی نے حدیں وہ کھینچ دی ہیں وائے محرومی
کہیں پر منزلِ مقصد نہیں معلوم ہوتی ہے

مری دردِ محبت کی خلش کو پوچھتا کیا ہے
کہاں بتلاؤں ہمدم ہر کہیں معلوم ہوتی ہے

میری مدہوشیوں کو واسطہ کیا جام و مینا سے
کہ اب ہر تلخئ مے انگبیں معلوم ہوتی ہے

رہِ غربت میں رک جاتے ہیں تھک کر جب قدم میرے
مجھے جب سے میری منزل وہیں معلوم ہوتی ہے

سمجھنے کا نہ قصہ اور نہ دکھلانے کی شے اُلفت
نظر سے دور اور دل کے قریں معلوم ہوتی ہے

کسی کے نام پر تج دی ہے شمعِ زندگی اپنی
تو پھر شکووں کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے

اشاریہ

اشاریہ

الف ممدودہ (آ)

الف مقصورہ (ا)

(چ)

ح

(خ)

(ز)

(س)

(غ)

(ف)

(ق)

(ن)

ختم شد